چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
نومبر 2015
REGD.NO.SS-1044
November 2015
قیمت -/60 روپے

☆ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خبر سنا دو جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان بخیلوں کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی اور کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے اب اس کا مزہ چکھو۔ (سورۃ توبہ 9 آیت 34 سے 35)

☆ کچھ شک نہیں کہ تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر عرش پر جا ٹھہرا وہی رات کو دن کا لباس پہناتا ہے کہ وہ اس کے پیچھے دوڑتا چلا آتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند اور ستاروں کو پیدا کیا سب اس کے حکم کے مطابق کام میں لگے ہوئے ہیں۔ دیکھو سب مخلوق بھی اسی کی ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔ یہ اللہ رب العالمین بڑی برکت والا ہے۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 54)

☆ اور جو چوری کرے مرد ہو یا عورت ان کے ہاتھ کاٹ ڈالو۔ یہ ان کے فعلوں کی سزا اور اللہ کی طرف سے عبرت ہے اور اللہ زبردست اور صاحب حکمت ہے اور جو شخص گناہ کے بعد توبہ کرلے اور نیکوکار ہو جائے تو اللہ اس کو معاف کر دے گا۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 38 سے 39)

☆ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑائی کریں۔ اور ملک میں فساد کرنے کو دوڑتے پھریں ان کی یہی سزا ہے کہ قتل کر دیئے جائیں یا سولی چڑھا دیئے جائیں یا ان کے ایک ایک طرف کے ہاتھ اور ایک ایک طرف کے پاؤں کاٹ دیئے جائیں یا ملک سے نکال دیئے جائیں۔ یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لئے بڑا بھاری عذاب تیار ہے۔ ہاں جن لوگوں نے اس سے پیشتر کہ تمہارے قابو آ جائیں توبہ کر لی تو جان رکھو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 33 سے 34)

☆ اور طبیعت تو حرص کی طرف مائل ہوتی ہے اور اگر تم نیکوکاری اور پرہیزگاری کرو گے تو اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔ (سورۃ نساء 4 آیت 128)

☆ اور ہم جو پیغمبروں کو بھیجا کرتے ہیں، تو صرف اس لئے کہ لوگوں کو اللہ کی نعمتوں کی خوشخبریاں سنائیں اور عذاب سے ڈرائیں۔ اور جو کافر ہیں وہ باطل کی سند سے جھگڑا کرتے ہیں تاکہ اس سے حق کو پھسلا دیں اور جو کافر انہوں نے ہماری آیتوں کو اور جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے ہنسی بنا لیا۔ (سورۃ کہف 18 آیت 56)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

چونکا دینے والی خوفناک کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کراچی

جلد نمبر 17 شمارہ نمبر 02 نومبر 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

منیجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1000 روپے

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیوار دوبازار کراچی: 32744391

خطوط

مریم شاہ بخاری سرگودھا سے۔ السلام علیکم! اللہ تعالیٰ سے تمہاری ترقی کے لئے دن رات دعاگو ہوں، اللہ کرے تمہیں جو عروج حاصل ہے وہ دن بدن بڑھتا ہی رہے، تمہارے حسن و ترقی کو کبھی زوال کی ہوا چھو کر بھی نہ گزرے، تمہاری سالگرہ پہ تمہیں مبارکباد پیش کرتی ہوں اور ان سب کو بھی جو تم سے وابستہ ہیں تمہارے حسن کو سنوارنے اور نکھارنے میں مصروف عمل ہیں۔ یہ انہی کی محنت اور انتھک کوششوں کا نتیجہ ہے جو تم اتنے برس گزر جانے کے باوجود ہمیں ہر بار فریش اور خوب صورت سے خوب تر بن کر ملتے ہو۔ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی تمہارے حسن اور نزاکت میں کمی واقع نہیں ہوئی اور خدا کرے کہ آنے والے برسوں میں بھی تمہاری چمک دمک اور آب و تاب یونہی قائم و دائم رہے۔ (آمین) "ڈر ڈائجسٹ" سے ہمارا تعلق بھی مضبوط سے مضبوط تر ہو اور اس کے قیمتی اوراق میں ہماری تحریریں یونہی شائع ہوتی رہیں، لوگوں کے لئے محبت اور امن کے نغمے بکھرتے رہیں، خوشبوؤں کی سرتال پہ دل جھومتے رہیں۔ اللہ کرے میری ارض پاک کا ہر فرد خوشحال اور با کردار ہو... میری ارض پاک ہمیشہ سلامت رہے آباد رہے۔ (آمین) ثم آمین۔ ایڈیٹر صاحبان آپ سب کو بھی سلام، مبارکباد اور Very Very thanks اتنا پیارا رسالہ نکالنے کے لئے، ماہ اکتوبر 2015ء میں شائع ہونے والی ہر تحریر خوب صورت تھی، خاص طور پر تار عنکبوت، خون آشام، بھیانک موت، آتش حسد، دھڑکتا دل، کرشمہ سازیاں، فرشتہ اجل، زندہ روح اور "گوشت زدہ" بہترین تحاریر ہیں جبکہ "قوس قزح" اور غزل میں شاعری خاص متاثر نہیں کر سکی بس ٹھیک تھی۔ سلسلے وار ناولز میں "رولوکا" اور "زندہ صدیاں" کی تو کیا ہی بات ہے... یہ دونوں کہانیاں ڈر ڈائجسٹ کی جان ہیں۔ "ڈر ڈائجسٹ کو پڑھنا ہی "رولوکا" کی وجہ سے شروع کیا اور اب تک جاری ہے۔ نیا سلسلہ "انگارے" بھی اچھی ہے آگے آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے، امید ہے شہزادہ صاحب کچھ اچھا ہی لے کر آئیں گے۔ باقی تمام رائٹرز کو سلام اور دعائیں۔ اپنی ایک غزل بھیج رہی ہوں امید ہے کہ جلد شائع ہوگی۔ اجازت دیں۔ اس بات کے ساتھ کہ خوش رہیں، خوشیاں بانٹیں اور اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھیں۔

☆☆ مریم صاحبہ۔ قلبی لگاؤ سے دعائیہ کلمات اور کہانیوں کی تعریف کے لئے بہت بہت شکریہ اور پھر دوبارہ شکریہ کہ آپ اپنی قلبی لگاؤ کا اظہار ہر ماہ خط بھیج کر کریں گی۔ Thanks۔

عروہ ھادی بھکر سے۔ السلام علیکم! ڈر ڈائجسٹ کے اسٹاف اور تمام لکھنے پڑھنے والوں اور دوستوں کو سلام۔ میں نے جولائی میں سنہری لاکٹ کہانی بھجوائی تھی وہ ملی؟ کیونکہ مجھے اگست کا شمارہ نہیں ملا۔ ڈر میں سب اچھا لکھ رہے ہیں۔ مجھے ملک این اے کاوش سے کچھ کہنا ہے۔ لالہ چھوٹی بہن سمجھ کے پڑھئے گا۔ آپ کی کہانیاں بہت بہت اچھی ہوتی ہیں مگر بوسیدہ ڈائرہ اور درندہ کا تھیم ایک جیسا تھا۔ آپ نے مرکزی کردار کو لالچی بنایا۔ پھر ایک شگفتہ شالی سے ملوایا۔ آخر میں اس کا بھیجا فرائی کروایا۔ کچھ ایک سا نہیں تھا۔ دوسرا تھا۔ دونوں کہانیوں میں ملہوترا خاندان؟... ایسا کیوں کیا؟ ڈونٹ مائنڈ لالہ! سب اچھا لکھتے ہیں، خاص طور پر لالہ ز رغام، لالہ عثمان اور آپی طاہرہ اینڈ آپی عطیہ ویری گڈ۔

☆☆ عروہ صاحبہ: خط لکھنے اور لالہ کاوش سے باتیں اچھی لگیں، امید ہے کاوش صاحب غور فرمائیں گے، مگر آپ بھی غور فرماتے ہوئے آئندہ ماہ بھی خط ضرور لکھئے گا۔ Thanks۔

درخشاں طالب حیدرآباد سے۔ السلام علیکم! میں ڈر ڈائجسٹ کو بہت شوق سے پڑھتی ہوں اور اس ڈائجسٹ میں چھپنے والی تمام کہانیاں منفرد ہوتی ہیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر میرے دل نے کہا کہ میں اس کے لئے کچھ لکھوں، لہٰذا اپنی تحریر "کٹھن ہے زندگی" ارسال کر رہی ہوں، اس امید کے ساتھ کہ اگر اس میں کچھ غلطیاں ہوں تو انہیں درست کر کے ضرور شائع کر دیں گے۔ یہ میری التجا ہے۔ پلیز غور فرمایئے گا۔ ڈر ڈائجسٹ کے تمام لکھاریوں اور قارئین کو اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے اور اس ڈائجسٹ کو اللہ دن دگنی رات چوگنی ترقی فرمائے۔ (آمین)

☆☆ درخشاں صاحبہ: آپ کی تحریر ضرور شائع ہوگی، نمبر آنے دیں اور ہاں تحریر ارسال کر کے بیٹھ نہ جائیں، امید ہے غور فرمائیں گی۔

آصفہ سراج لاہور سے، السلام علیکم! خیریت کے بعد عافیت کی طالب! ڈر ڈائجسٹ میں ایک مرتبہ پھر حاضر خدمت ہوں۔ امید ہے و علیکم ہیں گے۔ پریشانیوں، دکھوں اور غموں میں کچھ عرصے سے لئے ڈر سے رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔ مگر کہتے ہیں نا وقت ہر غم کا علاج ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ دکھ ختم تو نہیں ہوتے مگر وقت بڑا مرہم ہے۔ اس لئے تھوڑا سا قرار آ ہی جاتا ہے۔ اب اتنے عرصے بعد ڈر ڈائجسٹ دیکھا تو بہت خوشی ہوئی کہ بہت نئے رائٹرز اتنی پختگی سے لکھ رہے ہیں۔ اتنا عرصہ ڈر ڈائجسٹ میں موجود رہنے کے بعد بھی لگتا ہے کہ لوگ آصفہ سراج کو بھول گئے ہیں۔ مگر آصفہ سراج ڈر ڈائجسٹ کو نہ بھولی ہے نہ بھولے گی کیونکہ اس جیسا معیاری ڈائجسٹ پوری مارکیٹ میں نہیں ہے اور یہ واحد ڈائجسٹ ہے جو ہر نئے رائٹر کو خوش آمدید کہتا ہے۔ چلئے شاباش اب اپنی پرانی رائٹر کو بھی ذرا خوبصورت انداز میں ویلکم بیک کہیں تاہم ہر مرتبہ ہر ماہ ڈر ڈائجسٹ میں جلوہ افروز ہوتی رہوں اور اپنے قارئین کے لئے اچھی تحریر لکھتی رہوں۔ ابھی کہانی ادھوری ہے مکمل ہوتے ہی ارسال کردوں گی، چند اشعار بھیج رہی ہوں، شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں۔

☆☆ آصفہ صاحبہ چلئے قلمی نگاڑ سے ایک مرتبہ پھر موسٹ ویلکم، وعدہ یاد رکھئے گا کسی ماہ کی بھی غیر حاضری قابل قبول نہ ہوگی، امید ہے اپنے چاہنے والوں کی خوشی کے لئے ضرور تحریر ارسال کرتی رہیں گی۔ شکریہ۔

ثوبیہ شہزادی کھڈیاں خاص سے، محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم، آداب! ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ میں پہلی بار ایک تحریر ارسال خدمت ہے! یہ تحریر ماہ اگست 2015ء میں بھی بھیج دی تھی، اب معلوم ہوا ہے کہ آپ تک نہیں پہنچ پائی! بھلا ہو ڈاک خانے والوں کا! تحریر میں کمی بیشی ہوئی آپ درست فرما کر ہو سکے تو شامل اشاعت فرمائیں! شکریہ۔

☆☆ ثوبیہ صاحبہ جی پلیز! ذرا ویٹ کریں، آپ کی کہانی لائن میں لگ چکی ہے۔ مگر خط لکھنا نہ بھولئے گا۔

فلک زاہد لاہور سے، السلام علیکم! ماہ اکتوبر سالگرہ نمبر بذریعہ ڈاک موصول ہوا، فہرست میں اپنی کہانی دیکھ کر دل بلیوں اچھلنے لگا۔ سب سے پہلے تو میں اپنے پیارے ڈر کو سالگرہ مبارک کہنا چاہوں گی۔ خدا کرے ڈر ڈائجسٹ جیسا معیاری رسالہ مزید ترقی کرے اس جیسا رسالہ کوئی نہیں جب تک اسے پڑھ نہ لوں چین نہیں ملتا۔ اس میں وہ تمام کہانیاں شائع ہوتی ہیں جنہیں میں پڑھنا چاہتی ہوں۔ ڈر سے میرے لگاؤ کو پورا ایک سال ہو چلا ہے اور اس ایک سال میں، میں نے باقاعدگی سے ڈر کا مطالعہ کیا ہے۔ انشاء اللہ آگے بھی اس سے جڑی رہوں گی۔ کیونکہ بچپن سے ہارر کہانیاں میری پہلی پسند ہیں۔ کہانیوں پر تبصرہ کرتے ہیں تو اس ماہ سالگرہ نمبر کی سب سے زبردست نمبر ون کہانی ''تار عنکبوت'' تھی۔ ویلڈن ضرغام محمود صاحب، دوسری اے ون تحریر جس کی وجہ سے شمارے کو مزید چار چاند لگے وہ عمران قریشی صاحب کی ''نحوست زدہ'' تھی۔ عمران صاحب مان گئے، آپ کو، آپ کبھی کبھی نظر آتے ہیں مگر جب آتے ہیں تو سب پر بازی لے جاتے ہیں۔ تیسری لاجواب کہانی ایس امتیاز صاحب کی ''پراسرار دھند'' کا تھی۔ چوتھی خوبصورت تحریر جس نے دل موہ لیا وہ ساجدہ راجہ کی ''حیران کن'' تھی۔ آخری زبردست کہانی جس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کردیا وہ ناصر محمود فرہاد صاحب کی ''سالگرہ مبارک'' تھی، ناصر صاحب ویلڈن جبکہ بھائی خالد شاہان کی ''خون آشام'' بھی اچھی لگی۔ اپنی نئی کہانی ارسال کررہی ہوں۔ یہ میری زندگی کی سب سے خاص کہانی ہے اس پر میں نے بہت محنت کی ہوئی ہے۔ بطور رائٹر میری اپنی یہ کہانی میرے دل کے بہت قریب ہے۔ امید ہے آپ اسے دسمبر کے شمارے میں جگہ دیں گے کیونکہ دسمبر کی دوسری تاریخ کو میری سالگرہ ہے اور میرا پیارا ڈر ڈائجسٹ مجھے سالگرہ وش نہ کرے ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔

☆☆ فلک صاحبہ تمام اہل ڈر کی طرف سے سالگرہ بہت بہت مبارک ہو، اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں کے پالنا میں جھلاتا رہے۔ آپ ہر پل ہر لمحہ خوش رہیں۔ خط کا وعدہ کریں کہ آئندہ ماہ خط بھیجنا بھولیں گی نہیں، کہانی شامل اشاعت ہے۔

کوثر جہاں کراچی سے، محترم ایڈیٹر صاحب السلام علیکم! امید ہے مزاج بخیر ہوں گے، سالگرہ نمبر میرے ہاتھ میں ہے، رسالے کی کیسے اور کس طرح تعریف کروں الفاظ نہیں مل رہے، رسالہ دن دوگنی رات چوگنی ترقی کررہا ہے۔ یوں تو رسالے کا ہر رائٹر ہی شاندار ان کی کہانیاں جاندار مگر رسالے کی اصل جان اس شمارے میں شائع ضرغام محمود کی کہانی ''تار عنکبوت'' پڑھ کر مزہ آ گیا۔ بقیہ کہانیوں میں نحوست زدہ، فرشتہ اجل، خونی موبائل، انوکھی وصیت بھی خوب ہیں، ایس امتیاز بھی خوب لکھتے ہیں۔ کسی تعریف کے محتاج نہیں۔ آخر میں آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اتنا بہترین اور معیاری رسالہ نکالا جو کہ ہم جیسے ہارر کہانیاں پڑھنے والوں کو دلی تسکین پہنچا رہا

ہے۔ سب کے لئے دعا گو۔

☆☆ کوثر صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، ڈر ڈائجسٹ آپ کو اچھا لگا اور اس میں شائع کہانیاں بھی آپ کو اچھی لگیں اس کے لئے شکریہ، امید ہے آئندہ ماہ بھی تجزیہ ارسال کر کے شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔ Thanks۔

رابعہ عباس کوٹلی فتے والی سے، السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر سے وابستہ تمام افراد خوش و خرم ہوں گے۔ ہماری تو دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ڈر کو دن دگنی ترقی دے، میں ڈر میں پہلی بار خط لکھ رہی ہوں۔ امید ہے مایوس نہیں کیا جائے گا۔ ڈر میں تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ رد لوکا کسی سے کم نہیں، عشق ناگن بھی اچھی کہانی تھی، بقایا سب کہانیاں اچھی تھیں۔ شاعری میں حکیم خان حکیم، اور تدبیر راٹا کی شاعری اچھی تھی۔ الیس امتیاز احمد کراچی سے اچھا لکھتے ہیں۔ میں لکھنے اور پڑھنے والوں سے درخواست کرتی ہوں کہ میری Teacher مس تنزیلہ دو ماہ سے بیمار ہیں۔ ہماری مس کو کینسر ہے۔ مہربانی کر کے میری Teacher کے لئے دعا کریں۔ وہ جلد از جلد صحت یاب ہو جائیں۔ تمام رسالوں میں ڈر بہت زیادہ پسند ہے۔ میں نے ڈر کے لئے دو کہانیاں لکھی تھیں جو شائع نہیں ہو سکیں اور اگر وہ کہانیاں آپ لوگوں کے پاس موجود ہیں تو اصلاح کر کے شائع کر دیں پلیز اگلے ماہ تک اللہ حافظ۔

☆☆ رابعہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم، ہماری اور قارئین کی دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ٹیچر کو کلی صحت عطا فرمائے اور ان کی جھولی خوشیوں سے بھر دے، آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

سیدہ عطیہ زاہرہ لاہور سے، سب سے پہلے معذرت چاہوں گی کہ سالگرہ پر کہانی ارسال نہ کر سکی، دراصل میں کہانی لکھ ہی نہ پائی تھی۔ مجھے اس کا افسوس ہے، لیکن ایم اے کے امتحانات دینا بھی ضروری تھے۔ سالگرہ نمبر بذریعہ ڈاک موصول ہوا، بہت اچھا پرچہ ہے، کہانیاں تو نہیں پڑھ پائی، لیکن خطوط سب کے پڑھے، سب سے پہلے انجم شہزادی صاحبہ، افلک زاہد، مریم مرتضیٰ، میر اعوان گل، مدثر بخاری، ان سب لوگوں کی میں شکر گزار ہوں کہ ان کی تعریف و تنقید نے ہی مجھے جلد جلدی کہانی لکھنے کا حوصلہ دیا، دراصل ڈر نے مجھے بہت ہمت دی ہے کہ آج میرا پہلا ناول مارکیٹ میں ”سلگتی دھوپ کے صحرا“ کے نام سے موجود ہے۔ دوسرا میں لکھ رہی ہوں۔ آپ سب دوستوں سے التماس ہے کہ آپ میرا یہ ناول ضرور پڑھیں اور اپنی رائے دیں۔ اور ہاں مریم مرتضیٰ صاحبہ Vampire کے متعلق شاید آپ نے میری تحریر نہیں دیکھی جو کہ مئی 2014ء کے ڈر ڈائجسٹ میں ”ڈریکولا کے سفر“ کے نام سے آئی تھی۔ اس میں تاریخ کے سارے جھروکوں میں جھانکا تھا میں نے اور اس کردار کی الف، ب واضح کر دی تھی، یونانی، جاپانی، ہندوستانی اور رومن دیومالائی داستانوں سے لے کر یورپ، مشرقی یورپ، امریکہ غرضیکہ ہر جگہ بکھرے ڈریکولا کے نشانات کو جمع کر کے اس کی تصویر واضح کر دی تھی، پلیز آپ اس کو ضرور پڑھیں...... میں دو کہانی اور ایک نظم ارسال کر رہی ہوں امید ہے پسند آئیں گی۔

☆☆ عطیہ صاحبہ: آپ نے خط لکھا اور کہانی بھیجی اس کے لئے بہت بہت شکریہ، ایک کہانی موصول ہوئی جو کہ لیٹ ملی اس لئے آئندہ شمارے میں ضرور شائع ہو گی، امید ہے مزید کہانیاں بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گی۔ Thanks۔

صائمہ اختر بہاولپور سے، السلام علیکم! ڈر سے منسلک تمام قارئین اسٹاف اور رائٹرز کو دلی سلام، امید ہے سب خیر و عافیت سے ہوں گے، میں ڈر ڈائجسٹ کی محفل میں پہلی بار شریک ہو رہی ہوں۔ امید ہے حوصلہ افزائی فرمائیں گے۔ سب سے پہلے میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتی ہوں، جن کی وجہ سے میں ڈر میں آئی ہوں۔ بھائی خالد شاہان اور میرا کزن جو میرا بہت اچھا دوست بھی ہے اور اسی نے خط لکھنے کی ضد کی ہے۔ تو میں بھی آ گئی، بس اب تو مجھے خطوط میں پیاری میٹھی سی دوست مصباح کریم میواتی، انجم شہزادی، ایمان فاطمہ، فرخندہ، سلمیٰ کریم، ندیم عباس، عثمان بلوچ اور قاسم رحمان کا شدت سے انتظار ہے، پلیز جلدی آئیں...... اپنے کزن کو نہیں کہوں گی کیونکہ وہ آل ریڈی موجود ہے۔ ایڈیٹر صاحب میں بہت ڈرتی ہوں، کیا میرا خط شائع کر کے میرا ڈر کچھ کم کر دیجئے۔ ستمبر کا شمارہ میرے کزن نے مجھے سینڈ کیا سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ اسٹوریز پر نظر پڑتے ہی زندہ صدیاں پڑھنے لگی جو کہ اچھی لگی۔ پھر ناگ بھون عجیب سا نام لگا تو پڑھنے بیٹھ گئی۔ ارے واہ بھائی، واہ ...... خالد شاہان آپ تو سب سے بازی لے گئے، اتنی اچھی اسٹوری میں نے کبھی نہیں پڑھی، پورے ایک ہفتے ذہن پر سوار رہی، اب میری خواہش ہے کہ خالد شاہان کی کوئی قسط وار اسٹوری شائع ہونی چاہئے اور پھر الیس امتیاز احمد کراچی سے آسیب لائے زبردست تھی۔ انگارے بھی اچھی تھی۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ خوب ترقی کرے۔

☆☆ صائمہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم خط لکھنے اور قلبی لگاؤ سے کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، امید ہے آئندہ بھی آپ ہر ماہ خط بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گی۔ خالد شاہان کی قسط وار کہانی کی تیاری ہو رہی ہے۔ بس دعا کریں۔ شکریہ۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! بڑی انتظار کے بعد ''سالگرہ نمبر'' ہمارے ہاتھوں میں ہے، یہ ہم سب کے لئے ایک اعزاز ہے کہ ''ڈر ڈائجسٹ'' نے شاندار کامیابی کے 15 سال مکمل کر لئے ہیں۔ دعا ہے کہ اسی طرح کامیابی سے یہ سفر جاری وساری رہے۔ آتے ہیں ''سالگرہ نمبر'' کے تجزیہ کے ساتھ۔ ٹائٹل پر حسینہ خنجر کے ساتھ خوف و دہشت کا شکار ہے تو جناب موت سامنے دیکھ کر تو اچھے اچھوں کا ...... ''قرآن کی باتیں'' ہم سب کے لئے مشعل راہ...... ''خطوط'' ''ڈر'' کے خوب صورت دو یورز کے خوبصورت دل موہ لینے والے ''سندیسے'' جواب نہیں محبت اور خلوص کا حسین امتزاج۔ ''نحوست زدہ'' واقعی انسان کے سوچ کے برخلاف خوبصورت تحریر'' عمران قریشی'' کوئٹہ سے لائے زبردست عمران جی! ''سالگرہ مبارک'' ناصر محمود فرہاد فیصل آباد کی سالگرہ پر دل گرفتہ تحریر، ناصر صاحب آپ اچھا لکھ رہے ہیں تھوڑی سی کمزوری اگر دور ہو جائے تحریر میں تو کیا بات ہے...... ''زندہ روح'' رضوان علی سومرو کراچی سے خوب صورت اسٹوری لائے، ارے دل کے ہاتھوں تو اچھے اچھے مجبور ہو جاتے ہیں۔ آپ اسٹوری کا نام اگر تبدیل کر دیتے تو ...... 2 ماہ قبل ہم نے ''زندہ روح'' کے نام سے ایک ترجمہ لکھا تھا!...... بہرحال اچھا لگا......

''پراسرار دھند لکا'' اگاتھا کرسٹی کی ڈرامائی اسٹوری کا خوب صورت ترجمہ ''ایس امتیاز احمد کے قلم سے یعنی ہماری اپنی کاوش اور آپ سب نے بتانا ہے آپ کو اسٹوری کیسی لگی، منتظر ہیں، آپ سب دو یورز کے کمنٹ کے...... ''رولوکا'' پراسرار قوتوں کے مالک کی کرشمہ سازیاں بیسٹ رائٹر اے وحید کی سلسلہ وار ناولٹ 125 ویں قسط میں داخل ہو گئی ہے نہایت اثر انگیزی کے ساتھ کیا بات ہے۔ اے وحید صاحب۔ ''فرشتہ اجل'' مدثر بخاری، شبر سلطان سے، سسپنس اور ہارر سے بھرپور، اچھا لکھ رہے ہیں آپ مگر تھوڑی سی مزید محنت آپ کی اسٹوری کو چار چاند لگا سکتی تھی۔ ''گرداب'' عامر زمان عامر'' ڈیرہ اسماعیل خان'' سے خوبصورت تحریر لائے۔ عاملوں کی بات پر عمل کرنے نوجوان کا دلچسپ شاخسانہ...... عامر صاحب بچوں کے رائٹرز بن سکتے ہیں کچھ بڑوں کے لئے بھی لکھتے نا!'' انوکھی وصیت'' عامر ملک راولپنڈی سے لائے...... بلیک میجک پر اثر انگیز تحریر، اسٹوری ذرا سی طویل ہو جاتی تو...... ویسے خوب لکھتے ہیں، عامر جی! ''زندہ صدیاں'' ایم اے راحت کا خوب صورت ناولٹ صدیوں پر محیط سوچ کے دریچے کھولتی خوب صورت تحریر قسط نمبر 13 میں داخل ہو گئی ہے۔ ایم اے راحت صاحب ویلڈن، آپ واقعی استاد ہیں ہم جیسوں کے ہم نے آپ جیسے عظیم رائٹرز سے ہی لکھنا سیکھا ہے۔ ''خونی موبائل'' طارق محمود، کامراں کلاں اٹک سے دلچسپ تحریر لائے۔ طارق صاحب! آپ نے بہت اچھی تحریر لکھی ہے۔ عنوان بچوں والا ہے، تھوڑی سی محنت مزید کر لیتے۔ ''حیران کن'' ساجدہ راجہ ہندواں سرگودھا ساجدہ صاحبہ نو ڈاؤٹ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ مگر سالگرہ نمبر کے لئے کوئی خوب صورت سی اسٹوری تخلیق کرتیں آپ، آپ کی اسٹوری میں بس چاشنی رہ گئی امید ہے Next Month اچھی تحریر دیں گی۔ ''کرشمہ سازیاں'' این اے کاوش سلانوالی، سرگودھا حرص ولالچ انسان کو کس طرح برباد کرتی ہے۔ کاوش صاحب نے بڑے خوب صورت انداز میں بیان کیا۔ جواب نہیں آپ کا، میں بھی یہی کہتا ہوں تحریر کا کوئی مقصد ہو اور وہ راستہ دکھانے کی مترادف ہو۔ کاوش صاحب، کیا بات ہے زبردست...... ''دھڑکتا دل'' فلک زاہد لاہور سے لائیں، فلک جی! آپ اچھا لکھ رہی ہیں اور لکھتی رہیں۔ یہ ''ڈر ڈائجسٹ'' ہے۔ سسپنس، ہارر اور خوفناک تحریر کے لئے'' یہ رومانوی نام اچھے نہیں لگتے۔ آپ کی اگلی اسٹوری کے منتظر ہیں۔ امید ہے آپ ایک خوب صورت اسٹوری دیں گی۔ گڈ...... ''انگارے'' شہزادہ چاند زیب عباسی'' ایڈونچر، سسپنس، خوف اور ناقابل یقین واقعات سے خوب صورت اسٹوری اپنے قسط نمبر 2 میں داخل ہو گئی ہے، شہزادہ جی! بہت خوب لکھ رہے ہیں آپ، اب تو آپ نے بھی اپنا دو یورز بنا لیا ہے ہمیں، جواب نہیں آپ کا! اگلی قسط کے منتظر ہیں، ...... ''آتش حسد'' طاہرہ آصف ساہیوال سے خوب صورت اور فکر انگیز اسٹوری لائیں۔ بعض اسٹوری واقعی دل و دماغ پر نقش ہو جاتی ہیں۔ آپ نے بھی ایک اچھی بلکہ بہت اچھی کوشش کی ہے۔ ''بھیانک موت'' پشاور سے عثمان غنی کی خوفناک اسٹوری جنونی خواہشات کے تحت دوسروں کو اذیت دینے والے خود ہی اذیت انگیز موت کا شکار ہوتے ہیں۔ دل و دماغ کا احاطہ کرتی دلچسپ اسٹوری، عثمان صاحب آپ تو بہت اچھا لکھنے لگے ہیں۔ گڈ! ''قوس قزح'' ڈر کے دو یورز کے دلفریب اشعار اچھے لگے۔ ''غزلیں'' ڈر ڈائجسٹ کے خوب صورت دو یورز کی خوب صورت غزلیں، ہم سب کے لئے آؤ کے کچھ گنگنائیں ذرا۔ ''خون آشام'' خالد شاہان لوہار، صادق آباد سے انسانی

سوچوں سے ماورا اسٹوری لے کر آئے۔ خوب صورت تحریر اگر تھوڑی طوالت اختیار کر لیتی تو کیا بات تھی خالد جی!! ''تار عنکبوت'' شہر عام محمود کراچی سے لائے، بالکل صحیح تبر بھی ایک علم ہے معلوم ہے۔ ڈر کے آخری صفحات پر ایک دل میں اتر جانے والی تحریر شہر عام صاحب جواب نہیں پھر بھی کہیں گے کہ خدا کرے اور ہو زور قلم زیادہ۔ تو جناب یہ تھا ماہ اکتوبر کے سالگرہ نمبر پہ تجزیہ آپ کی رائے کے منتظر ہیں تمام خوب صورت لکھنے، پڑھنے والوں وو یورز کو دعا سلام، پلیز اپنا بہت بہت خیال رکھئے گا!

☆☆ امتیاز صاحب: ویری ویری تھینکس کہ آپ نے قلبی لگاؤ سے لکھ کر تجزیہ بھیجا۔ آئندہ ماہ بھی تجزیہ کا انتظار رہے گا۔

ریاض حسین قمر منگلا ڈیم سے۔ لائق صد احترام جناب مدیر صاحب سلام مسنون! خوب صورت ٹائٹل والا ڈر ڈائجسٹ کا سالگرہ نمبر پیش نظر ہے۔ قرآن کی باتیں ایمانوں کو تازہ کرنے والا سیکشن ہے۔ یہ سب باتیں اس جہاں اور اس جہان کے لئے فائدہ مند ہیں شرط عمل کرنے کی ہے۔ اس دفعہ آپ نے خطوط سے پہلے اپنے قیمتی خیالات کا اظہار نہیں فرمایا بہت کمی محسوس ہوئی۔ خطوط میں سب قارئین نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ سب دوست بڑی اپنائیت سے ایک دوسرے کے دکھ سکھ کا خیال کرتے ہوئے خطوط ارسال کرتے ہیں۔ رب کریم اس الفت و محبت کو قائم و دائم رکھے آمین۔ کہانیوں کا انتخاب حسب سابق خوب ہے۔ قوس قزح میں تمام منتخب کلام خوب رہے۔ اس میں جناب حسیم خان حسیم کا کلام بہت پسند آیا، اللہ کرے زور قلم اور زیادہ ہو، میری ایک تجویز ہے قوس قزح کی ابتدا حمد باری تعالیٰ اور نعت رسول مقبول سے کی جائے۔ میری شعراء کرام سے گزارش ہے کہ وہ اپنا حمدیہ اور نعتیہ کلام بھی ادارے کو ارسال فرمایا کریں۔ شکر الحمد للہ، کراچی کے حالات جناب جنرل راحیل شریف صاحب کی بے لوث کوششوں سے بہت حد تک ٹھیک ہو گئے ہیں، لیکن ایک خبر سن کر پھر پریشانی کی لاحق ہوئی ہے کہ خود غرضوں نے پھر تاجروں کو بھتے کی پرچیاں مع دھمکیوں کے ساتھ بھیجی ہیں۔ مدیر محترم کیا دوسروں کا حق مارنے والے، خواہ وہ بھتہ خور ہوں یا ڈاکو مسلمانوں کے زمرے میں آتے ہیں۔ دیکھیں مسلمان ہونا تو بہت بڑی بات، مسلمان ہونا تو انسانیت کی معراج ہے۔ ''دی بیسٹ آف دی مین آر مسلمز'' لیکن جو یہ جو کام کر رہے ہیں وہ نہیں مسلمان ہونا تو دور کی بات ہمیں انسانیت کے زمرے سے بھی خارج کر رہا ہے۔ غلط کرنے والوں کو خدا سنبھلنے کی توفیق بخشے اور ان میں صراط مستقیم پر چلنے کا جذبہ اور ولولہ پیدا فرمائے تا کہ ملک اور قوم ان کے شر سے محفوظ ہو سکے۔ آمین۔

☆☆ ریاض صاحب: ہمارے ملک میں جتنا بھی غلط ہو رہا ہے یہ سب مسلمانوں کے ہاتھ سے ہی ہو رہا ہے، کاش! کہ غلط کرنے والے سنجیدگی سے غور کریں، اپنے قول و فعل پر تو ہمارا ملک خوشیوں کا گہوارہ بن جائے۔ آپ کی ساری باتیں حقیقت پر مبنی ہیں۔

مہر پرویز دولو میاں چنوں سے۔ سلام مسنون، محبتوں کے سفیر ڈر سے متعارف کرانے کا سہرا جناب عامر زمان عامر کے سر ہے۔ جس ہستی نے ڈر کو اسپیشل لاہور اخبار مارکیٹ سے خرید کر میرے حوالے کیا۔ میرے اس محسن کا نام جناب عبدالغفار عابد ہے یہ ادب کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ تھوڑا لکھتے ہیں لیکن معیاری اور با مقصد تحریروں کے لکھاری ہیں۔ ''ڈر'' سے ملاقات کروا کر مجھ جیسے معمولی پڑھے لکھے طالب علم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ سالگرہ نمبر میرے سامنے محبتوں کے پھول نچھاور کر رہا ہے۔ سرورق کی حسینہ سے ڈرنے کے بجائے اس سے دل پشوری کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔ انجم شہزادی کا خط مفکرانہ سوچ کا عکاس تھا۔ مریم مرتضیٰ اور محسن عزیز کے خط پسند آئے، سالگرہ عام سی کہانی تھی، زندہ روح رضوان سومرو کی لاجواب تحریر تھی۔ ''فرشتہ اجل'' مدثر بخاری کی بہترین سبق آموز اور آخرت سنوارنے والی تحریر تھی۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عامر ملک کی ''انوکھی نصیحت'' بھی خوب نصیحت تھی گناہوں کے کفارے کی، حیران کن، گرداب، انگارے، آتش حسد، خون آشام، تار عنکبوت اچھی تحریریں تھیں۔ قوس قزح اور غزل میرے پسندیدہ کالم ہیں۔

☆☆ مہر پرویز صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم شکریہ قبول کریں کہ آپ آئندہ ماہ خط بھیجا کریں گے، کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔

محمد اسلم جاوید فیصل آباد سے۔ السلام علیکم! خیر و عافیت اور نیک دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں، عید کے فوراً بعد شہر جانا نصیب ہوا جب بک اسٹال پر پہنچا تو ماہ اکتوبر 2015ء کے تازہ پرچے سے ملاقات ہوگئی، سرورق بہت ہی خوب صورت تھا، اندر جھانکا تو رنگ برنگی تحریروں سے ملاقات ہوگئی۔ ڈر ڈائجسٹ کے سارے سلسلے اپنی اپنی جگہ پر اچھے ہیں۔ غزل اور شعر شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کے خلوص اور چاہتوں کی ہم دل سے قدر کرتے ہیں، یہی جذبہ آپ کو خط تحریر پر مائل ہوتا ہے، اس بار قرآن کی

باتیں، خطوط، شعر اور غزلیں خوب سے خوب تھیں، اس دفعہ ہر کہانی کا اپنا ایک الگ معیار تھا جن سے میں متاثر ہوا، انوکھی وصیت، سالگرہ مبارک، گرداب، انگارے، دھڑکتا دل، آتش حسد ان تمام قلمکاروں کو میری جانب سے مبارک ہو۔ غزل ارسال خدمت ہے۔ شائع کرکے شکریہ کا موقع دیں۔

☆☆ اسلم صاحب: آپ جس خلوص سے ہر ماہ خط بھیجتے ہیں آپ کی محبت ڈر ڈائجسٹ سے قابل دید ہے اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے اور خوشیوں سے نوازے۔

فرحان احمد نصیب کراچی سے۔ سب سے پہلے ڈر کی پوری ٹیم اور ادب کی اس نئے آواز دنیا کو بے بہا تصانیف سے آراستہ، پیراستہ بنانے والے پیارے رائٹر برادران، لکھنے والوں، قارئین کو میرا پیار، محبت اور خلوص بھرا اسلام قبول ہو۔ کئی ماہ بعد حاضری دے رہا ہوں۔ وجہ بیان کرچکا ہوں کہ طویل علالت نے جان نچوڑ کر رکھ دی تھی۔ اب نئی دواؤں سے طبیعت ذرا سنبھلی تو پیارے قارئین کی دعاؤں کو طلبگار بن کر پھر سے حاضر ہوں۔ اب سے جو گھر سے باہر نکلا تو ستمبر اور اکتوبر 2015ء کے ڈر خرید لایا۔ سالگرہ نمبر ابھی پڑھا نہیں، البتہ ستمبر کے متعلق تھوڑی سی رائے پیش خدمت ہے۔ قرآن پاک کی باتیں ہمیشہ کی طرح دل کو چھو گئیں، قوس قزح کی محفل بھی خوب رہی، سلسلہ وار کہانیاں نہیں پڑھتا۔ دیگر کہانیوں میں سب سے بہترین پیا سحر کی ''اندھیری رات'' لگی۔ مختصر بھی پرتدر عسکری جوان دل میں اتر گیا۔ ویلڈن پیا، شکیل نیازی کی ''ہوائی مخلوق'' رضوان علی سومرو کی ''تصویر کا قیدی'' منعم اصغر کی ''خطرناک سائے'' احسان سحر کی ''سائنسی حادثہ'' بھی بہت پسند آئیں۔ امتیاز سر، خالد شاہان بھائی، سیدہ عطیہ زاہدہ اور راشد نذیر بھائی کی کہانیوں کے کیا ہی کہنے۔ یہ سب نام ''ڈر'' کی شان ہیں۔ (بلاشبہ) آخر میں میری مکمل صحت یابی کے لئے ایک بار پھر دعاؤں کی درخواست۔

☆☆ فرحان صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے اور آپ کو جلد کلی صحت عطا کرے۔ نئی کہانی کا انتظار رہے گا۔ شاباش!!! پھر جلد آپ کو مل جائے گا۔ اللہ حافظ۔

اسد اللہ بھٹی بھکر سے۔ السلام علیکم! اکتوبر کا شمارہ سالگرہ نمبر جلد مل گیا۔ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں جس سے دل کو کافی حد تک سکون پہنچا، اگلا صفحہ فہرست کا تھا، اپنے پیارے رائٹر محمد خالد شاہان کی کہانی خون آشام دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کہانیوں میں سب سے اچھی کہانی تار عنکبوت صنم محمود کی تھی۔ خالد شاہان کی بھی Best تھی۔ انگارے شہزادہ چاند زیب عباسی ویری نائس پہلی قسط ایڈونچر تو دوسری میں تھوڑا تھوڑا sex تھا۔ اگلی قسط کا انتظار، رولوکا اے وحید... پہلے کی طرح روپ بدلتی کہانی، زندہ صدیاں ایم اے راحت زبردست تھی، باقی سب کہانیاں اچھی تھیں۔ دو کہانیاں ارسال خدمت ہیں پڑھ کر ضرور بتایئے گا۔

☆☆ اسد اللہ صاحب: کہانی لکھتے رہیں ایک دن آپ بھی لکھاری بن جائیں گے۔ دل برداشتہ ہونا ٹھیک نہیں۔ ڈر کی کہانیوں پر غور کریں اور کہانی لکھا کریں۔ آئندہ ماہ بھی نوازش ہائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔

ابوھریرہ بلوچ بہاولنگر سے۔ ڈر کی بزم سے منسلک تمام قاری قلمکار اور اسٹاف کو السلام علیکم! رسالے سے میری وابستگی کو تقریباً دو سال کا طویل عرصہ بیت چکا لیکن میں ممنون ہوں۔ پوری ٹیم کا جنہوں نے میری بھیجی ہر چیز کو شرف قبولیت کا درجہ دیتے ہوئے جگہ دی۔ یہ میرے لئے باعث فخر کی بات ہے کہ میری کہانی فروری میں ڈر کے اوراق کی زینت بن چکی ہے۔ ایک کہانی بعنوان مظلوم روح ہے جو زیر تحریر ہے جلدی روانہ کردوں گا۔ اب اگر اکتوبر 2015ء کے سالگرہ نمبر پر تبصرے کی بات کی جائے تو جناب پورا ناول رنگ برنگی تحاریر سے مزین تھا ہر ایک نے خوب محنت کی جن کا ثمر اشاعت کی صورت مل چکا۔ سب سے پہلے نامور قلمکار عمران قریشی کی تحریر نحوست زدہ پڑھی۔ ویلڈن۔ ایس امتیاز احمد پراسرار دھند لگا لے کر آئے اور چھا گئے۔ خالد شاہان اس دفعہ خون آشام کے ساتھ محفل میں براجمان نظر آئے، بڑی خوشی ہوئی کہ آپ مستقل ہو رہے ہیں، اچھا لکھا، عامر زمان عامر کی گرداب، عثمان غنی بھیانک موت، طاہرہ آصف آتش حسد، عامر ملک انوکھی وصیت بھی عمدہ کہانیاں رہیں۔ قسط وار میں رولوکا، زندہ صدیاں، انگارے بھی خوب جاری ہیں۔ غزل بھیج رہا ہوں، قبولیت کی اطلاع کا منتظر رہوں گا۔

☆☆ ابوہریرہ صاحب: خوش ہوجایئے کہانی ''بھیانک انجام'' شامل اشاعت ہے، اب جلدی سے کوئی نئی کہانی بھیج دیں، آئندہ ماہ خط لکھنا بھی بھولئے گا نہیں۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے۔اکتوبر کا سالگرہ نمبر 23 تاریخ کو مل گیا،ورق گردانی کی تو اپنا خط دیکھ کر خوشی ہوئی، قرآن کی باتیں ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھی تھیں، ستمبر کا مہینہ تو میرے لئے بہت ہی کٹھن تھا، کیونکہ پہلے تو میرے پاؤں پر سانپ نے سونگھ لیا، اس سے جان بچی تو جنات کا سایہ ہوگیا، خدا خدا کرکے وقتی طور پر جان چھوٹ گئی آگے کا پتہ نہیں، کہانیوں کی محفل میں دھڑکتا دل جو کہ فلک زاہد نے لکھی پڑھ کر سچ مچ دل دھڑکا تھا، Very Best حیران کن ساجدہ آپی نے لکھی، بہت خوب آپ پچھلے چند ماہ کہاں تھیں کرشمہ سازیاں ملک این اے کاوش آپ کی اسٹوری نے اس بار میرے دل میں جگہ بنالی، آتش حسد طاہرہ باجی کی بہت اچھی تھی۔تار عنکبوت ضرغام محمود نے بہت محنت سے لکھی ہے، باقی سب بھی بہت اچھی تھیں۔قسط وار کہانیوں میں انگارے بہت اچھی ہے، زندہ صدیاں میں ڈر کا کوئی عنصر نہیں، رودو کا اچھی جا رہی ہے، قوس قزح میں سب کے کلام پسند آئے، پلیز میری کہانی کا کچھ کیجئے گا، میری طرف سے ندیم بلوچ ٹیلر ماسٹر ملک نوید شوکت ذیشان بھٹی کو بہت بہت سلام، خط کمپلیٹ شائع کیجئے گا، آخر میں ڈر کے لئے ڈھیر ساری دعائیں اگلے ماہ تک کے لئے اللہ حافظ۔

☆☆ محسن صاحب: آپ گھبرائیں نہیں،عنقریب آپ کی کہانی بھی بہت جلد شائع ہوگی، ویسے خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس۔

محمد علی چغتائی خیر پور ٹامیوالی سے، سلام مسنون، امید واثق ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، تازہ شمارہ جس کی پیشانی پر سالگرہ نمبر تحریر ہے ہاتھوں میں ہے اور پہلی تین کہانیاں نظر سے ہو کر دماغ تک پہنچ کر دل میں گھر کر چکی ہیں، اگاتھا کرسٹی کا ترجمہ حکایت نامہ بہت ہی خوب تھا۔عمران قریشی صاحب نے نحوست زدہ پر خوب محنت کی ہے۔ بہر حال اچھی کاوش تھی باقی جریدہ ابھی باقی ہے۔ دیگر احوال ہے کہ میرے والد گرامی عید کے تیسرے روز قضائے الٰہی سے وفات پا گئے ہیں ادارہ ہذا و تمام قارئین و مصنفین سے دعائے مغفرت برائے والد گرامی تن کی عاجزانہ التماس ہے۔رودو کا ابھی پڑھی نہیں ہے مگر مجھے یقین کامل ہے کہ یہ قسط بھی حسب سابق بہترین ہوگی رودو کا میں ایک زبردست انفرادیت یہ ہے کہ اس میں ہندوانہ کلچر کے بارے میں کافی معلومات ہوتی ہیں میں بہت متاثر ہوں۔آئندہ ماہ بشرط حیات حاضری دوں گا۔اللہ تعالیٰ سب کا حامی و ناصر ہو۔آمین۔

☆☆ محمد علی صاحب: ہماری اور قارئین بلکہ تمام اہل ڈر کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کی مغفرت کرے اور انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سمیت تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم کرکے خوشیوں سے نوازے۔

عرفان اللہ جہانگیرہ سے، السلام علیکم! امید واثق ہے کہ تمام قارئین و رائٹر صاحبان خیر و خیریت سے ہوں گے۔ایک عرصہ بعد دوبارہ اپنے محبوب ڈائجسٹ میں لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں، امید ہے پذیرائی ملے گی۔ بہر حال اکتوبر کا ڈر ڈائجسٹ ملا جو کہ سالگرہ نمبر تھا۔ سالگرہ نمبر میں ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک تھی جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے، ہمیں جو کہانی سب سے زیادہ پسند آئی وہ ضرغام محمود کی کہانی تار عنکبوت تھی۔دوسرے نمبر پر ایم اے راحت کی زندہ صدیاں اور آخر میں عباسی صاحب کی انگارے تھی۔خط کے ہمراہ ایک کہانی بنام ''آتش انتقام'' بھیج رہا ہوں جو ہم نے بڑی محنت سے لکھی ہے۔اگر ڈر ڈائجسٹ کے مطابق ہو تو شائع کرکے بندے کو مشکور فرمائیں۔

☆☆ عرفان اللہ صاحب: دوبارہ آپ کو ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، کہانی ابھی پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو بہت جلد شامل اشاعت ہوگی، امید ہے آئندہ ماہ بھی اپنا تجزیہ ارسال کرنا بھولیں گے نہیں۔

محمد قاسم رحمان ہری پور سے، السلام علیکم! سب سے پہلے تو میں تین ماہ کی غیر حاضری کی معذرت چاہتا ہوں، بیماری نے ایسا جکڑا کہ ڈر کے لئے کچھ لکھ ہی نہ پایا۔ تاہم مطالعہ جاری رکھا۔لیکن مجھے ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ نہیں ملا، میں نے ایک ایک بک اسٹال چھان مارا لیکن ندارد، باقی اگست اور اکتوبر کے ڈر پڑھ لئے ہیں بہت خوشی ہوتی ہے کہ ڈر دن بدن ترقی کی منازل طے کرتا جا رہا ہے، لیکن ایڈیٹر صاحب آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں، پانچ ماہ سے آپ کے پاس میری دو کہانیاں ''کالی طاقتوں کا انتظار'' اور ''پراسرار درخت'' پڑی ہوئی ہیں۔لیکن آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔

☆☆ قاسم صاحب: چلئے توجہ دی اور کہانی جلوہ گر ہوگئی۔اب تو خوش ہیں ناں اور اس خوشی میں شمارے کا تجزیہ ارسال کرنا بھولنا مت۔Thanks۔

امام بخش مجاهد جعفرآباد سے، السلام علیکم! عرض ہے کہ ماہ اکتوبر کا تازہ شمارہ ڈر ڈائجسٹ میرے سامنے ہے، خوب صورت ٹائٹل اور اسلامی صفحہ پڑھ کر ایمان کو تازہ کیا۔ خطوطوں سے فارغ ہو کر کہانیوں کی بستی میں جھانک کر دیکھا۔ تو سب سے پہلے عمران قریشی صاحب کو پڑھنے کے لئے دل نے چاہا تو ماشاء اللہ (نحوست زدہ) نے زیادہ متاثر کیا، عمران بھائی میرے فیورٹ رائٹر ہیں، ناصر محمود فرہاد (سالگرہ مبارک) بھی بہترین تھی۔ رضوان علی سومرو (زندہ روح) قرآنی آیات کا ایک معجزہ دل چھو لینے والی کہانی تھی۔ ایس امتیاز احمد (پراسرار دھندلکا) سبق آموز کہانی ثابت ہوئی۔ مدثر بخاری (فرشتہ اجل) خوفناک چیخوں سے بھری ہوئی کہانی پڑھنے کو ملی۔ عامر زمان عامر (گرداب) عامر بھائی آپ پہلے یہ بتائیں کہ بورے والا سے ڈیرہ اسماعیل خان یہ کیسے ہوا۔ گرداب معاشرے کی عکاسی بنی۔ عامر ملک (انوکھی وصیت) نے ہمیں زیادہ ہی وصیت سے نوازا۔ ساحل ابرو اچھے تخلیق کار ہیں۔ اب اجازت دیں پھر ملیں گے۔

☆☆ امام بخش صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ، توی امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اپنا نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

عابد اسلم سمندری سے، کافی عرصہ سے ڈر پڑھ رہا ہوں، یہ کافی معیاری اور اچھا رسالہ ہے، خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ میری ایک کہانی شائع ہوئی تھی۔ ''سویرا کی روح'' یہ ڈائجسٹ مجھ سے گم ہو چکا ہے۔ مجھے اس رسالے کی بہت ضرورت ہے اگر آپ مجھے یہ ڈائجسٹ بھیج دیں تو آپ کی بہت نوازش ہوگی۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

☆☆ عابد صاحب: خط لکھنے اور پرچے کی تعریف کے لئے شکریہ، محترم یہ تو بتائیں کہ کہانی کس سن اور ماہ میں چھپی تھی، امید ہے جواب ضرور دیں گے۔

یاسر وکی دیپالپور سے، سب قارئین کو محبت بھرا اسلام قبول ہو، ستمبر کا ڈر ڈائجسٹ ملا پڑھ کر بہت مزا آیا، کہانیوں میں اندھیری رات، رولو کا، تصویر کا قیدی، مارٹنج، خونی واردات اچھی تھیں، پیارے لکھاری دوستو! ڈر ڈائجسٹ کی شان آپ لوگ ہیں، اللہ آپ کو ہر قدم پر کامیابی عطا فرمائے اور ادارے سے میری ایک گزارش ہے کہ سر جی اگر اجازت ہو تو ہم بھی اپنی اسٹوری لے کر آپ کی نگری میں آسکتے ہیں، اگر آپ کی اجازت ہوئی تو ہم بھی اسٹوری کی طرف دھیان دیں گے اور ہاں اگر قریبی شمارے میں اسٹوری کو جگہ ملتی ہے تو بھیج دیتا ہوں لگا دیں گے، نوازش ہوگی۔

☆☆ یاسر صاحب: کہانیوں کی تعریف اور نوازش نامہ بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں، جناب آپ بصد شوق کہانی بھیج دیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

مدثر بخاری شہر سلطان سے، محترم ایڈیٹر صاحب! السلام علیکم! خیریت مسنون! ڈھیروں خوشیوں کے لئے ڈھیروں دعاؤں کا تحفہ قبول فرمائیں۔ ...! سالگرہ نمبر کا خوبصورت ٹائٹل سے بی ذر 18 ستمبر کو موصول ہوا۔ خوب صورت حسینہ کی خوفزدہ آنکھیں اور ڈارک براؤن زلفیں، کانٹوں والی تلوار، لمبے ناخنوں والا ہاتھ اور سرخ کتاب۔ ..آمیز تک تھا... بھئی اس دفعہ ٹائٹل تو دل کو بھا گیا خطوط زبردست تھے۔ ضرغام بھائی اسپتال میں ٹائیفائیڈ کا علاج کروا رہے تھے۔ امید ہے ٹائیفائیڈ نے ان کی جان چھوڑ دی ہوگی، ان کی تار عنکبوت بہترین رہی، اچھا لکھتے ہیں ضرغام صاحب... ایس امتیاز ایک مرتبہ پھر پرانی روش پر آگئے، جناب کچھ عرصہ تک تو خوب تبصرہ فرماتے رہے، ملک این اے کاوش نے خطوط میں جان ڈال دی، البتہ جب ان کی کرشمہ سازیاں پڑھیں تو جان نکال بھی لی، کاوش صاحب کی کاوشیں ڈر کے صفحات پر خوب سے خوب تر ہیں ویلڈن ..... خالد شاہان نے ڈر کے تمام ممبرز کو Family سے Relate کیا، واقعی ہم سب ایک family کی طرح ہیں، دکھ سکھ اور تمام جذبوں کو دل سے سمجھنے والے۔ خالد صاحب کی خون آشام پسند آئی ...خدا مزید زور قلم دے۔ ویسے تمام کہانیاں خوب سے خوب تر تھیں، ایک مرتبہ پھر سب کے لئے دعا۔

☆☆ مدثر صاحب: ''موت کا تعاقب'' جلوہ گر ہے، اب دیکھتے ہیں کہ آئندہ ماہ اور کیا ہونے والا ہے، خوش رہیں اور اپنی خوشیوں میں دوسروں کو بھی شامل کریں، دکھوں کو بانٹیں اور گر جاؤ کچھ کام جہاں میں کہ بس رہ جائے نام جہاں میں، آئندہ ماہ پھر ملیں گے۔ اللہ حافظ۔

☆☆

خوشبو کا شاخسانہ

ایس حبیب خان-کراچی

ایک نادیدہ جوان وجود درخت پر اپنی مستی میں محو خواب تھا کہ اچانک اس کی ناک کے نتھنوں میں ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا خوشبو کا جھونکا آیا تو اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہوئی تو پھر

بڑوں کی باتیں چھوٹوں کے لئے سرمایہ حیات ہیں، پڑھ کر دیکھیں حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے

زنیرہ نہا کر باہر آئی اور اپنے لمبے لائٹ براؤن بالوں کو تولیے سے خشک کرنے لگی، بال خشک کرکے اس نے تولیہ بیڈ پر پھینکا اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھے پرفیوم کو اٹھایا، کیپ کھولا اور ہاتھ کے پشت پر اسپرے کرکے اسے ناک کے قریب لاکر سونگھنے لگی۔

زنیرہ کو خوشبوؤں سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا۔ شاید ہی کوئی پرفیوم ہوگا جو اس کی کلیکشن میں نہ تھا۔ مگر اس کے عشق اور اس کے بیچ اس کی دادو ظالم سماج بنی رہتی تھیں۔

''زونی!'' دادو کی آواز پر زنیرہ کو کرنٹ لگا اور اس نے تیزی سے پرفیوم کی بوتل بند کرکے رکھ دی اور واش بیسن میں جاکر ہاتھ دھونے لگی۔

''زونی بیٹا!'' دادو نے دوبارہ آواز دی۔

''جی دادو! ابھی آئی۔'' اس نے کہا اور سر پر دوپٹہ اوڑھ کر کمرے سے نکل گئی۔ زنیرہ گھر میں سب سے چھوٹی اور لاڈلی تھی اس سے بڑا ایک بھائی معاذ اور بہن زارا تھی۔ معصوم سی پیاری سی زنیرہ کو گورا چٹا رنگ اور بھورے بال اور آنکھوں کی وجہ سے سب مانو کہہ کر چھیڑتے تھے۔ اپنے خوشبو سے لگاؤ کی وجہ سے اکثر اسے دادو سے باتیں سننا پڑتی تھیں۔

دادو کا کہنا تھا۔ ''جوان خاص کر کنواری لڑکیوں کو خوشبو نہیں لگانی چاہئے اور نہ ہی پھول پہننے چاہئیں۔'' مگر پھر بھی زنیرہ موقع ملتے ہی اپنے شوق کو پورا ضرور کرتی۔ زنیرہ بھاگتی ہوئی دادو کے پاس آئی۔

''اے لڑکی کیا ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے؟'' دادو نے اس کی تیزی پر کہا۔

''وہ دادو آپ بلا رہی تھیں ناں۔'' زنیرہ نے کہا۔

''ہاں یاد آیا تمہاری پھپھی کی امی نے قرآن پاک کا کہا تھا وہ انہیں دے دینا۔'' دادو نے کہا۔ ''جی اچھا!'' زنیرہ نے کہا۔

''زونی بیٹا بہت دیر مت کرنا واپسی پر!'' امی نے کہا۔

''امی! مہندی تو شروع ہی لیٹ ہوتی ہے۔'' زنیرہ نے آگے آتے گیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''مہندی میں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ بارات میں چلی جانا۔'' دادو نے کہا۔

''دادو! میری بیسٹ فرینڈ ہے رانیل اس کے تو ہر فنکشن میں جاؤں گی۔'' زنیرہ نے جلدی سے کہا اسے پتہ تھا کہ اگر ابو کو خبر ہوگئی کہ دادو نے جانے سے منع کیا تھا پھر اس کا جانا پکا کینسل ہوجانا تھا۔ ''ٹھیک ہے! جانا ہے

تو وقت سے گھر واپس آ جانا۔" دادو نے کہا تو زنیرہ نے سکون کا سانس لیا۔

"بیٹا کپڑے استری کر لئے؟" امی نے پوچھا۔

"امی وہ تو رات کو ہی کر لئے تھے، یہاں تو لائٹ آنا خواب ہو گیا ہے۔" زنیرہ نے کہا تو دادو بھی بجلی والوں کی شان میں قصیدے پڑھنے لگیں۔ امی اور دادو کو چھوڑ کر زنیرہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور پھر اپنی جیولری پھیلا کر بیٹھ گئی۔ ان میں سے تو کوئی بھی اچھا نہیں لگ رہا! زنیرہ نے اپنے آپ سے کہا۔

"کیا اچھا نہیں لگ رہا؟" زارا نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

یہ "ایئر رنگس" زنیرہ نے کہا۔

"یاد آیا زارا آپی۔" اس نے اچھل کر کہا۔

"زارا الماری سے کچھ نکال رہی تھی۔

اس نے رک کر کہا۔ "آپی مجھے آپ اپنا کندن والا سیٹ دے دیں، وہ میرے سوٹ کے ساتھ چل جائے گا۔"

اوکے! ابھی دیتی ہوں۔" زارا آپی نے کہا اور جھٹ الماری سے سیٹ نکال کر اسے دے دیا۔ آپ کیا کر رہی ہیں آپی؟" اس نے پوچھا۔

"اپنی شرٹ سلوانی ہے ناپ کی شرٹ نکال رہی تھی۔"

"آپی! مجھے سینڈوچز بنا دیں۔" زنیرہ نے اپنی خوب صورت مخروطی انگلی میں انگوٹھی پہنتے ہوئے کہا۔

"ابھی بنا دیتی ہوں۔" زارا بولی۔

"تھینکس آپی!" زنیرہ نے جلدی سے کہا۔ کچھ ہی دیر میں زارا نے سینڈوچز بنا کر بھیج دیئے۔

دھانی رنگ کے سوٹ میں اس کی رنگت امڈ پڑ رہی تھی۔ معاذ باہر گاڑی میں بیٹھا ہارن بجا رہا تھا۔

"ابھی آئی!" زنیرہ نے جلدی سے کہا۔ اور نکلنے لگی۔

"زونی جلدی آنا بیٹا!" امی نے تاکید کی تو زنیرہ گردن ہلانے لگی اور تیزی سے گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

رابیل کے گھر پہنچ کر زنیرہ جلدی سے گاڑی سے اتر کر اندر جانے لگی۔ "زونی!" معاذ نے آواز دی تو وہ پلٹ کر آئی۔ "جب آنا ہو تو دس منٹ پہلے کال کر دینا۔" معاذ نے کہا۔

"اوکے بھائی!" زونی نے کہا اور رابیل کے گھر چلی گئی۔

رابیل اپنے کمرے میں بیٹھی تھی زنیرہ اس کے پاس جا کر اس سے لپٹ گئی۔ "اب آئی ہے زونی کی بچی؟ میں نے کہا تھا کہ دوپہر سے پہلے آ جانا!" رابیل نے شکوہ کیا۔ "دوپہر! میڈم دادو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ مجھے ابھی بھی آنے سے روک دیتیں۔" زنیرہ بولی۔

"اچھا چھوڑ ان سب باتوں کو تو مجھے اپنے پرفیومز کی رینج دکھا۔ گھر سے تو میں ایسے ہی آ گئی۔ تجھے تو پتہ ہے ناں۔ خوشبو کے بغیر میں رہ نہیں سکتی اور دادو مجھے خوشبو لگا کر آنے نہیں دیتیں۔" زنیرہ نے سامنے لگے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"سامنے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ہیں دیکھ لے۔" رابیل نے کہا تو زنیرہ پرفیومز دیکھنے لگی۔ پھر اس نے ایک بوتل اٹھائی اور اپنے اوپر پرفیوم اسپرے کر لیا۔

"ہوں!"

"بس کر۔" رابیل نے کہا کیونکہ زنیرہ نے اس کے اوپر بھی اسپرے کرنا شروع کر دیا تھا۔

"ارے بھئی آج تو زنیرہ قیامت ڈھا کر چھوڑے گی۔" رمشا ان کی دوست نے کہا۔

"کیسی ہو زونی بیٹا؟" رابیل کی والدہ نے کمرے میں آ کر زونی سے پوچھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں آنٹی!" زنیرہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "چلو لڑکیوں! اب باہر آ جاؤ ڈھولکی شروع کر لو، لڑکے والے آ گئے ہیں اور زونی تم رابیل کو باہر لے آؤ۔" رابیل کی والدہ نے کہا تو زنیرہ اور رابیل کی کزنز اور دوستیں اٹھ کھڑی ہوئیں۔ پھر وہ سب رابیل کو لے کر باہر آ گئیں۔

مہندی کا انتظام چھت پر کیا گیا تھا۔ رابیل کو اسٹیج پر بٹھا کر تمام لڑکیاں ڈھولکی لے کر بیٹھ گئیں۔ "ذرا

ڈھولکی بجاؤ گوریوں......" زنیرہ ڈھولکی پر تھاپ مارتی جارہی تھی اور لڑکیاں زور زور سے گانے گارہی تھیں۔

زنیرہ دھانی رنگ میں الگ ہی چمک رہی تھی وہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی سب کی نگاہوں کا مرکز بنی زنیرہ اس بات سے بالکل بے خبر اپنی دھن میں مگن ہنس رہی تھی کہ وہ یہاں موجود ان سب لوگوں کے علاوہ "کسی ان دیکھی نگاہوں کے حصار میں آ چکی تھی ایسا حصار جس سے نکلنا اس کے لئے ناممکن تھا۔"

سامنے درخت کی سب سے اونچی شاخ پر ایک ان دیکھا وجود آرام سے سو رہا تھا۔ نیند میں ہونے کے باوجود اس کے نتھنے انتہائی مسحور کن خوشبو کے ٹکرانے سے پھڑکنے لگے۔ اس نے نیند سے بوجھل اپنے پپوٹوں کو تین، چار بار جھپکا اور پھر اس نے اپنی سرخ ڈوروں سے بھری نیند سے بھری گہری سبز ترچھی پتلی آنکھوں کو جنبش دے کر کھول دیا۔ پھر اس کے کان ہوا میں اونچے کھڑے ہو گئے، ایک کھنکتی ہنسی ان سے ٹکرائی تھی جیسے کسی نے جلترنگ کو چھیڑ دیا ہو، اس نے اپنے آپ کو کھینچ کر انگڑائی لی اور سیدھا ہو کر آواز کی سمت مڑ گیا، وہ ایک کے بعد ایک شاخ اتر کر نیچے آ رہا تھا اور پھر وہ پہلی شاخ پر آ کر رک گیا، اس کی نگاہ آواز کی سمت کا تعین کر چکی تھی اور وہ ایک جگہ ٹھہر گئی۔

دھانی رنگ میں ملبوس سرخ و سفید بھوری سی وہ حسین پیکر اپنے گلاب کی پنکھڑیوں جیسے لبوں سے گانے گا رہی تھی۔ اس کے سنہری بالوں کی لٹیں ہوا سے بار بار رخسار چھو رہی تھیں۔ اس کا وجود خوشبو میں ڈوبا ہوا تھا۔

وہ حسن کے اس نظارے میں کھو گیا تھا، کتنی دیر گزر گئی اور وہ بت بنا اسے تکتا رہا، وہ اس کی نظروں کے حصار میں تھی۔ پر اس کی نگاہوں کا حصار ایک دم ٹوٹ گیا۔

وہ حسن پیکر اس کی نگاہوں کے سامنے سے اوجھل ہو گئی تھی۔ اس نے جھنجلا کر اپنی نگاہوں کو حرکت دی اور متلاشی انداز سے آگے بڑھنے لگا۔

"چلو بچیو! ابھی ڈھولکی اٹھالو، رسم شروع کرنی ہے، پھر بعد میں گانے گاتی رہنا۔" رانئیل کی پھپھو نے کہا تو زنیرہ اور باقی لڑکیاں کھڑی ہو گئیں، رسم شروع ہو گئی اور خواتین رانئیل کو ابٹن لگانے لگیں۔ زنیرہ ایک طرف جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ "چل ناں زونی! یہاں کیوں بیٹھ گئی؟" رمشا بولی۔

"تو چلو میں ابھی آئی، ڈھول بجانے سے ہاتھ دکھ رہا ہے۔" زنیرہ نے کہا اس کا اتنا کہنا تھا کہ ایک طرف رکھا ڈھول کرسی سے نیچے گرا اور دو ٹکڑے ہو گیا، سب اسی طرف دیکھنے لگے۔ "ارے! یہ ڈھول کیسے ٹوٹ گیا؟" ایک عورت نے کہا۔ "کچی لکڑی کا ہوگا۔" دوسری نے رائے دی۔ پھر دونوں باتوں میں مصروف ہو گئیں۔ ڈھول اتنا اہم نہ تھا کہ کوئی ایشو بنتا، رمشا وہاں سے جا چکی تھی، زنیرہ اٹھنے لگی تو اس کی نگاہ اپنے برابر میں پڑے موتیا کے گجروں پر پڑی۔ زنیرہ نے وہ گجرے اٹھالئے وہ انہیں ہاتھ میں پہننے ہی والی تھی کہ رانئیل کی پھپھو آ گئیں۔ "زنیرہ بیٹا رمشا اور رانئیل تمہیں بلا رہی ہیں۔ ارے اتنے خوب صورت گجرے!" انہوں نے زنیرہ کے ہاتھ میں گجرے دیکھ کر کہا۔

"آنٹی آپ پہن لیں یہ میرے نہیں ہیں۔" زنیرہ بولی اور گجرے ان کی جانب بڑھائے۔ رانئیل کی پھپھو نے وہ گجرے لے کر پہن لئے۔ "تھینک یو بیٹا!" انوں نے کہا اور زنیرہ مسکراتی رانئیل کے پاس چلی گئی۔

رسم چل رہی تھی ایک دم شور ہونے لگا۔ سب وہاں گئے تو وہاں عجیب ہی منظر تھا گھر پر لگی لائٹیں جانے کیسے ٹوٹ کر گر گئیں ان کے نیچے رانئیل کی پھپھو کھڑی تھیں وہ ان میں الجھ گئیں۔ ان کے دونوں ہاتھوں سے تار ٹکرائے اور انہیں زور دار جھٹکا لگا تو وہ زمین پر گر کر بے ہوش ہو گئیں۔ سب ان کے پاس آ گئے اور انہیں نکالا وہ بچ تو گئیں مگر ان کے دونوں ہاتھ کلائی سے کہنیوں تک جھلس گئے۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا تقریب ختم کر دی گئی۔

زنیرہ نے معاذ کو فون کر کے بلالیا اور رانئیل کو بتا کر گھر چلی گئی جب وہ گھر پہنچی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ گھر پہنچ کر جب دادو کو پتہ چلا کہ زونی خوشبوؤں

میں ڈوبی ہوئی ہے تو انہوں نے اس کی خوب کلاس لی، اب تو زونی کی ٹھیک ٹھاک شامت آ گئی۔ ابو، امی اور دادو نے اس کو بہت ڈانٹا۔ ”زونی وقت دیکھا ہے تم نے؟ ضروری نہیں ہے کہ بڑوں کی بات کو رد کر کے ہر جگہ من مانی کی جائے، جانتی ہو کہ رات میں لڑکیوں کا یوں خوشبو لگانا کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے! دشمن نہیں ہوں میں تمہاری؟“ دادو روہانسی ہو گئیں۔

”بہت بری بات ہے زونی جو تم نے اپنی دادو کی نافرمانی کی۔“ زنیرہ کی والدہ نے خفگی سے کہا۔

زنیرہ اس وقت شرمندگی سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ اس پر گھڑوں پانی آن پڑا تھا۔ وہ دادو سے لپٹ گئی۔ ”دادو مجھے معاف کر دیں! یہ سراسر میری بدتمیزی، بے ادبی ہے کہ میں نے آپ کے کہنے کے باوجود یہ حرکت کی، میں وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“ زنیرہ کو سچ مچ اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ دادو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور زنیرہ سے کمرے میں جانے کا کہا۔

زارا اور زنیرہ کا ایک ہی کمرہ تھا زنیرہ جب کمرے میں گئی تو زارا سو چکی تھی، زنیرہ کو اپنے قدم منوں بھاری محسوس ہو رہے تھے۔

ان دیکھا بوجھ اس کے کاندھوں پر تھا ایک عجیب سی تھکن اسے اپنے وجود میں طاری ہوتی محسوس ہو رہی تھی۔ سر بے انتہا بھاری ہو رہا تھا۔ زنیرہ بڑی مشکلوں سے بستر تک آئی اور دھپ سے گر گئی۔ اسے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ پھر اس کو اپنے وجود میں اٹھتی تپش کا احساس ہونے لگا وہ بستر پر لوٹنے لگی۔ لاتعداد انگارے اس کو اپنے وجود میں رقص کرتے محسوس ہونے لگے۔

ایک ان دیکھی آگ اس کے وجود کو جھلسا رہی تھی اس نے بے بسی سے گردن موڑی اور زارا کو آواز دینی چاہی زززا...... مگر اس کے ہونٹ آپس میں چپک گئے۔ خوف سے زنیرہ کی آنکھیں پھٹنے لگیں ایک دم زنیرہ کو اپنے اوپر اندھیرا آتا محسوس ہوا اور اس کی آنکھیں جلتے جلتے بند ہوتی چلی گئیں۔

صبح کے وقت ”زونی اٹھو! گیارہ بج رہے ہیں۔“ زارا نے زنیرہ کو اٹھانے کے لئے ہاتھ لگایا تو وہ چونک گئی، زنیرہ بھٹی کی طرح تپ رہی تھی اس کی گوری رنگت تانبے کی طرح ہو رہی تھی، ”زونی چندا!“ اس نے زنیرہ کی دہکتی پیشانی کو چھوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ زنیرہ کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے، زارا نے گھر والوں کو بتایا تو سب آ گئے۔ زارا اور معاذ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ واپس آ کر زنیرہ دوا کھا کر سو گئی۔

☆......☆......☆

وہ کھڑا اسے ٹکٹکی باندھے تک رہا تھا پھر وہ چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ زنیرہ کو ایک دم سے بے انتہا تپش محسوس ہونے لگی، وہ نیند میں تھی، مگر تپش سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پسینے میں شرابور ہو چکی ہے۔

اس نے زنیرہ کی پیشانی کو چھوا تو زنیرہ کو آگ میں لپٹیں محسوس ہونے لگیں، اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے، اس نے اپنے لبوں پر زبان پھیری اور بولی۔ پ...... پا...... پانی!!! وہ بمشکل بول پائی۔

وہ مڑی تو اس کے ہونٹوں سے ٹھنڈے پانی کا گلاس لگا دیا گیا وہ پانی پی کر تکیے پر گر گئی۔

صبح زارا آئی تو زونی کو دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔ ایک ہی رات میں اس کی آنکھیں سیاہ حلقوں سے گھری ہوئی ملیں۔ ”زونی! یہ کیا حالت بنالی ہے؟ چلو اٹھو رابیل کا فون آیا ہے آج اس کی شادی ہے تمہاری بیسٹ فرینڈ کی۔“ زارا نے پیار سے کہا۔

مگر زنیرہ نے صاف منع کر دیا اور بولی۔ ”میری طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہے، میں نہیں جاؤں گی۔“

رابیل کی ناراضگی کی وجہ سے باقی گھر والے شادی میں چلے گئے صرف دادو اور زنیرہ رہ گئیں۔ زنیرہ دوا کھا کر لیٹ گئی اور دادو اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

زنیرہ کمرے میں لیٹی تھی کہ کسی نے دروازہ ناک کیا۔ ”ٹھک! ٹھک! ٹھک!“ زنیرہ نے سوچا دادو کو کچھ ضرورت ہوگی وہ مشکل سے اٹھی اور دروازہ کھولا تو ایک

زور دار ہوا کے جھونکے نے اس کے بال بکھیر دیئے، زونی کو یہ یاد تک نہ تھا کہ زارا نے اس کے بال باندھے تھے مگر وہ تو کھلے ہوئے تھے۔ وہ دروازہ بند کر کے بستر پر آئی تو اسے ایک سایہ سا اپنے اوپر محسوس ہوا، اس کی آنکھیں بوجھل ہونے لگیں اور غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ وہ بے اختیار بستر پر دراز ہوتی چلی گئی۔

کچھ تھا جو ایک تنی چادر کی طرح اس کے وجود پر چھا گیا تھا مگر وہ کیا تھا؟ یہ جاننے کے لئے وہ حواس میں نہ تھی۔

''زونی! یہ لو تمہارے لئے فروٹ چاٹ بنا کر لائی ہوں۔'' زارا نے کمرے میں داخل ہو کر کہا مگر کمرہ خالی تھا۔ زارا نے ٹرے ایک طرف رکھی اور زنیرہ کو ڈھونڈنے لگی، اس نے سب جگہ دیکھ لیا مگر زنیرہ نہ دکھائی دی پھر زارا کا ذہن چھت کی طرف گیا، وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی مگر اوپر پہنچ کر آخری سیڑھی پر قدم رکھتے ہی وہ ٹھٹک گئی۔ ''سامنے زنیرہ بڑے سے لگے ہوئے جھولے میں لیٹی ہوئی تھی، اس کے سنہری بال پھیلے ہوئے تھے اور ساری چھت خوشبو سے رچی ہوئی تھی جبکہ زنیرہ کے اوپر سیاہ بادل جیسا اندھیرا سا ہو رہا تھا۔'' زارا نے اپنی آنکھیں ملیں پھر دوبارہ دیکھا مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ زارا کا پارہ ایک دم ہائی ہوگیا۔ وہ جا کر زنیرہ پر برس پڑی۔

''یہ کیا ہے زونی! دادو نے منع کیا تھا نا تمہیں اس طرح پرفیوم لگانے سے وہ بھی مغرب کے وقت!''

جواب میں زنیرہ نے زارا کو چند لمحے گھورا پھر اجنبی انداز سے دوسری طرف دیکھنے لگی۔

''اٹھو یہاں سے اور نیچے چلو!'' زارا نے اس کو اٹھایا، زنیرہ اٹھ تو گئی مگر آگے نہ بڑھی۔ ''چلو اب۔'' زارا نے پھر کہا، زنیرہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ ''چلو زونی'' زارا نے اس کا ہاتھ سختی سے پکڑ کر کھینچا۔

جواب میں ایک تھپڑ زارا کے پڑا اور وہ چکرا کر رہ گئی۔ اذان کی آواز آئی تو زنیرہ خود تیزی سے نیچے بھاگ گئی اور کمرے میں گھس گئی۔ زارا اس کی حرکت پر حیران پریشان نیچے آگئی مگر اس نے کسی سے کچھ کہا نہیں۔

اگلے روز جب زونی واش روم میں تھی تو زارا نے اس کے سارے پرفیوم اٹھائے اور انہیں لے جا کر باہر پھینک آئی۔ ''بہت بدتمیز ہوگئی ہو زونی! بڑوں کی عزت کرنا بھول گئی ہو، یہ ہی تمہاری سزا ہے!'' زارا نے غصے سے کہا۔ پھر زارا نے امی سے کہا کہ وہ نہانے جا رہی ہے۔ زارا نے گرم اور ٹھنڈے پانی کو بیلنس کیا اور شاور کھول دیا پھر سر میں شیمپو لگانے کے لئے اس نے شاور بند کیا، بالوں میں شیمپو لگانے کے بعد زارا نے شاور کھولا اور اس کے نیچے آ کھڑی ہوئی اور اس کی چیخیں نکل گئیں۔

اس کے پورے وجود پر پانی لاوے کی طرح برسا تھا پانی ابلنے کے حد تک کھول رہا تھا۔ زارا کے جسم پر آبلے پڑ گئے تھے وہ مسلسل چیخ رہی تھی، اس کی آواز پر امی دوڑتی ہوئی آئیں، اور باہر سے معلوم کرنے لگیں زارا نے انہیں اندر بلا لیا اور امی کس طرح اسے لے کر باہر آئیں، انہوں نے بڑی چادر سے اسے ڈھانک دیا تھا پھر اسے اسپتال میں ایڈمٹ کروا دیا گیا کافی روز اس کا علاج چلا پھر وہ گھر آگئی، کمرے میں سے جب سب چلے گئے تو زنیرہ نے اپنا انداز بدل لیا۔

''اگر خیریت چاہتی ہے تو اپنے کام سے کام رکھ، میرے بیچ آئی تو!'' زنیرہ نے روکھے انداز سے کہا زارا کو اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا اس نے ڈر کے مارے اپنی آنکھیں میچ لیں۔

''زونی بیٹا! معاذ کی شرٹ استری کردو۔'' امی نے زنیرہ کو شرٹ دیتے ہوئے کہا اور چلی گئیں۔ زنیرہ نے شرٹ کی طرف دیکھا اور شرٹ سے دھواں نکلنے لگا۔ جب معاذ اپنی شرٹ لینے آیا تو اسے دیکھ کر اس کے غصے کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ''یہ کیا کیا؟ زونی تم تو بالکل پھوہڑ ہو سوائے فیشن کرنے کے کچھ نہیں آتا تمہیں، آپی کیا بیمار ہوئیں پورا گھر الٹ گیا! تم تو کسی کام کی نہیں ہو، ایک کام کہا اس کا بھی بیڑا غرق کر دیا، پتہ ہے کتنی مہنگی شرٹ تھی یہ جاہل!'' معاذ غصے میں بکتا رہا اور زنیرہ خاموشی سے سنتی رہی معاذ کے جاتے ہی کمرے کی میز پر

رکھا گلدان خود بخود کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔

''معاذ بیٹا! پانی کی موٹر اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے ذرا دیکھ لو بیٹا'' امی نے معاذ سے کہا۔

''جی امی! آپ چلیں میں یہ سوال سالو کر کے آتا ہوں۔'' معاذ نے ادب سے کہا۔ ''بیٹا جلدی نہیں ہے آرام سے اپنی پڑھائی کر کے دیکھ لینا۔ امی نے کہا اور چلی گئیں۔ معاذ نے دس منٹ بعد کتابیں رکھیں اور موٹر دیکھنے چلا گیا۔ اس وقت صحن میں کوئی نہ تھا اس کے ابو بھی گھر پر نہ تھے۔ معاذ نے بٹن پریس کیا تو موٹر چلنے لگی۔ ''لو جی! امی تو کہہ رہی تھیں چل نہیں رہی۔'' اس نے خود سے کہا اور بٹن کو بند کرنے اس پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ بورڈ میں آگ لگ گئی اور معاذ کا ہاتھ وہیں چپک گیا وہ وہیں جھٹکے لیتا رہا اور اس کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی وہ جل کر سیاہ ہو گیا، ایک دم آگ بجھ گئی اور معاذ اچھل کر دور جا گرا، کتنی ہی دیر وہ صحن میں پڑا رہا مگر کسی کو خبر نہ ہو سکی جب معاذ کے والد چابی سے لاک کھول کر گھر کے اندر آئے تو ان کی نظر معاذ پر پڑی۔

''معاذ!!!'' وہ دوڑ کر پاس آئے اور اسے اٹھا کر اسپتال بھاگے مگر کوئی فائدہ نہ ہوا۔ معاذ واپس نہ آنے والے سفر پر روانہ ہو چکا تھا۔ گھر میں صف ماتم بچھ گئی۔ سارے رشتے دار، ملنے والے اس جوان موت پر آبدیدہ تھے۔

زنیرہ اب بھی اپنے کمرے میں گھسی خاموش بیٹھی تھی۔ سب سمجھ رہے تھے کہ بھائی کی موت کا صدمہ ہے، زارا پھر بھی ہمت کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور والدین کو دلاسے دیتی رہی، اس موقع پر اسے اپنی پھپھو سے بہت ڈھارس ملی، روبینہ پھپھو، اپنے بیٹے ضامن کے ساتھ آئی تھیں انہوں نے بکھرے ہوئے غمزدہ والدین کو سمیٹا، زنیرہ کی دادو کی حالت بھی خراب ہو رہی تھی، معاذ ان کا اکلوتا پوتا تھا۔ معاذ کی تدفین کے بعد تایا، چچا اور روبینہ پھپھو وہیں رک گئے تھے، روبینہ پھپھو نے خاموش بیٹھی زنیرہ سے کہا۔ ''زونی کچھ بولو بیٹا!'' مگر زنیرہ خاموشی سے گردن جھکائے زمین کو تکتی رہی۔

''بھابھی! اس کا بولنا یا رونا بہت ضروری ہے، اس سے کچھ بلوائیں۔'' روبینہ پھپھو نے فکرمندی سے زنیرہ کی امی سے کہا۔ پھر تو سب نے زنیرہ کو بلانا شروع کیا۔ پہلے تو زنیرہ کچھ نہ بولی پھر منہ اوپر اٹھا کر ایک زناٹے دار تھپڑ روبینہ پھپھو کے رسید کیا۔ روبینہ پھپھو چکرا کر رہ گئیں اور ہکا بکا زنیرہ کو دیکھنے لگیں۔ لمحہ بھر کو کسی کے کچھ سمجھ نہ آیا اگلا لمحہ سب کے لئے دانتوں تلے انگلی دبانے والا تھا۔

زنیرہ نے بھاری آواز میں جب کہا۔ ''مر گیا اپنے کئے کی وجہ سے، جو مجھ سے اڑے گا اپنے انجام کو جائے گا!''

سب زنیرہ کو چونک کر دیکھنے لگے۔ ''بھائی! زونی نے معاذ کی موت کا اثر دماغ پر لے لیا ہے، بھائی کی موت کا صدمہ برداشت نہ کر پائی میری بچی۔'' زنیرہ کے چچا بولے۔

''فوراً ڈاکٹر کو بلواؤ۔'' تایا ابو نے کہا تو ضامن ڈاکٹر کو لانے چلا گیا۔ ڈاکٹر زنیرہ کو دیکھنے آیا اور دوا دے کر بولا۔ ''اگر یہی حالت رہے تو، تو آپ ان کے پاس پہلی فرصت میں مریضہ کو لے جایئے گا۔'' انہوں نے سائیکاٹرسٹ سہیل حسن کا کارڈ انہیں دیتے ہوئے کہا۔ گھر والوں نے زونی کو پابندی سے دوا دی مگر اس نے کسی سے ملنا تک بند کر دیا تھا کوئی اس کے کمرے میں نہ جاتا۔

شام ہوتے ہی زونی تیار ہو کر خوشبو لگا کر چھت پر بال کھول کر چلی جاتی اور فجر کی اذان سے پہلے اپنے کمرے میں آ کر دروازہ بند کر لیتی، پھر دروازہ شام کو کھلتا۔ ''ایسے کب تک چلے گا، ہمیں زونی کو زبردستی لے جانا ہو گا۔''

زنیرہ کے ابو نے کہا اور پھر انہوں نے دوپہر میں زبردستی زنیرہ کو اٹھایا اور گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے گئے۔ اندر صرف چشمت کو جانے کا کہا گیا کیونکہ سہیل حسن نے پوچھا جواب میں زنیرہ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ ''اچھا میں آپ کی ہسٹری دیکھتا

ہوں۔'' سہیل حسن نے فائل دیکھی۔ ''اچھا تو آپ کا نام زنیرہ ہے۔'' اس نے کہا۔

زنیرہ خاموش رہی۔

''اوکے! تو مس زنیرہ آپ کی مصروفیات کیا ہیں؟'' سہیل حسن نے دوبارسوال کیا۔

جواب خاموشی۔ ''آپ کے گھر والوں نے آپ کے بھائی معاذ کی ڈیتھ کے بارے میں بتایا، واقعی بہت افسوس ہوا سن کر، آپ کی اپنے بھائی سے کافی دوستی تھی۔''

''رائٹ؟'' سہیل حسن نے زنیرہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ مگر زنیرہ نے جواب دینے کی کوئی زحمت نہ کی۔ سہیل حسن نے گہری سانس لی اور اپنی چیئر سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ پھر وہ گھوم کر ٹیبل کی دوسری طرف بیٹھی زنیرہ کے پاس جا کر کھڑا ہوگیا اور بولا۔ ''مس زنیرہ آپ کیا سمجھتی ہیں کہ آپ بولیں گی نہیں تو آپ کو میں واپس بھیج دوں گا، جب تک آپ بات نہیں کرلیتیں آپ اس روم سے باہر نہیں جاسکتیں۔'' سہیل حسن کا بس اتنا کہنا تھا، زنیرہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور جانے کے لئے مڑگئی۔

''مس زنیرہ آپ یوں نہیں جاسکتیں!'' سہیل حسن نے اسے روکنے کے لئے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ خود بخود فضا میں اوپر اٹھا اور ایک زوردار دھکا لگنے سے دور جا گرا، اس کی چیئر اڑتی ہوئی اس کے پاس آکر گری اگر وہ ایک طرف نہ ہوتا تو وہ اس کے لگتی۔ سہیل حسن نے مڑ کر زنیرہ کی جانب دیکھا تو اسے اپنے جسم سے جان کھسکتی محسوس ہوئی۔

زنیرہ کی چٹیا کے بل خود بخود ایک ایک کرکے کھلنے لگے اور پھر اس کے بال بکھر گئے، زنیرہ نے منہ اوپر اٹھایا اس کی آنکھوں کی پتلی میں آگ کے شعلے جل رہے تھے۔ ''تیری اتنی ہمت کہ ہماری چیز کو چھوئے!'' زنیرہ کے منہ سے بھاری مردانہ آواز نکلی۔ سہیل حسن نے گرتے پڑتے اٹھ کر بھاگنا چاہا تو اس قوت نے اس کا گلا اپنی گرفت میں جکڑ لیا، سہیل حسن کو اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگا اور وہ دونوں ہاتھوں سے کسی ان دیکھی گرفت سے اپنا گلا چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔

☆......☆......☆

''بھابھی بہت دیر ہوگئی ہے، اندر چل کر دیکھتے ہیں۔'' روبینہ پھپھو نے زنیرہ کی امی سے کہا۔ ''چلو!'' وہ اٹھ گئیں اور دونوں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگئیں۔ اندر قدم رکھتے ہی دونوں ٹھٹک گئیں۔ ان کی نظر پہلے سہیل حسن پر پڑی جس کا منہ سرخ غبارہ ہورہا تھا اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا گلا پکڑا ہوا تھا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' زنیرہ کی پھپھو بولیں۔ زنیرہ کی امی اس کی طرف بڑھیں۔ ''میری بچی!''

''رک وہیں!'' زنیرہ کے منہ سے مردانہ آواز نکلی اس نے پھر ڈاکٹر سہیل کی سامان سے بھری ٹیبل کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر ہوا میں اوپر اٹھایا جو اس کے سر سے اوپر اٹھ گئی تھی۔'' روبینہ پھپھو یہ منظر دیکھ کر غش کھا کر زمین پر جا پڑیں، جبکہ زنیرہ کی امی نے اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے قرآنی آیات کا ورد کرنا شروع کردیا، کچھ دیر میں زنیرہ لہرا کر کرسی پر جا گری اور سہیل حسن زمین پر لیٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

زنیرہ کی امی زنیرہ کے گال تھپتھپانے لگیں۔ ''زونی! اٹھو بیٹا۔'' زنیرہ نے آنکھیں کھول دیں۔ سہیل حسن اٹھے اور بیل بجا کر اسٹاف کو بلایا۔ ان کی اسسٹنٹ ساتھ آئی اور زنیرہ کی پھپھو کو پانی کے چھینٹے مارے وہ ہوش میں آگئیں مگر زنیرہ کو خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگیں۔

سہیل حسن نے زنیرہ کو وہیں بٹھایا اور اس کی والدہ اور پھپھو کو لے کر باہر آگئے۔ اور ایک طرف لے جا کر بولے۔ ''دیکھیں آپ کو شاید میری بات عجیب لگے کہ میں سائیکاٹرسٹ ہو کر آپ سے یہ بات کر رہا ہوں، مگر میں مسلمان ہوں اور اس بات پر میرا یقین ہے کہ دنیا میں آسیب یا جنات کا وجود ہے۔ آپ جتنی جلدی ہو اپنی بچی کو ''کسی'' کو دکھائیں! یہ میرا میٹر نہیں ہے۔ آپ سمجھ رہی ہیں ناں میں کیا کہنا چاہ رہا ہوں۔''

"جی! ڈاکٹر صاحب میں سمجھ گئی آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔" روبینہ پھپھو نے کہا پھر وہ لوگ واپس گھر آ گئے۔

زنیرہ کو اس کی امی نے کمرے میں لے جا کر لٹا دیا۔ پھر دوسرے کمرے میں بڑوں کی میٹنگ شروع ہوگئی۔ روبینہ پھپھو نے سائیکاٹرسٹ سہیل حسن کے ہاں ہونے والے تمام واقعات سے آگاہ کیا، سب باتیں سننے کے بعد زنیرہ کی دادو نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "ہزار بار منع کیا تھا۔ اس لڑکی کو کہ مت بکی رہا کرو ہر وقت خوشبوؤں میں! مگر کب مانی اس نے میری بات" دادو روتے ہوئے بولیں۔

"مجھے تو زارا کا جلنا اور معاذ کی موت اسی سلسلے کی کڑی لگ رہی ہے۔" زنیرہ کے چچا بولے تو سب تائید کرنے لگے۔

"زارا کو بلاؤ!" زنیرہ کے والد بولے۔ زارا آ گئی۔ "بیٹا اس روز کیا ہوا تھا جب تم جلی تھیں۔" ابو نے پوچھا۔

"ابو! زنیرہ دادو کے منع کرنے کے باوجود پرفیوم لگا کر مغرب کے وقت چھت پر لیٹی ہوئی تھی میں نے اسے نیچے آنے کو کہا تو اس نے..... زارا چپ ہوگئی۔

"اس نے کیا بیٹا؟" تایا ابو بولے۔

"اس نے میرے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا۔" زارا نے سر جھکا کر کہا۔ "اوہ! اللہ! اتنی بدتمیزی۔" دادو بولیں۔

"تو میں نے اگلے دن اس کے سارے پرفیومز لے جا کر پھینک دیئے۔ پرفیومز پھینک کر میں نے نہانے کے لئے پانی چیک کیا وہ بالکل نارمل تھا مگر جیسے ہی میں نے شاور دوبارہ کھولا اس میں سے ابلتا ہوا پانی نکلا۔" زارا نے بتایا۔

"اس کے بعد تمہاری زونی سے کوئی بات ہوئی تھی۔" چچا بولے۔

"جی چچا جان! جب اسپتال سے واپس گھر آ کر میں روم میں آ گئی تھی تو زونی نے اکیلے میں مجھے دھمکی دی تھی کہ "اگر اپنی خیریت چاہتی ہے تو اپنے کام سے کام رکھ، میرے بیچ آئی تو!" اور ہاں یاد آیا جب اس روز میں اسے بلانے چھت پر گئی تو میں نے زونی کے اوپر "ایک سیاہ بادل نما سایہ دیکھا تھا مگر وہ پلک جھپکتے ہی غائب ہوگیا تھا۔" زارا نے تفصیل سے بتایا۔

زنیرہ کی امی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور بولیں۔ "یا اللہ! میری بچی کی حفاظت کر، وہ تو نادان تھی مگر تو بچانے والا ہے۔"

"ہمت رکھئے! مجھے ایک حل سمجھ میں آتا ہے۔ پتہ نہیں وہ ٹھیک ہے بھی یا نہیں۔" زنیرہ کے چچا بولے۔

"جلدی بتائیں بھائی صاحب!" زنیرہ کی امی بے تابی سے بولیں۔

"ہم زنیرہ کا نکاح کر دیتے ہیں۔" چچا نے کہا۔

"نکاح! یہ کیسا حل ہے بھائی جان؟" روبینہ پھپھو بولیں۔

"ہم اس کا نکاح کر کے اسے رخصت کر کے دوسرے گھر بھیج دیتے ہیں اس طرح اس کی جان اس مصیبت سے چھوٹ جائے گی۔" چچا بولے۔

"ہاں یہ حل ٹھیک ہے۔" تایا ابو نے تائید کی۔

"مگر بھائی صاحب اتنی جلدی نکاح کیسے کریں گے؟" "ابھی تو معاذ کو گئے....." زنیرہ کی امی نے رونا شروع کر دیا۔

"بیگم خود کو سنبھالئے! معاذ تو چلا گیا کیا اب زنیرہ کو کھونا چاہتی ہیں؟" زنیرہ کے ابو بولے۔ "اللہ نہ کرے! میں کیوں ایسا چاہوں گی مگر لوگ کیا کہیں گے؟" انہوں نے اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ "لوگوں کی نہیں بھابھی ہماری بچی کی فکر کریں۔" چچا بولے۔

"تم سب سے اہم بات تو بھول ہی گئے کہ "زنیرہ کا نکاح کریں گے کس سے؟" دادو نے کہا تو سب ایک دوسرے کی شکلیں تکنے لگے۔

"میں کروں گا زنیرہ سے نکاح!" ضامن نے اندر آتے ہوئے کہا تو لمحہ بھر کے لئے سب بالکل خاموش ہوگئے۔

زنیرہ کے والد نے خاموشی کو توڑا۔ ''ضامن بیٹا یہ جذباتی بات نہیں عمر بھر کا فیصلہ ہے، تمہاری اپنی زندگی ہے۔''

''ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے ضامن بھائی صاحب اگر معاذ کا معاملہ نہ ہوا ہوتا تو میں دو چار روز میں زونی کا ہاتھ ضامن کے لئے مانگنے آنے والی تھی۔'' روبینہ پھپھو نے کہا۔

زنیرہ کی امی روتے ہوئے ان کے گلے لگ گئیں۔ ''میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں روبی!''

''بھابھی کردی ناں آپ نے میری خوشی پھیکی، بھلا اپنوں کو شکریہ کہا جاتا ہے؟ بلکہ اپنوں پر تو حق جمایا جاتا ہے۔'' روبینہ نے کہا اور دونوں پھر گلے لگ گئیں۔

''تو پھر ٹھیک ہے نکاح کی تقریب میں صرف گھر والے ہونگے؟ پرسوں جمعہ ہے، عصر، مغرب میں دونوں بچوں کا نکاح کردیں گے۔'' دادو نے کہا تو سب نے فوراً اس فیصلے کو مان لیا۔

''بس اللہ تعالیٰ جلد از جلد اس مصیبت سے میری بچی کی جان چھڑادے!'' زنیرہ کی امی نے کہا تو سب نے جلدی سے کہا۔ ''انشاء اللہ!''

جمعے کا دن آگیا صبح سے ہی سب کی مصروفیت کا آغاز ہوگیا تھا آج زنیرہ کا نکاح تھا۔ دوپہر تک تایا ابو اور چچا کی فیملیز بھی آگئیں۔ شام ہونے لگی تو زنیرہ کے ابو بولے۔ ''ارے روبینہ کو کال کرو جلدی نکلے، شام میں ٹریفک بہت ہوجاتا ہے۔'' ان کے کہنے پر زارا نے روبینہ پھپھو کو کال کی۔ ''ارے بیٹا بس بیٹھ رہے ہیں گاڑی میں بھائی صاحب تو ذرا سی بات پر پریشان ہوجاتے ہیں، کہہ دو ان سے پونے گھنٹے میں پہنچ جائیں گے۔'' روبینہ پھپھو نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اللہ حافظ پھپھو!''

''او کے بیٹا اللہ حافظ۔'' روبینہ پھپھو نے کہا۔ زارا نے فون رکھ کر اپنے ابو کو جا کر بتادیا وہ پون گھنٹے میں پہنچ رہے ہیں۔ ''ٹھیک ہے بیٹا۔'' انہوں نے گھڑی کی طرف دیکھا گھڑی کی سوئی پانچ بجا رہی تھی۔

وہ سب لوگ انجام سے بے خبر اپنی نادانی میں سب کرے جارہے تھے اور مطمئن تھے کہ ان کا سوچا ہوا حل مسئلے کو ختم کردے گا۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت کرتی آگے بڑھتی جارہی تھیں۔ سوا پانچ، چھ پھر سوا چھ بج گئے مگر روبینہ پھپھو اور ضامن نہیں پہنچے۔ ''ارے بھئی غیر ذمہ داری کی بھی حد ہوتی ہے! اگر کسی وجہ سے انسان کو دیر ہو بھی رہی ہو تو انسان ایک کال ہی کردے۔'' زنیرہ کے ابو غصہ کرنے لگے۔

سب ضامن اور روبینہ بیگم کو کالز کرنے لگے، مگر دونوں میں سے کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ ''ایسا کرتے تو نہیں ہیں وہ اس طرح اللہ خیر کرے!'' زنیرہ کے چچا بولے۔

مغرب بھی ہوگئی اب تو سب پریشان ہونے لگے۔ اتنے میں گھر کے نمبر پر بیل ہوئی۔ زنیرہ کے ابو تیزی سے فون سیٹ کی طرف بڑھے۔ سی ایل آئی پر روبینہ بیگم کا نمبر آرہا تھا۔ انہوں نے جلدی سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا اور بولے۔ ''حد کردی روبی! کہاں رہ گئی ہو بھئی اور ضامن کال کیوں ریسیو نہیں کررہا۔''

''دیکھئے جناب مجھے آپ کا نام نہیں معلوم مگر آپ فوراً نیشنل اسپتال پہنچئے!'' دوسری طرف سے مردانہ آواز آئی۔

''معاف کیجئے گا آپ کون؟'' زنیرہ کے ابو نے حیرانی سے پوچھا۔

''انسپکٹر اظہر بات کررہا ہوں، اس موبائل پر آخری نمبر آپ کا تھا اس لئے آپ کو کال کی گئی ہے۔'' دوسری طرف سے جواب آیا۔

''جی یہ میری بہن کا نمبر ہے وہ کہاں ہے؟'' زنیرہ کے ابو نے گھبرا کر کہا۔

''ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے! آپ جلدی آجائیں۔'' زنیرہ کے ابو ریسیور چھوڑ کر دوڑ پڑے سب ان کے پیچھے تھے۔ زارا نے جلدی سے ریسیور اٹھایا تو اسے معلوم ہوا کہ کیا بات ہے۔ جب سب کو پتہ چلا تو

باقی لوگ ان کے پیچھے بھاگے زارا گھر میں دادو اور زنیرہ کے پاس رک گئیں۔

جب سب اسپتال پہنچے تو ان سب کو اپنے قدموں پر کھڑا رہنا محال ہو گیا۔ انسپکٹر اظہر نے انہیں بتایا کہ ''ضامن اور روبینہ پھپھو گاڑی میں آ رہے تھے۔ ان کے آگے بڑا ٹرک سریے لے کر جا رہا تھا۔ اچانک وہ ٹرک خراب ہو گیا اور پیچھے سے تیزی سے آتی آپ کی بہن کی کار میں ٹرک سے باہر نکلے سریے ونڈ اسکرین توڑ کر گھس گئے، ضامن کے تو سینے میں سریے آر پار ہو گئے اس کی تو آن دی اسپاٹ ڈیتھ ہو گئی! گاڑی بے قابو ہوئی اور بیرج کی دیوار توڑ کر نیچے گر گئی۔

''یا اللہ!'' زنیرہ کے ابو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ ''انسپکٹر صاحب ہماری بہن کہاں ہے؟'' چچا نے پوچھا۔

''وہ آپریشن تھیٹر میں ہیں ان کی سرجری چل رہی ہے۔'' سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سب بیٹھ کر دعائیں کرنے لگے۔ ڈاکٹر باہر آئے تو سب دوڑ کر ان کے پاس گئے۔ انہوں نے بتایا کہ ''سرجری تو ہو گئی ہے مگر پیشنٹ ہوش میں آنے کے بجائے کومہ میں چلی گئیں۔'' زنیرہ کے ابو وہیں کرسی پر ڈھے گئے۔

تایا ابو اور تائی اسپتال میں رک گئے اور زبردستی سب کو واپس بھیج دیا۔ زنیرہ کے ابو کو سب نے زبردستی دوا دے کر سلا دیا۔ تھوڑی دیر رک کر چچا اور چچی دوبارہ اسپتال چلے گئے۔ دادی جان کو چپ لگ گئی، گھر میں ماتم کی فضا چھائی ہوئی تھی، امی اور زارا صحن میں بیٹھی دادو کو دلاسے دے رہی تھیں۔ ''جانے کس منحوس کی نگاہ پڑ گئی میرے گھر پر!'' زنیرہ کی دادو روتے ہوئے بولیں تو وہ دونوں بھی رونے لگیں روتے روتے وہ لوگ ایک دم اچھلے۔

صحن میں دھماکے سے ایک بہت بڑا پتھر آ کر گرا وہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ اس سے پہلے کہ ان لوگوں کے کچھ سمجھ آتا صحن میں پتھروں کی برسات شروع ہو گئی۔ اس کے بعد لگا جیسے چھت پر بھونچال آ گیا ہو، کوئی مانو بڑی بڑی چیزوں کو ادھر سے ادھر اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا ہو، وہ لوگ دوڑ کر ایک دیوار سے جا لگے۔ ''یا اللہ! رحم کر۔'' دادو کے منہ سے نکلا۔ ''زارا بیٹا زونی کو دیکھو جا کر کمرے میں اٹھ تو نہیں گئی۔'' امی نے فکرمندی سے کہا تو زارا دوڑ کر اندر کمرے میں گئی۔ ''امی!!'' وہ وہیں سے بولتی ہوئی بھاگ کر آئی، امی زونی کمرے میں نہیں ہے!'' اس نے آ کر بم پھوڑا۔ ''میری بچی!'' زنیرہ کی امی نے کہا۔ ایک دم چھت پر سے مردانہ قہقہے سنائی دیئے۔ تینوں کی نگاہ بیک وقت اوپر اٹھی تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ ''چھت کی منڈیر پر زنیرہ ہاتھ چھوڑے کھڑی تھی اور مردانہ قہقہے اس کے منہ سے نکل رہے تھے۔ بال اس کے ہوا میں اوپر اٹھے ہوئے تھے اور آنکھوں کی پتلی میں شعلے بھڑک رہے تھے۔

''کون ہے تو اور تیری منشا کیا ہے؟'' زنیرہ کی امی پھٹ پڑیں تو ایک دم زنیرہ کے قہقہے رک گئے۔

''دیکھ لیا انجام میرے بیچ آنے کا! یہ میری ہے اور میں اسے اپنے ساتھ ہر صورت لے کر جاؤں گا۔'' زنیرہ نے اپنا سینہ ٹھونکتے ہوئے کہا۔

''یہ میری بیٹی ہے، تیری چیز نہیں نامراد۔'' زنیرہ کی امی نے غصے سے کہا بس ان کا اتنا کہنا تھا کہ انہیں ایک جھٹکا لگا اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ہوا میں معلق ہو گئیں، انہیں کسی نے چٹیا کے بل لٹکا دیا تھا، تکلیف سے ان کے منہ سے چیخیں نکل گئیں اور وہ اپنے آپ کو آزاد کرانے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ ایک دم دادو نے کلام الٰہی کا ورد کرنا شروع کر دیا۔ لمحہ نہ گزرا تھا کہ زنیرہ کی امی نیچے آ گریں، زارا نے اوپر دیکھا تو زنیرہ چھت کی منڈیر سے غائب تھی۔

''امی آپ ٹھیک تو ہیں؟'' زارا نے پوچھا۔

''مجھے چھوڑو بیٹا تم زونی کو دیکھو'' امی نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔ زارا ڈرتے ڈرتے اوپر گئی تو دیکھا زنیرہ چھت پر بے ہوش پڑی تھی۔ زارا مسلسل کلام الٰہی کا ورد کر رہی تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب اسپتال سے کال آئی کہ روبینہ بیگم کو ہوش نہ آ پایا اور کوما میں ہی ان کا

انتقال ہوگیا۔ زنیرہ کے ابو کو جب خبر دی گئی تو ایک دم اسپتال دوڑ پڑے۔

دادو پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ وہ سنبھالے نہ سنبھل رہی تھیں۔

☆......☆......☆

زنیرہ کے ابو اپنی بہن کو دفنا کر گھر واپس آئے اور خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئے۔

دروازے پر ایک فقیر نے صدا لگائی تو اٹھ کر گئے اور اسے پیسے دینے لگے۔ فقیر نے نوٹ لیتے ہوئے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ زنیرہ کے ابو نے اسے دیکھا تو وہ بولا۔

''وہ اپنا کہا ضرور کرے گا۔'' اس کی نگاہیں آسمان پر تھیں۔

ایک دم زنیرہ کے ابو کو جھٹکا لگا اور وہ وضو کر کے مسجد کی طرف گئے ان کا دل ڈوب رہا تھا ان کے پیارے ایک ایک کر کے انہیں چھوڑ کر جا رہے تھے اور وہ بے بس تھے۔ مسجد جا کر وہ اپنے رب کے آگے سجدہ ریز ہوگئے۔ ''اے اللہ ہم پر رحم فرما! میری زونی کو اس عذاب سے نجات دلا دے، آج میں تجھ سے اپنی بچی کے لئے اس عذاب سے نجات مانگنے آیا ہوں۔ میری ہمت ٹوٹ چکی ہے......''

انہوں نے اپنے رب کے آگے اپنے دل کو کھول کر رکھ دیا۔ وہ مستقل روئے جا رہے تھے۔ ان کی جائے نماز آنسوؤں سے تر ہوگئی تھی۔ کتنا وقت بیت گیا انہیں کچھ علم نہ تھا وہ مسجد میں ہی تھے کہ کسی نے آہستہ سے ان کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھنے لگے۔ ان سے اٹھا نہیں جا رہا تھا وہ برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔ ان کا چہرہ، داڑھی، جائے نماز آنسوؤں سے تر ہو رہی تھی۔ انہوں نے نگاہ اوپر کی تو وہ مسجد کے امام صاحب تھے جنہوں نے انہیں اٹھایا تھا۔

''میں معافی چاہتا ہوں جناب کہ آپ کو اس طرح پریشان کر کے اٹھایا مگر میں کافی دیر سے آپ کو دیکھ رہا ہوں اور آپ کو اس طرح دیکھ کر مجھ سے رہا نہ گیا۔ دراصل آپ کی پریشانی مجھ سے برداشت نہ

اعتماد کا عالم

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے بارے میں مشہور واقعہ ہے۔ آپ ظہر کی نماز سے پہلے حجرے میں بیٹھے تھے۔ ایک نوجوان آیا...... سلام و دعا کے بعد بیٹھ گیا۔ مولانا نے آنے کا مقصد پوچھا۔ کہنے لگا۔ حضرت میں اپنے چچا کی بیٹی سے شادی کا خواہش مند ہوں، لڑکی بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ لیکن چچا جان مانتے نہیں ہیں۔ آپ میرے ساتھ چل کر چچا جان سے بات کریں۔ مولانا نے جواب دیا۔ یہ تیرے گھر کا ذاتی مسئلہ ہے۔ اپنے خاندان کے بزرگوں کو درمیان میں لاؤ۔ بار بار کے اصرار کے باوجود مولانا گنگوہی ساتھ جانے پر راضی نہ ہوئے تو نوجوان نے صحن میں موجود کنواں پر جا کر کپڑے اتار کر ایک چادر باندھ لی۔ مولانا کو آواز دی کہ میرا جنازہ آپ ہی کو پڑھانا ہے۔ مولانا ٹھہرو، ٹھہرو کا شور مچاتے ننگے سر، ننگے پاؤں بھاگے، نوجوان کو واپس پکڑ کر حجرے میں لائے...... سر پکڑ کر بیٹھ گئے پھر کاغذ قلم لے کر لکھا اور تاکید کی کہ چچا کو یہ تحریر دکھاؤ، یا اللہ میں کچھ جانتا نہیں اور یہ شخص کوئی بات مانتا نہیں، تو اس کا مولا اور یہ تیرا غلام، اب تو جانے اور تیرا کام۔ نوجوان اپنی گلی میں داخل ہوا، اس کے چچا اور دیگر اسے تلاش کر رہے تھے اسے دیکھ کر کہا۔ ''کدھر گئے تھے آؤ تیری شادی کرا دیں، یہ تھا اللہ والوں کا اللہ پر اعتماد کا عالم''

(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

ہوئی۔'' امام صاحب نے زنیرہ کے ابو سے پیار سے کہا۔

''میں بہت بڑی مشکل میں ہوں!'' زنیرہ کے ابو نے کہا۔

''آپ اٹھیے! اور میرے ساتھ آیئے۔'' امام صاحب نے کہا اور انہیں اپنے حجرے میں لے گئے۔

''اطمینان سے بیٹھیے۔'' انہوں نے زنیرہ کے ابو کو بیٹھایا اور پانی پلایا۔ ''اب بتایئے آپ کو کیا پریشانی ہے؟'' انہوں نے پوچھا تو زنیرہ کے ابو نے ساری بات ان کے گوش گزار کردی۔

ساری بات تفصیل سے سننے کے بعد امام صاحب بولے۔ ''پریشان نہ ہوں ہر مشکل کا حل موجود ہوتا ہے بس اللہ سے مدد مانگ کر ہم اس حل کو تلاش کرنے کی کوشش کریں تو مشکل آسان ہوجاتی ہے۔ آپ ایسا کریں ایک کاغذ پر بچی اور اس کی والدہ کا نام مجھے لکھ کر دے دیجئے میں کوشش کرتا ہوں کہ آپ کے کام آسکوں، آپ تین روز بعد تشریف لایئے گا میرے پاس۔''

زنیرہ کے والد نے جلدی سے زنیرہ اور اس کی والدہ کا نام امام صاحب کو بتادیا اور گھر آگئے۔ پیش امام صاحب کی باتوں سے انہیں کچھ ڈھارس ہوئی تھی۔

تین روز تک زنیرہ نے گھر والوں کو خوب پریشان کیا جیسے تیسے تین روز گزر گئے۔ زنیرہ کے ابو امام صاحب کے پاس گئے۔ نماز پڑھنے کے بعد وہ امام صاحب کے ساتھ ان کے حجرے میں چلے گئے۔ امام صاحب بولے۔ ''محترم میں نے تین روز تک پڑھائی کی، اس سے آپ کی بچی کے لئے کافی کچھ معلوم ہوا ہے۔ ایک نہایت ضدی جن ہے۔ جو آپ کی بچی کے پیچھے ہاتھ دھوکر پڑگیا ہے اور اس کے ارادے نہایت خطرناک ہیں وہ کسی قیمت پر آپ کی بچی کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہے!''

''اب کیا ہوگا امام صاحب؟'' زنیرہ کے ابو پریشانی سے بولے۔

''میری حد جتنی تھی اس کے مطابق میں نے یہ سب تفصیل معلوم کی ہے۔ وہ بہت طاقتور جن ہے اپنے مقصد کی راہ میں آنے والی ہر شے کو وہ نیست و نابود کرنے پر کمربستہ ہے۔ آپ کی بہن اور بھانجا بھی اس کا شکار ہوئے۔ آپ نے کتنی بڑی غلطی کی جو اس جن کے ہوتے ہوئے بچی کے نکاح کا فیصلہ کیا۔ وہ جن اپنے ہوتے بھلا آپ کی بچی کا نکاح ہونے دے گا؟ آپ پہلے کسی سے معلوم تو کر لیتے شاید آپ کے بھانجے کی جان بچ جاتی۔'' امام صاحب نے بتایا۔

''تو اب پھر میں کیا کروں؟ میری بچی؟'' زنیرہ کے ابو اتنا کہہ کر زور زور سے سسکنے لگے۔

''ہمت رکھئے جناب! اللہ بہت بڑا ہے! میرے جاننے والے ایک بہت بڑے اللہ والے ہیں ان سے بات کی ہے، وہ آپ کی مدد ضرور کریں گے۔'' امام صاحب نے کہا اور پھر انہیں تفصیل بتانے لگے۔

☆......☆......☆

کمرے میں اللہ والے بزرگ کی پرنور شخصیت سے نور بکھرا ہوا تھا۔ ایسا نور ان کی شخصیت سے پھوٹ رہا تھا کہ بندہ اس میں کھو جائے۔ سفید کپڑوں میں ملبوس سفید داڑھی کے پیچھے سرخ و سفید نورانی چہرہ، سر جھکائے آنکھیں بند کیے ان کے ہونٹ حرکت کررہے تھے اور ہاتھ میں موجود تسبیح کے دانے تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ سب سر جھکائے ان کے منتظر تھے کہ وہ کچھ کہیں، کافی دیر گزر گئی پھر ایک دم ان کے ہونٹوں کی حرکت رک گئی اور تسبیح کے دانے بھی ٹھہر گئے۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں اور ادھر ادھر نظریں گھمائیں پھر وہ کسی سے بنا کچھ کہے خاموشی سے کھڑے ہوگئے۔ زنیرہ کے ابو بھی ان کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے باہر نکلنے لگے۔ زنیرہ کے ابو نے ان کے پیچھے آنا چاہا تو انہوں نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے انہیں منع کردیا۔ زنیرہ کے ابو وہیں رک گئے۔

وہ بزرگ پہلی مرتبہ زنیرہ کے گھر آئے تھے مگر وہ کسی سے راستہ پوچھے بغیر چلتے گئے۔ لائن سے تین

کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن میں سے تیسرا کمرہ زنیرہ کا تھا۔ تینوں کمرے کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ جیسے ہی بزرگ نے وہاں قدم رکھا دھڑاک سے پہلے کمرے کا دروازہ بند ہوگیا وہ آگے بڑھے تو دوسرے کمرے کا دروازہ بھی بند ہوگیا۔ پھر وہ زنیرہ کے کمرے کے آگے پہنچے تو اس کے کمرے کا دروازہ دھماکے سے بند ہوگیا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔

بزرگ نے شہادت کی انگلی دروازے پر رکھی اور دروازہ اشارے سے کھلتا چلا گیا۔ کمرے میں اندھیرا گھپ ہورہا تھا۔ بزرگ نے اندر قدم رکھا تو ایک دم کمرے میں روشنی ہوگئی۔ سامنے بستر پر زنیرہ دوزانو بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سارے بال کھول کر آگے چہرے پر ڈالے ہوئے تھے جن سے اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک دم کمرے میں موجود الماری میں لگا شیشہ دھماکے سے ٹوٹ کر کرچی کرچی ہوکر زمین پر بکھر گیا۔ پھر ایک طرف رکھی ہوئی کرسی ہوا میں اڑتی ہوئی سامنے کی دیوار سے جاکر ٹکرائی اور نیچے جاپڑی۔

''بند کر اپنی یہ شعبدہ بازی!'' بزرگ نے رعب دار آواز سے کہا تو چند لمحوں کے لئے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ زنیرہ کے منہ سے مردانہ قہقہے نکلنے لگے۔ پھر تو کمرے میں طوفان آگیا ایک ایک کرکے کمرے میں موجود تمام چیزیں ہوا میں معلق ہوکر دھم سے نیچے گرتیں پھر اوپر اٹھتیں، پھر دوبارہ نیچے گر جاتیں۔ کمرے سے آتی آوازوں سے گھر والے ہول رہے تھے اور مسلسل دعائیں مانگ رہے تھے۔

بزرگ نے پڑھنا شروع کیا تو تمام کی تمام چیزیں آہستہ سے نیچے اپنی جگہ پر آگئیں۔ زنیرہ نے زور زور سے جھٹکے لینے شروع کردیئے۔ پھر اس کے منہ سے گالیوں کا طوفان نکلنے لگا۔ زنیرہ نے اپنی جگہ سے ہلنے کی لاکھ کوشش کی مگر وہ انچ نہ ہل سکی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی نے طاقتور زنجیروں سے جکڑ دیا ہو۔ پہلے تو وہ زور لگاتی رہی پھر اس کے منہ سے غراہٹ نکلنے لگی۔ پھر وہ زور سے دہاڑی۔ ''چھوڑ مجھے!''

مگر بزرگ اطمینان سے خاموش کھڑے رہے۔

''میں کہتا ہوں چھوڑ، ورنہ پچھتائے گا!'' زنیرہ نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔

''بکواس بند کر! اور چھوڑ دے اس بچی کو، کیوں پریشان کررہا ہے اسے۔'' حضرت نے غصے سے کہا۔

''یہ مجھے بہت اچھی لگی، اس کے مہکتے وجود نے مجھے اس پر عاشق ہونے پر مجبور کردیا۔ اب یہ صرف اور صرف میری ہے۔ میں اس کو حاصل کرکے رہوں گا۔'' زنیرہ کے منہ سے بھاری سی آواز نکلی۔

''چھوڑنا تو اسے تجھے پڑے گا!'' بزرگ نے جواب میں کہا۔

''ناممکن ہے! یہ میری چیز ہے اور میں اسے ضرور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔'' جن نے غصے سے کہا۔

''یہ کوئی چیز نہیں جیتی جاگتی بچی ہے اور اس پر تیری کوئی مرضی نہیں چلے گی اور رہی بات لے جانے کی تو اسے تو کیا لے کر جائے گا پہلے اپنے جانے کی تو فکر کر۔'' بزرگ کا اتنا کہنا تھا کہ زنیرہ کے منہ سے دردبھری چیخیں نکلنا شروع ہوگئیں۔

زنیرہ نے سر پٹخنا شروع کردیا۔ ''چھوڑ دو مجھے!'' جن نے غراتے ہوئے کہا مگر بزرگ نے اپنی پڑھائی شروع کردی تھی۔ ''میں کہتا ہوں چھوڑ دو مجھے!'' بزرگ پڑھتے رہے۔ ''چھوڑ دو مجھے جانے دو!'' اب اس کی آواز میں اذیت تھی۔ ''جانے دو مجھے!'' اس نے گڑگڑا کر کہا۔

''نکل گئے تیرے کس بل؟'' بزرگ نے کہا۔

''میں چلا جاؤں گا یہاں سے، مجھے چھوڑ دو۔'' جن نے منت کرنے والے انداز میں کہا۔

''صرف اتنا نہیں کہ چلا جاؤں گا، وعدہ کرکے اس بچی کو یہیں چھوڑ کر جائے گا، تو پھر تیری بات پر غور ہوگا۔'' بزرگ نے پڑھائی روک کر کہا تو چند لمحے زنیرہ خاموش رہی، پھر بزرگ نے پڑھائی شروع کردی تو زنیرہ کے منہ سے چیخیں نکلنے لگیں۔ ''معاف کردیں مجھے! مجھے منظور ہے، مجھے جانے دیں، میں اس لڑکی کو

چھوڑ دوں گا۔" جن نے اذیت ناک انداز میں بلبلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے! بزرگ نے کہا اور پھر کچھ پڑھ کر زنیرہ کی جانب پھونک ماری تو زنیرہ کے جسم سے دھواں نکل کر فضا میں تحلیل ہوگیا اور زنیرہ دھپ سے بستر پر گر پڑی اور بے سدھ ہوگئی۔ بزرگ کمرے سے نکل گئے اور واپس زنیرہ کے گھر والوں کے پاس گئے اور زنیرہ کی والدہ کو ایک تعویذ دیا اور بولے۔ "لمحہ ضائع کئے بغیر یہ بچی کے گلے میں ڈال کر آؤ۔"

زنیرہ کی امی نے تعویذ لیا اور دوڑتی ہوئی گئیں اور اسے زنیرہ کے گلے میں ڈال دیا اور واپس آگئیں۔ پھر بزرگ بولے۔ "اس مردود سے بچی کی جان چھوٹ گئی ہے۔ مگر بھول کر بھی یہ تعویذ بچی کے گلے سے نہیں اترنا چاہئے کچھ بھی ہوجائے! جب تک یہ تعویذ بچی کے جسم سے لگا رہے گا، وہ مردود کبھی چاہ کر بھی اس کے قریب نہ آپائے گا کیونکہ ایسے ضدی جن دوبارہ بھی قابض ہوجاتے ہیں۔ یہ تعویذ زندگی بھر اس بچی کے گلے میں رہنا چاہئے۔ اور پہلی فرصت میں آپ اس بچی کا نکاح کردیں۔ شادی کے بعد بھی یہ تعویذ اترنا نہیں چاہئے۔" یہ بول کر بزرگ خاموش ہوگئے۔

"میں آپ کا شکریہ کس طرح ادا کروں!" زنیرہ کے والد نے روتے ہوئے حضرت کے ہاتھ تھام کر اپنی آنکھوں سے لگالئے۔

"شکر میرا نہیں اس پاک ذات کا ادا کرو، جس کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔ یہ تو میرے اللہ کا مجھ پر احسان ہے کہ اس نے اپنے بندوں کی آسانی کے لئے مجھے چنا ہے!" بزرگ بولے۔

"اچھا حضرت مجھے میرے محسن کا نام تو بتادیجئے۔" زنیرہ کے ابو بولے تو بزرگ مسکرادیئے اور بولے۔ "بندۂ خدا" اور ان سے رخصت لے کر چلے گئے۔ بعد میں زنیرہ کے ابو کے بے حد اصرار پر امام صاحب نے حضرت کا نام انہیں بتایا۔ "بزرگ اشرف شاہ۔"

☆......☆......☆

"زونی بیٹا ذرا ادھر تو آؤ اور ہاں میری ڈائری لیتی آنا۔" زنیرہ کی امی نے اسے آواز دی۔ زنیرہ امی کی ڈائری لے کر آگئی اور ان کے ہاتھ میں دے دی۔ امی نے ڈائری کے صفحے کھولے اور بولیں۔ "زونی ذرا فون تو لگاؤ۔"

"کس کو امی؟" زونی نے پوچھا۔ "یہ لو! امی نے ڈائری زنیرہ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ زنیرہ نے ڈائری پر نگاہ ڈالی تو وہاں نگہت آنٹی کا نمبر درج تھا وہ اس کی امی کی کالج فرینڈ تھیں اور ان دنوں اسلام آباد میں رہتی تھیں۔ زنیرہ نے نمبر ڈائل کیا اور آواز دے کر امی کو بلالیا۔ "امی لیں! بیل جارہی ہے۔" زنیرہ نے ریسیور امی کو دیتے ہوئے کہا۔ تین بیلز کے بعد نگہت آنٹی نے خود فون ریسیو کیا۔ "کیسی ہو نگہت؟" زنیرہ کی امی نے پوچھا۔

"میری چھوڑو تم نے آج کیسے یاد کرلیا بے وفا!" نگہت آنٹی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہاں تم تو جیسے روز مجھے کال کرتی ہو، آخری بار میں نے ہی تمہیں کال کی تھی جب تم اپنی نند کی بیٹی کی شادی میں آئی ہوئی تھیں، اس بات کو سال ہونے والا ہے۔" زنیرہ کی امی نے کہا۔

"ہاں بھئی وقت کا پتہ ہی نہیں چلتا، خیر سب کیسے ہیں؟ بھائی صاحب، امی جان، زرارا، زنیرہ سب۔" نگہت نے پوچھا۔

"سب خیریت سے ہیں اللہ کا شکر ہے! میں نے تمہیں انوائٹ کرنے کے لئے فون کیا ہے۔ کارڈ تو ایک، دو روز میں پہنچ جائے گا، مگر میں تمہیں پرسنلی کہہ رہی ہوں۔ ستائیس ستمبر کو زارا اور زنیرہ دونوں کی شادی ہے۔" زنیرہ کی امی نے کہا۔

"ارے بھئی بہت بہت مبارک ہو!" نگہت آنٹی نے خوشی سے سرشار انداز سے کہا۔ "تمہیں بھی مبارک ہو۔" زنیرہ کی امی نے کہا۔

"لڑکے کرتے کیا ہیں؟" نگہت آنٹی نے پوچھا۔

"بھئی زارا کا ہونے والا شوہر تو ڈاکٹر ہے، جبکہ

زونی کا ہونے والا شوہر اس کی دوست رابیل کا دیور ہے، بی ایس ایس کیا ہوا ہے، آفیسر ہے۔
رشتے دونوں اچھے تھے تو میں نے سوچا کیوں نہ دونوں کے فرض سے ایک ساتھ ہی سبکدوش ہوجاؤں۔'' زنیرہ کی امی نے بتایا۔
''بالکل ٹھیک کیا، تم فکر مت کرو میں ضرور آؤں گی۔'' نگہت آنٹی نے کہا اور پھر دونوں باتوں میں مصروف ہوگئیں۔

☆......☆......☆

زنیرہ کے والد ظہر کی نماز پڑھ کر گھر آئے اور خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گئے، زنیرہ کی امی انہیں اس طرح دیکھ کر تشویش زدہ ہوگئیں اور آ کر بولیں۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے ناں؟''
''ہاں بیگم طبیعت تو بالکل ٹھیک ہے مگر......'' وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگئے۔
''مگر کیا؟'' زنیرہ کی امی ان کے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔
آج زارا اور زونی کی مایوں تھی۔ مسجد میں امام صاحب ملے تھے، انہوں نے یہ افسوسناک خبر سنائی کہ ''ہمارے محسن حکیم اشرف شاہ صاحب اس دنیا سے رخصت ہوگئے ہیں۔'' جن کی بدولت آج ہم اپنی بیٹی کو اس کے گھر کا کر رہے ہیں۔'' انہوں نے افسردگی سے کہا تو زنیرہ کی امی بے اختیار رونے لگیں۔ ''اللہ پاک یہ ایک ماں کے دل سے نکلی دعا ہے۔ تو اپنے اس نیک بندے کی چھوٹی سے چھوٹی خطا معاف فرما کر ان کو جنت میں اعلیٰ ترین مقام عطا کر (آمین) دونوں نے کہا۔

☆......☆......☆

''بیٹا کوشش کرنا کہ سارے کام پہلے ہی نمٹالو ورنہ آخر تک کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے اور پھر رخصتی دیر سے کی جاتی ہے۔'' دادو نے کہا۔ ''جی بہتر! امی حضور!'' زنیرہ کی امی نے کہا۔ دادو اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ''سنئے! نہ جانے کیوں میرے دل میں خوف آ رہا ہے۔'' زنیرہ کی امی بولیں۔

''نہیں بیگم یہ صرف وہم ہے جب تک یہ خبر آپ نے سنی نہیں تھی تو آپ مطمئن تھیں۔ ہمت سے کام لیں اور یاد ہے ناں شاہ صاحب نے وہ تعویذ دیا تھا اور کہا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ مردود چاہ کر بھی ہماری بچی کے قریب نہیں آ سکے گا۔'' زنیرہ کے ابو بولے۔ ''آپ دعا کریں کہ ہماری بیٹی خیریت سے رخصت ہو کر اپنے گھر کی ہو جائے۔''

☆......☆......☆

وہ جن چھت پر ٹہل رہا تھا اس کی سبز چمکتی آنکھیں اندھیرے میں اور بھی خوفناک معلوم ہو رہی تھیں۔ نیچے زارا اور زنیرہ کے ہاتھوں میں مہندی لگ رہی تھی اور وہ بے تابی سے زنیرہ کو دیکھ رہا تھا مگر وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھنے پر مجبور تھا، وہ بے بس نگاہوں سے اس کے خوب صورت ہاتھوں کو دیکھ رہا تھا۔ چھت پر کسی کے آنے کی چاپ سن کر وہ چھلانگ لگا کر دوسری چھت پر چلا گیا۔
''زارا آپی مجھے تمہارے سوٹ کا کلر زیادہ اچھا لگ رہا ہے۔'' زونی نے کہا۔
''چندا یہاں میں تمہیں اپنا سوٹ آفر نہیں کرسکتی کیوں کہ یہ سسرال سے آیا ہوا میری شادی کا سوٹ ہے۔ میری ساس گھر میں قدم رکھتے ہی میرا بھرتہ بنا دیں گی۔'' زارا نے مذاق کیا تو دونوں ہنسنے لگیں۔ دونوں اپنے کمرے میں تیار ہو رہی تھیں اور بیوٹیشن انہیں تیار کرنے گھر آئی ہوئی تھی۔ ''بی بی یہ تعویذ آپ کے گلے سے نظر آئے گا۔'' بیوٹیشن نے زنیرہ سے کہا۔
''آپ اسے پن سے قمیض کے اندر سیٹ کردیں اور اس کو اتارنا میرے بس میں نہیں ہے!'' زنیرہ نے صاف کہا تو بیوٹیشن چپ ہوگئی۔
''میں تو ہر دفعہ کی طرح آج بھی تم سے پہلے ریڈی ہوگئی ہوں زونی۔'' زارا نے کہا تو زنیرہ مسکرانے لگی۔
''اچھا میں ذرا امی کے پاس ان کے روم میں جارہی ہوں، میں ان کے ساتھ وقت گزارنا چاہتی

ہوں، پھر تو میں چلی جاؤں گی۔'' زارا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''ٹھیک ہے آپی! میرا بس ہیئر اسٹائل رہتا ہے، میں بھی وہاں آ جاؤں گی۔'' زنیرہ نے کہا تو زارا گردن ہلانے لگی۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے وہ واپس آئی اور زنیرہ کے گلے لگ گئی۔ ''جانے کیوں عجیب سا لگ رہا ہے زونی! پھر ہم ملیں گے یا نہیں۔'' زارا نے بھرائے ہوئے انداز سے کہا تو زنیرہ بھی رونے لگی پھر الگ ہٹ کر بولی۔ ''آپی تم تو ایسے کر رہی ہو جیسے رخصت ہو کر یو ایس جا رہی ہو۔ چند گھنٹوں کی دوری پر گھر ہے اور سیکنڈ میں موبائل پر کال لگے گی۔ کیا ہو گیا!'' اس نے زارا سے کہا تو وہ روتے ہوئے بھی ہنسنے لگی۔

''میں بھی پاگل ہوں۔'' زارا نے کہا تو زنیرہ جھٹ بولی۔ ''یہ تو بالکل سچ ہے اس بات میں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔'' پھر زارا ہنستی ہوئی کمرے سے چلی گئی۔ زنیرہ چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔

''یہ دن ہی ایسا ہوتا ہے کہ انسان نروس ہو جاتا ہے!'' بیوٹیشن نے زارا کی کیفیت پر کہا تو زنیرہ تائید کرنے لگی۔

پھر دادو زونی کے پاس آئیں اور زونی کی بلائیں لینے لگیں۔ ''کتنی حسین لگ رہی ہے میری بچی! اللہ نظر بد سے بچائے۔'' انہوں نے کہا تو زونی نے مسکرا کر نظریں نیچی کر لیں دادو چلی گئیں اور بیوٹیشن نے زنیرہ کے سنہرے بالوں کو ہاتھ میں پکڑا اور کنگھے سے بالوں کو تیزی سے سمیٹنے لگی۔ اوپر نیچے جاتے کنگھے میں اچانک ''تعویذ کی ڈوری اٹکی اور اس کی گرہ کھل گئی۔'' تعویذ کب زنیرہ کے گلے سے نکل کر نیچے گرا اسے معلوم ہی نہ ہو سکا۔

بیوٹیشن اس سے پہلے کہ کچھ کرتی کمرے میں اندھیرا چھا گیا، پھر جب روشنی ہوئی تو بیوٹیشن بے ہوش پڑی تھی اور زنیرہ دلہن بنی آئینے کے سامنے کھڑی تھی اس کے سنہرے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس نے پرفیوم کی بوتل اٹھائی اور اپنے اوپر اسپرے کر لیا۔

وہ اکیلی نہ تھی اس کے برابر میں ایک نوجوان کھڑا تھا، اس کی سبز آنکھیں زونی پر ہی تھیں۔ ''تم صرف میری ہو! آج میں تمہیں اپنے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لے جاؤں گا۔'' اس کے منہ سے آواز نکلی۔ زنیرہ نے اس نوجوان کی آنکھوں میں دیکھا اور پھر وہ کہیں کھوتی چلی گئی۔

''زونی دروازہ کھولو!'' زارا نے واپس آ کر دروازہ ناک کیا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ سیدھی امی کے پاس گئی انہوں نے دادو سے کہا پھر تو امی، ابو، دادو، سب زونی کے کمرے کے باہر جمع ہو گئے۔ امی نے تو دروازے کو توڑ دینے والے انداز سے پیٹ ڈالا مگر کوئی جواب نہ آیا۔ ابو اور چچا نے مل کر دروازے کو توڑ دیا۔

سب اندر آ گئے وہاں ایک طرف بیوٹیشن بے ہوش پڑی تھی۔ مگر زنیرہ کا کہیں نام و نشان نہ تھا، دادو نے اٹیچ باتھ میں جھانکا وہ بھی خالی تھا۔ سب نے بیوٹیشن کو اٹھایا تو اس نے بتایا کہ ''ایک دم لائٹ چلی گئی تھی پھر اسے کچھ یاد نہیں۔''

مگر سب حیران تھے کہ لائٹ تو گئی ہی نہیں!

ایک دم دادو نے کمرے میں رچی پرفیوم کی خوشبو پر غور کیا تو انہوں نے اپنا رخ ڈریسنگ ٹیبل کی طرف کیا۔ وہاں ان کا استقبال پرفیوم کی کھلی ہوئی بوتل نے کیا۔

دادو نے آگے بڑھ کر اسے اٹھانا چاہا تو ان کے پیر کے نیچے کوئی چیز آ گئی۔ انہوں نے جھک کر اٹھا لیا وہ چیز کچھ اور نہیں۔ ''زونی کے گلے میں پڑا بزرگ کا دیا ہوا تعویذ تھا۔''

اس ضدی جن نے اپنی ضد پوری کر کے چھوڑی۔

''یہ میری چیز ہے اور میں اسے ضرور اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

بڑوں کی بات کو نظر انداز کر کے کبھی ہم بہت بڑی مشکل میں بھی پڑ سکتے ہیں! اگر بڑے کچھ سمجھائیں تو ہمیں سمجھنا چاہئے اسی میں ضرور ہماری بھلائی ہوگی۔

تنہا مکان

ساحل ابڑو۔ ڈیرہ اللہ یار بلوچستان

نوجوان کے سامنے کھڑے بوڑھے پر ایک دو تین چار بلکہ چھ گولیاں چلادیں مگر بوڑھا اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ، ساری گولیاں اس کے سینے میں پیوست ہوچکی تھیں مگر بوڑھا مسکرا رہا تھا، آخر کیوں؟

رگ و پے میں خوف و ہراس کی لہر گردش کرتی ہوئی خوفناک حیرت ناک دل شکستہ کہانی

رات کا پچھلا پہر ہے۔ میری زندگی کے صرف چند گھنٹے باقی رہ گئے ہیں۔ صبح ہوتے ہی مجھے پھانسی دے دی جائے گی۔ لوگ مجھے انتہائی خطرناک مجرم سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں اپنے بے گناہ ہونے کا یقین دلانے کی ہرممکن کوشش کی ہے۔ لیکن میری ہر بات کو جھوٹ سمجھا گیا۔ اب میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ زندگی کے ان تمام واقعات کو مختصراً قلمبند کردوں۔ جو گاؤں کے قریب ایک تنہا مکان میں قیام کے دوران مجھے پیش آئے اور جن کی وجہ سے مجھے یہ منحوس دن دیکھنا پڑا ہے۔

گزشتہ سال موسم بہار کے شروع میں میرے مصائب کا آغاز اس منحوس دن ہوا۔ جب دلال نے فون پر ایک دیہی مکان کے بارے میں مجھے اطلاع دی۔ چار کمروں پر مشتمل یہ دومنزلہ مکان گاؤں کی آبادی سے نصف میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ میں کئی

دنوں سے کسی ایسے ہی مکان کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ تا کہ شہر کے ہنگاموں سے دور چار چھ ماہ کے لئے کوئی پرسکون جگہ مل جائے اور میں اطمینان اور یکسوئی سے اپنے دو ادھورے ناول مکمل کرلوں۔ میں نے دلال کی فراہم کردہ معلومات پر فوراً ہی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے مکان کرائے پر حاصل کرنے کی ہدایت کردی۔

سالہاسال خالی رہنے کے سبب اس مکان کی حالت خستہ ہورہی تھی حتیٰ کہ تالے تک زنگ آلود ہوچکے تھے۔ نچلی منزل کے دو کمروں یعنی خواب گاہ اور نشست گاہ میں پرانا سامان ٹوٹا ہوا فرنیچر، کراکری اور کوڑا کباڑ ابھرا پڑا تھا ان دو کمروں سے ملحق باورچی خانہ اور سب سے آخر میں ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ جب میں نے اس چھوٹے سے کمرے کا دروازہ کھولا تو بدبو اور تعفن کے بھبھکوں سے میرا دماغ پھٹنے لگا۔ تھوڑی دیر تک دروازہ کھلا رہنے دیا جس سے تعفن کم ہوا تو میں کمرے میں داخل ہوا۔ دروازے کے سامنے والی کھڑکی تھی جس کے اوپر والے دو شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور باقی تمام دیواروں کے ساتھ چھت تک اونچے شلفوں پر بے ترتیبی سے پڑی ہوئی گرد آلود کتابوں کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا جیسے یہ کسی کباڑی کی اجڑی ہوئی دکان ہے۔ ان کتابوں میں سے اکثر کو دیمک نے چاٹ کر برباد کردیا تھا۔ درودیوار پر لکڑی کے جالے اور بدبو سے کمرے کا اندرونی ماحول بڑا ہی پراسرار اور انتہائی دہشت ناک ہوگیا تھا یہ غلیظ بدبو ایسی تھی جیسے گوشت کی سڑانڈ۔

مجھے خیال آیا کہ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشوں کے راستے سے کوئی چھوٹا موٹا جانور کمرے میں داخل ہونے کے بعد باہر نکلنے میں کامیاب نہیں ہوسکا اور بھوک پیاس سے سسک سسک کر یہیں مرگیا ہے۔ جس کی لاش کے گلنے سڑنے سے تعفن پیدا ہوگیا ہے۔ میں نے کمرے میں ہر طرف دیکھا لیکن کسی مردہ جانور کی لاش دکھائی نہ دی۔ اس اجڑے ہوئے مکان میں داخل ہونے کے بعد میں نے دو باتیں خاص طور پر نوٹ کیں۔ ''ایک تو یہ کہ میں آثار قدیمہ کے کسی گمشدہ مقبرے میں چلا آیا ہوں۔ اور یہاں سے باہر نکلنے کی کوئی صورت نہیں۔ دوم یہ کہ مکان میں میرے علاوہ کوئی دوسرا شخص بھی موجود ہے جو میری نگرانی کررہا ہے۔ انجانی آنکھیں مجھے گھور رہی ہیں۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو۔'' میں نے سوچا۔

لیکن یہاں قیام کرنے کے بعد بھی مجھے ہر وقت کسی دوسرے کی موجودگی کا احساس ہوتا رہا۔ مختصر یہ کہ مکان کسی بھی صورت میں رہائش کے قابل نہیں تھا۔ مجھے اس وقت دلال کی حماقت پر بہت غصہ آیا۔ لیکن اب میرے لئے اس مقبرہ نما مکان میں رات گزارنے کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ گاؤں کے کسی بھی آدمی سے میری واقفیت نہ تھی۔ جس کے گھر رات بسر کرنے کے بعد صبح واپس شہر چلا جاتا۔ حیران تھا کہ کیا کروں اور کدھر جاؤں۔ آخر مجبور ہوکر اوپر کی منزل پر آ گیا۔

آپ میری بات پر شاید یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اوپر کی منزل انتہائی صاف ستھری ہونے کے ساتھ ساتھ اس میں رہائش کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ یہ تضاد یقیناً تعجب خیز تھا۔ دونوں کمروں میں نہایت اعلیٰ قسم کے قیمتی قالین بچھے ہوئے تھے۔ جدید فیشن کا ساگوانی فرنیچر اور خواب گاہ میں گدوں والا پلنگ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ کھڑکیوں پر پھول دار پردے آویزاں تھے اور بلور کے منقش گلدانوں میں تازہ پھول دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ کوئی شخص مالک مکان کی اجازت کے بغیر یہاں رہائش پذیر ہے اور میری آمد سے باخبر ہونے پر چھپ گیا۔ ان کمروں سے ملحق باورچی خانہ اور سب سے آخر میں ایک چھوٹا کمرہ تھا۔ بس یہ سمجھ لیجیے کہ دونوں منزلیں تعمیر کے اعتبار سے بالکل ٹھیک تھیں۔

دن بھر کے سفر کی تھکن کے باعث میں پلنگ پر پڑ گیا اور سو گیا۔ رات بڑے اطمینان سے گزری۔ صبح ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد سب سے پہلے تو میں نے اپنے سامان کو نچلی منزل سے لاکر کمروں میں ترتیب و قرینے سے رکھا جو گزشتہ رات سے وہیں پڑا تھا اور پھر ناول لکھنے میں مصروف ہوگیا شام تک لکھتا رہا اس طرح اٹھارہ دنوں تک میرا یہی معمول رہا۔ حتیٰ کہ ناول

مکمل ہو گیا۔

اس دوران نہ تو میں گھر سے باہر نکلا اور نہ ہی گاؤں کا کوئی شخص مجھ سے ملنے آیا۔ میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ آتے وقت میں بند ڈبوں میں خورد ونوش کی چیزیں وافر مقدار میں لیتا آیا تھا جو میرے لئے ڈیڑھ ماہ تک کے لئے کافی تھیں۔ اس لئے ان اٹھارہ دنوں میں ایک مرتبہ بھی مجھے گاؤں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

میں اب بہت تھک چکا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ دوسرا ناول شروع کرنے سے پیشتر کچھ دن سیر کرلینی چاہئے اور گاؤں میں رہنے والے اپنے ہمسایوں سے بھی مل لوں۔

دوسرے دن بھی گاؤں جانے کے لئے پہلی مرتبہ گھر سے نکلا تو ایک آدمی کو بھاگ کر قریب ہی جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپتے دیکھا۔ وہ کون ہے۔ یہاں کیا کررہا ہے۔ میں نے سوچا ممکن ہے وہی آدمی ہو جو میری آمد سے پیشتر مکان میں مقیم تھا اور اب شاید نچلی منزل میں رہنے لگا ہے، بہر حال کوئی بھی ہو مجھے اس سے کیا مطلب میرے لئے اوپر والی منزل کافی ہے۔

میں نے اس کو زیادہ اہمیت نہ دی اور گاؤں کی طرف چلا آیا۔ لیکن اب وہ میرا تعاقب کرنے لگا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اس سے تعرض کرنا مناسب نہ جانا اور خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ البتہ گاؤں پہنچنے کے بعد لوگوں کے رویئے سے مجھے سخت دکھ پہنچا۔ کسی نے بھی سلام کا جواب تک دینا گوارہ نہ کیا۔ میں جس طرف جاتا، لوگ حقارت سے منہ پھیر لیتے۔ آخر بہت دیر تک بے مقصد گھومنے کے بعد مجبور ہو کر میں نے گھر کی راہ لی۔

میں حیران تھا کہ گاؤں والے مجھ سے ناراض کیوں ہیں۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا ہے۔ ایک اجنبی ہونے کی حیثیت سے ان کی مجھ سے اس قدر شدید نفرت کا سبب کیا ہوسکتا ہے۔ اس سے پیشتر نہ میں نے انہیں دیکھا ہے اور نہ ہی ان میں سے کوئی شخص مجھ سے واقفیت رکھتا ہے۔

اسی ادھیڑ بن میں جب میں گھر کے دروازے کے نزدیک پہنچا تو میرا تعاقب کرنے والا بھاگتا ہوا میرے سامنے آ کھڑا ہوا اس نوجوان کی اس نازیبا حرکت پر مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن حالات کے پیش نظر خاموش رہا۔ اس کی عمر پچیس برس تھی بلند قامت، چوڑے شانے، متناسب اور مضبوط بدن۔ میں نے ایک نظر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور اس نے بڑے گستاخ لہجے میں کہا۔

”کیا آپ نے یہ مکان خریدا ہے؟“

”نہیں۔“ میں نے غصے پر قابو پاتے ہوئے مختصر جواب دیا۔

”تو پھر آپ ارشد ہیں۔ ڈاکٹر کے بھتیجے، جس کی وصیت کے مطابق یہ مکان آپ کو ملا ہے۔“ نوجوان نے فلسفیانہ انداز میں خود ہی میرے متعلق رائے قائم کردی۔

”نہیں۔ میں کسی ارشد سے واقف نہیں ہوں اور نہ ہی مرنے والے ڈاکٹر سے میرا کوئی رشتہ ہے۔ میں نے یہ مکان چھ ماہ کے لئے کرائے پر حاصل کیا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”مگر تم کون ہو اور مکان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“

”آپ کے سوال کا جواب تو میں بعد میں دوں گا۔“ نوجوان بولا۔

”پہلے یہ بتایئے کہ مکان میں قیام کے دوران آپ نے کوئی خلاف معمول بات تو محسوس نہیں کی یا کوئی عجیب وغریب واقعہ تو پیش نہیں آیا ہے۔“

”یہ جگہ تو اتنی اچھی اور پرسکون ہے کہ ساری عمر یہیں رہنے کو جی چاہتا ہے۔“ میں نے نوجوان کو بتایا۔

”آپ بڑے خوش نصیب ہیں لیکن......“

”لیکن کیا۔ کہو، خاموش کیوں ہوگئے......“ میں نے نوجوان کا حوصلہ بڑھانے کی خاطر پوچھا۔ کیونکہ میں خوش تھا کہ گاؤں کے ایک آدمی سے علیک سلیک تو ہوئی۔

”تم کون ہو؟ مجھ سے مکان خالی کرنے کے لئے کہنے والے۔“ میں نے نوجوان کی بات کو دھمکی سمجھ کر جیسے چیختے ہوئے کہا۔

"جناب...... آپ مجھے مرعوب کرنے کی کوشش نہ کریں۔" نوجوان نے میری بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "آپ جب سے یہاں آئے ہیں ایک پل بھی میری نظروں سے اوجھل نہیں رہے۔ میں نے چوری چھپے آپ کی تھوڑی سی تحریر بھی پڑھی ہے۔ جس کی وجہ سے آپ کے بارے میں میری رائے بہت اچھی ہے۔ آپ کے مکان خالی کرنے سے مجھے ذاتی طور پر کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ڈرتا ہوں کہ آپ بے خبری میں کہیں مصیبت میں گرفتار نہ ہو جائیں۔ یہ مکان آسیب زدہ ہے۔

مکان کا مالک ڈاکٹر شیطانی قوتوں کا حامل تھا۔ وہ خدا جانے یہاں کیا کچھ کرتا رہتا تھا۔ اسی لئے ڈاکٹر کی موت کے چار سال بعد تک مکان خالی پڑا رہا ہے۔ ڈاکٹر کے بھتیجے نے بارہا اسے فروخت کرنے کی کوشش کی لیکن گاؤں کا کوئی شخص بھی خریدنے کو تیار نہیں ہوا۔ گزشتہ سال کچھ خطرناک واقعات رونما ہوئے تھے۔ اور گاؤں والے مکان کو جلا دینے کے درپے تھے۔ لیکن پولیس کی بروقت مداخلت سے بچ گیا۔ ان حالات میں اگر آپ یہاں رہنے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں تو مجھے یا کسی کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ مگر ایک بات یاد رکھئے کہ گاؤں کا کوئی بھی فرد خوف زدہ ہونے کے سبب آپ کے قریب نہیں آئے گا اور آپ کے خلاف ان کی نفرت دن بدن شدت اختیار کرتی جائے گی۔"

"تو یہ بات ہے۔" میں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا...... "مسٹر...... کیا نام ہے تمہارا......"

"اکبر۔"

"ہاں تو اکبر۔ آؤ اندر چلیں۔ مکان دیکھ کر تم یقیناً اپنی رائے تبدیل کر لو گے۔" میں نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھولتے ہوئے کہا۔

"میں اس منحوس مکان میں قدم نہیں رکھوں گا۔" اکبر نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا اور پھر گاؤں کی سمت چلا گیا۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا گیا۔ مجھے یہاں رہتے ہوئے ایک مہینہ سے زیادہ ہونے کو آیا تھا۔ میں اس پرسکون ماحول میں بڑا ہی خوش تھا۔ کہ ایک دن اچانک حالات تبدیل ہو گئے۔

شام کا وقت تھا۔ دھندلکے رفتہ رفتہ گہری تاریکی میں بدلتے جا رہے تھے کہ میری طبیعت بے چین ہو گئی اور لحہ بہ لحہ ذہنی الجھن اور انتشار میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ میں سمجھا کہ زیادہ کام کرنے سے اعصاب تھک گئے ہیں۔ مجھے آرام کی ضرورت ہے۔ میں نے کاغذ سمیٹے اور لباس تبدیل کر کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ مگر نیند کہاں۔ آخر بہت دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد سگریٹ سلگایا اور کش لگاتے ہوئے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اس دن خلاف معمول گرمی کچھ زیادہ ہی تھی اور کھڑکیوں کے دروازے بند ہونے کے سبب کمرے میں حبس کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی سوچا شاید گرمی شدت کام کی تھکن اور حبس ہی طبیعت میں اضطراب کا سبب ہیں۔

میں نے دونوں کھڑکیاں کھول دیں۔ اور ایک کھڑکی کے پاس کھڑا پہاڑ کے دامن میں پھیلے ہوئے جنگل کے دیو قامت درختوں کو دیکھنے لگا۔

چاندنی رات کا منظر بڑا ہی خوب صورت تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے خوف آ رہا تھا درختوں کی اوٹ سے چاند بلند ہو رہا تھا۔ اور درختوں کے لمبوترے سائے سمٹتے چلے جا رہے تھے تھوڑی دیر بعد مکان کی نچلی منزل سے آوازیں سنائی دیں بہت ہی خوف ناک اور بلند۔ میرا دماغ پھٹنے لگا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سنبھلنے کی کوشش کی لیکن بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

خدا جانے کب تک بے ہوش پڑا رہا۔ اور مجھ پر کیا بیتی۔ لیکن جب ہوش آیا تو اپنے آپ کو پلنگ پر لیٹا ہوا پایا۔ ایک آدمی کھڑکی کی طرف جاتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ سر سے پیر تک سفید چادر میں ملبوس تھا۔ جیسے کفن پوش مردہ قبر کی گہرائیوں سے نکل آیا ہو۔ اس کی کمر کمان کی طرح جھکی ہوئی تھی جس سے اسکی پیرانہ سالی کا پتہ چلتا تھا۔ میں نے اسے پکارنا چاہا کہ اس نے خود میری طرف پلٹ کر دیکھا۔

"اوہ خدایا۔" میں خوف سے کانپ اٹھا۔ اس

بوڑھے کا چہرہ انتہائی مکروہ اور بھیانک تھا دوسرے ہی لمحے وہ کھڑکی سے کود کر چاندنی رات کی وسعتوں میں تحلیل ہوگیا اور میں حیرت سے دیکھتا ہی رہ گیا۔

مکان کے اندر سے بلند ہونے والی بھیانک آواز اب سرور میں ڈوبی ہوئی موسیقی کا روپ دھار چکی تھی۔ جی چاہا کہ ساری رات سنتا رہوں۔ لیکن نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ بہت جلد نیند کی وادیوں میں جا پہنچا۔

صبح خلاف معمول بہت دیر تک سوتا رہا اور بیدار ہونے پر سب سے پہلے میری نظر کھڑکیوں پر پڑی۔ دونوں کھڑکیاں بند تھیں۔ ایک ایک کرکے رات کے واقعات یاد آنے لگے لیکن۔ یہ سب خواب وخیال کی باتیں تھیں زندگی کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وقت کی رفتار میں یکسانیت برقرار رہی۔

اور پھر ایک رات میری آنکھ کھل گئی۔ نچلی منزل کے ویرانوں میں کوئی مجھے بلا رہا ہے۔ ’’اس وقت کون ہوسکتا ہے؟ رات کے دو بجے ہیں۔ اکبر کے علاوہ میرا نام بھی کوئی نہیں جانتا اور یہ بوڑھی نحیف آواز یقیناً اکبر کی نہیں ہوسکتی۔‘‘ میں سوچنے لگا۔

میرے کانوں سے بار بار کسی کے بلانے کی آواز ٹکراتی رہی اور پھر میں کمرے سے نکل کر سیڑھیوں سے اترتا ہوا نچلی منزل پر جا پہنچا۔

میری حالت اس شخص جیسی تھی جیسے کوئی نیند میں چلا کرتا ہے اور اسے اپنے کسی فعل پر اختیار نہیں ہوتا۔ مجھے بھی اس وقت اپنے آپ پر اختیار نہیں تھا۔ میرے قدم خود بخود کتابوں والے چھوٹے کمرے کی طرف اٹھتے چلے جارہے تھے۔ کمرے میں کتابوں کی ایک الماری اپنی جگہ سے سرکی ہوئی تھی جس کے پیچھے دروازہ تھا۔ میں اس خفیہ دروازے سے گزرتا ہوا تہہ خانے میں جا پہنچا۔

یہاں میرے علاوہ کوئی اور بھی تھا۔ جس کے زور زور سے سانس لینے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس جگہ اتنا تعفن تھا کہ میرے لئے سانس لینا مشکل ہوگیا۔ میں نے جیب سے ماچس نکالی اور تیلی جلا کر دیکھا ہر طرف جانوروں اور انسانوں کے پنجر اور

کام کے بعد

ایک شخص ایک وقت میں بیس روٹیاں کھا سکتا ہے، سرکس والوں کو پتہ چلا تو وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے۔

پہلے شو میں بیس روٹی کھانے پر لوگ بہت حیران ہوئے۔ ایک گھنٹے بعد ہونے والے شو میں وہ پھر بیس روٹیاں کھا گیا اور گھنٹے بعد ہونے والے تیسرے شو سے پہلے غائب ہوگیا۔

مالک نے ڈھونڈا تو ایک ہوٹل پر بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔ مالک کے ڈانٹنے پر معصومیت سے بولا۔

سارا دن کام کے بعد کیا میں روٹی بھی نہیں کھا سکتا۔

(ہما راجہ۔کراچی)

ہڈیاں بکھری ہوئی تھیں۔ میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک دلدوز انسانی چیخ بلند ہوئی۔ اس کے بعد کیا ہوا مجھے کچھ علم نہیں۔ البتہ صبح جب بیدار ہوا تو اپنے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔

’’آخر یہ سب کیا ہے۔ کیا میں نے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہے؟‘‘ میں بہت دیر تک سوچتا رہا اور پھر اپنے شکوک کی تصدیق کے لئے نچلی منزل پر کتابوں والے چھوٹے کمرے میں گیا۔ سب الماریاں دیواروں کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ کوئی بھی اپنی جگہ سے معمولی سی بھی نہیں سرکی ہوئی دکھائی دی۔ البتہ فرش پر دھول کی موٹی تہہ پر میرے جوتوں کے تازہ اور واضح نشانات ایک الماری کے سامنے موجود تھے۔ اب مجھے اپنے شکوک کی صداقت پر یقین آگیا اور مزید اطمینان کی خاطر میں نے الماری کو سرکایا تو زیرزمین خفیہ تہہ خانے کا دروازہ دکھائی دیا۔ میں نے الماری کو مزید سرکا کر دروازہ کھولنا چاہا۔ لیکن افسوس

دروازہ اندر سے بند تھا۔ تہہ خانہ کا سربستہ راز یوں ہی رہا۔

☆......☆......☆

مجھے یہاں آئے دو ماہ گزر چکے تھے۔ اس دوران میں نے صرف ایک خط شہر اپنے دکاندار کو لکھا جس کے جواب میں اس نے مجھے ڈبوں میں بند خوردونوش کی مطلوبہ اشیاء بھیج دیں ورنہ اس کے علاوہ بیرونی دنیا سے میرا تعلق عملی طور پر منقطع ہو چکا تھا۔ گاؤں والے تو میری شکل دیکھنے سے بیزار تھے۔ مجھے بھی ان کی پروا نہیں تھی بلکہ میں خوش تھا کہ اس پرسکون ماحول میں میرا دوسرا ناول بھی مکمل ہونے والا تھا۔

ایک دن جب صبح بیدار ہوا تو شب خوابی کے لباس کی بجائے خود کو سوٹ میں ملبوس پاکر حیران رہ گیا۔ میں نے سوٹ کب پہنا تھا اور اس پر خون کہاں سے لگا ہے۔ میں ابھی اسی گومگو کے عالم میں تھا کہ دروازے پر دستک کی آواز ہوئی۔

میرا دل یکلخت زور سے اچھلا گویا سینے سے باہر آنے والا ہے۔ خوف سے پسینہ پھوٹ گیا دستک کی آواز لحہ بہ لحہ تیز ہوتی گئی۔ ڈر تھا کہ دروازہ نہ کھولا تو دستک دینے والا دروازہ توڑ کر مکان میں داخل ہونے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔ میں نے فوراً ہی سوٹ اتار کر بستر کے نیچے چھپادیا۔ اور شب خوابی کا لباس پہن کر خون آلودہ ہاتھ دھونے کے بعد آنکھیں ملتا ہوا دروازہ کھولا تو سامنے آدمیوں کا ہجوم کھڑا پایا۔ ایسے معلوم ہورہا تھا جیسے گاؤں والوں نے میرے گھر کا محاصرہ کررکھا ہو۔

''جی فرمایئے۔'' میں نے اپنے مختل حواس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ہم اپنی بکری لینے آئے ہیں۔'' ہجوم میں سے ایک آواز ابھری۔

''کیسی بکری؟'' میں نے پوچھا۔

''تم گزشتہ رات چوری کرکے لائے ہو۔'' ایک نے کہا۔

''میں اور چوری۔'' میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

مگر میری بات پر یقین نہیں تو اندر آکر دیکھ لیں۔ کوئی ماچس کی ڈبیہ تو ہے نہیں۔ جسے میں جیب میں رکھ لوں گا۔''

میں نے دروازے سے ایک طرف ہٹتے ہوئے انہیں اندر آکر دیکھنے کی پیشکش کی۔ ہجوم میں کھسر پھسر ہونے لگی، کوئی بھی شخص اس آسیب زدہ مکان میں داخل ہونے کو تیار نہیں تھا۔ سب ہی ڈر رہے تھے۔ مبادا کسی ناگہانی آفت کا شکار نہ ہوجائیں۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے قہقہہ لگایا اور سب خاموش ہوگئے۔ جیسے ان کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ میرا قہقہہ ان کی غیرت کے لئے کھلا چیلنج تھا۔

اکبر ہجوم کو چیرتا ہوا آگے بڑھا۔ اس نے میرے قریب سے گزرتے ہوئے مجھے گھور کر دیکھا اور مکان میں داخل ہوگیا۔ اس کی جرأت و بے باکی سے دوسروں کی بھی ہمت بندھی اور آٹھ دس آدمی اکبر کے پیچھے مکان میں داخل ہوگئے۔ میں وہیں کھڑا رہا۔ تاکہ میرے متعلق ان کو کسی قسم کا شک نہ ہونے پائے۔ سب کو مایوس ہونا پڑا۔ کچھ ہوتا تو ملتا۔

سب اپنا منہ لئے واپس چلے گئے۔ تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی نے میرا بستر اٹھا کر خون آلود سوٹ نہیں دیکھا ورنہ میرے لئے ان کے الٹے سیدھے سوالات کا جواب دینا مشکل ہوجاتا۔ مجھے بکری کے ساتھ ہلاکت کا مجرم بھی ٹھہرایا جاتا۔ میں خود بھی پریشان تھا کہ میرے ہاتھوں اور سوٹ پر خون کہاں سے لگا ہے؟ کہیں مجھے نیند میں چلنے کا مرض تو لاحق نہیں ہوگیا۔ ممکن ہے اسی دوران میں جرم کا مرتکب ہوا ہوں۔ مجھے تہہ خانے میں بوڑھے کا خیال آیا شاید اسی نے ایسا کیا ہو۔

اس واقعہ کے بعد میں ڈر گیا کہ کسی دن کوئی شخص مشتعل ہوکر مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ اسی ڈر سے میں نے شام کے وقت چہل قدمی کے لئے گھر سے باہر نکلنا بند کردیا۔

بس یہ سمجھئے کہ لوگوں نے مجھے میرے ہی گھر میں قید کردیا تھا۔ اس احتیاط کے باوجود میری مصیبت ختم نہ ہوئی۔

کچھ ہی دن گزرے ہوں گے کہ لوگوں نے ایک بار پھر میرے گھر کا محاصرہ کرلیا۔ اس مرتبہ پولیس بھی ان کے ساتھ تھی۔ گاؤں کے چوکیدار نے مجھ پر بڑے ہی گھناؤنے جرم کا مرتکب ہونے کا الزام لگایا تھا کہ آدھی رات کے وقت اس نے مجھے ایک بچے کو کندھے پر اٹھائے گھر کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ بچہ مرچکا تھا۔ اور اس کی کٹی ہوئی گردن کے ساتھ سر نیچے کو جھول رہا تھا۔ چوکیدار نے اپنی بزدلی کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ خوف زدہ ہونے کے باعث وہ مجھے پکڑنے کی جرأت نہیں کرسکا۔ چوکیدار کے اس بے ہودہ الزام پر پولیس مجھے گرفتار کرنے آئی تھی۔ کچھ سپاہی مکان کی تلاشی لینے کے لئے وہیں رک گئے اور دو سپاہی مجھے تھانہ لے گئے۔

اس تازہ افتاد سے میں بے حد پریشان ہوا۔ اگر پولیس زیر زمین خفیہ تہہ خانہ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگئی تو میرے لئے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں رہے گی۔

تہہ خانہ میں انسانوں اور جانوروں کے پنجر اور ہڈیاں مجھے پھانسی کی سزا دلانے کے لئے سب سے بڑا ثبوت تھیں۔

گزشتہ رات میں نے بھی بچے کی دلدوز چیخیں سنی تھیں۔ یہ اس مکروہ بوڑھے ہی کی کارستانی ہوگی یہ بھی ممکن ہے کہ بچے کی لاش اب تک تہہ خانہ پڑی ہو۔ مجھے یقین تھا کہ بچے کی موت تہہ خانہ میں آنے کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن بچہ وہاں کیسے پہنچا۔

پولیس انسپکٹر ڈیڑھ دو گھنٹے مجھ سے سوالات کرتا رہا۔ اور میں ہر سوال کے جواب میں اسے صحیح معلومات فراہم کرتا رہا۔ مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ میں نے جرم تھوڑا ہی کیا تھا اور بحیثیت ناول نگار کے میری شہرت بھی میرے بے داغ کردار کا سب سے بڑا ثبوت تھی۔

انسپکٹر بھی میری صاف گوئی اور شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اس نے مجھے بتایا کہ ''گاؤں کے لوگ اس مکان کے بارے میں بڑے حساس اور جذباتی ہوگئے ہیں۔ ہر اندوہناک واقعہ کو مکان سے منسوب کرکے ہنگامہ کھڑا کردیتے ہیں۔''

اگر پولیس مجھے گرفتاری کا بہانہ کرکے پولیس اسٹیشن نہ لے آتی تو مشتعل ہجوم کے ہاتھوں میری ہلاکت کا خطرہ تھا۔ آخر میں انسپکٹر نے مجھے مکان چھوڑ کر یہاں سے چلے جانے کا مشورہ دیا۔ انسپکٹر کا مشورہ بالکل صحیح تھا۔ کاش! میں انسپکٹر کے مشورے پر عمل کرتا۔

☆......☆......☆

اس واقعہ سے حقیقت میں مجھے بے حد صدمہ ہوا اور میں نے مجرم کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔ مجھے یقین تھا کہ بچے کو ہلاک کرنے والا مجرم بوڑھا تہہ خانے میں چھپا ہوا ہے وہ یقیناً پاگل ہے۔ جو کسی دن مجھے بھی ہلاک کردے گا۔

میں نے گھر پہنچتے ہی پستول میں گولیاں بھریں اور ٹارچ لے کر تہہ خانے میں گیا۔ اندر اس قدر تعفن تھا کہ کسی بھی انسان کا یہاں رہنا۔ ناقابل برداشت معلوم ہوتی تھی۔ لیکن میرے لئے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں تھا۔ اندر جاتے ہی میرے پاؤں کی ٹھوکر سے ایک انسانی کھوپڑی گیند کی طرح لڑھکتی ہوئی کسی پنجرے سے جا ٹکرائی۔

میرا دل کانپ اٹھا اور میں حواس باختہ کھڑا اپنی حماقت کے متعلق سوچ رہا تھا۔ مجھے چاہئے تھا کہ پولیس کو صحیح حالت سے باخبر کردیتا۔ اور پولیس خود مجرم کو گرفتار کرلیتی میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنی پشت پر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔

میں نے ایک دم پلٹ کر دیکھا۔ مکروہ چہرہ والا بوڑھا اپنی آنکھوں کو ہاتھ سے چھپائے زور زور سے چیخنے لگا۔ وہ اب بھی سر سے پاؤں تک سفید چادر اپنے بدن کے گرد لپیٹے ہوئے تھا۔ جیسے کفن پہن رکھا ہو۔ مگر اس کے چہرے کی رنگت اب یرقان کے مریض کی طرح زرد تھی۔ بلکہ انار کی طرح سرخ ہورہی تھی اور جھریوں کی لکیریں بھی پہلے کی نسبت بہت مدہم تھیں۔ اس کے شانے بھی کمان کی طرح جھکے ہوئے نہیں تھے۔

وہ میرے سامنے پہلوان کی طرح سینہ تانے کھڑا تھا۔ اس قوی ہیکل بوڑھے کو دیکھ کر گھبراہٹ کے عالم میں، میں نے گولی چلادی جس سے اس کے سفید لباس میں دو سوراخ ہوگئے۔ لیکن وہ پہلے ہی کی طرح سینہ تانے کھڑا رہا۔ میں نے دوبارہ گولی چلائی۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ دو گولیاں اس کے سینے اور ایک پیٹ میں لگی تھی۔

میں اس کو مطمئن دیکھ کر ڈر گیا اور تہہ خانے سے بھاگ نکلنے کی تدبیر سوچنے لگا۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے ہم دونوں ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لئے موقع کی تاک میں کھڑے ہیں۔ میں مسلح تھا۔ اور بوڑھے کو قدوقامت اور قوت کے اعتبار سے مجھ پر برتری حاصل تھی۔ لیکن مجھے حیرت ہے تو صرف اس بات پر کہ ”وہ اپنی آنکھوں کو ہاتھوں سے چھپائے کیوں چیخ رہا ہے۔

”طویل مدت تک تاریکی میں رہنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں روشنی میں چندھیا جاتی ہیں اور وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا۔“ یہ خیال آتے ہی میں نے ٹارچ کا رخ براہ راست اس کی آنکھوں پر کردیا۔ بس پھر کیا تھا۔

وہ چیختا چلاتا تہہ خانے کے اندرونی حصے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا، میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور باہر نکل گیا۔

ایک ماہ مزید گزر گیا۔ اس دوران میں بوڑھے کا تہہ خانے سے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن مقصد پورا نہ ہوا۔ ان حالات میں پولیس کو اطلاع دینا میرے لئے بھی مجرم گردانا جاتا۔ خونی بوڑھے کے نہ پکڑے جانے کی صورت میں میرے لئے خطرناک تھا۔ جس کے ثبوت میں تہہ خانے میں پڑی ہوئی انسانی ہڈیاں اور پنجر موجود تھے۔ بچے کی لاش کا کچھ بچا ہوا حصہ بھی اب تک تہہ خانے میں موجود تھا۔

☆......☆......☆

وقت کے تیور بدلے اور پھر ایک دن حالات نے رخ تبدیل کیا اس مرتبہ ایک نیم مردہ بکرے کو ثبوت کے طور پر پیش کیا گیا۔ جس کی گردن شدید زخمی تھی۔

پولیس نے میرے خلاف ارتکاب جرم کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا کہ کسی بھوکے جنگلی جانور نے حملہ کرکے بکرے کو زخمی کردیا ہے لیکن اس طرح آخر کب تک جرم چھپا رہ سکتا ہے۔

گاؤں والوں نے میری نگرانی کی خاطر مسلح نوجوان پر مشتمل دو گروپ ترتیب دیئے۔ ان میں سے پانچ آدمیوں کا ایک گروپ دن کے وقت نگرانی کرتا اور دوسرا گروپ رات کو ڈیوٹی پر متعین ہوتا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد آخر کار ان کو محنت کا پھل مل گیا، یہ دوسری بات ہے کہ انہوں نے اصل مجرم کی بجائے مجھے پکڑ کر مجرم ٹھہرادیا، وہ رات بڑی ہی بھیانک اور اداس تھی۔

اچانک میری طبیعت بے چین ہوگئی اور یوں محسوس کرنے لگا جیسے آج رات کچھ ہونے والا ہے۔ نیند نہیں آرہی تھی بہت دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد پریشانی کے عالم میں گھر سے باہر چہل قدمی کے لئے آیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ بندوق سے مسلح اکبر کو اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر چونک گیا۔ سوچا کہ وہ شاید بوڑھے مجرم کو پکڑنے آیا ہے اسے بھی کسی نہ کسی طرح تہہ خانے کا علم ہوگیا ہے۔

میرے دل میں آئی کہ اکبر کو صحیح حالات سے آگاہ کردینا چاہئے اس میں میری اپنی بہتری ہے۔

میں نے اکبر کو سب کچھ بتادیا۔ وہ میری باتیں بڑے انہماک سے سن رہا تھا اس کے بعد کیا ہوا۔

میں نے خود کو جیل کی کوٹھری میں پایا۔

مجھ پر الزام ہے کہ میں اکبر کا قاتل ہوں۔ اکبر کی شہ رگ کٹی ہوئی تھی مجھے رنگے ہاتھوں گرفتار کیا گیا۔

حالانکہ میں خود نہیں جانتا کہ اکبر کو کس نے قتل کیا اور اگر میں یہ خیال ظاہر کربھی دوں کہ قتل اسی بوڑھے خبیث نے کیا ہے جو تہہ خانے میں موجود ہے تو کون مانے گا؟

عجیب و غریب

فلک زاہد۔ لاہور

نوجوان جب کاؤنٹر پر آیا تو اچنبھے میں پڑگیا کیونکہ کاؤنٹر پر کوئی موجود نہ تھا لیکن ہر کام بخیر و خوبی انجام پارہا تھا۔ کاؤنٹر سے جب نوجوان فارغ ہوا تو اس کا بریف کیس خود بخود ہوا میں معلق آگے کو بڑھنے لگا کہ اچانک......

ماورائی قوت کی تحیر انگیز اور ورطۂ حیرت میں ڈالتی اپنی نوعیت کی ناقابل یقین کہانی

بس اسٹاپ پر بس آ کر رکی گہری خاموشی اور سناٹا ہر سو مسلط تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس تھامے پینٹ کوٹ کے اوپر لانگ کوٹ ڈالے اور سر پر فلیٹ ہیٹ پہنے مارلن رولنڈ (Marlun Roland) بس سے نیچے اترا۔ بس کا دروازہ آٹومیٹک طریقے سے کھلا اور بس اپنے اگلے مسافروں کو لے کر آگے بڑھ گئی۔ سڑکیں دور دور تک ویران تھیں، درخت چپ چاپ سر جھکائے کھڑے تھے، آسمان پر چاند اور ستاروں کا نام و نشان نہیں تھا، ہر چیز یوں خاموش تھی جیسے وقت ایک جگہ ٹھہر گیا ہو، مارلن نے بس اسٹاپ پر کھڑے کھڑے اپنے چاروں طرف نگاہ دوڑائی ہر طرف سناٹا خاموشی...... اندھیرا... سناٹا اور ویرانی ہی ویرانی تھی۔

مارلن نے جب اپنے سامنے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا، سامنے ایک بہت بڑی اونچی عمارت تھی اس پر بڑا

سا عمارت کا نام لکھا تھا۔ ''ہوٹل کیلی فورنیا۔''

اس اندھیرے اور ویران علاقے میں بہت کم لوگوں کا آنا جانا تھا، دن میں بھی یہ جگہ بہت کم ہی آمدورفت کے لئے استعمال ہوتی تھی اس جگہ یہ ہوٹل ابھی نیا بنا تھا مگر بہت جلد لوگوں میں خاصی مقبولیت حاصل کر گیا تھا وجہ اس ہوٹل کی آٹو میٹک سروس تھی سب کچھ اپنے آپ ہوتا تھا۔

ہوٹل کیلی فورنیا کا نام شہر شہر گاؤں گاؤں پہنچ چکا تھا اس بارے میں مارلن نے بھی اپنے دوستوں اور دوسرے بے شمار لوگوں سے اس ہوٹل کی بہت تعریفیں سن رکھی تھیں مثال کے طور پر ''ہوٹل کیلی فورنیا کی سروس بہت اچھی ہے یہاں سب کچھ آٹو میٹک ہے ہر چیز ٹائم پر ملتی ہے وغیرہ وغیرہ۔''

لوگوں اور اپنے دوستوں کی زبانی ہوٹل کیلی فورنیا کی بے انتہا تعریفیں سن کر مارلن کے دل میں بھی اس ہوٹل کو دیکھنے کی خواہش جاگی اور یہ خواہش اتنی پروان چڑھی کہ آج اس کا یہ شوق اسے یہاں تک لے آیا۔ مارلن چالیس پینتالیس سال کا ادھیڑ عمر شخص تھا وہ نیویارک سے کام کے سلسلے میں کیلی فورنیا آیا تھا دن بھر کی مصروفیت کے بعد مارلن کو اب رات گزارنے کے لئے ایک چھت درکار تھی جو اسے ہوٹل کیلی فورنیا کی صورت میں مل گئی تھی۔

یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں آٹو میٹک ہوٹل اور ریسٹورنٹس کوئی نئی بات نہیں، آئے دن یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں ایسے واقعات عام ہیں۔ مارلن نے گہری سانس لی اور ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ ہوٹل جدید طرز کا خوبصورت ہوٹل تھا روزانہ دور دور سے سیاح اسے دیکھنے کے لئے آتے، غیر ملکی یا پھر دوسرے شہر سے آیا ہوا کوئی بھی شخص جب کیلی فورنیا آتا تو ہوٹل کیلی فورنیا کا دورہ کرنا نہ بھولتا ہوٹل سے واپسی پر سب کے چہروں پر خوشی اور زبان پر تعریفیں ہوتیں۔ ہوٹل کیلی فورنیا کی طویل سیڑھیاں طے کرنے کے بعد مارلن جب اس کے صدر دروازے پر پہنچا تو دروازہ اپنے آپ کھل گیا مارلن نے ہوٹل کے اندر قدم رکھ دیا۔

مارلن کے اندر قدم رکھتے ہی کہیں سے لاؤڈ اسپیکر پر ایک نسوانی آواز مارلن کی سماعت سے ٹکرائی ''ویلکم ٹو دا ہوٹل کیلی فورنیا سر۔'' مارلن نے آواز کے تعاقب میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں تاکہ یہ جان سکے کہ آواز کہاں سے آئی مگر مارلن کو کہیں بھی کچھ نظر نہ آیا۔

پورا ہوٹل مدھم روشنیوں سے جگمگا رہا تھا، اتنا وسیع و عریض اور شاندار ہوٹل مارلن نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ہوٹل جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ پہلی ہی نظر میں یہ ایک معیاری اور مہنگا ہوٹل معلوم ہوتا تھا۔

مارلن نے کئی ہوٹل روشنیوں سے جگمگاتے دیکھے تھے مگر یہ پہلا ہوٹل تھا جس کی مدھم روشنیوں نے اس کے ماحول کو خوبصورت اور رومانوی بنا دیا تھا ہوٹل کیلی فورنیا سب سے منفرد اور دلفریب ہوٹل تھا جو سب کی توجہ اپنی جانب مرکوز کر لیتا تھا یہ ہوٹل مارلن کی توقع سے بڑھ کر تھا۔

''مہربانی فرما کر اپنی شناخت سامنے کاؤنٹر پر پڑے رجسٹر پر درج فرمائیں۔'' لاؤڈ اسپیکر سے آتی ہوئی نسوانی آواز ایک بار پھر ابھری۔ اس بار آواز کی سمت کا تعاقب کرنے کی بجائے مارلن سیدھا چلتا ہوا سامنے کاؤنٹر پر آیا۔ جہاں پیچھے کوئی نہیں تھا۔ پورا ہوٹل خاموشی میں ڈوبا ہوا تھا اور خالی معلوم ہوتا تھا۔

مارلن کو بالکل حیرت نہیں تھی کیونکہ یہاں آنے سے پہلے وہ اپنے دوستوں اور باقی لوگوں سے یہ سب سن چکا تھا کہ ہوٹل کیلی فورنیا کی مدھم روشنیاں خاموشی اور آٹو میٹک سروس ہی اس کی خاصیت ہے۔ مارلن نے کاؤنٹر پر پہنچ کر دو بار بیل بجائی جس کے جواب میں کاؤنٹر پر پڑا رجسٹر اپنے آپ کھلتا چلا گیا۔

مارلن نے گھبرا کر اپنے گردونواح میں نظریں دوڑائیں تاکہ وہ یہ دیکھ سکے کہ ہوٹل کا کنٹرول روم کدھر ہے مگر مارلن کو کہیں بھی کچھ نظر نہیں آیا، بے شک مارلن جانتا تھا کہ یہاں آکر اسے ان تمام چیزوں کا سامنا کرنا ہوگا جسے انسانی سوچ قبول نہیں کرتی مگر اب جبکہ اس کے ساتھ یہ ذاتی طور پر ہو رہا تھا وہ کچھ سہم گیا تھا اس نے

ریسٹورنٹس میں انسانوں کی جگہ روبوٹ کام کرتے دیکھے تھے جو لوگوں میں کھانا تقسیم کرتے تھے اور بدلے میں کوئی اجرت بھی نہیں مانگتے تھے اس کے علاوہ اس نے برطانیہ کے ریسٹورنٹس میں ہوا میں اڑتی ٹرے بھی دیکھی تھی جن پر کھانا رکھ کر لوگوں کو تقسیم کیا جاتا ہے اور انہیں کنٹرول روم میں بیٹھے لوگ کمپیوٹر کی مدد سے کنٹرول کرتے ہیں وہ سب تو قابل قبول ہے مگر یہاں تو ہر چیز آٹو میٹک تھی جس کا تصور ہی ناممکن ہے۔

''Identification please'' لاؤڈ اسپیکر سے ابھرتی لڑکی کی آواز نے مارلن کو چونکا دیا اور وہ ہوش کی دنیا میں واپس آ گیا مارلن کے سامنے رجسٹر کھلا ہوا تھا اور اس کے اوپر پین (Pen) موجود تھا۔ مارلن نے نا سمجھنے کے سے انداز میں پین اٹھایا اور نام کی جگہ ''مارلن رولنڈ'' درج کیا اور Stay کے خانے میں ایک رات لکھ کر پین واپس رکھ دیا۔

''Confirmed'' لاؤڈ اسپیکر سے لڑکی کی آواز آئی۔ مارلن نے ایک بار پھر ہوٹل کے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں یہ دیکھنے کے لئے کہ کیمرے یہاں لگے ہیں مگر اسے ایک کیمرہ بھی کہیں نظر نہیں آیا۔ مارلن نے خود ہی اپنی سوچ کو فضول سمجھ کر جھٹک دیا یہ سوچ کر کے کیمرے محفوظ جگہوں پر لگائے جاتے ہیں جنہیں انسانی آنکھ بہ آسانی تلاش نہیں کرسکتی۔ پورا ہوٹل خالی معلوم ہو رہا تھا جس وجہ سے مارلن کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس وسیع وعریض ہوٹل میں اکیلا ہے۔ خیر مارلن نے اس معاملے پر زیادہ غور نہیں کیا اور اگلی آواز آنے کا انتظار کرنے لگا اس کی توقع کے عین مطابق لاؤڈ اسپیکر سے ابھرتی لڑکی کی آواز ایک بار پھر اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''برائے مہربانی ایک رات ٹھہرنے کا کرایہ تین ہزار ڈالر جمع فرمایئے۔''

مارلن نے لڑکی کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اپنے والٹ میں سے تین ہزار ڈالر کے نئے نوٹ نکال کر کاؤنٹر پر رکھ دیئے۔ کاؤنٹر کا دراز اپنے آپ کھلا اور تین ہزار ڈالرز ہوا میں اڑتے ہوئے اپنے آپ دراز میں چلے گئے۔ جس کے فوراً بعد دراز بند ہوگیا اور لاؤڈ اسپیکر سے لڑکی کی آواز ابھری۔ ''شکریہ۔''

اس ناقابل یقین منظر کو مارلن نے اپنے مکمل ہوش وحواس میں جاگتی آنکھوں سے دیکھا تھا یہ عقل کو حیران کردینے والا منظر اس کے لئے حیرت و بے یقینی سے بالکل کم نہیں تھا۔ یکا یک کاؤنٹر پر کہیں سے ایک چابی نمودار ہوئی جس کے ساتھ روم نمبر کا (Tag) بھی لگا ہوا تھا۔ مارلن کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں جس کے ساتھ ہی لاؤڈ اسپیکر سے آتی ہوئی لڑکی کی آواز ایک بار پھر ابھری۔

''روم نمبر 89 اب آپ کا ہوا۔ اسے اپنا ہی جانیے شکریہ۔''

مارلن نے کاؤنٹر پر پڑی چابی اٹھائی ہی تھی کہ معاً اس کے ہاتھ میں جھولتا بریف کیس اپنے آپ اس کے ہاتھ سے نکل کر ہوا میں معلق ہوگیا۔ مارلن نے بے اختیار اپنے بریف کیس کو دیکھا جو کہ اب آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔ پہلے تو مارلن کچھ سمجھ نہ سکا مگر جلد ہی اس کی سمجھ میں آ گیا کہ بریف کیس آٹو میٹک اسے اپنے کمرے کی جانب لے جا رہا ہے۔ یہ سوچ آتے ہی مارلن خود بھی اپنے بریف کیس کے پیچھے چلنے لگا۔ چلتے چلتے وہ بریف کیس ایک ایلیویٹر (Elevator) کے سامنے آ کر رکا جس کا دروازہ اپنے آپ کھل گیا۔ بریف کیس لفٹ کے اندر داخل ہوا مارلن نے بھی اس کی تقلید کی اور لفٹ کے اندر چلا گیا۔ اپنے آپ دوسرے فلور کا بٹن پش ہوا اور لفٹ ایک جھٹکا کھا کر اوپر کو چلنے لگی۔ مارلن لفٹ کے اندر کھڑا بڑے غور سے اپنے بریف کیس کو دیکھ رہا تھا جو بدستور ہوا میں معلق تھا۔

دوسرے فلور پر پہنچ کر لفٹ کا دروازہ آٹو میٹک کھل گیا اور بریف کیس سمیت مارلن بھی لفٹ سے باہر آ گیا۔ دوسرے فلور پر بھی خاموشی کا راج تھا اور یہ بھی خالی معلوم ہوتا تھا، چلتے چلتے مارلن کی نظر ایک بورڈ پر پڑی جس پر لکھا تھا۔ ''NO Noise'' مارلن کو ہوٹل میں اس قسم کی عبارت پڑھ کر بے حد حیرانی

ہوئی۔ کیونکہ جہاں تک اس کا خیال تھا تو یہ عبارت عموماً لائبریریز میں استعمال ہوتی تھی ایسی جگہوں پر تو "NO Smoking" کا لفظ زیادہ عام تھا مگر یہاں تو سلسلہ ہی کچھ الٹ تھا۔ خیر مارلن نے زیادہ نہ سوچا اور چلتا رہا چلتے چلتے بریف کیس اور مارلن راہ داری میں آئے اور روم نمبر 89 کے سامنے آ کر رک گئے۔ بھورے رنگ کے دروازے پر 89 نمبر کی پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ مارلن کے ہاتھ سے چابی اپنے آپ اڑتی ہوئی کی ہول میں پیوست ہوگئی اور دروازہ اپنے آپ اندر کو کھل گیا۔

مارلن کی حالت کو کوئی مخصوص لفظ نہیں دیا جا سکتا تھا یہ سب دیکھ کر وہ حیران تھا...... الجھن میں تھا...... بھروسہ نہیں کر پا رہا تھا یا پھر سمجھ نہیں پا رہا تھا...... ان میں سے الفاظ اس کی صحیح کیفیت بیان نہیں کر سکتے تھے وہ عجیب سی کشمکش میں مبتلا تھا۔

بریف کیس ہوا میں اڑتا ہوا اندر داخل ہو گیا۔ مارلن بھی اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔ کمرہ بہت خوبصورت اور جدید طرز کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ کمرے کے فرش پر نیلے رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا اور کمرے کے عین وسط میں بہت بڑا بیڈ موجود تھا جس کے دونوں طرف سائیڈ ٹیبلز پڑے تھے۔ اور ان پر ٹیبل لیمپ نہایت عمدگی کے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کے اٹیچ واش روم کے ساتھ لکڑی کا بہت بڑا ڈریسنگ ٹیبل بھی موجود تھا۔ کمرے کے چاروں کونوں میں بڑے بڑے گلدان کھڑے تھے جن کے اندر سفید رنگ کے آرٹیفیشل پھول بڑی خوبصورتی سے سجائے گئے تھے۔ ایک بڑی سی ایل سی ڈی بھی دیوار پر نصب تھی جس کے ساتھ ہی گرمیوں کے لئے ائیر کنڈیشنڈ اور سردیوں کے لئے ہیٹر بھی موجود تھا۔

مارلن کو کمرہ بہت پسند آیا اس نے اپنے بریف کیس کی طرف دیکھا جو کہ اب ایک طرف بے جان کھڑا تھا۔ مارلن نے کی ہول میں سے چابی نکال کر کمرے کا دروازہ بند کیا اور فریش ہونے کے لئے واش روم بھی چلا گیا، باتھ روم نیلی ٹائلز کا بنا بہت اچھا لگ رہا تھا ضرورت کی ہر چیز اس میں موجود تھی۔ مارلن نے شاور لینے کا فیصلہ کیا اور بریف کیس میں سے کپڑے نکال کر واش روم میں چلا گیا تقریباً کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد مارلن شاور لے کر آیا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ سامنے بیڈ پر ٹرے پڑی تھی جس پر چائے کی بھاپ اڑاتی پیالی کے ساتھ گرما گرم کھانا بھی موجود تھا۔ مارلن نے حیرت سے دروازے کی جانب دیکھا جو ہنوز اسی طرح بند تھا جس طرح مارلن چھوڑ کر گیا تھا۔

مارلن نے سوچا یہاں ہر چیز آٹومیٹک ہے تو ہوٹل کے کنٹرولز نے دروازہ بھی اپنے آپ کھول کر یہ کھانا پہنچا دیا ہوگا اس میں اتنا حیران ہونے والی کون سی بات ہے زیادہ نہ سوچتے ہوئے۔

مارلن تولیہ سے اپنے بال اور بدن کو خشک کرنے لگا اس کی حیرت ختم ہو چکی تھی مگر جو بات اسے پسند نہیں آئی تھی وہ یہ تھی کہ یہاں کسی قسم کی پرائیویسی نہیں تھی۔

ہوٹل کا عملہ ہر پل اپنے گاہکوں پر نظر رکھے ہوئے تھا جو اس کھانے کی وجہ سے ثابت ہو گیا تھا اور یہ اخلاقی طور پر ایک غلط حرکت تھی۔ "کوئی بھی شخص اپنے کمرے میں کسی بھی حالت میں ہو سکتا ہے۔" یہ سب سوچتے ہوئے مارلن خود کو بے سکون محسوس کرنے لگا۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ پورے کمرے میں ڈالی مگر اسے خفیہ کیمرے کہیں نظر نہیں آئے۔

مارلن نے نائٹ ڈریس پہن کر ہیٹر آن کیا اور کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

ہوٹل کیلی فورنیا کی سروس نے مارلن کو بالکل بھی اس قدر متاثر نہیں کیا تھا جس قدر اس کے دوست اور باقی لوگ تعریفوں کے پل باندھتے تھے ان کے منہ سے ہوٹل کیلی فورنیا کی باتیں سن سن کر اس کا تجسس اسے یہاں کھینچ تو لایا تھا مگر اب اس کا تجسس جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا۔ اسے یہ سب ایک دم فضول لگ رہا تھا۔

مارلن پرانے خیالات کا آدمی تھا اسے اس طرح کی جدید ٹیکنالوجی ایک آنکھ نہیں بھاتی تھیں۔ کھانا بہت

مزیدار تھا مارلن نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اس نے خالی برتنوں کو ایک طرف رکھ کر بیٹر بند کیا اور کمرے کی لائٹیں آف کر کے سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تھکان کی وجہ سے پلک جھپکتے ہی مارلن میٹھی نیند کے مزے لینے لگا۔ نجانے وہ کتنی دیر سویا ہوگا کہ۔

رات کے کسی پہر مارلن کی آنکھ کھل گئی کچھ دیر تو وہ یونہی لیٹا دوبارہ سونے کی کوشش کرتا رہا مگر نیند اب اس کی آنکھوں سے روٹھ چکی تھی، مارلن کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کی آنکھ کیوں کھلی کیونکہ جتنا وہ تھکا ہوا تھا اسے مدنظر رکھتے ہوئے تو اسے گہری نیند میں ہونا چاہئے تھا۔

کروٹیں بدل بدل کر جب مارلن تنگ آ گیا تو وہ بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور وال کلاک کی جانب نظریں اٹھائیں جو آدھی رات کے تین بجا رہی تھی، گہری خاموشی میں گھڑی کی ٹک ٹک سر پر ہتھوڑے برساتی معلوم ہو رہی تھی، مارلن خالی الذہن ٹک ٹکی لگائے گھڑی کو گھور رہا تھا جب ہی باہر سے اسے کوئی آہٹ سنائی دی۔

مارلن نے بے اختیار دروازے کی طرف دیکھا دروازے کے نیچے کسی کا سایہ پڑ رہا تھا مارلن بیڈ سے اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا دروازے تک آیا۔

باہر سے مسلسل ہلکی پھلکی آوازیں آ رہی تھیں۔ مارلن دروازے سے کان لگا کر باہر سے آنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ آوازیں اب کچھ صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ دو لوگ محو گفتگو تھے ایک نسوانی آواز تھی اور دوسری مردانہ" شاید ہوٹل میں کوئی جوڑا آیا ہے۔" مارلن نے سوچ کر آہستگی سے دروازے کی کنڈی کھولی اور ہلکا سا دروازہ کھول کر ایک آنکھ کے ذریعے باہر جھانکا، باہر واقعی ایک لڑکی اور ایک لڑکا اپنے کمرے کے سامنے بانہوں میں بانہیں ڈال کھڑے باتوں میں مشغول تھے۔ ان کا کمرہ مارلن کے سامنے والے کمرے سے دو تین کمرے چھوڑ کر تھا ان کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر سے مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں شاید ان کا سامان آٹو میٹکلی ترتیب سے رکھا جا رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں کمرے سے آوازیں آنا بند ہو گئیں اور دونوں لڑکا لڑکی ہنستے مسکراتے کمرے میں چلے گئے اور کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ مارلن بھی اپنے کمرے کا دروازہ بند ہی کرنے جا رہا تھا کہ۔

اچانک ایک قدآور پینٹ کوٹ میں ملبوس کالے بالوں والا لڑکا ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھامے مارلن کے کمرے کے سامنے سے گزرا اس کی پشت مارلن کی طرف تھی جس وجہ سے مارلن اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا وہ لڑکا چلتا ہوا اس جوڑے کے کمرے کے باہر آیا اور کمرے کے دروازے کے اندر سے بغیر کسی رکاوٹ کے اندر داخل ہو گیا۔ یہ روح فرسا منظر دیکھ کر مارلن کی آنکھیں دہشت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، وہ دروازہ جیسے اس لڑکے کی راہ میں حائل ہی نہیں تھا جبھی تو وہ ٹرے سمیت بہ آسانی اندر داخل ہو گیا تھا۔

مارلن نے فوراً سے پیشتر بنا آواز پیدا کئے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی اور دو تین قدم پیچھے ہٹ کر ہراساں نگاہوں سے دروازے کو دیکھنے لگا اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ لڑکا اس کا دروازہ بھی پار کر کے آ جائے گا مارلن نے حیرت وخوف سے اپنے گال پر چٹکی بھری یہ جاننے کے لئے کہ کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا...... لیکن نہیں...... اس نے جو دیکھا تھا حقیقت میں دیکھا تھا۔

مارلن کا خوف مزید بڑھ گیا وہ بجلی کی سی تیزی سے دوڑتا ہوا اپنے بیڈ پر آیا اور اپنے اوپر لحاف اوڑھ کر اس میں خود کو اچھی طرح چھپا لیا۔ اس کے پورے بدن پر لرزہ طاری تھا وہ عمر کے اس حصے میں تھا جس میں عموماً لوگوں کے دل کمزور ہوتے ہیں مگر مارلن مضبوط اعصاب کا مالک ثابت ہوا تھا۔

ہوٹل کیلی فورنیا کا راز بے نقاب ہو چکا تھا۔ ہوٹل آتے آتے اور یہاں پہنچنے کے بعد بھی مارلن کو مختلف سوچوں نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اور اب اس کے ہر سوال کا جواب اس کو مل چکا تھا۔ سائنس جیسے جدید دور میں بھی ان تمام چیزوں کا اپنے آپ کام کرنا جسے انسانی سوچ قبول نہیں کرتی آج بھی ممکن نہیں یہی سب

مارلن کا ذہن بھی تسلیم کرنے کو تیار نہ تھا۔
ہوٹل کیلی فورنیا کوئی آٹومیٹک ہوٹل نہیں بلکہ جن بھوتوں کا بنایا ایک آسیب زدہ ہوٹل تھا۔
جن بھوتوں کے متعلق مارلن نے بہت کچھ سن رکھا تھا مگر ان کی دنیا میں موجودگی کا یقین اسے آج ہو گیا تھا۔
مارلن اس دن کو کوسنے لگا جس دن ہوٹل کیلی فورنیا دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں جاگی تھی۔ وہ دل ہی دل میں اپنے دوستوں اور دوسرے لوگوں کو برا بھلا کہنے لگا جو بڑے شوق سے ہوٹل کیلی فورنیا کی تعریفیں کرتے تھے۔
تھوڑی بہت نیند جو مارلن کو آئی تھی وہ بھی یہ سوچ کر اڑ گئی تھی کہ وہ محفوظ جگہ نہیں بلکہ جنات اور بھوتوں وغیرہ کے قبضے میں ہے جو کسی بھی وقت اس کی جان لے سکتے ہیں۔
مارلن کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا اسے کچھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے بھاگ جائے یہاں سے مگر کیسے ؟ اس سے آگے مارلن کا دماغ ریڈ سگنل دے دیتا۔
ایک عجیب سی کشمکش و پیچ میں وہ مبتلا تھا جس سے نکلنا مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آ رہا تھا۔ مارلن کا دماغ یہ سوچ سوچ کر پھٹا جا رہا تھا کہ وہ لڑکا وہ جن اسے ہی کیوں نظر آیا؟ کیا اس جوڑے کو بھی وہ لڑکا دروازے سے اندر داخل ہوتا ہوا دکھائی دیا ہوگا؟ ''نہیں...... '' مارلن نے خود ہی اپنی سوچ کی نفی کر دی کیونکہ اگر وہ لڑکا اس جوڑے کو دکھائی دیا ہوتا تو ممکن ہے لڑکا نہ سہی مگر وہ لڑکی ضرور چیخ اٹھتی اور یہاں سے نکلنے کے لئے خوب واویلا کرتی مگر ایسا کچھ سننے یا دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔
ہوٹل میں بدستور خاموشی کا راج تھا یعنی وہ لڑکا اس جوڑے کو دکھائی نہیں دیا صرف انہیں ہوا میں معلق وہ کھانے کی ٹرے دکھائی دے گئی، مارلن سوچتا رہا مگر اپنے اس سوال کا جواب وہ کسی بھی طرح حاصل نہ کر سکا کہ وہ لڑکا اسے ہی کیوں دکھائی دیا؟ جس طرح ہوٹل میں آتے ہوئے اسے سب آٹومیٹک نظر آ رہا تھا تو انہیں سب کو مد نظر رکھتے ہوئے اسے بھی صرف کھانے کی ٹرے دکھائی دینی چاہئے تھی مگر اسے تو ٹرے کو سنبھالنے والا بھی نظر آیا تھا جس وجہ سے اس پر روح فرسا راز کا انکشاف ہوا تھا۔
''کیوں؟ آخر کیوں اسے ہی وہ جن زادہ نظر کیوں آیا؟''
بہت کوشش کے باوجود بھی مارلن اس سوال کا جواب حاصل نہ کر سکا۔
''رات کا نصف پہر جب سب انسان نیند کی وادیوں میں چلے جاتے ہیں تب ایسی مخلوقات جاگ اٹھتی ہیں اور دن کی روشنی میں جب انسان جاگ جاتا ہے تو ایسی مخلوقات سو جاتی ہیں یا پھر کہیں روپوش ہو جاتی ہیں۔ شاید اسی لئے وہ جن زادہ رات کے اس پہر مجھے نظر آیا؟''
مارلن نے سوچا مگر یہ بھی کوئی تسلی بخش جواب نہ تھا۔
مارلن سوچتا رہا مگر اس کا ذہن ماؤف ہوتا جا رہا تھا اس نے یہ سوچ کر اس بارے میں زیادہ نہ سوچا کہ ممکن ہے وہ لڑکا جن زادہ نہ جانتا ہوگا کہ کسی نے اسے دیوار کے اندر سے جاتے ہوئے دیکھ لیا ہے کیونکہ وہ اپنی ہی دھن میں ناک کی سیدھ میں جا رہا تھا اور اس کا مجھے نظر آ جانا اتفاق سے بڑھ کر اور کچھ نہیں تھا اگر اسے اس بات کا علم ہوتا تو وہ ابھی آ کر اس کا گلا گھونٹ دیتا، مارلن نے ایسا سوچ تو لیا مگر پھر بھی اس کی تسلی نہ ہو سکی یہی سوچ سوچ کر اس کی جان نکلتی جا رہی تھی کہ وہ بھوتوں اور جنات سے بھری بلکہ یوں کہا جائے تو مناسب ہوگا کہ ان کے علاقے میں اکیلا آدم زاد ہے۔ کیا پتہ کون کہاں سے اسے دیکھ رہا ہو؟ کیا پتہ اس کے آس پاس ہی کوئی ہو؟ نجانے کب کیا کر دے؟ اسی طرح کے دیگر سوالات نے مارلن کا سکون غارت کر کے رکھ دیا تھا اس کی تھکان اس کی نیند گویا ختم ہو گئی تھی۔ یہی سوچ سوچ کر وہ دہشت زدہ ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا بریف کیس ہوا میں معلق نہیں تھا بلکہ ایک جن زاد نے پہلے فلور سے دوسرے فلور تک اس کے ساتھ سفر کیا تھا۔
مارلن کو بے چینی سے صبح کا انتظار تھا، وہ یہاں

صرف ایک رات گزارنے کے لئے آیا تھا اس لئے وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اور پلٹ کر یہاں آنا تو درکنار یہاں کے بارے میں خیال بھی نہ کرنے کا خود سے عہد کر چکا تھا، مارلن کا بدن بدستور خوف سے کانپ رہا تھا اور ذہن مختلف سوچوں کی زد میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر ہر وہ شخص جو یہاں رہ کر گیا ہے، اس جن زادے کا دیوار کے اندر سے گزر جانے والا منظر دیکھ لیتا تو یقیناً وہ ہوٹل کیلی فورنیا کی تعریفیں نہ کرتا، نہ ہی کبھی کسی کو یہاں آنے کا مشورہ دیتا۔

مارلن خود سے عہد کر چکا تھا کہ وہ اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کرے گا کیونکہ امریکہ کے علاوہ دیگر ملکوں کی بھی ایک بڑی تعداد ہوٹل کیلی فورنیا کی گرویدہ تھی، ایسے میں اس اکیلے کی کون سنے گا۔ مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ ہوٹل کیلی فورنیا کی تعریف کرے گا بلکہ وہ نہ صرف اس کو ناپسندیدہ قرار دے گا اور یہاں آنے سے ان سب کو روکنے کی کوشش کرے گا جو اس سے ہوٹل کیلی فورنیا میں رات گزارنے کے تجربے کے بارے میں پوچھیں گے یا پھر وہ وہاں جانے کی خواہش کا اظہار کریں گے۔

اصل حقیقت وہ ہرگز نہیں بتائے گا بس اتنا کہہ دے گا کہ اسے جدید ٹیکنالوجی پسند نہیں آئی اور نہ ہی کبھی وہ اس طرح کا تجربہ دوبارہ کرنا پسند کرے گا لہٰذا میرا مشورہ تم سب کو یہی ہے کہ آج کے سائنسی دور میں بھی عام ہوٹلوں کا انتخاب کرو تو بہتر ہے۔

مارلن کی سمجھ میں اب ساری بات آ گئی تھی کہ کیوں ہوٹل کیلی فورنیا کی روشنیاں مدھم تھیں کیونکہ یہ تمام جن زادے اندھیرے اور ویرانوں میں رہنے کے عادی ہوتے ہیں، اس لئے سورج کی روشنی یا پھر کسی بھی طرح کی تیز روشنی یہ سب برداشت نہیں کر سکتے جس طرح ایک آدم زاد اندھیرا اور ویرانہ برداشت نہیں کر سکتا۔

"NO Noise" کی عبارت بھی اب مارلن کی سمجھ میں آ گئی تھی جہاں آدم زاد سناٹا اور خاموشی برداشت نہیں کر سکتا وہیں یہ آتش زاد شور شرابا برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی لئے بھی ہوٹل کیلی فورنیا سیاسی لوگوں اور نئے نئے شادی شدہ جوڑوں کی پہلی ترجیح تھا کیونکہ سیاسی لوگوں کو اپنے دفتری کام کے لئے اور شادی شدہ جوڑوں کو ہنی مون منانے کے لئے ایک پرسکون ماحول میسر ہوتا تھا جو انہیں صرف ہوٹل کیلی فورنیا کی ہی صورت میں مل سکتا تھا۔

مارلن مسلسل سوچتا رہا مگر پھر بھی یہ بات وہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ یہ سب جنات ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیا وہ سب نقصان پہنچانا چاہتے ہیں؟ نہیں اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اب تک جتنے لوگ یہاں سے قلبی خوشی رہ کر گئے ہیں زندہ سلامت واپس نہ جاتے، یہ سوچ آتے ہی مارلن نے اپنی ہی سوچ کی نفی کر دی۔ تو پھر ان کا کیا مقصد ہے؟ مارلن اپنے ذہن پر زور دیتا رہا مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

کیا یہ سب ہم سے دوستی کرنا چاہتے ہیں؟ کیا ہمارے ساتھ مل جل کر رہنا چاہتے ہیں؟ اس بھری دنیا میں ہماری خدمت کر کے اپنے لئے تھوڑی سی جگہ چاہتے ہیں؟ کیا پتہ ہمارا بھروسہ جیت کر ہمیں دھوکہ ہی دینا چاہتے ہوں؟ مارلن سوچتا رہا مگر کوئی بھی تسلی بخش جواب حاصل نہ کر سکا۔ مارلن بدستور لحاف کے اندر منہ چھپائے سوچے جا رہا تھا کہ جتنے بھی لوگ یہاں رہ کر گئے ہیں کیا وہ اس بارے میں جانتے ہوں گے جس کا انکشاف اس پر ہوا ہے؟ ممکن ہے نہیں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو کوئی نہ تعریف کرتا نہ ہی کسی آدم زاد کو یہاں آنے کا مشورہ دیتا۔

مارلن نے ڈرڈر کر آہستہ آہستہ اپنے اوپر سے لحاف کھینچا اور ہراساں نگاہوں سے کمرے کے چاروں کونوں میں نظریں دوڑائیں سب کچھ پرسکون تھا۔ مارلن نے فوراً سے پہلے اٹھ کر کمرے کی لائٹ جلا دی، کمرے کے روشن ہوتے ہی مارلن کو کچھ ڈھارس ہوئی وہ واپس اپنے بیڈ پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا اور غور غور سے دروازے کو گھورتا رہا۔ ایک عجیب سی خواہش نے مارلن کے دل میں سر اٹھایا کہ کیوں نہ وہ باہر جا کر اس جوڑے کا دروازہ کھٹکھٹائے یہ جاننے کے لئے کہ وہ خیریت سے ہیں یا پھر مر گئے؟ کیونکہ سناٹا بدستور چاروں طرف اپنے پر پھیلائے ہوئے تھا پتے کے ہلنے کے برابر بھی آواز نہیں تھی۔

مارلن اپنے سانس لینے کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ مگر مارلن نے خود ہی اپنے دل میں آئی اس خواہش کو فضول سمجھ کر جھٹک دیا۔ باہر جانے کے نام سے ہی اس کے بدن پر کپکپی طاری ہوجاتی تھی۔ مارلن نے لائٹ جلتی رہنے دی اور دوبارہ بیڈ پر لیٹ کر اپنے اوپر لحاف اوڑھ لیا کافی دیر یونہی گزر گئی کچھ دیر بعد مارلن نے لحاف ہلکا سا آنکھوں پر سے سرکا کر گھڑی کی جانب دیکھا جو صبح کے چار بجا رہی تھی، صبح ہونے میں ابھی بھی دو گھنٹے باقی تھے مگر یہ دو گھنٹے دو صدیوں کے برابر تھے۔

مارلن سونا نہیں چاہتا تھا اسی خوف سے کہ نجانے صبح کا سورج وہ دیکھ بھی سکے گا یا نہیں مگر نیند نجانے کہاں سے اس پر بری طرح غلبہ پانے لگی تھی اس کی پلکیں جڑنے لگی تھیں، مارلن نے خود کو جگائے رکھنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہوسکا نینداس پر غلبہ پاتی پاتی آخر اس کو خوابوں کی دنیا میں پہنچانے میں کامیاب ہوگئی نجانے نیند کا سلسلہ کب تک رہا۔

مارلن کی جب آنکھ کھلی تو سیدھی سامنے لگی وال کلاک پر چلی گئی صبح کے آٹھ بج رہے تھے مارلن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ سو رہا تھا اور اب وہ زندہ ہے۔

مارلن نے حیرانی سے اپنے آپ کو دیکھا وہ بالکل صحیح سلامت تھا۔ کیا وہ خواب دیکھ رہا ہے؟ اس کا یقین کرنے کے لئے مارلن نے اپنے بازوؤں پر زور کی چٹکی لگائی ہلکی سی درد نے اس کو یقین دلایا کہ وہ خواب نہیں دیکھ رہا، مارلن کی حیرت ہنوز اپنی جگہ قائم تھی اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ سچ مچ میں زندہ ہے۔

گزشتہ رات مارلن نے نہ سونے کی بہت ناکام کوشش کی تھی مگر کامیاب نہ ہوسکا تھا لیکن اب نہ ہی وہ سو کر زندہ اٹھا تھا بلکہ صحیح سلامت بھی تھا جس پر وہ یقین نہیں کر پا رہا تھا۔

گزشتہ رات کا تمام واقعہ اسے اچھی طرح یاد تھا اس لئے اپنی جگہ اس کی حیرت ٹھیک بھی تھی اور دو چند بھی مارلن جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا اس نے جھٹ سے اپنے اوپر سے لحاف اتارا اور بریف کیس میں سے کپڑے نکال کر شاور لینے کے لئے چلا گیا چند منٹ بعد جب وہ شاور لے کر باہر آیا تو اس کے قدم وہیں منجمد ہوگئے اور آنکھیں حیرت وخوف سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ سامنے مارلن کے بیڈ پر ناشتے کی ٹرے پڑی تھی جس پر گرم گرم انڈہ سلائس اور چائے کا کپ موجود تھا ناشتے کے پہلو میں سرخ گلابوں کے پھولوں کا گلدستہ بھی پڑا تھا۔ جس کے ساتھ ایک خط بھی موجود تھا۔

مارلن نے حیرت وخوف سے پورے کمرے میں یوں نگاہ دوڑائی گویا ناشتہ دے کر جانے والا ادھر ہی کہیں موجود ہو۔ مگر پورا کمرہ خالی اور پرسکون تھا مارلن چلتا ہوا بیڈ پر آکر بیٹھ گیا، ناشتے اور پھولوں کے گلدستے کو نظر انداز کرکے خط اٹھالیا سفید رنگ کا کاغذ فولڈ تھا جسے کھول کر مارلن پڑھنے لگا۔

"پیارے دوست مارلن رولنڈ۔

ہم جانتے ہیں کہ پچھلی رات تم پر کس قدر اذیت بن کر گزری جس کے لئے ہم خلوص دل سے معذرت خواہ ہیں مگر ایسا کرنا ضروری تھا جی ہاں جناب! حیران نہ ہوں ہم آپ کو سب بتاتے ہیں دراصل تم اکیلے نہیں ہو جس پر یہ قیامت گزری تم سے پہلے جتنے بھی لوگ یہاں رہ کر گئے ہیں ان سب کے ساتھ بھی ہمیں مجبوراً ایسا کرنا پڑتا کہ تم سب ہماری حقیقت جان سکو کہ ہم کون ہیں اگر یقین نہ آئے تو بے شک اپنے کسی دوست سے پوچھ لینا جو ہوٹل کیلی فورنیا میں رات گزار کر گیا ہو۔

یہاں سے جانے والا اسی ڈر سے اس واقعہ کا ذکر کسی سے نہیں کرتا کہ آیا اگلا اس بات پر یقین کرے بھی کہ نہیں؟ تم پہلے نہیں ہو جسے ہم یہ خط لکھ رہے ہیں ہم ہر اس شخص کو اپنی اصلیت دکھا کر اسے خط لکھتے ہیں جو یہاں رات گزار کر جانے لگتا ہے۔ تم انسانوں کا ہم کوئی نقصان نہیں چاہتے صرف اور صرف تم آدم زادوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھا رہے ہیں تاکہ صدیوں سے چلتی اس مٹی اور آتش کی جنگ کا خاتمہ کرسکیں اور تم انسانوں کے ذہن میں بنی اپنی غلط تصویر کو بدل سکیں۔

تم انسانوں کی طرح ہم میں بھی اچھے برے جن موجود ہیں اس کا مطلب یہ نہیں کہ پورا جن قبیلہ ہی برا ہو، امید ہے کہ تم ہماری باتوں کو سمجھو گے اب یہ تم پر ہے کہ تم ہماری دوستی قبول کرتے ہو یا اس کو ٹھکراتے ہو۔ ہماری طرف سے کوئی زور زبردستی نہیں۔ فقط تمہارے دوست، ہوٹل کیلی فورنیا۔"

مارلن کے ہاتھوں سے کاغذ لرز کر زمین پر گر گیا سب کچھ دیکھ لینے اور اب یہ خط پڑھ لینے کے باوجود مارلن کو یقین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی اس نے اپنی زندگی کا ناقابل فراموش تجربہ ایک ہی رات میں دیکھ لیا تھا جس کے بعد یہ خط، اس کا یقین پختہ، اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

دفعتاً باہر سے بے شمار لوگوں کی ادھر سے ادھر چلنے پھرنے اور باتیں کرنے کی آوازیں مارلن کو سنائی دینے لگیں مارلن نے چونک کر دروازے کی جانب دیکھا اور چلتا ہوا دروازے تک آیا اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو یہ دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں کہ لوگوں کی بڑی تعداد ہوٹل کیلی فورنیا میں ٹھہرنے کے لئے آئی تھی۔ تمام لوگ خوشی سے ادھر سے ادھر گھومتے پھر رہے تھے ان کا سامان ہوا میں اپنے آپ کمروں میں ترتیب سے رکھا جا رہا تھا کافی گہما گہمی تھی۔ گزشتہ رات ہوٹل میں چھائی وحشت زدہ خاموشی اس وقت اس کی نفی کر رہی تھی، اپنے جیسے لوگوں کو دیکھ کر مارلن کے دل کو صد درجہ تسلی ہوئی وہ ابھی اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا سب کو دیکھ ہی رہا تھا جب ہی اس کی نظر اس جوڑے پر پڑی جو گزشتہ رات ہی ہوٹل کیلی فورنیا میں آیا تھا، پچھلی رات کی طرح اب بھی ان دونوں کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔

مارلن کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ "شاید یہ لوگ یہاں دیر تک ٹھہرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یہاں سے جانے سے ایک رات پہلے ان پر بھی مجھ جیسی قیامت گزری ہوگی۔" مارلن نے سوچا اور دروازہ بند کر کے بیڈ پر براجمان ہو گیا اور ناشتہ کرنے لگا اس نے ناشتے کے دوران بہت کچھ سوچ لیا تھا ہر شخص کو ہنستا مسکراتا دیکھ کر اور یہاں سے صحیح سلامت جاتے دیکھ کر مارلن بھی خوش اور مطمئن ہو چکا تھا کیونکہ وہ خود بھی ہوٹل کیلی فورنیا سے صحیح سلامت واپس جا رہا تھا۔

مارلن بھی اب باقی لوگوں کی طرح اس ہوٹل کیلی فورنیا کا گرویدہ ہو گیا تھا جو نہ صرف لوگوں سے ہوٹل کیلی فورنیا کی تعریف کرے گا بلکہ انہیں یہاں آنے کا مشورہ بھی دے گا مارلن ناشتہ ختم کر چکا تھا۔ اس نے اپنا بریف کیس اور پھولوں کا گلدستہ سنبھالا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

وہ چلتا ہوا لفٹ تک آیا جس کے ذریعے وہ نچلے فلور پر آ گیا۔ لوگوں کی بڑی تعداد ہوٹل کے داخلی دروازے سے آ جا رہی تھی مارلن کے لبوں پر مسکراہٹ رقصاں تھی وہ چلتا ہوا ایک کاؤنٹر تک آیا تقریباً سب ہی کاؤنٹرز پر لوگوں کی لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ مارلن بھی ان میں شامل ہو گیا اور اپنی باری آنے پر مارلن نے چابی واپس کاؤنٹر پر رکھ دی جس کے بدلے اس کے سامنے نجانے کہاں سے دوبارہ سفید رنگ کا ایک کاغذ نمودار ہوا، مارلن کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی اور اس نے وہ کاغذ اٹھا لیا اس کا رخ باہر جانے والے دروازے کی جانب تھا وہ ابھی صدر دروازہ عبور کرنے ہی والا تھا کہ لاؤڈ اسپیکر سے ابھرتی نسوانی آواز مارلن کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہوٹل کیلی فورنیا کی سروس استعمال کرنے کا بہت بہت شکریہ سر۔" اس کے ساتھ ہی مارلن ہوٹل کیلی فورنیا سے باہر آ گیا۔ سورج کی چھن چھن کرتی کرنیں زمین پر پڑ رہی تھیں خاصا خوشگوار دن تھا۔ مارلن ہوٹل کی سیڑھیاں اترتے ہوئے سفید کاغذ پڑھنے لگا جس میں کچھ یوں درج تھا۔

"ہماری دوستی قبول کرنے کا بہت شکریہ ہمارے دوست۔ امید ہے تمہیں ہماری مہمان نوازی پسند آئی ہوگی۔ ہمیں اس دن کا شدت سے انتظار ہے جب تم ادھر کا دوبارہ رخ کرو گے، ہمیں تمہاری خدمت کر کے خوشی ہوگی۔ اپنا خیال رکھنا۔ ہوٹل کیلی فورنیا۔" مارلن کے لبوں پر چھائی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 126

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب رولوکا اپنے آبائی گاؤں میں تھا، روحانیت میں کمال حاصل کرچکا تھا اور اپنے استاد کی ہدایت کے مطابق پریشان حال لوگوں کے مسائل حل کردیا کرتا تھا، ایک روز رولوکا اپنے آستانے میں بیٹھا تھا اور چند لوگ اس کے سامنے موجود تھے کہ اچانک ایک جوان عورت آئی اور رولوکا کے سامنے بیٹھتے ہی زاروقطار رونے لگی، رولوکا نے جلدی سے ٹھنڈا پانی منگایا اور عورت کو پلادیا، پانی پینے کے بعد عورت کے حواس بحال ہوئے تو رولوکا کے پوچھنے پر عورت گویا ہوئی۔ ”محترم وچ ڈاکٹر میرا نام لوری ہے اور اب میں مسز نارمن ہوں اور پھر اس عورت نے اپنی پوری روداد سنادی، پھر گویا ہوئی۔ محترم وچ ڈاکٹر..... میں نے اپنی پوری روداد سنا ڈالی مگر اب آئے دن جلنے کی روح میرے خواب یا پھر جاگنے پر جب میں تنہا ہوتی ہوں تو میرے پاس آتی ہے اور مجھے طرح طرح کی باتوں سے پریشان کرتی ہے، آپ خود ہی اندازہ کریں کہ ایک روح جب آئے دن کسی زندہ آدمی کے پاس آکر اپنی باتیں کرے تو وہ زندہ شخص کس اذیت سے دوچار ہوسکتا ہے۔ پلیز! آپ جلنے کی روح سے میرا پیچھا چھڑادیں، میں تاحیات آپ کو دعائیں دیتی رہوں گی، آپ کو خداوند کا واسطہ پلیز! میری مدد کریں تاکہ میں سکھ کا سانس لے سکوں۔“ اور پھر مسز نارمن خاموش ہوگئی۔ شام کا اندھیرا پھیلتے ہی رولوکا نے جلنے کی روح کو حاضر کیا اور اس سے دریافت کیا کہ تم نے مسز نارمن کو کیوں پریشان کررکھا ہے تو جلنے کی روح بولی۔ ”گریٹ وچ ڈاکٹر۔ دراصل مسز نارمن مجھے اچھی لگتی ہے اور میں مرکر بھی اسے چاہتی ہوں۔ خیر آپ کی مداخلت سے میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اسے بہت دور چلی جاؤں گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے کہ میں کبھی بھی اس کے قریب نہیں آؤں گی۔ خیر رولوکا نے جلنے کی روح سے مسز نارمن کا پیچھا چھڑادیا۔ رولوکا کی بات مان کر جلنے کی روح نے آئندہ مسز نارمن کو تنگ کرنے یا اس کے خواب میں آنے سے بھی انکار کردیا، مسز نارمن خوشی سے پھولے نہ سمارہی تھی۔ مسز نارمن نے رولوکا کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور تاحیات دعائیں دینے کا وعدہ کرکے چلی گئی۔

(اب آگے پڑھیں)

رولوکا روحانیت میں کمال حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی قصبے میں آکر ضرورت مندوں کے مسائل حل کرنے لگا، استاد نے سختی سے تاکید کردی تھی کہ کسی بھی ضرورت مند سے ایک پیسہ بھی نہیں لینا اور تمہاری ضرورتوں کے لئے اوپر والا تمہیں کہاں سے روزی دے گا یہ تمہیں پتہ بھی نہیں چلے گا اور پھر رولوکا نے استاد محترم کی بات گرہ میں باندھ لی۔

ایک روز استاد نے فرمایا۔ ”بیٹا اب تم میری نظر میں وچ ڈاکٹر بن چکے ہو۔“

افریقہ میں ریت رواج صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ جو بھی روحانیت میں کمال حاصل کرلیتا ہے یا پھر تھوڑا بہت بھی روحانیت سے روشناس ہوجاتا ہے اسے ”وچ ڈاکٹر“ کہا جاتا ہے۔

استاد نے رولوکا کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ”بیٹا تمہارے قبضے میں بے شمار نادیدہ قوتیں آگئی ہیں اور اگر تم نے مزید محنت کی تو مزید طاقتیں تمہارے زیراثر آجائیں گی، کبھی اپنی طاقت پر گھمنڈ نہ کرنا، ہمیشہ اپنے آپ کو اعلیٰ کے بجائے ادنیٰ ہی سمجھنا، اپنی طاقت

سے بڑھ کر کبھی کسی طاقتور سے نہ ٹکرانا۔

اور اگر کبھی ایسا وقت آن پڑے، تمہارے مدمقابل کوئی تم سے طاقت میں زیادہ ہو، وہ تمہاری بات کسی صورت نہ مانے تو خفیہ طور پر اپنے بڑوں سے رابطہ کرنا، تمہارے بڑے تمہاری مدد کو فوراً حاضر ہوں گے یا پھر تمہیں اپنے مدمقابل سے مدد کے لئے کوئی خاص عمل یا طریقہ اخذ کردیں گے اور ہاں ایک اور بات یاد رکھنا کبھی لالچ کو دل میں جگہ نہیں دینا۔

پھر ایک اور اہم بات جس کے لئے مرد اپنے آپ کو روک نہیں سکتا وہ ہے خوبصورت عورتوں کا دام فریب، عورتیں بڑے بڑے متقی پرہیزگار لوگوں کو راہ سے بھٹکا دیتی ہیں اور جب کوئی مرد جو کہ متقی ہی کیوں نہ ہو جب وہ عورت کے فریب میں آجاتا ہے تو اپنی عاقبت تک خراب کرلیتا ہے عورت کو کبھی نہ کھلونا بنانا اور نہ ہی کبھی کسی عورت کے ہاتھ میں کھلونا بن جانا، ان باتوں پر تم اگر قائم رہو گے تو کامیابی و شہرت تمہارے قدم چومے گی۔"

رولوکا نے استاد کی باتوں پر ہمیشہ قائم رہنے کے لئے وعدہ کیا، اور استاد کی اجازت سے اپنے قصبے میں آکر پریشان حال لوگوں کے مسئلے حل کرنے لگا۔

صبح ایک مخصوص وقت پر رولوکا اپنے آستانے پر آکر بیٹھ جاتا اور پھر ضرورت مندوں کی لائن لگ جاتی، اور پھر شام کا بھی ایک وقت مقرر تھا۔

مقررہ وقت ختم ہونے کے بعد کوئی ضرورت مند نہیں آتا بلکہ قصبے کے چند دوست آجاتے جو کہ روحانیت میں دلچسپی لیتے، وہ آستانے میں بیٹھ کر رولوکا سے روحانیت کے متعلق باتیں کرتے انہی دنوں رولوکا کے چند شاگرد بن گئے تھے اور ان کی خواہش تھی کہ رولوکا انہیں روحانیت سے روشناس کرائے۔

ایک دن ایک شاگرد نے پوچھا۔ "استاد محترم روحانی علوم حاصل کرنے کے دوران کوئی ایسا بھی واقعہ آپ کے ساتھ رونما ہوا، جس کی وجہ سے آپ ناقابل بیان حالات سے دوچار ہوئے یعنی آپ نے بہت زیادہ ڈر محسوس کیا ہو؟"

یہ سن کر رولوکا بولا۔ "عزیز ساتھیو! عمل سیکھنا حقیقت میں لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہے میرے ساتھ بے شمار دفعہ خوفناک اور ناقابل بیان واقعات رونما ہوئے۔ ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ میں حصار قائم کرکے عمل میں مصروف تھا کہ مجھے لگا کہ میں جنگل میں بیٹھا ہوں اور جب میرے ہوش بحال ہوئے تو میں خوف زدہ ہوگیا کہ میں جنگل میں کیسے پہنچ گیا کہ اتنے میں ایک شیر کے دھاڑنے کی آواز سنائی دی تو میں دہل کر رہ گیا پھر چند لمحے ہی گزرے تھے کہ وہ شیر اپنی قہر برساتی آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر آکر غرانے لگا۔

پھر چند لمحے ہی گزرے تھے کہ ایک ساتھ کوئی درجن بھر شیر قریب آگئے اور سب نے دھاڑنا شروع کردیا ان شیروں کو دیکھ کر میری گھگھی بندھ گئی میرا گلہ خشک ہونے لگا میرے جسم میں ایسا محسوس ہونے لگا کہ میرے رگوں میں خون منجمد ہوکر رہ گیا ہو۔

اور پھر ایسا ہوا کہ تمام شیر یک بیک دھاڑتے ہوئے مجھے چیر پھاڑنے کے لئے مجھ پر جھپٹ پڑے۔

میں نے ایک چیخ ماری اور اپنی جگہ اوندھے منہ پڑ گیا۔ مگر میں محفوظ تھا میرے جب حواس بحال ہوئے تو میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تمام شیر اپنی اپنی جگہ پڑے تھے اور وہ شعلوں کی لپیٹ میں تھے۔

میری چیخ اتنی بلند تھی کہ میں کیا بتاؤں پھر میں نے دیکھا کہ میرے استاد میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اور آواز سے بتایا کہ یہ سب نظروں کا دھوکہ تھا تم اپنا عمل جاری رکھو پھر میری جان میں جان آئی۔"

اتنے میں رولوکا کی نظر ایک شاگرد کے ہاتھ پر پڑی۔ شاگرد نے اپنے ہاتھ میں ایک کتاب پکڑی ہوئی تھی، اسے دیکھ کر رولوکا بولا۔ "بھئی یہ کون سی کتاب ہے؟"

شاگرد بولا۔ "استاد یہ بہت اچھی کہانی کی کتاب ہے۔"

یہ سن کر رولوکا بولا۔ "چلو ذرا مجھے بھی سناؤ کہ کیسی

کہانی ہے۔''

رولوکا کی بات سن کر شاگرد نے کتاب کھولی اور گویا ہوا۔

رائٹر لکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے آپ کو میری اس بات سے اختلاف ہو کہ دنیا میں خونخوار بھیڑیوں سے بڑھ کر بھی ایک چیز ایسی ہے جو درندگی، وحشت اور بربریت میں اپنا ثانی نہیں رکھتی لیکن اس معاملے میں آپ کو مجھ سے یقیناً اتفاق ہوگا کہ اس جاندار کا نام عورت ہے۔ عورت جو کبھی تو پھول کی پنکھڑی سے زیادہ نازک ہوتی ہے اور کبھی کبھی چٹان سے زیادہ سخت ہوجاتی ہے۔ کبھی شمع بن کر پروانوں کو جلا کر راکھ کردیتی ہے تو کبھی آسمانوں پر کڑکنے والی بجلی کی مانند جہاں گرتی ہے تو مرد کا نام ونشان تک مٹا دیتی ہے۔

اب میں آپ کی آتش شوق کو زیادہ ہوا نہیں دوں گا اور اصل داستان کی طرف آؤں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اور بہت سے دوسرے قارئین کی طرح آپ بھی یہ سب جاننے کے لئے بے قرار اور بے چین ہوں گے کہ آخر میں نے عورت کے متعلق ایسی رائے کیوں قائم کی تو میرا خیال ہے کہ پہلے وہ واقعہ میں آپ کو سناتا چلوں جس کی وجہ سے میں آج تک قانون کی نظروں سے خود کو چھپائے پھرتا ہوں۔ قانون اور معاشرے کی نگاہوں میں میری حیثیت چاہے ایک مفرور قاتل کی ہی سہی لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے کوئی گناہ نہیں کیا اور اگر کسی کو قتل بھی کیا ہے تو کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے۔ کیونکہ میری نظر میں کسی درندے کو ہلاک کردینے سے بہتوں کا بھلا تو ہوسکتا ہے ان کی اچھائی اور بہتری کا پہلو تو نکل سکتا ہے لیکن یہ ناممکن ہے کہ آپ اسے قتل کا نام دے سکیں۔ ہوسکتا ہے یہ واقعہ جان کر بھی آپ مجھے ہی مورد الزام ٹھہرائیں اور ایک قاتل ہی سمجھیں لیکن میں یہ بات آپ کے ذہن نشین کرانا چاہوں گا کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اس وقت قانون کو میری ضرورت ہے۔ مجھے قانون کی نہیں۔''

میری زندگی کی سب سے حسین رات وہ تھی جب میری ملاقات ایک کیفے ٹیریا میں انگرڈ سے ہوئی۔ انگرڈ ایک سویڈش لڑکی تھی۔ ارب پتی باپ کی اکلوتی لڑکی اور حسن وجمال میں یکتا ہونے کے علاوہ بلا کی ذہین اور پروقار بھی تھی میں ان دنوں ایک سروے کمپنی میں اچھی پوزیشن پر ملازم تھا اور کسی ضروری کام سے میڈرڈ (اسپین) گیا ہوا تھا۔ اسپین کی سرزمین مشرقی اور مغربی تہذیبوں کا بے حد حسین اور خوبصورت سنگم ہے اور آپ میں سے جو لوگ اسپین گئے ہوں گے انہیں وہاں کی فراخ دل عورتیں اور خوبرو حسیناؤں کے جھرمٹ یقیناً پسند آئے ہوں گے۔ اسپین کی دوشیزائیں زندگی سے بھرپور آگ کی لہر کی طرح ہوتی ہیں۔ یہاں میری ملاقات ازابیلا، جولیانا اور کئی اور لڑکیوں سے ہوئی لیکن میں غیر معمولی حسن سے ہی متاثر ہوا کرتا ہوں۔ میڈرڈ کے ایک کیفے ٹیریا میں جہاں میں ایک کروڑ پتی ہسپانوی تاجر کا مہمان تھا اور اس کی دعوت پر وہاں گیا تھا۔ میں نے پہلی بار انگرڈ کو دیکھا۔ اور مجھے یوں لگا جیسے وہ اگر مجھے نہ مل سکی تو میں اسپین سے زندہ بھی واپس امریکہ نہیں جاسکوں گا۔

میرے میزبان نے میری توجہ کھانے کی لمبی چوڑی میز پر سجے ہوئے سات قسم کے خوش ذائقہ بھنے ہوئے روایتی گوشت کی طرف کرائی۔ میں نے دیکھا کہ تلی ہوئی مچھلی کے خوشبودار مصالحے میں رچی ہوئی پارچوں کے علاوہ میز پر بھنے ہوئے مرغ، تیتر، مرغابی، ہرن، گائے، بکری اور بھیڑ کا گوشت بھی موجود تھا۔ اسی طرح سات قسم کے مختلف ذائقوں والے پھل اور پھر سات ملکوں سے منگوائی ہوئی بیش قیمت شرابیں جن کو کیفے ٹیریا کی حسین گلبدن دوشیزائیں میرے سامنے پیش کرنے آئیں بھی جو اس مرغن اور لذیذ کھانے کا ایک حصہ تھیں۔

میرا خیال ہے کہ اب تک میں نے اتنا لذیذ کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے ذرائع آمدنی اگر لامحدود نہیں تو اتنے بھی محدود نہیں تھے اور میرے متعلق عام تاثر یہی تھا کہ میں زمین کے کسی بھی خطے کو محض سونگھ

کر تیل کی موجودگی کا پتہ چلا لیا کرتا ہوں اور یہ کوئی معمولی صلاحیت نہیں ہوتی۔

سروے کے ضمن میں اس اضافی خوبی اور خداداد قابلیت نے مجھے ایک مختصر سے عرصے میں کہیں سے کہیں پہنچادیا تھا۔ اب صورت حال یہ تھی کہ میں ایک بہت بڑی امریکی تیل کمپنی میں چیف سروے آفیسر تھا اور میری تنخواہ کا یہ حال تھا کہ اس وقت میں میڈرڈ کے سب سے مہنگے ہوٹل یعنی میڈرڈ شرٹن میں مقیم تھا اور مجھے پانچ سوڈالر روزانہ محض تفریحی الاؤنس مل رہا تھا جبکہ مجھے میڈرڈ میں ابھی کم ازکم دو ہفتے قیام کرنا تھا اور ٹھیک دوروز بعد میری سیٹ پان امریکن کی جینوا فلائٹ کے لئے بک کرادی گئی تھی۔

نیویارک سے مجھے براہ راست میڈرڈ بھجوایا گیا تھا اور یورپ کے اس دورے کے لئے میرے لئے ایک لاکھ ڈالر کی رقم مخصوص کردی گئی تھی جبکہ یہ دورہ صرف دوماہ کے عرصے میں مکمل ہوتا تھا۔ اور یہ رقم محض مجھے تفریحی الاؤنس کے بونس کے طور پر اس لئے دی گئی تھی کیونکہ گزشتہ دوبرسوں سے میں نے کوئی چھٹی نہیں لی تھی اوراب یہ دورہ تفریح سے زیادہ تجارتی رنگ اختیار کرگیا تھا۔

مجھے میڈرڈ آئے ابھی مشکل تمام 36 گھنٹے گزرے تھے۔ گزشتہ شب میں نے ازابیلا کے فلیٹ پر گزاری تھی لیکن وہ اپنی والدہ کی بیماری کے باعث کچھ بجھی بجھی سی رہی تھی اور مجھے اس کی رفاقت میں اس کے قرب میں بھی ایک دوری اور فاصلے کا احساس باقی رہا۔ میں سمندر میں جاکر بھی تشنگی سے نجات نہیں پاسکا تھا، اور نصف شب تک کسی جانور کی طرح ازابیلا کو جھنجھوڑنے کے بعد میں نے رات کے پچھلے پہر جولیانا کے فلیٹ کی گھنٹی بجائی تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور ہسپانوی زبان میں اول فول بکتی ہوئی دروازے تک آئی۔

مجھے گھر کے دروازے پر دیکھتے ہی اس کی آنکھوں سے نیند اڑن چھو ہوگئی اور حیرت وتجسس کی تصویر بن کر دروازے کے فریم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ میں نے مسکراتے ہوئے آہستہ سے اس کے شانے تھپتھپائے اور اس کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اس کی گردن پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ وہ اس غیر متوقع اقدام کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں تھی اس نے کسمساتے ہوئے خود کو میری گرفت سے آزاد کرالیا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اندر کاریڈر کی طرف جانے لگی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے فربہ اور دلفریب کولہے بے حد ہیجان انگیز اور جنون خیز انداز میں دائیں بائیں بل رہے تھے اور ان کے تھرکنے کے ساتھ ساتھ میرا دل بھی زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

میں نے برق رفتاری سے دروازے کی چٹخنی لگائی اور کسی چیتے کی مانند اس پر جھپٹ پڑا۔ وہ ایک ٹھوس اور بے حد صحت مند لڑکی تھی لیکن اس وقت مجھ میں کوئی ایسی طاقت سمائی ہوئی تھی کہ میں خود بھی اس کا صحیح طور پر اندازہ نہیں لگا سکتا تھا میں اسے لئے ہوئے کاریڈور کے پختہ فرش پر گر پڑا اور ہم دونوں ایک دوسرے میں الجھے ہوئے شفاف اور چکنے فرش پر دور تک پھسلتے چلے گئے ملاقات کا یہ انداز بڑا عجیب وغریب تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی یا اٹھ سکتی میں نے بڑی برق رفتاری سے اسے زیر کرلیا تھا۔ اور وہ پوری طرح صورت حال کو سمجھنے کی کوشش میں بری طرح بوکھلا گئی تھی میں نے اسے بے بس کردیا تھا اور جب اس نے مجھے بعد میں پوچھا کہ آخر یہ کیا حرکت تھی تو میں نے اسے بتایا کہ دراصل میں جذبات کی یلغار کے سامنے بے بس ہوکر رہ گیا تھا اور اسی وجہ سے میں نے ایسی حرکت کی تھی! وہ مسکرائی شاید اتنی دلفریب رات میں نے پہلے کبھی نہیں گزاری تھی۔ صبح میں بہت دیر سے اٹھا لیکن میں تازہ دم تھا۔

اگلے دن بلکہ اگلی رات میں پھر ازابیلا کے فلیٹ پر جا پہنچا اس وقت وہ اپنے فلیٹ میں موجود نہیں تھی۔ میں اس کی غیر موجودگی میں اس کے بیڈروم میں بیٹھا اس کی البم کی ورق گردانی کرتا رہا۔ شاید ازابیلا اپنے کسی دوست کے ہمراہ کہیں رات گزارنے چلی گئی تھی۔ اس

کی غیر موجودگی میں اس کی ذاتی ملازمہ اولیویا میرے لئے سیاہ کافی بنا کر لائی اور مجھے آرام کرنے کی تلقین کرتی ہوئی دوسرے کمرے کی طرف بڑھی۔ میں نے بھرپور نظروں سے اولیویا کے بدن کا جائزہ لیا وہ گدرائے ہوئے بدن کی ایک سانولی سی دوشیزہ تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کے سانولے رنگ میں بے پناہ کشش تھی اور اس کا بھرا بھرا بدن بے پناہ جنسی کشش رکھتا تھا اور اس کے بالائی ہونٹ کے قریب ایک ننھا سا اور بے حد خوبصورت تل تھا جو اس قدر ہیجان خیز تھا کہ میں نے خود کو بڑی مشکلوں سے قابو میں رکھا۔ اولیویا اس وقت کچن میں تھی اور میرے لئے گوشت کے پارچے تل رہی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ ایک ٹرے میں گوشت کے پارچے لئے نمودار ہوئی اور اس نے پلیٹ میں چند ٹکڑے ڈال کر میرے سامنے رکھ دیئے۔ وہ کسی کام سے میری میز کے قریب آئی۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کھینچا لیکن وہ کسمسا کر علیحدہ ہو گئی۔

وہ اس بات سے خوف زدہ تھی کہ اگر اس کی مالکہ یعنی ازابیلا آ گئی تو کیا ہوگا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ میں ساری صورت حال کو سنبھال لوں گا لیکن وہ بہت ہراساں تھی اس نے کہا۔ ”آپ نے ابھی تک ازابیلا کا ایک ہی روپ دیکھا ہے غصے میں وہ کسی بپھری ہوئی شیرنی یا پھنکارتی ناگن سے کم نہیں ہوتی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنا لباس درست کر ہی رہی تھی کہ باہر آہٹ ہوئی اور اچانک صدر دروازے میں تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی اور چند لمحوں بعد ہی ازابیلا دروازہ کھول کر اندر آ گئی تھی اور اب اپنے بیڈروم کی طرف آ رہی تھی۔ میں نے جلدی سے اولیویا کو بیڈ کے نیچے چھپا دیا اور خود بیڈ پر لیٹ گیا۔

ازابیلا نے آگے بڑھ کر اپنے ہونٹ میری آنکھوں پر رکھ دیئے اور آہستہ سے بولی۔ ”تم کب آئے اور ہاں وہ اولیویا کہاں ہے؟ کیا تم نے کسی کام سے کہیں بھیجا ہے؟“ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

میں نے جواب دیا۔ ”اوہ۔ اولیویا۔ دراصل وہ پڑوس میں گئی ہے۔ خیر چھوڑو اسے۔ تم ایسا کرو کہ نہا کر تازہ دم ہو جاؤ پھر ہم دونوں آج رات شیرٹن میں کھانا کھائیں گے اور اوپیرا دیکھنے چلیں گے۔“

ازابیلا خوشی سے کھل اٹھی۔ وہ یوں بھی اچھے ہوٹلوں میں جانے کی شدت سے آرزومند معلوم ہوتی تھی سیدھی غسل خانے میں جا گھسی۔ اس کے وہاں سے جاتے ہی اولیویا برق رفتاری سے بیڈ کے نیچے سے نکلی اور باہر چلی گئی۔

”اولیویا۔ اولیویا۔ تم کہاں ہو؟“ ازابیلا کی آواز بیڈروم میں گونجی، شاید وہ کسی چیز کی تلاش میں پھر رہی تھی۔ ”کرسس ڈارلنگ تم کہاں چلے گئے، کہاں ہو تم؟“ پھر اس نے مجھے پکارا۔ میں نے جلدی سے چٹخنی کھولی اور تقریباً بھاگتا ہوا بیڈروم میں آیا۔ ”اوہ کچھ نہیں۔ میں ذرا کچن تک گیا تھا۔ اولیویا واپس آ گئی ہے اور کچن میں ہے۔“ میں نے اپنی سانس درست کرتے ہوئے کہا۔

میں نے دیکھا کہ ازابیلا اپنے حسین بدن کے اردگرد ایک بڑا سا گلابی تولیہ لپیٹے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اولیویا کے چہرے پر جس قسم کے جذبات اور تاثرات ابھرے تھے بالکل اسی قسم کے حجاب آلود جذبات اس وقت ازابیلا کے چہرے سے بھی عیاں تھے۔ پھر وہ غسل خانے میں چلی گئی۔ کچھ دیر بعد وہ تیار ہو چکی تھی۔ میں نے حسرت سے اولیویا کی طرف دیکھا۔ اولیویا نے ایک ہوائی بوسہ میری طرف اچھالا اور میں اور ازابیلا کار کی طرف بڑھے۔

میں اور ازابیلا شیرٹن کی حسین شام گزارنے جب ہوٹل کی لابی میں گئے تو میری نظر انگرڈ کی ہم شکل ایک لڑکی پر پڑی اسے دیکھتے ہی میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے مجھے جلد از جلد انگرڈ کو تلاش کرنا ہوگا اس سے ملنا ہوگا۔ ورنہ اس کے بغیر میں جی نہیں سکوں گا! جانے وہ مجھے کیوں اس قدر یاد آ رہی تھی اور میں اس کی یاد اور فرقت سے بے چین ہونے لگا۔ میں نے اپنے بازو کی گرفت ازابیلا کی کلائی پر سخت کر دی۔ میری انگلیاں اس کے نرم

و نازک ہاتھ میں گزری جارہی تھیں۔ وہ آہستہ سے چیخی۔ ''یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کیرس؟'' اس نے محبت سے میرے نام کی تخفیف کرتے ہوئے کہا۔

کھانے کے دوران وہ اپنے ملائم اور ریشمی پاؤں سے میز کے نیچے سے میری پنڈلی پر طلسمی انداز سے گدگدی کرتی رہی میرے اعصاب کو خاصا سکون مل رہا تھا اور میں خوش ذائقہ کھانوں کی لذت سے زیادہ اس کے لمس میں لطف محسوس کررہا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہی ہم دونوں ایک شاندار اوپیرا دیکھنے چلے گئے۔ ہسپانوی نوجوان دوشیزائیں بڑی ہیجانی انداز میں رقص کررہی تھیں۔ دف اور آرکسٹرا کی ملی جلی آوازیں نیم تاریک ماحول کو اور زیادہ رومان پرور اور جذبات انگیز بنارہی تھیں اور ازابیلا میرے سینے پر سر رکھے مجھ سے بالکل لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ برائن کی زبردست مہک اس کے خوبصورت بالوں سے آرہی تھی جو اس کے دلکش شانوں پر بکھرے ہوئے تھے پھر اس نے چہرہ اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر اس کی مخروطی صراحی دار گردن کی تل کو میں نے چوم لیا۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور اپنا بیگ سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہم دونوں اوپیرا سے واپس شرٹن میں لوٹ آئے۔

جانے کیا بات تھی ازابیلا سے دو ملاقاتوں کے بعد اور اولیویا سے نیم ملاقات کے بعد میری طبیعت میں ایک عجیب وغریب قسم کی تشنگی پیدا ہوگئی تھی اور میرا اجی بار بار انگرڈ کو ملنے کو ترس رہا تھا۔ آخر میرے دل کی تڑپ رنگ لاکر ہی اس روز سہ پہر کے وقت میں نے انگرڈ کا نام اور ٹیلی فون نمبر ایک ڈائریکٹری سے تلاش کیا۔ اس ڈائریکٹری میں اسپین کے سرکردہ افراد کے نمبر درج تھے لیکن جب میں نے ہوٹل سے انگرڈ کو فون کیا تو اس کی ذاتی ملازمہ ایرلنڈ نے مجھے بتایا کہ وہ ابھی سورہی تھی اور شام 5 بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوگی اس نے میرا نمبر لکھ لیا تھا۔ اب مجھے دو گھنٹے گزارنے دوبھر ہوگئے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وقت پر لگا کر اڑ جائے اور میں اسے دوبارہ فون کرسکوں۔ دراصل اس دن یعنی پہلے دن کیفے ٹیریا میں اس کے ملکوتی حسن سے اس قدر مرعوب ہوا کہ کوئی بات ہی نہیں کرسکا تھا اور جب وہ چلی گئی تو میں اپنے اوسان بھی کھو بیٹھا اور یہ احساس مجھے اور بھی زیادہ اذیت میں مبتلا کرگیا تھا کہ میں کھل کر اس سے اپنے دل کی بات ہی نہیں کرسکا تھا۔

ٹھیک پانچ بج کر پانچ منٹ پر جب میں واش بیسن کے پاس کھڑا برش کررہا تھا میرے کمرے کے فون کی گھنٹی بجی۔ میرے دل کی دھڑکن جیسے مدہم ہوکر ڈوبنے لگی تھی اور میری نبضیں بھی آہستہ آہستہ جیسے رک سی گئی تھیں۔

''ہیلو.... !'' دوسری جانب ایک بے حد دلکش اور حسین آواز نے میرے کانوں میں شہد ٹپکایا۔

''ہیلو۔ کون ہے؟'' میں نے دھڑکتے ہوئے دل پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''میں انگرڈ ہوں کیا یہ تم ہو کرس؟''

میں نے خوشی سے ریسیور کو چوم لیا اور بولا۔ ''آہ میری زندگی، کیا یہ تم ہی ہو یا میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین نہیں آرہا کہ یہ تم ہو! میں تمہاری حالت کو سمجھتا ہوں۔'' اس کی دلکش آواز مجھے بے خود کرنے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''تم تیار رہنا میں خود تمہیں لینے آؤں گی، وقت یاد رکھنا ٹھیک آٹھ بجے شب لیکن کیا تم واقعی مجھ سے ملنے کے لئے بے چین ہو؟''

میں نے فوراً کہا۔ ''میرے صبر کو اور نہ آزماؤ۔''

کار ایک عالی شان محل نما عمارت کے پورچ میں جاکر رک گئی اور انگرڈ مجھے ہمراہ لئے ہوئے جیسے ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی ایک بڑے سے ہال سے گزر کر سا گوانی سیڑھیاں طے کرتی ہوئی بالائی منزل کی طرف چل دی راہداری کے آخری سرے پر جاکر وہ رک گئی اور مجھے ایک کمرے میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میرے کانوں میں جیسے شائیں شائیں ہونے لگا۔ انتظار کا ایک ایک لمحہ میرے لئے قہر آلود قیامت اور صدیاں بن کر گزر رہا تھا! میں کمرے کی دیواروں پر

آویزاں بے حد عریاں تصاویر کو دیکھ رہا تھا۔ یہ قد آدم تصویریں اس قدر ہیجان انگیز اور اشتعال انگیز تھیں کہ میرے بدن کے رونگٹے فرط جذبات سے گنگنانے لگے چند لمحوں بعد اس کمرے کے دروازے پر کسی نے آہستہ سے دستک دی۔ شاید یہ دروازہ انگرڈ کی خواب گاہ میں کھلتا تھا۔ پھر انگرڈ کی آواز نے میرے کانوں میں شیرینی ٹپکائی۔ ”اب تم اندر آسکتے ہو۔“ یہ سن کر میں کمرے میں داخل ہوا اور ٹٹول کر دیوار پر لگا ہوا سوئچ آن کردیا۔ پورا کمرہ ہلکی سبز روشنی میں نہا گیا۔ وہ میرے سامنے تھی۔

میں نے نظریں اٹھائیں سبز روشنی میں نہائی ہوئی انگرڈ کا عریاں بدن مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کوئی سروقد مجسمہ تھی جسے اکائی سے تراشا گیا تھا اس کا بدن اس قدر متناسب اور گداز تھا کہ اسے نظر بھر کر دیکھنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں نے اگر زیادہ دیر تک اسے دیکھا تو میں خود اپنے جذبات کی آگ میں جل کر راکھ ہوجاؤں گا اس کا بدن کسی ستار کی مانند تنا ہوا جو مضراب کے لئے بے قرار ہو۔

میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس قدر سحر انگیز بدن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بدن میں ایک سینٹی میٹر بھی فالتو گوشت کی تہہ نہیں تھی۔ وہ مائیکل انجلو کے کسی خوبصورت تراشے ہوئے مجسمے کی مانند حسین تھی۔

مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں وینس کے زندہ مجسمے کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اس کے لبوں پر ایک طلسمی مسکراہٹ رقصاں تھیں۔

اس نے اپنے دونوں بازو وا کئے اور میں اس کے حسن کے حضور خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ وہ کسی بھوکی شیرنی کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوئی اور اس سے پہلے کہ اس کی اس حرکت یا ادا کو سمجھنے کی کوشش کرتا وہ مجھے اپنے وزن تلے دبائے قالین پر لوٹ رہی تھی اس نے اپنے تیز اور لمبے ناخنوں سے میرا چہرہ لہولہان کردیا۔ میرا لباس تار تار کردیا میں حیران تھا کہ آخر کیا ہوگیا تھا۔ اس کو وہ کسی جنگلی اور وحشی مادہ چیتے کی طرح بار بار مجھے زمین پر گرا کر مجھ پر حملے کررہی تھی اور ہر بار میں یہ محسوس کررہا تھا کہ اس کے حملوں میں شدت پیدا ہوتی جارہی تھی۔ پھر اس نے مجھے کسی بپھری ہوئی شیرنی کی مانند بھنبھوڑنا شروع کردیا میرے شانوں، رانوں ہاتھوں اور سینے کے علاوہ اس نے میری گردن پر جگہ جگہ کاٹ لیا۔ پھر اس نے میرے ہونٹ اپنے دانتوں میں دبالئے اور انہیں کاٹ ڈالا۔ درد اور تکلیف کی شدت سے میرا برا حال ہوگیا تھا خون کا تلخ اور نمکین ذائقہ مجھے اپنی زبان پر محسوس ہورہا تھا۔

وہ کسی درندے کی مانند مجھ سے کھیل رہی تھی۔ لذت وصال کا ہر تصور یہاں بے معنی ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ میرے بدن سے نکل کر بہنے والے خون کو بڑی رغبت سے کسی خون آشام چڑیل یا ڈائن کی طرح چاٹ رہی تھی۔

مجھے یقین ہوچلا تھا کہ میں اب زندہ یہاں سے نہیں نکل سکوں گا۔ میں نے غنودگی کے عالم میں دیکھا، اب میز کی دراز سے ایک بڑا سا پھل دار چاقو لے کر میری طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ہولناک شیطانی مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

میں نے تیزی سے کروٹ لی اور اچھل کر ایک فلائنگ کک اس کے سینے پر ماری تو وہ تیورا کر دور جا گری۔ میں نے چاقو اٹھایا اور دستے تک اس کے دل کے مقام پر پیوست کردیا۔ پھر میں پھرتی سے باہر نکلا اور دروازہ بند کرتا ہوا تیزی سے راہداری سے بھاگتا ہوا اس محل نما عمارت سے باہر آ گیا۔

اب میں ایک قاتل تھا۔ ایک خونی درندہ جس کی اپنی کوئی حیثیت نہیں تھی اور جو ہمہ وقت اپنی جان بچانے کے لئے ادھر سے ادھر پناہ کی تلاش میں پھر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے وہاں سے آتے ہی انگرڈ کی لاش دستیاب ہوچکی ہوگی اور اب پورے میڈرڈ کی پولیس میری تلاش میں سرگرداں ہوگی۔ میں لوہے کے پائپ کے ذریعے کسی بلی کی مانند اپنے ہوٹل کے سویٹ میں داخل ہوا اور اپنے سامان کا بیگ کمرے باندھ کر پھر اسی راستے سے نیچے اتر کر میڈرڈ کے ایک قہوہ خانے میں پناہ لی۔

اب مجھے میڈرڈ سے نکلنے کی کوئی راہ تلاش کرنا تھی اور یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے اپنی گھنی اور خوبصورت داڑھی منڈوا دی۔ اپنا امریکن پاسپورٹ پھاڑ کر ایک گٹر میں پھینک دیا اور اب میں ایک ہسپانوی گڈریئے کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ اگلی صبح میں نے ایک قریبی قصبے میں یک اسٹال پر میڈرڈ ٹائمز میں پہلے صفحے پر انگرڈ کی تصویر دیکھی۔ یہ وہ منظر تھا جسے دیکھنے کی تاب مجھ میں نہیں تھی اور میں اسے دیکھے بغیر ہی اس کے پاس سے فرار ہو گیا تھا۔

وہ قیمتی قالین پر بالکل چاروں شانے چت گری ہوئی تھی اس کی آنکھیں ہولناک انداز میں پھٹی ہوئی تھیں اور اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی تھی۔ پھل دار چاقو دستے تک اس کے سینے کے ابھاروں کے عین درمیان دل کے مقام پر دھنس گیا تھا اور اس کے قریب قالین پر خون کا ایک بڑا سا دھبہ صاف نظر آ رہا تھا۔ دوسری تصویر میں اس کی لاش چادر سے ڈھکی ہوئی تھی اور رپورٹ میں درج تھا کہ ہسپانوی پولیس ایک امریکی باشندے کی تلاش میں ہے جو ایلین میکائنے کے نام سے میڈرڈ کے شرٹن ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا اور حادثے یعنی اس قتل کی واردات کے بعد سے مفرور ہے۔

خبر میں اس بات کی بھی وضاحت کی گئی تھی کہ آخری بار انگرڈ کو کچھ لوگوں نے اسی امریکی باشندے کے ساتھ دیکھا تھا اور وہ دونوں قتل کی رات بھی اکٹھے دیکھے گئے تھے۔

خیر میں اس چرواہے کی مدد سے میڈرڈ سے فرار ہوا اور پیرس چلا آیا۔ پیرس میں میں خود کو میڈرڈ کے مقابلے میں بہت زیادہ محفوظ سمجھتا تھا۔

پیرس میں میری ملاقات مائیکل سے ہوئی۔ مائیکل ایک بہترین آرٹسٹ تھا اور وہ میرا ایک بہت اچھا دوست ثابت ہوا۔ اس نے اپنے ایک قریبی دوست سے مل کر میرا جعلی پاسپورٹ بنوا دیا اور میں راتوں رات فرانس کی سرحدوں سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ فرانس کی سرحدوں کے قریب ایک ہیلی کاپٹر سروس سے میں نے اٹلی کا رخ کیا اور پھر روم میں اپنے دوست انطونی سے کچھ رقم حاصل کی اور واپس نیویارک جانے کی بجائے الاسکا کا فضائی سفر اختیار کیا۔ اب میں ایک فرانسیسی پاسپورٹ پر سفر کر رہا تھا۔ میری امریکی شہریت ختم ہو چکی تھی اور میں یہ بھول جانے پر مجبور ہو گیا تھا کہ کبھی میں بھی نیویارک کا ایک مہذب باشندہ تھا۔

اور اس طرح میں فرانس سے فرار ہو کر الاسکا چلا آیا۔

قیمتی اور پرانی شرابیں، خوبصورت اور نوجوان عورتیں یعنی شراب اور شباب ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہیں، الاسکا میں مجھے یہ دونوں چیزیں میری مرضی کے عین مطابق دستیاب ہو رہی تھیں اور میں بڑے سکون سے اپنا وقت گزار رہا تھا یہاں میں کینیڈا اور امریکہ کی حکومتوں کی سیاسی پناہ میں تھا اور مجھے کسی قسم کا خوف دامن گیر نہیں تھا۔ ہاں اب بھی یہ ضرور تھا کہ انٹرپول (بین الاقوامی پولیس) اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے جاسوس شکاری کتوں کی طرح دنیا بھر کے ملکوں میں میری بو سونگھتے پھر رہے تھے اور انہیں ابھی تک اس بات کا یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ مجھے تلاش کر ہی لیں گے۔ میں نے اپنا حلیہ اب مکمل طور پر تبدیل کر لیا تھا اور اب میں ایک فرانسیسی باشندے کے روپ میں تھا جو اپنی گھنی داڑھی اور شکار کھیلنے کی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے اس علاقے میں بہت مقبول ہو گیا تھا۔

الاسکا میں، میں نے ایک بہت بڑی کمپنی میں جو برف صاف کرنے کا کام کرتی تھی بلڈوزر اور ہیوی مشینری چلانے کے لئے ملازمت کر لی اور اس جگہ مجھے ایک ہزار ڈالر ہفتے کی آمدنی ہونے لگی۔ میں نے یہاں ایک چھوٹا سا کاٹیج خرید لیا تھا اور تھوڑے ہی عرصہ میں یہاں کے لوگوں میں اپنے بہترین نشانے اور زبردست طاقت کی وجہ سے مشہور ہو گیا تھا۔ میں شکار کا بے حد شوقین ہو گیا تھا اور جب بھی مجھے موقع ملتا تھا میں اپنے شوق کی تکمیل کے لئے شکار کھیلنے نکل کھڑا ہوتا۔

مجھے الاسکا کے موٹے اور تندرست بھیڑیوں کو ہلاک کر کے بے حد خوشی حاصل ہوتی تھی۔ انہیں

دیکھ کر مجھے خواہ مخواہ انگرڈ کی یاد بری طرح ستانے لگی تھی۔ آہ وہ بھی کیا رات تھی جب اس نے مجھے نڈھال کردیا تھا اور اس قدر تھکا دیا تھا کہ آخر میں اسے ہلاک کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ بظاہر تو میں اس کے جذبات کے آتش فشاں کو سمجھنے میں ناکام رہا تھا لیکن یہ حقیقت تھی کہ اگر میں اسے اپنی مدافعت میں ہلاک نہ کرتا تو شاید میں زندہ نہ رہتا۔

خیر جو ہوا سو ہوا اب اس کا تذکرہ بے مقصد ہے، اب میں نوم کے علاقے میں اپنے چھوٹے سے کاٹیج میں رہتا تھا اور کچھ عرصہ ہماری مشینوں والی کمپنی میں کام کرنے کے بعد میں نے بہت سے شکاری کتوں اور برفانی گاڑیوں کو کھینچنے والے کتوں کا ایک فارم کھول لیا تھا۔ اب میں زیادہ وقت شکار کھیلنے اور معدنی ذخائر تلاش کرنے میں صرف کرتا تھا اور الاسکا میں مجھے اپنی برق رفتاری اور زبردست ذہانت کی وجہ سے کرسس کی بجائے اب وہاں کے لوگ مجھے ''ٹائیگر'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

میں اب جیسے خطروں سے کھیلنے کا عادی ہوگیا تھا اور ہر مشکل کام کرنے میں مجھے بے حد لطف آتا تھا۔ واقعی زندگی رسک کے بغیر کس قدر بے رس اور بے کیف ہوکر رہ جاتی ہے۔ ایک شام میں اپنے فارم کے پاس کاٹیج کے برآمدے میں بیٹھا تازہ امپورٹ کی گئی وہسکی کی چسکیاں لے رہا تھا کہ میرے قریب بیٹھے ہوئے روسی نسل کے السیشن ٹونی نے آہستہ سے غرا کر مجھے فارم کے باہر کسی کی موجودگی کا احساس دلایا۔

میں نے آہستہ سے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا اور فارم کے صدر دروازے تک گیا۔ میں نے دیکھا دروازے کے قریب ایک بے حد خوبصورت اور صحت مند عورت کھڑی تھی اس کی عمر تقریباً بائیس سال تھی اور وہ شکل وصورت سے کسی بہت کھاتے پیتے گھرانے کی فرد معلوم ہورہی تھی۔ اس کے کانوں میں ہیروں کے قیمتی آویزے تھے اور اس کی کلائی پر ایک بیش قیمت گھڑی بھی بندھی ہوئی تھی۔ اس کا لباس گہرا نیلا نفاست سے سلا ہوا اور بے داغ تھا اس کی جلد ریشم کی طرح ملائم، ہونٹ گلاب کے گہرے سرخ خون کے رنگ کی طرح لال تھے اور اس کے گلے میں ایک بے حد بیش قیمت ہیروں کا لاکٹ جگمگا رہا تھا۔ شام کی دھندلی روشنی میں اس کا چہرہ کسی آگ کی طرح روشن تھا۔

یہ عورت واقعی شاداب اور رسیلے بدن کی مالک تھی اور ایک ہی نظر میں، میں نے تاڑ لیا تھا کہ وہ بڑی مردمار اور دھڑلے دار عورت تھی؛ اس کا نام جین تھا۔

جین منگٹو۔ منگٹو اس کے شوہر کا نام تھا جو گزشتہ ایک ہفتے سے لاپتہ تھا اس کے بال گہرے سیاہ تھے اور اس کی نیلی آنکھیں مجھے۔ جی ہاں انگرڈ کی یاد دلارہی تھیں میں نے اس کے دلکش اور حسین خدوخال کو اور اس کے پرکشش بدن کے جنون خیز نشیب وفراز کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنا شروع کیا تو وہ کچھ جھینپ سی گئی اور اپنے گاؤن کے اوپری حصے کا بٹن بند کرکے کوٹ کے کالر رخساروں تک اوپر کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا تم ٹائیگر ہو؟''

میں نے ایک قہقہہ لگایا اور جواب دیا۔ ''مجھے کرسس بھی کہتے ہیں لیکن تمہاری زبان سے بھی ٹائیگر کا لفظ سن کر مجھے بہت اچھا لگا ہے کیا میں تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہوں؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔ جانے کیوں نوجوان اور نوخیز دوشیزاؤں کو دیکھتے ہی میرے دل میں محبت کے جذبات اور ہمدردی ابھر آتی ہے۔ شاید میں بہت نرم یا کمزور دل واقع ہوا ہوں وہ کسی گڑیا کی طرح حسین اور طرحدار تھی۔

اس کے بدن سے چھوٹتی ہوئی مشک نافہ کی خوشبو مجھے بے قرار کیے دے رہی تھی۔ وہ مسکرائی اور اس کے دونوں رخساروں میں گڑھے سے پڑ گئے۔ وہ ایک خوبصورت ڈمپل گرل تھی۔ میں نے اپنی حفاظت اور مدافعت کے خیال سے وہسکی کا جام اٹھا کر غٹاغٹ چڑھالیا۔ اس کی خوبصورت آواز جیسے مجھے دور بہت دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ ''مسٹر ٹائیگر۔ اور مسٹر کرسس یہاں کے لوگوں نے مجھے بتایا ہے کہ آپ مجھے اوپر، ان پہاڑوں کے پیچھے گلیشر وادی کی وادی میں لے جاسکتے ہیں۔'' وہ تم سے آپ پر آگئی تھی اب اس کے لہجے میں روانی یا بے تکلفی

نہیں تھی بلکہ خالص کاروباری پن جھلک رہا تھا۔

میں نے صاف انکار کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو بھی کہتے ہیں جھوٹ کہتے ہیں۔ آپ اچھی طرح دیکھ رہی ہیں کہ درجہ حرارت رات ہونے سے پہلے ہی نقطہ انجماد سے کئی درجے نیچے گر جاتا ہے۔ ابھی آپ نے برف کے وہ ہولناک طوفان دیکھے ہی نہیں ہوں گے جب انسانی خون رگوں میں منجمد ہوجایا کرتا ہے اور ہونٹ، ہاتھ پاؤں سردی کی یخ بستہ شدت سے کٹنے لگتے ہیں اور چہرے پر آنکھوں کے سوا کسی اور شے کے وجود کا احساس تک کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ آپ نے غلط دروازے پر دستک دی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی اس معاملے میں کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

میں نے یہ بات بہت جرأت پیدا کر کے کہی تھی اور اس دوران میں اس کی طرف دیکھنے کی ہمت ہی اپنے اندر پیدا نہیں کرسکا تھا۔ اس نے میری بات کو قطعی طور پر نظرانداز کردیا تھا اور سی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔ ''میری طرف دیکھو۔ ذرا خود کو میری جگہ رکھ کر سوچو۔ میں اپنے شوہر کو ہر قیمت پر تلاش کرنے کی خواہش مند ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم یقیناً میری مدد کرسکتے ہو اور میرا دل کہتا ہے کہ تم انکار کر ہی نہیں سکتے۔ میں جانتی ہوں تمہیں اس مہم میں بہت سے خطرات پیش آسکتے ہیں لیکن میں خود تمہارے ساتھ چلوں گی اور تمہیں اس کا باقاعدہ طور پر معاوضہ بھی ادا کروں گی۔'' اس نے کڑکڑاتے ہوئے بالکل نئے ڈالروں کے دس پیکٹ اپنے بیگ سے نکال کر میرے سامنے رکھی ہوئی تپائی پر ڈال دیئے۔ ''ایک لاکھ ڈالر۔'' میرا خیال ہے یہ بہت کافی ہیں لیکن اگر تم اس مہم میں کامیاب رہے تو میں تمہیں ایک لاکھ ڈالر مزید دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔'' اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور وعدہ کی پختگی کے اظہار کے لئے اپنا نرم وملائم ہاتھ میری طرف بڑھادیا۔ میں اس وقت تک اس کی ریشمی رانوں اور گوشت سے بھرپور کولہوں کے متعلق سوچ رہا تھا جو بے حد جان انگیز اور پرکشش تھے۔

میں نے ہڑبڑا کر اس کا ہاتھ اپنے کھردرے اور مضبوط ہاتھ میں لے کر دبایا۔ میرے بدن کی رگوں میں خون گردش کرنے لگا اور میری کنپٹیاں سلگنے لگیں۔ مجھے معلوم تھا کہ جس کام یا جس مہم کے لئے وہ ذہنی طور پر مجھے آمادہ کررہی تھی اس کے مقابلے میں یہ رقم بہت زیادہ بلکہ کہیں زیادہ تھی لیکن میرے دل میں سوئے ہوئے لالچی اور ہوس کے غلام ''ٹائیگر'' نے پھر انگڑائی لی اور مجھے اس مہم کے لئے تیار کرلیا۔ میں نے حامی بھرلی اور اس سے کہا کہ ''کل صبح وہ میرے پاس آجائے۔''

میں نے اس شام علاقے کے بہت سے مضبوط اور فولادی بدن والے مزدوروں سے اس مہم پر جانے کے لئے پوچھ گچھ کی۔ لیکن سوائے کلائین کے کوئی شخص بھی کسی طرح میرے ہمراہ جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے خراب موسم میں اس مہم پر جانا گویا جان بوجھ کر موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا اور وہ کسی قیمت پر کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھے۔ میں نے انہیں بزدل، ڈرپوک، چوہا اور نجانے کیا کیا کہا لیکن وہ تھے کہ اس سفر کے متعلق سن کر ہی کانوں کو ہاتھ لگانے لگے لیکن کلائین جو اس علاقے کا بہت چھٹا ہوا بدمعاش تھا محض پندرہ ہزار ڈالر کے عوض اس مہم پر ہمارے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہوگیا تھا۔ اور اس کی وجہ بھی خوبرو اور خوش بدن جین تھی۔

اب میں نے جلدی جلدی تین بڑی برف گاڑیوں کا انتظام کیا اور دو کتے فالتو بھی ہمراہ لے لئے۔ ان تین گاڑیوں کو کھینچنے کے لئے میں نے چھ بے حد طاقتور اور مضبوط کتوں کا انتخاب کیا۔ الاسکا کے اس علاقے میں ان کتوں سے زیادہ توانا جانور اور کسی کے پاس نہیں تھے۔ ایک برف گاڑی (سلیج) میں، میں نے چھ ہفتوں کے لئے کھانے پینے کا سامان رکھ لیا اور یہ انتظام اس لئے کیا تھا کیونکہ جس جگہ سے ہم نے سفر شروع کرنا تھا وہاں سے شیلٹن تقریباً چھ سو میل دور تھا اور اس جگہ تک جانے کے لئے چھ ہفتوں سے کم وقت کا درکار نہیں تھا پھر راستے میں جگہ جگہ رک کر جین کے شوہر کی تلاش لازمی تھی جو اس مہم کی بنیادی شرط اور وجہ تھی۔

اگلی صبح ہماری تینوں برف گاڑیاں بالکل تیار تھیں۔ ایک گاڑی میں، میں خود سوار ہوا دوسری میں کلائین موجود تھا اور کھانے پینے کا سامان بھی تھا جبکہ تیسری گاڑی میں جین کے لئے مخصوص کردی تھی۔ برفانی طوفان سے مقابلہ کرنا کوئی آسام کام نہیں ہوتا۔ میں جانتا تھا کہ جین کے لئے یہ سفر جان جوکھم ہوگا۔ اس لئے اس کو بتائے بغیر میں نے اپنی برف گاڑی میں ایک زبردست قسم کا گرم کمبل بھی رکھ لیا تھا۔

جین کی آنکھوں میں میرے لئے جو پیغام تھا وہ کلائین نہیں پڑھ سکا تھا ویسے بھی اس مہم میں، میں نے اس بات کا پہلے سے ہی انتظام کر رکھا تھا کہ اس قافلے کی پہلی برف گاڑی جو سب سے آگے تھی وہ کلائین کی تھی۔ میں نے اس شام یعنی سفر شروع کرنے سے ایک دن پہلے رقم اپنے ایک بے حد قریبی دوست میگوائر کے یہاں رکھوا دی تھی اور چونکہ برف گاڑیوں کا انتظام میگوائر نے ہی کیا تھا اس لئے میں نے جین سے کہہ کر اسے تیس ہزار ڈالر علیحدہ دلوا دیئے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ کلائین اس قسم کی مہمات کے سلسلے میں بے حد مددگار ثابت ہوسکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک تجربہ کار مہم جو تھا اور اس سے پہلے بھی اس قسم کے کاموں میں بڑی مہارت اور کامیابی سے اپنا کردار ادا کر چکا تھا۔ میں نے اپنے کتوں کو کبھی نہیں مارا تھا لیکن اس برفانی موسم میں مجھے یہ احساس بڑا اذیت ناک لگا کہ سفر کے آغاز ہی میں مجھے والرس مچھلی کا تین فٹ لمبا چابک استعمال کرنا پڑا لیکن اس کے سوا کوئی اور چارہ نہیں تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ میرے یہ بے زبان دوست جلد ہی میری آہٹ اور میری حرکات وسکنات کا اندازہ لگانے کے عادی ہوگئے تھے اور پھر جب بھی چابک ہوا میں گھماتا وہ اس کی سرسراہٹ سن کر ہی تیزی سے آگے بڑھنے لگتے تھے، برف آہستہ آہستہ گر رہی تھی اور ہمارا یہ تین آدمیوں پر مشتمل چھوٹا سا قافلہ آگے بڑھ رہا تھا۔

سفر کا پہلا دن خاصا خوشگوار گزرا لیکن شام کے وقت ایک حادثہ پیش آیا۔ جین کی برف گاڑی ایک ٹھوس برف کی چٹان سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ جین بچ گئی تھی۔ اسے معمولی خراشیں آئی تھیں لیکن برف گاڑی بری طرح تباہ ہوچکی تھی اب میں نے دونوں باقی برف گاڑیوں میں چار چار کتے جوت دیئے اور جین کو اپنی برف گاڑی میں اپنے ساتھ بیٹھا لیا تھا۔ رات ہوتے ہی برف کے طوفان کا زور بڑھنے لگا تھا اور میں نے کلائین سے کہا کہ ''ہمیں کیمپ لگانا چاہئے۔''

ہم نے ایک برفانی چٹان کے قریب پڑاؤ ڈالا اور اپنے اپنے بستر وہاں لگا دیئے۔ جین نے سارے راستے میرا دماغ چاٹ لیا تھا اور جس وقت سے وہ میری برف گاڑی میں آئی تھی اس نے اپنا دکھڑا سناتے سناتے میرے کان کھالئے تھے، بدقسمتی سے میں نے اس سے یہ پوچھ لیا تھا کہ اس کا شوہر گفتگو کیا کرتا تھا۔

بس پھر کیا تھا وہ تو کسی کیسٹ کے ٹیپ کی طرح شروع ہوگئی اور جانے کہاں کہاں کے قصے کہانیاں سنانے لگی۔ ہاں میں یہ تو بتانا بھول ہی گیا کہ جب وہ بات کرتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دلکش لبوں سے پھول جھڑ رہے ہوں اور اسی لئے میں چاہتا تھا کہ وہ باتیں کرتی ہی رہے اور میں سنتا رہوں۔

میں جانتا تھا کہ کلائن خوب جل بھن رہا تھا اور میں خود بھی اس کو جلانے کے لئے خوب قہقہے لگا رہا تھا اور میری فلک شگاف قہقہوں کی گونج میں جین کے دلکش اور نقرئی قہقہے بھی شامل تھے اور یہ جلتی پر تیل کا کام کر رہے تھے۔ کلائین ہم دونوں سے الگ تھلگ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنائے کھانا بنانے میں مصروف تھا۔ میں جانتا تھا کہ میں کلائن جیسے بدخصلت انسان پر کسی قسم کا بھروسہ نہیں کرسکتا تھا اس لئے میں اس کی کڑی نگرانی کر رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس کی حرکات وسکنات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھا۔

ہم انسانی تہذیب وتمدن سے اس وقت پچاس میل دور آگئے تھے اور خلاف توقع کتوں نے ہمارا بے حد ساتھ دیا تھا جس وقت کھانا لگا تو وہ اس پر ٹوٹ پڑے اور جلدی جلدی کھانے لگے۔ کھانے کی طرف سے اچھی

طرح مطمئن ہونے کے بعد کہ کلائین نے کھانے میں کسی قسم کی آمیزش نہیں کی تھی۔ میں نے اپنے کھانا اور جین کا کھانا ایک چھوٹی سی ٹرے میں لگایا اور اس کے پاس لے آیا جین کھانا کھاتے ہوئے بار بار محبت پاش نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی ایک شاندار پرکشش اور پرشباب عورت تھی۔

جین نے مجھے بتایا کہ اس کا تعلق ریاست مشی گن سے تھا اور اس کی شادی الیونا ئے کے ایک ماہر ارضیات سے ہوئی تھی وہ شکاگو یونیورسٹی میں ارضیات کا پروفیسر تھا لیکن بعد میں جب جین اور اس کی شادی ہوگئی تو وہ جین کے ساتھ مشی گن چلا آیا تھا اور اس نے یہاں کی یونیورسٹی میں ملازمت کرلی تھی جین اس وقت اٹھارہ برس کی ایک نوخیز کلی تھی جب اس 42 سال کے ادھیڑ عمر پروفیسر کے عشق میں مبتلا ہوکر وہ محبت کی شادی کرنے کی حماقت کر بیٹھی تھی اور اس کا نتیجہ صاف ظاہر تھا پروفیسر کنگز کو اپنی ارضیات کی ضخیم کتابوں سے فرصت ہی نہیں ملتی تھی اور جین کسی پاگل ہرنی کی طرح پریشان پریشان اور بوکھلائی ہوئی پھرا کرتی تھی۔

کچھ عرصہ بعد پروفیسر نے امریکی بحریہ میں ملازمت کرلی اور جین کو لے کر الاسکا چلا آیا تھا اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی بڑی دل پھینک اور فلرٹ واقع ہوئی تھی اور پھر ازدواجی زندگی کے گزشتہ چار سال کچھ ایسے خوشگوار بھی نہیں تھے جو جین یا کنگز کی زندگی میں خوشیوں کے پھول کھلاتے یا دھنک کے رنگ بکھیرتے ۔جلد ہی جین اور اس کا شوہر ایک دوسرے کی رفاقت سے بیزار ہو چکے تھے۔ جین کسی طور پر مطمئن نہیں تھی اور پروفیسر کا خیال تھا کہ وہ اس منہ زور گھوڑی کو زیادہ دیر تک لگام ڈال کر نہیں رکھ سکتا تھا، جین کے نخرے بھی بہت تھے اور وہ اس قدر خوش شکل تھی کہ ایک عام آدمی کے لئے اس کی ناز برداریاں کسی طور بھی ممکن نہیں تھیں، ویسے خوبصورتی بہت بری چیز ہوتی ہے اس کے پاس دولت کی کمی نہیں تھیں۔ جین کا باپ خود ایک ارب پتی تھا اور پھر پروفیسر نے بھی زندگی کے رنگین وقت دولت کمانے میں گزار دیئے تھے اور اس وقت اس کے پاس کم وبیش پانچ کروڑ ڈالر تھے جو ایک خطیر رقم تھی۔

اس نے یہ رقم جین کے نام سے جمع کرادی تھی اور یہ رقم اس رقم کے علاوہ تھی جو پروفیسر کی موت کی صورت میں جین کو ملنے والی تھی گویا کنگز کی موت اس قدر قیمتی تھی کہ اس کے مرتے ہی جین کو یک مشت دس کروڑ ڈالر مل جاتے۔

جین کے نازنخروں کا یہ عالم تھا کہ اس کو محض انڈا ابالنے کے لئے چھ ملازموں کی ضرورت تھی اور مزید تین آدمی یہ ابلا ہوا انڈا پیش کرنے کے لئے درکار تھے اس کا ننھا سا دل جس بات کی بھی خواہش کرتا پروفیسر اس کے لبوں سے بات نکلتے ہی اسے پورا کرنے کی کوشش شروع کردیتا لیکن یہ تو حقیقت ہے نا کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوا کرتی۔

اور اسی لئے جین کو اب دولت کے نام سے ہی نفرت ہوگئی تھی۔

جب چینی کیتگ میں کھولتی ہوئی کافی اور تلے ہوئے پارچے میں نے اسے دیئے تو اس نے بڑی چاہت سے مزے لے لے کر کھانا شروع کردیا وہ بہت زور زور سے ہنس رہی تھی اور میں جانتا تھا کہ وہ ریچھ نما کلائین کا دل جلانے کے لئے ایسا کررہی تھی۔ میں بھی اس کے ساتھ بڑھ چڑھ کر بات چیت کررہا تھا۔

جین اس وقت اپنے شوہر کے لئے خاصی فکر مند تھی۔ وہ رات ہم لوگوں نے جاگ کر گزاری اور ہم آگ جلا کر دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے لیکن اس دوران کلائین برفانی ریچھ کی طرح خراٹے لیتا رہا۔

دوسری شب ہم دن بھر سفر کرکے نڈھال ہو چکے تھے اور تقریباً نوے میل سفر کر چکے تھے۔ جب ہم نے کیمپ لگایا تو کھانے سے فارغ ہوکر میں سونے کی تیاری کرنے لگا۔

جین نے کہا۔ ”میرا موڈ ابھی سونے کا نہیں ہے تم سو جاؤ۔ میں کچھ دیر یہاں آگ کے پاس بیٹھ کر اس برفانی موسم سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔“ ہم کافی پی چکے تھے اور کلائین سو گیا تھا۔ جین کے منہ سے بھاپ

نکل رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''جین میرا خیال ہے کہ اب تمہیں سوجانا چاہئے کیونکہ کل صبح ہم نے بہت جلدی یہاں سے نکلنا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں جلد از جلد اس مہم کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟'' میں چاہتا تھا کہ وہ آرام کرکے تازہ دم ہوجائے۔

وہ پھٹ پڑی۔ ''خدا کے واسطے کرسس، تمہیں کیا ہوگیا ہے یہ ضروری تو نہیں کہ اگر تمہیں نیند آرہی ہو تو میں بھی سوجاؤں مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

میں اس کی بات سن کر اپنے بستر میں جا گھسا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کمبل سے جھانک کر دیکھا۔ وہ آگ کے قریب بیٹھی تھی اس کے بالوں کی ایک لٹ اس کے رخساروں پر جھول رہی تھی۔ فضا کی خاموشی میں برف گرنے کی ہلکی ہلکی آواز آرہی تھی اور کلائین کے خراٹوں سے ارتعاش پیدا ہورہا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے سامنے انگرڈ بیٹھی تھی۔

میں نے اپنے ذہن کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔ آگ کے شعلوں کا عکس جین کے رخساروں پر پڑرہا تھا اور وہ کسی حسین سرخ گلاب کی مانند دکھائی دے رہی تھی ایسے میں مجھے آگ میں پھول والی تشبیہ یاد آگئی۔ جین نے اچانک مڑ کر میری طرف دیکھا پھر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرلیں۔ نیند کا غلبہ آہستہ آہستہ حاوی ہوتا جارہا تھا اور میری آنکھیں بوجھل ہورہی تھیں۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے قریب آکر کوئی بیٹھ گیا ہو۔ میں نے آنکھیں کھول دیں، جین مجھ سے لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اس نے میری داڑھی میں انگلیاں پھیریں جو گزشتہ کئی ہفتوں سے بہت گھنی ہوگئی تھیں، مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں حیران ہوں کہ یہ تمہیں کیا ہوجاتا ہے، رات آتے ہی تم مرد لوگ آخر کیوں خرگوش کی طرح آنکھیں بند کئے خرخر کرنے لگتے ہو۔ میں تو بور ہوکر رہ گئی ہوں۔'' میں نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''میں خرگوش نہیں، آدمی ہوں بلکہ مرد ہوں، سمجھی کیا ہو تم اپنے آپ کو؟''

میں نے اس کی کلائی تھام کر اسے اپنے ساتھ لٹالیا۔ وہ میرے پہلو میں گر کر کسمسانے لگی۔ میں نے کہا تم جانتی ہو ایک بار کیا ہوا۔ ایک مرتبہ میری ہی طرح ایک گائیڈ تم جیسی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ ایک جنگل میں سفر کررہا تھا اچانک اس لڑکی کے کچھ اور چاہنے والے ادھر آنکلے پھر جانتی ہو کیا ہوا۔ ایک گولی آئی اور گائیڈ کی کھوپڑی میں سوراخ کرتی ہوئی نکل گئی اور یوں اس حسین سفر کا اس قدر المناک انجام ہوا۔''

وہ ہنس دی۔ ''اور تم۔ تم اس قدر بزدل ہو کہ۔''

میں نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی اور اس کے یاقوتی ہونٹوں کو اپنے لبوں سے سی دیا۔ میں نے جلدی سے برف گاڑی سے اپنا قیمتی کمبل نکالا اور اپنے اوپر بلکہ ہم دونوں کے اوپر ڈال لیا۔ وہ کچھ سردی سی محسوس کررہی تھی، اس نے مجھے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا اس کا بدن لذتوں اور حلاوتوں سے بھرپور تھا اور ہم دونوں اس وقت اسکیمو باشندوں کی طرح بڑے روایتی انداز میں ایک جان دو قالب ہوگئے تھے۔

لیکن اگلی صبح جلد ہی معلوم ہوگیا تھا کہ رات کو بدخصلت اور بدنیت کلائین سویا نہیں تھا وہ حرام زادہ جاگ رہا تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھ کر زیرلب مسکرا رہا تھا۔ ہم نے صبح جلدی جلدی ناشتہ کیا۔ میں اگر چاہتا تو چابک سے اس کی کھال ادھیڑ سکتا تھا اس کی ٹانگیں توڑ سکتا تھا اس کی کھوپڑی میں اپنی رائفل سے کئی سوراخ کرسکتا تھا۔ میں یوں محسوس کررہا تھا کہ اس کی طنزیہ مسکراہٹ پھیلی جارہی تھی اور اس کے چہرے کا احاطہ کرتی چلی جارہی تھی لیکن میں ایسے معاملات میں بڑے ٹھنڈے دماغ اور مستقل مزاجی سے کام لینے کا عادی ہوں اور اس لئے میں نے یہ سوچ کر کہ ابھی ہمیں کلائین کی ضرورت تھی اس کی اس طنزیہ مسکراہٹ کو بالکل نظرانداز کردیا اس پر قطعی توجہ نہیں دی اور یوں بن گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

جین بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ میں اس قدر خاموش اور اکھڑا اکھڑا کیوں تھا لیکن میں نے اسے ٹال دیا۔ میں اسے بھلا کیا جواب دیتا کہ اصل بات کیا

تھی۔ یہ معاملہ صرف میرے اور کلائین کے درمیان تھا۔ میں اسے کسی کو نہیں بتانا چاہتا تھا۔

"کرمس۔ کیا بات ہے تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔ ایسی کیا بات ہے جو تم مجھے بتانا نہیں چاہتے۔" وہ اصرار کررہی تھی۔

یہ ہمارے سفر کا تیسرا دن تھا اور جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے برف کا طوفان بڑھتا جارہا تھا۔ میں نے جین کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا، دوپہر کے وقت ہم ایک ایسی جگہ جا پہنچے جس کے متعلق میں پہلے ہی سب جانتا تھا۔ برف میں ایک ٹوٹی ہوئی برف گاڑی دھنسی ہوئی تھی۔ ہمارے کتے تیزی سے دوڑ رہے تھے ہم اس ٹوٹی ہوئی برف گاڑی کے قریب جا کر رک گئے۔

برف میں جمے ہوئے خون کا دھبہ جمع ہوا واضح نظر آرہا تھا اور کتوں کی کھال کے نیچے پھیلے ہوئے ٹکڑے بھی ادھر ادھر بکھرے ہوئے نظر آرہے تھے۔ کسی آدمی کی ٹوٹی چبائی ہوئی کھوپڑی برف میں دھنسی ہوئی تھی اور جگہ جگہ پھٹے ہوئے لباس کے چیتھڑے بکھرے تھے۔ خون خوار برفانی بھیڑیوں نے لاش کا کوئی نام ونشان تک باقی نہیں چھوڑا تھا۔

جین سہم کر میرے سینے سے لگ گئی۔ وہ دیکھ چکی تھی۔ پروفیسر کمنگز اس کا شوہر اب اس دنیا سے دور بہت دور کبھی واپس نہ آنے کے لئے جاچکا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں یا جین کچھ کہتے کلائین نے جس کا چہرہ اس وقت موت کے خوف سے سیاہ ہوگیا تھا چیخ کر چابک ہوا میں لہرایا اور اس کی گاڑی کو کتے کھینچتے ہوئے تیزی سے واپس لے چلے، اب ہم یہاں ایک لمحہ بھی نہیں رک سکتے تھے۔ جین کی آنکھیں فرط خوف سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اور اس کا بدن بید مجنوں کی طرح لرزاں تھا اس پر سکتے کی سی کیفیت طاری تھی۔ کتوں کی غراہٹ اور برف پر پنجے گھسٹنے کی آوازیں بتدریج بڑھ رہی تھیں اور کلائن کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے خوف کو دیکھ کر میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ ہم خونخوار وحشی بھیڑیوں کے نرغے میں تھے اور موت ہماری منتظر تھی۔

سرد اور خوفناک موت۔

جین نے ایک سسکی لی اور میرے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کردی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن جیسے اس کی زبان پر تالے پڑ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے لرز رہے تھے۔ وہ بری طرح کانپ رہی تھی پھر اس کی آواز مجھے کہیں دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔ "ک..... کیا کمنگز ......؟" میں نے آہستہ سے سر ہلاتے ہوئے سرگوشی کی۔ "ہاں وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ بھیڑیوں نے اسے ہلاک کر ڈالا اور اس کے بدن کی ایک ایک ہڈی چبا گئے۔" یہ کہہ کر میں نے اپنا چابک لہرایا۔ کتے برق رفتاری سے مڑے اور جلدی جلدی فاصلہ طے کرنے لگے۔ کلائین برق گاڑی تیزی بھگائے جارہا تھا اسے ہماری کوئی پرواہ نہیں تھی لیکن ہم اس کی پرواہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کیونکہ ہمارا تمام راشن اس کی برف گاڑی میں لدا ہوا تھا اور ہم راشن کھونے کا تصور بھی نہیں کرسکتے تھے۔

کتے ہانپ رہے تھے لیکن وہ پوری قوت سے بھاگ رہے تھے۔ برف گاڑی بار بار ہچکولے کھارہی تھی اور اس وقت کلائین اور میں دونوں ہی واپسی کے لئے کوئی مختصر ترین راستہ تلاش کرنے میں مصروف تھے تاکہ شام ہونے سے پیشتر کسی محفوظ مقام پر پہنچ سکیں۔

اچانک مجھے کلائین کی خوفناک چیخ سنائی دی اس کی برف گاڑی ٹوٹتی ہوئی برف میں دھنس رہی تھی اور وہ مدد کے لئے چلا رہا تھا میں تیزی سے اس کے قریب جا پہنچا۔ برف میں شگاف پڑ رہا تھا اور برف گاڑی اس برف کے ہولناک گڑھے میں گرتی جارہی تھی۔ میرا جی چاہا کہ کلائین کو اس میں ہی زندہ دفن کردوں اسے مرجانے دوں لیکن پھر اس خیال کے آتے ہی کہ اگر بھیڑیوں نے ہم پر حملہ کردیا تو میں اکیلا کہاں تک ان عفریتوں کا مقابلہ کروں گا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور برف گاڑی سے باہر کھینچ لیا۔ وہ برف کی چکنی سطح پر دور تک پھسلتا چلا گیا۔ پھر میں کتوں کی طرف متوجہ ہوا وہ برف گاڑی کو باہر کھینچنے کی کوشش کررہے تھے۔

میں نے جلدی جلدی اپنی برف گاڑی سے کتوں

کو کھولا اور انہیں دوسری برف گاڑی والے کتوں کے ساتھ باندھ دیا اور جابک فضا میں لہرایا۔ کلائین بچ گیا تھا۔ ہمارے کتوں نے بقایا چار کتوں کے ساتھ مل کر برف گاڑی کو باہر کھینچ لیا تھا لیکن اس افراتفری میں راشن کا ایک بڑا سا پیکٹ برف کے شگاف میں گرتا چلا گیا اور جلدی نظروں سے اوجھل ہوگیا میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ آخر ہم لوگ کچھ راشن اور برف گاڑی بچانے میں کامیاب ہوگئے تھے ورنہ شاید ہماری مصیبت میں اور اضافہ ہوجاتا۔

ہم نے اس بار پھر برق رفتاری سے اپنا واپسی کا سفر شروع کردیا۔ ہم کمنگز کا انجام دیکھ چکے تھے اور ہمیں جلد از جلد ان بھیانک درندوں کے مسکن سے دور چلے جانے کی دھن لگی ہوئی تھی۔ کتے کافی تھک کر ہانپنے لگے تھے اور ہم تینوں بھی بری طرح نڈھال ہوچکے تھے۔ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اب کتے برف پر دوڑنے کی بجائے گھسٹنے لگے تھے اور ہم ان بے زبان جانوروں پر مزید ظلم نہیں کرسکتے تھے۔ ہم نے دونوں برف گاڑیاں روک دیں۔

دھچکوں اور ہچکولوں کی وجہ سے جین کا برا حال ہوگیا تھا۔ وہ احتجاج کرتے ہوئے بولی۔ ''کیا بات ہے تم لوگ پاگل تو نہیں ہوگئے ہو۔ آخر اس افراتفری کا کیا مطلب ہے پھر اس نے بڑے پرمطمئن لہجے میں کہا۔'' میں جانتی ہوں کہ اب میرا خاوند مرچکا ہے اور اسے بھیڑیوں نے ہلاک کردیا ہے لیکن وہاں تو کوئی بھیڑیا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا خیال ہے وہ ہمیں وہاں پا کر ڈر کر بھاگ گئے تھے پھر اس افراتفری کا کیا فائدہ؟'' اس کے لہجے میں تجسس اور حیرت نمایاں تھی۔ میں نے غمگین نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا۔

''دیکھو! تم زیادہ عقلمند بننے کی کوشش مت کرو اور اپنی زبان بند رکھو۔ بہتر یہ ہوگا کہ تم صرف اپنی خوبصورت آنکھیں اور کان کھلے رکھو۔ کیا تم اتنی سی بات نہیں جانتی کہ وہاں واقعی اس وقت کوئی بھیڑیا موجود نہیں تھا ورنہ ہم اس وقت تک ان کے معدوں کی نذر ہوچکے ہوتے۔ وہ سب ایک غول کی شکل میں اکٹھے ہوکر حملہ آور ہوں گے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ ہمارے بدن کی بو پاکر ہمارے کتوں کے پاؤں کے نشانات کو سونگھتے ہوئے ہمارا تعاقب کررہے ہوں گے اس لئے کہ مسٹر کمنگز کے بعد اب ہماری باری ہے۔''

اس نے میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے گانا شروع کردیا۔ ''بھیڑیئے سے کون ڈرتا ہے جی۔'' میں اس کی دلیری اور جرأت پر حیران رہ گیا اور میں نے اسے اس رویے پر سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''حیرت ہے تمہارا شوہر مرگیا ہے اسے بھیڑیوں نے چٹ کرلیا ہے اور تم گارہی ہو۔''

اس نے جواب میں حیرانی سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''اور تمہارا کیا مطلب ہے کہ میں رونا شروع کردوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گی مجھے اس سے کوئی محبت وحبت نہیں تھی۔ مجھے اس سے نفرت تھی میں سمجھتی ہوں کہ اس کا جو حشر بھی ہوا بہتر اور بے حد مناسب ہے۔ جب میں نے گزشتہ دنوں اس سے کہا کہ میں طلاق لینا چاہتی ہوں تو اس کا ہونق اور بے رونق چہرہ دیکھنے کے لائق تھا۔ عجیب گھامڑ اور چغد شوہر تھا۔ میں نے ایسا بوم آدمی نہیں دیکھا۔ کم بخت کو حس لطافت یا حس مزاح چھو کر نہیں گزری تھی۔ میں صرف یہ یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ واقعی مرچکا ہے اور اب مجھے یقین ہوگیا ہے۔''

میرا جی چاہا کہ اس بد بخت عورت کے منہ پر اس قدر زناٹے دار تھپڑ رسید کروں کہ وہ لڑھکتی ہوئی دور جا گرے۔ میں اس وقت کو کوسنے لگا جب اس منحوس کے کہنے پر میں دولت کے لالچ میں پھنس گیا تھا اور میں نے یہ جان لیوا سفر شروع کردیا تھا۔

وہ میرے قریب آئی اور میری داڑھی سے کھیلتے ہوئے ہنستے ہوئے بولی۔ ''چھوڑو بھی یہ تم نے کیا بکواس لگا رکھی ہے آؤ پروفیسر کمنگز کی موت کا جشن منائیں۔''

میں نے اسے اپنے جسم سے دھکیلتے ہوئے اور پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''دور ہوجاؤ ہٹ جاؤ میرے پاس سے۔ خدا معلوم وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب میں تم سے ملا تھا۔''

شام کے سائے آہستہ آہستہ اتر رہے تھے اور ہم نے ایک چھوٹی سی برفانی چٹان کے پاس اپنا خیمہ لگالیا تھا۔ بہت سی لکڑیاں جو ہم نے یہاں جاتے وقت جمع کی تھیں انہیں برف سے کھود کر ہم نے ان پر مٹی کا تیل چھڑکا اور آگ لگادی پھر ہم نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور سونے کی تیاری کرنے لگے بھوک ختم ہوتے ہی گندم کے خمار نے اپنا رنگ جمانا شروع کردیا تھا۔ میں اپنے بستر میں جا گھسا۔ تھکن کی وجہ سے میری آنکھیں بند ہورہی تھیں۔ جسمانی تھکن کے علاوہ اعصابی تھکن بھی مجھے نڈھال کئے دے رہی تھی۔

اچانک میری چھٹی حس نے مجھے کسی ناگہانی خطرے سے آگاہ کرتے ہوئے خبردار کیا۔ چاندنی روشنی میں سامنے کا منظر بہت صاف اور واضح نظر آرہا تھا۔ جینی دوسری طرف کروٹ لئے لیٹی تھی اور اس کا چہرہ کمبل سے باہر تھا لیکن پھر اچانک میری نظر کلامین پر پڑی جو دبے پاؤں اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے چابک سنبھالا ہنٹر کلامین کے ناک کو چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔ وہ رک گیا اور خونخوار نظروں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آگ برس رہی تھی۔ ادھر تو خونخوار بھیڑیئے ہمارا تعاقب کررہے تھے اور ادھر اب میرے ہی کیمپ میں ایک اور ہولناک درندہ میرے لئے دردسر بن گیا تھا۔ ہم دونوں نے کوئی بات نہیں کی اور دیر تک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر کلامین نے آہستہ سے سر ہلایا اور میری طرف دیکھتا ہوا واپس اپنے بستر میں جا کر لیٹ گیا۔

ابھی رات زیادہ نہیں بھیگی تھی کہ میری طبیعت کو ایک عجیب سی بے چینی نے گھیر لیا۔ میں نے جلدی جلدی جینی کو بیدار کیا اور کتوں کو واپس برف گاڑی میں جوت دیا۔ ابھی ہم لوگ اپنا سفر بھی کرنے نہ پائے تھے کہ فضا میں بھیڑیوں کی خون خوار آواز گونجی۔ بھیڑیوں کے رونے اور چلانے کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ خطرہ لحظہ بہ لحظہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جارہا تھا۔

اب ہمارا وہاں سے بھاگنا یا کہیں جانا بے سود تھا۔ ہمیں اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ ایسے موقعوں پر بھی بھاگ جانے کو ترجیح نہیں دے سکتا تھا۔ میں ہمیشہ موت سے پنجہ آزمائی کرنے کا قائل رہا ہوں اور فرار ہونے پر موت کو ترجیح دیتا ہوں۔ اب میں نے اس مرحلہ پر باقاعدہ طور پر جنگ کی تیاری شروع کردی تھی۔ مجھے مورچہ بندی کرنی تھی تاکہ ایک قابل عمل منصوبے کے تحت اپنا کام کرسکوں۔ میں جانتا تھا کہ اب قضا ہم سے زیادہ فاصلے پر نہیں لیکن میں موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ایک باہر کی طرف نکلی ہوئی برفانی چٹان کے قریب اپنا کیمپ لگایا۔ یہاں مجھے کچھ لکڑیاں اور بھی مل گئی تھیں۔ میں نے یہاں ایک بہت بڑا الاؤ جلایا۔ اب ہماری پشت پر برف کی دیوار تھی اور سامنے کی طرف برف کا وسیع و عریض میدان نظر آرہا تھا اور حد نظر تک برف ہی برف نظر آرہی تھی۔ میں نے اپنی دونوں کلہاڑیاں سنبھالیں اور چٹان کے عقبی حصے کی طرف اگی ہوئی خودرو جنگلی جھاڑیاں کاٹنے لگا۔ مجھے اپنی ان دونوں کلہاڑیوں سے لکڑی کاٹنے کا اس قدر تجربہ ہوچکا تھا کہ میں نے چشم زدن میں تمام جھاڑیاں کاٹ کر ایک بڑا سا ڈھیر الاؤ کے پاس لگادیا۔

کلامین اور جینی بڑی حیرت بھری نظروں سے میری برق رفتار کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں ان دونوں پر بھی یہ بات ہر حالت میں ثابت کردینا چاہتا ہوں کہ میں آسانی سے موت سے ہار ماننے یا حالات کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی شکست تسلیم کرنے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا۔ جلد ہی آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے اور گرد کی برف چٹخنے اور پگھلنے لگی۔ جلد ہی جینی کو حالات کی سنگینی کا علم ہوگیا بھیڑیوں کی آوازیں اب زیادہ بلند اور واضح ہوتی جارہی تھیں۔

جونہی برف کے کہر میں پہلے بھیڑیئے کا منحوس چہرہ نمودار ہوا جینی نے ایک دلخراش چیخ ماری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ خوف کے مارے اس کا برا حال تھا اور اس وقت سردی کی وجہ سے نہیں بلکہ موت کے خوف سے اس

کے بدن پر لرزہ طاری تھا اور گھگھی بندھی ہوئی تھی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے بدن سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو۔ اور اس کا چہرہ کفن کے لٹھے کی مانند سفید ہو چکا تھا۔ میں نے اسے دلاسہ دیا مگر وہ کانپتی رہی، لرزتی رہی۔

یہ وہ بھیڑیے نہیں تھے جو محض چڑیا گھروں میں بند رکھے جاتے ہیں یا جنہیں دیکھ کر بچے تالیاں بجانے لگتے ہیں یہ الاسکا کے قوی ہیکل ڈھائی تین سو پونڈ وزنی بھیڑیے تھے جن کے خونی جبڑوں سے ان کے تیز اور نوکیلے دانت کسی ڈریکولا کے دانتوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے ان کی سرخ زبانیں باہر لٹک رہی تھیں۔ وہ وحشی اور خون آشام درندے تھے جو غول کی صورت میں مل کر کسی انسان کی تو کیا شیر جیسے بہادر جانور کی بھی تکا بوٹی کر سکتے تھے۔

وہ ایک ایک کر کے کافی فاصلے پر اکٹھے ہو رہے تھے، سفید، بھورے، سرمئی اور براؤن رنگ کے خونخوار بھیڑیے جن کی تعداد میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا۔ ہم سے کچھ فاصلے پر رک گئے۔ وہ ہم سے تقریباً ڈھائی سو فٹ دور آ کر بیٹھ گئے وہ ہانپ رہے تھے اور ان کے حلق سے آہستہ آہستہ غرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میرے آٹھوں کتوں کی آنکھوں سے خوف عیاں تھا۔ بھیڑیے کافی فاصلے پر نیم دائرے کی صورت میں آ کر بیٹھ گئے تھے اور ہمارے اعصابی دورے کے منتظر تھے۔ وہ بڑے سکون اور صبر سے ہمارے بدن کا گوشت نوچنے کی تیاری میں مصروف تھے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ ان کی تعداد پچاس کے لگ بھگ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ دنیا بھر میں بھیڑیے سے زیادہ صبر کرنے والے جانور اور کوئی نہیں ہو سکتے۔ میں نے سامان ٹٹولا اور اپنی قابل اعتماد ون چیسٹر رائفل نکالی۔ میرے پاس اس وقت پندرہ راؤنڈ تھے۔ میں نے نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ جب تک آگ جل رہی تھی اور جس وقت تک یہ خوف ناک ہتھیار ہمارے پاس تھا وہ ہمارے قریب آنے کی جرات نہیں کریں گے۔

ہم نے حیرانی سے دیکھا کہ جونہی ایک بھیڑیے کے گولی لگی اور وہ چکرا کر گرا۔ اس کے ساتھی بھیڑیے چیل کی طرح اس پر حملہ آور ہوئے اور زخمی بھیڑیے کو چیر پھاڑ کر رکھ دیا۔

چند سیکنڈ میں وہاں ٹوٹی ہوئی ایک کھوپڑی اور چند ہڈیوں کے سوا اور کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ابھی تک وہ بھیڑیے اپنے ساتھی کا خون چاٹ رہے تھے اور اس کی آنتوں اور اوجھڑی کے لئے کتوں کی طرح آپس میں لڑ رہے تھے ان کی خونخوار غراہٹ اور چیخنے کی آوازیں بڑی خوف ناک تھیں اور ان میں سے کئی تو برف میں دور تک لڑھکتے چلے گئے تھے چند لمحوں بعد وہاں کھال بھی باقی نہیں تھی اور یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ایک عرصے سے مردہ گوشت کی تلاش میں بھٹک رہے تھے اب وہ اس بات کے منتظر تھے کہ میں اور بھیڑیوں کو ہلاک کروں۔ میں نے یکے بعد دیگرے دس بار فائر کئے اور دیکھا کہ ان کی تعداد میں رفتہ رفتہ کمی ہو رہی تھی لیکن انہوں نے ہم پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے سوچا۔ ”کیا یہ حرام زادے میرا اسلحہ ختم ہو جانے کا انتظار کر رہے ہیں لیکن میرا اندازہ غلط تھا وہ صرف اس بات کے منتظر تھے کہ میں اور بھیڑیوں کو زخمی کرتا رہوں تاکہ وہ اپنے ساتھی درندوں کا خون اور گوشت اڑا سکیں۔ ہر بار جب میری رائفل شعلہ اگلتی اور کوئی نہ کوئی بھیڑیا زخمی ہو کر برف پر تڑپنے لگتا تو تمام بھیڑیے اس کے نیم مردہ جسم کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور اس کے آپریشن یا پوسٹ مارٹم میں ہمہ تن مصروف ہو جاتے، یہی ان کا شغل بن گیا تھا۔

وہ سب اپنی اپنی پسند کے مطابق اس کے بدن سے اپنی مرضی کے حصے نکالتے اور دور جا کر کھانے لگتے۔ ان کی غراہٹ اور ہٹ دھرمی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ سچ ہے کہ ہر کمزور کو طاقت ور کے سامنے ہتھیار ڈالنے ہی ہوتے ہیں۔

”ٹائیگر۔ ٹائیگر۔ وہ اب ہم پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“ جین نے سسکی لی اور میرا بازو پکڑ کر جیسے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں نے مڑ کر اس

طرف دیکھا جہاں ایک سرمئی رنگ کا بڑا سا گدھے کی جسامت والا بھیڑیا کافی دیر سے بڑے تحمل اور صبر سے بیٹھا ہوا میری حرکات کا یوں جائزہ لے رہا تھا جیسے وہ میرے اعصاب کے تھک جانے کا انتظار کر رہا ہو اور واقعی یہ بات صحیح بھی تھی، وہ بڑی منصوبہ بندی سے حملہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھا اور آگے بڑھا۔ سلور گرے رنگ کا بڑا سا بھیڑیا جوان تینوں بھیڑیوں کے آگے آگے چل رہا تھا اب میری طرف آ رہا تھا میں اس کا ارادہ بھانپ گیا تھا۔

یہ منظر اس قدر بھیانک تھا کہ جینی نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا تھا اور سسکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔ میں نے رائفل ایک طرف پھینک دی اور اپنی مضبوط کلہاڑی سنبھال لی۔ اس سے پہلے کہ وہ بھیڑیے مجھ پر حملہ آور ہوتے میں نے کلہاڑی کے ایک ہی وار سے آگے بڑھنے والے درندے کی کمر توڑ دی پھر جیسے مجھ پر دیوانگی کا سا دورہ پڑ گیا۔ میں پاگلوں کی طرح کلہاڑی گھمانے لگا اور باقی تمام بھیڑیے چیختے ہوئے واپس بھاگے۔ وہ سب پسپا ہو رہے تھے شاید ان کا سرغنہ مارا گیا تھا۔

بھیڑیے وقتی طور پر پسپا ضرور ہو گئے تھے لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ پھر آئیں گے، میں نے اپنے بچے کچھے اسلحہ کا جائزہ لیا میرے پاس صرف پانچ کارتوس باقی رہ گئے تھے۔ اگر وہ اس بار زیادہ تعداد میں آئے تو یہ بات یقینی تھی کہ وہ ہر حالت میں ہم تینوں پر حاوی ہو جائیں گے۔ میں دل وہی دل میں کلائین کو کوسنے لگا جس کے بے احتیاطی کی وجہ سے ہمارا اسلحہ اور کارتوس ضائع ہو گئے تھے۔

اسی اثناء میں جینی نے کافی تیار کر لی تھی اور میرے قریب آ کر کھڑی ہو گئی تھی اس نے کافی کا مگ میری طرف بڑھایا اور کہنے لگی۔ ''ٹائیگر میں چاہتی ہوں کہ جب تم دیکھو کہ مقابلہ بیکار ہے تو اپنے ہاتھ سے مجھے گولی مار دینا ایک کارتوس میرے لئے ضرور بچا لینا۔'' اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی موجود تھی۔ وہ بولی۔ ''آہ میں جانتی ہوں کہ یہ میری آخری خواہش ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اسے ضرور پورا کرو گے۔'' میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور کافی کی چسکیاں لینے لگا، اس وقت موت کے دہانے پر کھڑے ہو کر بھی کافی کا تلخ ذائقہ مجھے بہت خوشگوار محسوس ہو رہا تھا۔ اب میں اپنے دشمنوں کا منتظر تھا۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ پھر کافی فاصلے پر بہت سے بھیڑیے نمودار ہوئے ان کی مکروہ آوازیں آہستہ آہستہ بلند ہونے لگیں اور جلد ہی وہ کہر کی چادر کو چیرتے ہوئے سامنے آ گئے۔ دھندلی روشنی میں ان کی آنکھیں دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح چمک رہی تھیں اور وہ بے حد تازہ دم نظر آ رہے تھے۔ انسانی گوشت اور خون کی تیز بو اور طلب انہیں یہاں کسی مقناطیس کی طرح کھینچ لائی تھی اور اب وہ اپنے صبر کا پھل چکھنے کے لئے بے قرار تھے، ان میں کچھ پرانے بھیڑیے بھی تھے اور اب تازہ دم کمک انہیں مل چکی تھی۔ میں نے دیکھا بھیڑیے بھی تعداد میں کم و بیش 25 یا تیس رہے ہوں گے۔

بھیڑیوں کا یہ غول بھی پہلے کی طرح ہم سے تقریباً دو سوفٹ کے فاصلے پر آ کر رک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس بار وہ آہستہ آہستہ فاصلہ کم کر رہے تھے شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اب وہ اس آگ کے عادی ہو چکے تھے اور انتقامی جذبہ انہیں ہماری طرف دھکیل رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کا گوشت کھا کھا کر اکتا چکے تھے۔ میں نے دیکھا کہ آگ آہستہ آہستہ مدھم ہو رہی تھی اور اب بھیڑیوں کے معدوں میں بھوک کی آگ بھڑک رہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ بھیڑیے اپنی خونخوار سرخ زبانیں نکالے ہمارے چاروں طرف چکر لگا رہے تھے بھوک نے انہیں بے حال کر رکھا تھا۔ وہ ایک پل کے لئے بھی ٹک کر نہیں بیٹھ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ جلد ہی وہ ہم پر تیر کی طرح حملہ آور ہوں گے وہ زیادہ دیر تک وہاں بیٹھ کر صبر نہیں کر سکتے تھے۔ ان کے انتظار کی حد ختم ہونے کو تھی اب انہیں آگ کا خوف بھی ہم سے دور نہیں رکھ سکتا تھا۔

موت کے خیال سے مجھے جھرجھری آنے لگی اب ہمارے سامنے کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ ہم ایک ٹوٹی ہوئی

چٹان کے نیچے کھڑے تھے جس کے اطراف میں ہزاروں فٹ گہری کھائیاں تھیں اور سامنے بھیڑیوں کا یہ غول ہمارے اعصاب کے تھک کر چور ہو جانے کا منتظر تھا۔

دوسرے الفاظ میں موت ہماری منتظر تھی۔

میں نے سنا گاڑی کھینچنے والے آٹھوں کتے آہستہ آہستہ غرار ہے تھے وہ سہمے ہوئے تھے اور خود کو شاید ذہنی طور پر اس خونریز جنگ کے لئے تیار کر رہے تھے جوان کی زندگی اور موت کی جنگ تھی۔ میں نے اپنی دونوں کلہاڑیاں سنبھال لیں۔ بندوق اب بیکار ہو چکی تھی۔ "تیار ہو جاؤ۔" میں نے چیخ کر کلائین سے کہا اور اس نے اپنا شکاری چاقو ڈب سے نکال لیا۔

خونخوار درندے ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے فولادی اور مضبوط پٹھے اور خنجر کی مانند تیز دھار والے دانت سرخ سرخ زبانیں اور خون برساتی ہوئی آنکھیں یہ سب اس قدر دہشت ناک تھے کہ میری روح لرز کر رہ گئی۔ میں پاگلوں کی طرح خود کو باور کرا رہا تھا کہ یہ سب محض ایک بھیانک خواب تھا لیکن یہ ایک اٹل اور سنگین حقیقت تھی۔

میں اپنی کلہاڑیاں سنبھالے ان خونخوار بدروحوں پر قہر بن کر ٹوٹ پڑا۔ میں اگر ایسا نہ کرتا تو آج اپنی داستان نہ سنا رہا ہوتا۔ گولیاں تو میں ختم کر چکا تھا لیکن بھیڑیوں کی تعداد زیادہ تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگر اس مرحلے پر میں نے ہمت ہار دی تو چند لمحوں بعد درندے میری کھال بھی کھینچ لیں گے۔ اور شاید میں اسی لئے زندہ تھا۔

مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ میں کیا کر رہا تھا ادھر کلائین بھی تین چار بھیڑیوں سے بیک وقت گتھم گتھا تھا۔ میرا چہرہ، داڑھی اور کپڑے ان درندوں کے خون میں لت پت ہو چکے تھے اور اب ان کی تعداد کم ہوتے ہوئے صرف دس رہ گئی تھی۔

اس خونریز جنگ میں جو ہم تینوں کے لئے زندگی اور موت کی جنگ تھی ہمارے آٹھوں کتے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بڑے موثر انداز میں حملہ کرنے میں مصروف تھے۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے میری پشت میں کسی نے زہر میں بجھا ہوا خنجر گھونپ دیا ہو۔ میں بجلی کی سی تیزی سے مڑا۔ ایک بھیڑیا نے مجھ پر پشت سے حملہ کر دیا تھا اور اس کے تیز دانت میرے چمڑے کے کوٹ سے ہو کر میرے شانے میں اتر گئے تھے۔

میں نے پوری قوت سے کلہاڑی کا ایک وار کیا اور اس کی کھوپڑی سے بھیجا نکل کر چاروں طرف بکھر گیا، اب میرے چاروں طرف مردہ نیم مردہ زخمی بھیڑیے پڑے تھے۔ میں نے کلہاڑیاں پھینک دیں اور رائفل کے دستے سے ان کے سر پاش پاش کر دیئے ان کے پیٹ پھاڑ ڈالے۔ بمشکل تمام دو تین بھیڑیے زندہ بچ سکے تھے اور اپنی جان بچا کر جنگل کی طرف بھاگے۔ جنگل جوان سے میلوں دور تھا لیکن اب بھوک کی آگ مٹانے سے زیادہ انہیں اپنی جان بچانے کی فکر لاحق تھی اور وہ ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر ہم سے دور چلے جانا چاہتے تھے میرے اعصاب شل ہو گئے تھے۔

میں اب بری طرح تھک گیا تھا اور واقعی نڈھال ہو چکا تھا۔ میں نے دیکھا کہ جین اب ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھی۔ کمبل اس نے ایک طرف رکھ دیا تھا اب وہ کسی قدر مطمئن نظر آ رہی تھی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے دونوں گھٹنے زمین پر ٹیکتے ہوئے خدا کے حضور شکر ادا کرنا شروع کر دیا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور رائفل کے ٹوٹے بٹ کو چوم کر اپنی آنکھوں سے لگانے لگی۔ میں کسی جنونی اور دیوانے کی طرح اس کی یہ حرکتیں دیکھ رہا تھا۔

ہر طرف ایک پراسرار خاموشی چھائی ہوئی تھی اور برف کے چٹخنے یا لکڑیوں کے سلگنے کی آواز کبھی کبھی اس خاموشی کا سینہ چیر جاتی تھی۔ میری چھٹی حس مجھے پھر خبردار کر رہی تھی کہ یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تھی۔ میں نے اچانک کلائین کی طرف دیکھا کلہاڑی ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی وہ ابھی تک اپنے حواس بحال نہیں کر سکا تھا۔

لیکن نہیں وہ ہوش میں تھا۔ اس نے ایک شیطانی مسکراہٹ اپنے لبوں پر بکھیرتے ہوئے ہولناک نگاہوں سے جین کی طرف دیکھا پھر اپنی زبان ہونٹوں پر پھیرتے

ہوئے کلہاڑی تولتا ہوا میری طرف بڑھا۔ ''ٹائیگر۔ ہوشیار ہوجاؤ!'' جین چیخی۔

میں اب خود کو پوری طرح مستعد اور تیار کرچکا تھا۔

''جہاں میں نے اتنے خونخوار درندوں کا مقابلہ کیا تھا وہاں ایک درندہ اور سہی۔'' یہ خیال میرے لئے باعث تقویت تھا کہ ''جین کے دل میں میرے لئے محبت تھی اور وہ کبھی خود کو کلا مین کے حوالے نہیں کرے گی۔'' اس خیال نے میرے اندر ایک غیر معمولی طاقت پیدا کردی تھی۔ میں بجلی کی سی تیزی سے جھکا اور کلا مین کی چلتی ہوئی کلہاڑی میری کھوپڑی کے قریب سے گزرتی ہوئی دور جا گری۔

کلا مین بڑی برق رفتاری سے بھاگا تاکہ کلہاڑی اٹھا سکے۔ میں نے اپنی ٹانگ اس کی ٹانگوں میں پھنسادی۔ وہ اس غیر متوقع حملے کے لئے بالکل تیار نہیں تھا وہ چاروں شانے چت جا گرا۔ میں نے فوراً اسے جالیا اور اس کے سر اور چہرے کو اپنے وزنی بوٹوں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ اچانک لیٹے لیٹے کلا مین نے اچھل کر میرے ناف کے نیچے ایک فلائنگ کک رسید کی تو میں درد کی شدت سے دوہرا ہوگیا۔ چند سیکنڈ بعد میں برف پر پڑا تھا اور کلا مین کے وزن تلے میرے سینے کی ہڈیاں کڑکڑا رہی تھیں۔

وہ پوری بربریت اور درندگی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اچانک اس نے ایک ہاتھ میری گردن سے اٹھالیا اور قریب پڑی ہوئی کلہاڑی اٹھا کر جین کی طرف پھینکی۔ جین شاید میری مدد کرنا چاہتی تھی۔ مجھے جین کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ کلہاڑی اس کی پنڈلی میں لگی تھی۔

اس خونریز جنگ میں ہمارے چار کتے بھی ہلاک ہوگئے تھے۔

اچانک مجھے قریب ہی سے ایک غراہٹ سنائی دی۔ آہ یہ کوئی بھیڑیا نہیں میرا سب سے جاندار کتا ہاک تھا۔ ہاک نے کلا مین کا ٹینٹوا اپنے خونخوار جبڑوں میں دبالیا تھا اور اس خونریز کھیل کا پانسہ ہی پلٹ دیا تھا۔ چند منٹ بعد کلا مین بے ہوش ہوگیا تھا، اب وہ بے حد زخمی حالت میں تھا۔

میں نے جلدی سامان سمیٹا، برف گاڑی میں کتوں کو جوتا اور جین کو گود میں اٹھا کر برف گاڑی میں جا کر ڈال دیا، ہمیں جلد از جلد اس جہنم سے نکل جانا ہوگا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا کلا مین خود کیفر کردار کو پہنچ جائے گا۔

خس کم جہاں پاک؟ ٹھیک ہے ناں۔'' اور جین نے اپنی مرمریں بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔

مجھے کچھ پتہ نہیں، کچھ معلوم نہیں کہ اس مہم سے زندہ واپس آجانے کے بعد میں نے کیا کیا۔ ہاں میں چار دن اور چار راتیں متواتر سویا رہا۔ میں اس قدر تھک گیا تھا کہ بیان نہیں کرسکتا۔

جین اب واپس جانا چاہتی تھی لیکن وہ مصر تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔ ''تم کل میرے ساتھ فلوریڈا چل رہے ہوناں'' جین نے کہا۔

''شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ میں ایک قاتل ہوں جس کی تلاش میں سی آئی اے انٹرپول اور اسکاٹ لینڈ یارڈ کے علاوہ ایف بی آئی کے شکاری کتے لگے ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ تم اکیلی لوٹ جاؤ اور مجھے میری دنیا میں ہی رہنے دو۔''

''نہیں۔ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میں ایسا نہیں کرسکتی، میں دیکھ چکی ہوں کہ تم ایک بہادر، دلیر اور جواں مرد انسان ہو، میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی کیا میں تمہاری شریک حیات نہیں بن سکتی۔''

میں نے اس کی اس بات کا جواب وہاں نہیں دیا اگلا دن اتفاق سے اتوار تھا، میں نے اس کا بازو تھاما اور جا کر فادر کے سامنے کھڑا ہوگیا، اب ہم قانونی اور شرعی طور پر میاں بیوی بن چکے تھے۔

کہانی جب ختم ہوگئی تو شاگرد بولا۔ ''استاد کہانی ختم ہوگئی۔'' یہ سن کر رولوکا مسکرانے لگا۔

کہ اتنے میں رولوکا نے ایک نادیدہ کارندہ کی دل دہلا دینے والی، دل و دماغ کو مبہوت کرتی، بدن پر لرزہ طاری کرتی، رگوں میں خون کو منجمد کرتی اور پورے جسم پر سکتہ طاری کرتی سرگوشی کان کے پاس سنائی دی۔

(جاری ہے)

بدروح بلی

خالد شاہان۔ صادق آباد

سامنے موجود ہیولہ نے اچانک ایک عورت کا روپ دھار لیا اور اس کے کئی ہاتھ نمودار ہو کر آگے کو بڑھنے لگے اور پھر دو ہاتھوں نے سامنے کھڑے سادھو کو دبوچ لیا گرفت سخت تھی کہ سادھو اپنی جگہ ساکت ہو گیا.

جادوئی عمل کا لرزہ براندام کرتا عجیب وغریب شاہکار افسانہ جو کہ دلوں پر ہیبت طاری کر دے گا

اس بلی کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو مجھے اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔ اگرچہ ڈرنے کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ مگر پھر بھی اس سے ایک انجانا سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو سادھو اس سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بلی اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

سادھو بلی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں باتیں کر رہا تھا کہ جیسے وہ بلی نہیں بلکہ انسان ہو۔

''تمہاری سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ تم ہدایت کو غور سے نہیں سنتیں۔ اسی وجہ سے اس پر عمل درآمد نہیں کر پاتی۔ اپنی یہ کمزوری دور کرو۔''

بلی کی نگاہیں سادھو کی نگاہوں میں جیسے پیوست تھیں۔

سادھو کہہ رہا تھا۔ ''میں یہ نہیں کہتا کہ تمہاری کمزوری ایک ہی دن میں ختم ہو جائے گی۔ کوئی بھی کی یا

خامی ایک ہی دن میں نہیں دور ہوتی آہستہ آہستہ دور ہوتی ہے۔کوشش کرو، کروگی تو ناں کوشش۔"
بلی نے اثبات میں گردن ہلائی۔"تم ناراض تو نہیں ہوگئیں میری باتوں سے۔" سادھو نے پوچھا۔ بلی نے نفی میں گردن ہلائی۔"شاباش اب جاؤ مگر دیکھو زیادہ دور نہ جانا۔ بس اتنی دور رہو کہ جب میں تمہیں بلاؤں تو تمہیں آنے میں دیر نہ لگ جائے۔" سادھو کی بات ختم ہونے پر وہ کھڑی ہوئی اور اس نے احترام سے اپنا سر جھکایا۔ اور ایک طرف کو چلنے لگی۔
میں دور کھڑا یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ دراصل میں سادھو سے ملنے اس کے پاس گیا تھا۔ مگر اس کی بلی سے اس دوران گفتگو سن کر ٹھٹھک گیا تھا۔ بلی میرے قریب سے مجھے گھورتی ہوئی گزر گئی۔ میں نے ہلکے سے آواز دی۔"میں اندر آسکتا ہوں۔ سادھو صاحب۔"
"آجاؤ۔"
میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ یوں کہنا چاہئے کہ میں تازہ بہ تازہ لاہور کے سائٹ ایریا میں پہنچا تھا۔ جہاں مجھے ایک زیرِ تعمیر پروجیکٹ میں ملازمت ملی تھی۔ یہ علاقہ شہری آبادی سے کافی فاصلے پر تھا۔ اس علاقے میں ایک دو ایسے ہی پروجیکٹ کی تعمیر ہورہی تھی اور ان میں کام کرنے والوں کے علاوہ اور کوئی یہاں آباد نہ تھا۔ ان پروجیکٹس میں کام کرنے والے اعلیٰ عہدیدار روزانہ شہری آبادی سے یہاں آتے جاتے تھے۔ باقی کا تمام عملہ یہاں مقیم ہوتا تھا۔ مگر یہاں دور دور تک لق و دق ریگستان کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔
اس جگہ ایک ہوٹل تھا جو کہ سادھو ہوٹل سے مشہور تھا۔ جہاں ہم جیسے دور دراز سے آئے ہوئے کام کرنے والوں کو طعام و قیام کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ زیرِ تعمیر پروجیکٹس کے مالکان نے کچھ کوارٹرز بھی تعمیر کئے تھے۔ جس میں دوسرے درجے کے افسران کو رہائش وغیرہ کی سہولت حاصل تھیں۔ مگر ہم جیسے نچلے درجے کے کارکنوں کے بس کی بات نہیں تھی۔ کہ ان میں رہیں کیونکہ ان کا کرایہ وغیرہ کافی تھا۔

سادھو ہوٹل کوارٹروں کے مقابلے میں بہت سستا تھا۔ جہاں قیام و طعام کی سہولت حاصل تھی رہائش کی جگہ ایک بستر، الماری، اور ایک کرسی ہر ضرورت مند کارکن کو دی جاتی تھی صبح کے ناشتے سے لے کر رات کے کھانے تک کا بندوبست تھا۔ جبکہ دیگر اوقات میں چائے یا دوسری چیزوں کے حصول کے لئے نقد ادائیگی کرنی پڑتی تھی۔
میں سادھو کے قریب جاکر کھڑا ہوا تو اس نے غور سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ پھر بولا۔"تم نئے آنے والوں میں سے ہو۔"
"جی ہاں....." میں نے کہا۔
"کہاں سے آئے ہو؟"
"جھنگ ام سے۔"
"کیا نام ہے؟"
"کاشف۔" میں نے جواب دیا۔
"یہاں میرے اس چھوٹے ڈھابے جیسے ہوٹل میں رہنے کی سہولت چاہتے ہو۔"
"جی ہاں۔"
"تمہارے ساتھیوں نے تمہیں بتادیا ہوگا کہ یہاں کے کیا طور طریقے ہیں۔ اپنا شناختی کارڈ ساتھ لائے ہو۔"
"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔
"شناختی کارڈ ہم اس لئے جمع کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ کھا پی کر چپکے سے بھاگ جاتے ہیں مگر ہم بھاگنے والوں کو معاف نہیں کرتے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ہم دوبارہ پکڑ کر واپس لے آتے ہیں۔ خیر یہ الگ دردسری ہے اس لئے شناختی کارڈ اپنے پاس رکھتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے سادھو صاحب مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے اسے اپنا شناختی کارڈ دے دیا۔ سادھو اپنی شخصیت کے اعتبار سے کافی پراسرار تھا خاصا دراز قد، لیکن بے حد دبلا پتلا گویا ہڈیوں پر جیسے چمڑے کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔ وہ جتنا آسانی اور

روانی کے ساتھ عربی بولتا تھا اتنی ہی روانی کے ساتھ کافی زبانیں بھی بول لیتا تھا۔ اور وہ اس علاقے میں ہوٹل کب سے چلا رہا تھا ابتداء میں مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہ تھا لیکن قیاس غالب تھا کہ اس علاقے میں کام شروع ہونے کے بعد ہی وہ ادھر آیا ہوگا۔

"تمہارا سامان کدھر ہے؟" اس نے پوچھا۔

"جدھر کام ہو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تم جب بھی ادھر آؤ اپنا سامان لیتے آنا۔ تمہیں تمہارا بستر اور دیگر سامان تیار ملے گا۔"

شام کو میں دیگر کارکنوں کے ساتھ سادھو کے ہوٹل میں آیا۔ لکڑی کا ایک تخت لوہے کی ایک پلے والی الماری اور ایک معمولی نوعیت کی کرسی، کرسی اور تخت پر میرے نام کی پرچی لگی ہوئی تھی وہاں کی سب سے اچھی بات جو مجھے فوری طور پر محسوس ہوئی اس کا ٹھنڈا ہونا تھا۔ باہر کی آگ برساتی گرمی کے مقابلے میں یہاں کا موسم خاصا خوشگوار تھا۔

رات کے وقت کھانا وغیرہ کھا کر میں کچھ کارکن ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ لگانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد آدھی بتیاں گل ہوگئیں تو وارث بولا۔ "جاؤ اب اپنے بستر پر چلے جاؤ۔"

"اتنی جلدی کیوں؟"

"آدھی بتیاں بجھنے کا مطلب ہے سونے کی تیاری کرو۔"

"کوئی ضروری نہیں جب ہمارا دل چاہے گا تو سوئیں گے۔" میں نے کہا۔

"کاشف ایسی بات نہیں، یہاں سب کچھ اصولوں کے مطابق کرنا ہے۔" وارث نے ہلکے لہجے میں کہا۔ "ابھی بلی گشت کرے گی۔"

"اس کا کیا مطلب ہوا؟"

"یہ سادھو کی خاص بلی ہے۔ وہ گشت پر آتی ہے اگر کسی کو اس کے بستر پر نہیں دیکھتی تو۔"

"تو کیا کرتی ہے؟" میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ "میاؤں کر کے دھمکاتی تو نہیں۔"

وارث نے قدرے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ "یار اس بارے میں ایسی باتیں نہ کرو۔"

"کیوں وہ بلی ہے یا کوئی بلا..."

"پتہ نہیں وہ کیا بلا ہے۔" وارث نے کہا۔ "تم آہستہ آہستہ خود اس کے بارے میں جان جاؤ گے۔" اور یہ کہنے کے ساتھ ساتھ اس نے چادر تان کر منہ چھپالیا۔

تھوڑی دیر بعد بلی آئی۔ بستروں کے درمیان سے گزرنے لگی سارے لوگ اپنے اپنے بستروں پر دم سادھے لیٹے رہے۔ میں بھی ان کی تقلید کر رہا تھا مگر ذرا سی چادر سرکا کر بلی کو دیکھنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب وہ میرے بستر کے قریب سے گزرنے لگی تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے کان کے پاس منہ لا کر سرگوشی کی ہو۔ "اپنا منہ ڈھانپوں اور سونے کی کوشش کرو۔" یہ میرے کسی ساتھی کی آواز نہ تھی۔ "تو پھر کیا یہ بلی کی آواز تھی۔" مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بلی ہماری طرح بول بھی سکتی ہے میں نے فوراً اپنا منہ ڈھانپ لیا۔

بستروں کی دوسری یا تیسری قطار سے ذرا دیر بعد کسی نے سسکاری لیتے ہوئے۔ "ارے باپ رے۔" کہا تھا۔ جبکہ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ساری بتیاں گل ہوگئی تھیں۔ جس کا مطلب تھا بلی کا گشت ختم ہوگیا ہے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا تھا۔ جلد ہی میرے ساتھ والے بستر سے خراٹوں کی آوازیں آنے لگی تھیں میری چونکہ یہ پہلی رات تھی اس لئے میں دوسروں کی طرح سو نہ سکا۔

دوسرے دن کام کے دوران میں نے ایک ساتھی سے کہا۔ "یار یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ ہوٹل میں اتنی جلدی سونے پر کیوں اصرار کیا جاتا ہے۔"

"سادھو کا اصول ہے کہ جلدی سو جاؤ۔ تاکہ صبح جلدی اٹھ سکو دیر سے سونے والوں کی صبح سویرے اٹھنے پر نیند پوری نہیں ہوتی اور جب بندے کی نیند پوری نہ ہوگی تو وہ دن بھر دلچسپی سے کام نہیں کر پائے گا۔" وہ بولا۔

چونکہ میں جلدی سونے کا عادی نہیں تھا اس لئے
پہلی دوسری راتوں کو مجھے جھٹ پٹ نیند نہیں آئی تھی
میں دم سادھے لیٹا رہا مگر اندھیرا ہونے کے بعد میں
اپنے منہ پر سے چادر ہٹا دیتا تھا۔

جانے کتنا وقت گزرا ہوگا۔ اس وقت کیا بجا
ہوگا۔ مجھے صحیح اندازہ نہیں تھا۔ یہ تیسری رات کا واقعہ تھا۔
مجھے یوں لگا کہ اندھیرے میں بھی کوئی گشت کررہا ہے۔
مگر جب وہ ہمارے بستروں کے رو سے گزرا تو مجھے
یوں لگا کہ وہ کوئی بلی نہیں شیر ہے۔ یا ایسی جسامت کا
کوئی اور شے، شے میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ
انسانوں جیسی دو پیر والی مخلوق محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پتہ
نہیں یہ مخلوق بستروں کی کون سی قطار میں تھی۔ کہ مجھے
ایک بار اندھیرے میں دو چمکتی ہوئی چیزیں نظر آئی
تھیں۔ مگر یہ دو دہکتے ہوئے انگارے کسی طرح بھی بلی
کی آنکھیں نہیں تھیں ڈر کے مارے میں نے اپنا منہ
چادر سے ڈھک دیا۔

ہاں یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ پہلی رات
گزرنے کے بعد دوسری صبح ناشتہ کرتے وقت ایک
ساتھی کو میں نے اپنی دائیں پنڈلی کو بار بار سہلاتے
ہوئے دیکھا۔ جو سرخ ہورہی تھی اور لگتا تھا جیسے وہاں
کوئی گہری چوٹ لگی ہو۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا
ہوا ہے؟''

اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا۔ ''بلی۔''
مگر وہ ایک دم چپ ہوگیا تھا۔ جیسے اس نے مغالطے میں
یہ لفظ منہ سے نکال دیا ہو دوسرے ساتھی کھانے میں اسی
طرح مشغول ہوگئے۔ جیسے کسی نے کچھ سنا ہی نہیں
ہے۔ اسی لمحے بلی سامنے سے آتی ہوئی نمودار ہوئی۔ وہ
ایک جگہ آکر یوں بیٹھ گئی جیسے ہماری نگرانی کررہی
ہو۔ سائٹ پر پہنچ کر میں نے کام کرنے کے دوران ایک
آدمی سے پوچھا۔ ''اس کی پنڈلی سے بلی کا کیا تعلق؟''
تو اس نے ادھر ادھر دیکھ کر دھیرے سے کہا۔ ''رات تم
نے ایک ہلکی سی چیخ سنی تھی۔ نا۔'' ''ارے باپ رے۔''

''ہاں سنی تھی۔''

''وہ غالباً مکمل طور پر بستر پر دراز نہیں ہوا ہوگا۔
ہنڈا بلی نے اس کے پیر پر پنجہ یا منہ مارا ہوگا۔'' وہ بولا۔

''مگر یار وہ تو...'' میں نے کہا۔

''وہ بلی نہیں بلا ہے۔ اپنا کام کرو۔'' کہتے
ہوئے وہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔

چند روز بعد وارث سے میری اچھی خاصی
دوستی ہوگئی تھی اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ میرے
ساتھ ہی کام کرتا تھا دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کے بستر
کے برابر میرا بستر تھا۔

میں نے آہستہ آہستہ کام کے دوران اس پر
اسرار بلی کے بارے میں اس سے معلومات حاصل کرنا
شروع کردی یہاں کے متعلق اسے بہت سی باتوں کا علم
تھا۔ ایک دن میں نے اس سے پوچھا۔ ''یار وارث اس
ہوٹل میں سب لوگ اس بلی سے کیونکہ ڈرتے ہیں؟''

''وہ بلی نہیں بلا ہے۔ بلا۔'' وہ بولا۔

''یہ تو سبھی اس کے بارے میں کہتے ہیں۔
مگر ایسا سمجھنے یا کہنے کی وجہ؟''

''وہ، وہ بہت خطرناک بلی ہے۔ شیر سے بھی
زیادہ خطرناک۔''

''آخر اس کی کن باتوں کی وجہ سے اسے ایسا
سمجھا جاتا ہے۔''

''اس کی کچھ باتوں کا اندازہ تو تم خود بھی
لگا چکے ہو۔ جبکہ اس کی بہت سی باتوں کا علم بہت سے
لوگوں کو نہیں ہے۔'' وارث بولا۔

''مثلاً۔''

''مثلاً یہاں سے ایک بار ایک لڑکا بھاگا تھا۔''

''مگر یہاں تو شناختی کارڈ وغیرہ جمع ہوتے
ہیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ ایسا عاجز آگیا تھا۔ یہاں سے کہ اپنے
سامان کے بغیر ہی بھاگا تھا اور رات کی تنہائی سنانے اور
اندھیرے میں وہ جانے کتنی دور تک بھاگا تھا۔ اسے
امید تھی کہ وہ صبح ہوتے ہوتے شہری آبادی تک پہنچ
جائے گا۔ مگر۔

"تو کیا وہ پکڑا گیا۔"

"ہاں۔"

"مگر اس میں بلی کا کیا کردار تھا؟"

"یہ بلی کا تو ہی کارنامہ تھا۔"

"بلی نے اس موقع پر کیا کیا؟"

"رات کو غالباً گشت کے دوران بلی کو معلوم ہوا کہ ایک بستر خالی ہے۔ بس ذرا دیر بعد اسے پتہ چل گیا کہ وہ یہاں سے فرار ہوگیا ہے۔ بلی اس کے تعاقب میں نکل پڑی اور ذرا دیر بعد ہی اسے جالیا۔ صبح جب ہم لوگ بیدار ہوئے تو نوجوان کو خون میں لت پت ہوٹل کے باہر پایا۔ جس کے پاس بلی بیٹھی گویا پہرہ دے رہی تھی۔ اس کے منہ پر خون کے دھبے صاف نظر آرہے تھے۔"

"نوجوان نے بتایا نہیں کہ وہ کیسے گرفتار ہوا۔ اور اس حال کو کیونکر پہنچا۔"

اس وقت تو وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ مگر جب علاج معالجے سے اچھا ہوگیا تو اس نے اپنے چند قریبی ساتھیوں کو بتایا کہ "میں اندھیری رات میں پیچھے دیکھے بنا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا اور مجھے امید ہو چلی تھی کہ تھوڑی دیر بعد شہری آبادی تک پہنچ جاؤں گا مگر مزید کچھ دور جانے کے بعد میں لڑکھڑا کر بری طرح گر گیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے پیچھے سے کسی نے مجھ پر حملہ کیا ہو۔ گرنے کے بعد میں ابھی سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھ پر دوبارہ حملہ ہوا۔ مگر فوراً ہی مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ کوئی شیر تو نہیں آیا، پھر مجھے احساس ہوا کہ یہاں دور تک جنگل نہیں تو شیر کہاں سے آئے گا۔

مگر ایک غراہٹ جو بعد میں سنائی دی تھی وہ شیر ہی جیسی تھی اس کے دونوں حملے اتنے شدید تھے کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہ رہا پھر آہستہ آہستہ مجھ پر غشی طاری ہونے لگی جانے کتنی دیر بعد میرے کچھ کچھ حواس بحال ہوئے تو مجھے یوں لگا کہ جیسے کسی نے مجھے اپنے منہ میں دبا رکھا ہو اور اسی حالت میں آگے بڑھ رہا ہے۔

ہزاروں خواہشیں ایسی......!

خواہش ایک ایسے بے لگام گھوڑے کی طرح ہوتی ہے جو منزل کا تعین کئے بغیر سرپٹ آگے بڑھتا جاتا ہے۔ یہ خودرو پودے کی طرح دل میں پیدا ہوتی ہے اور نفس کی آبیاری سے پھل پھول کر تناور درخت بن جاتی ہے۔ اس کی جڑیں خون میں شامل ہو کر پورے جسم کو جکڑ لیتی ہیں۔ خواہش ایک ایسے ضدی بچے کی طرح ہوتی ہے جو اپنی من مانی کے لئے ہر وقت مچلتا رہتا ہے۔ سیلاب کے اس بپھرے ہوئے پانی کی طرح ہے جس کے آگے بند باندھنا ناممکن ہوتا ہے۔

بنیادی خواہشات دو طرح کی ہوتی ہیں، فطری اور نفسانی، فطری خواہشات قدرتی ہوتی ہیں جو فطری تقاضوں کے مطابق اپنے وقت پر پوری ہوتی چلی جاتی ہیں جبکہ نفسانی یا دنیاوی خواہشات نفس کے زیر نگرانی دل میں پلتی ہیں۔ اگر انہیں بے جا لاڈ پیار سے پالا جائے تو یہ بگڑ کر انسان کے اپنے لئے وبال جان بن جاتی ہیں۔

نیک خواہشات، دعا کی شکل میں اپنے پیاروں کو تحفتاً پیش کی جاتی ہیں جبکہ بری یا بدخواہشات ہوس بن کر ایمان کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ بے جا خواہشات اس اندھے کنویں کی طرح ہوتی ہیں جس میں اگر کوئی انسان گر جائے تو اس کا بچ نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

یوں سمجھئے کہ جیسے بلی اپنے منہ میں اپنے بچوں کو دبا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح مجھے کوئی لئے جارہا تھا۔ میں اس کے علاوہ اور کچھ سوچ نہ سکا۔ کہ شیر مجھے اپنی کچھار تک لے جارہا ہے اور وہاں لے جاکر مجھے چیر پھاڑ کر کھا جائے گا اس تصور کے بعد مجھ پر ایسا خوف طاری ہوا کہ میں دوبارہ بے ہوش ہوگیا مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں ہوٹل کے سامنے پڑا تھا۔

''یہ منحوس بلی میرے سامنے بیٹھی اپنے منہ پر جمے ہوئے میرے خون کے قطرے چاٹ رہی تھی۔''

''واقعہ سن کر میرے بھی رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ ''واقعی یہ بلی نہیں..... کوئی بلا ہے۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ذرا دیر تک سناٹے میں رہنے کے بعد میں نے کہا۔ ''وارث یہ سب کیا ہے؟''

''یہ سب سے تمہاری مراد کیا ہے؟''

''یہی کہ بلی۔ سادھو اور ہوٹل..... وغیرہ۔''

''بات دراصل یہ ہے شبیر کہ زیادہ پیسے اور بہتر مستقبل کے خیال سے ہم جیسے مجبور لوگ اس بیابان میں چلے تو آتے ہیں مگر جب یہاں آکر لوگوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ دولت کی لالچ میں آکر جہنم کی چاردیواری میں قید ہوکر رہ گئے ہیں تو یہاں سے بھاگنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ شروع شروع میں یہی ہوتا رہا۔ کہ اکثر آنے والے موقع ملتے ہی نکلتے تھے ان چیزوں کو روکنے کے لئے ان پروجیکٹوں کے مالکوں نے یہ بندوبست کیا۔''

''تمہاری یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی پیارے۔ یہ بندوبست سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

''میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔'' وارث نے کہا۔

''یہ سادھو کالے جادو کا ماہر ہے۔ جو اس پروجیکٹ کے ٹھیکیدار ہیں، سادھو سے ملے اور صورت حال کا ذکر کرکے اس پر قابو پانے کا مشورہ طلب کیا۔''

جس پر سادھو یہاں آکر اس ہوٹل کا مالک بن کر حالات کنٹرول کرنے لگا۔ اور اپنے اصولوں پر اسے چلانے لگا اور یہ بلی۔ اس بلی کو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

''یعنی یہ جادوئی بلی ہے۔''

''ہاں خیال یہی ہے کہ یہ خاص بلی وہ خاص طور پر اس لئے اپنے ساتھ لایا ہے کہ یہاں کے حالات پر وہ کنٹرول کرسکے۔'' اس کے بعد بھی وقتاً فوقتاً اس بلی اور سادھو کے بارے میں مجھے کچھ نہ کچھ اطلاعات ملتی رہتی تھی۔

کوئی ایک سال بعد میرا مطلب ہے کہ میرے وہاں پہنچنے کے ایک سال بعد ہمارے ریوڑ میں کچھ اور لوگ آئے ریوڑ میں نے اس لئے کہا کہ ہم لوگ یہاں جانور جیسی زندگی گزار رہے تھے۔ نئے آنے والوں میں ندیم نامی ایک نوجوان تھا۔ وہ کراچی سے آیا تھا اس کے بارے میں ہمیں آہستہ آہستہ بعد میں پتہ چلا کہ وہ بہت پہنچا ہوا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ وہ حافظ قرآن اور عالم دین تھا۔ اور پانچ وقت کا نمازی بھی تھا۔

سادھو نے اسے خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا تھا مگر دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ نہیں کہا۔

دونوں نارمل طریقے سے ملے تھے۔ مگر دونوں کو ایک دوسرے میں غالباً کچھ غیر معمولی باتیں نظر آرہی تھیں۔ پھر چند دنوں بعد ندیم کو سادھو کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوگئی تھیں۔

سادھو کی بلی نے بھی ندیم کو دیکھ کر اپنی بے چینی اور بے قراری کا اظہار کیا تھا۔

ندیم نے آہستہ آہستہ ہم لوگوں سے دوستی بڑھانی شروع کردی۔ اور یہاں کے حالات سے واقفیت حاصل کرنے لگا۔ پھر اس نے ہم سے یہ کہنا شروع کیا۔ ''ہم اپنے شہر سے دور بال بچوں کو چھوڑ کر اس لئے نہیں آئے کہ ایسے لوگوں کے چنگل میں آکر قید ہوجائیں مجھے پتہ چلا ہے کہ یہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنہیں برسوں سے گھر جانے کی اجازت نہیں ملی ہمارے خط جو ہم گھر بھجواتے ہیں وہ سنسر ہونے کے بعد بھجوائے جاتے ہیں ہمیں جو تنخواہ ملتی ہے وہ یہاں کٹ کٹا کر آدھی رہ جاتی ہے اور سادھو جانے کس کس بہانے

اس میں سے اپنا حصہ نکال لیتا ہے۔ ہمیں یہاں سے شہر تک آنے جانے کی بھی سہولت میسر نہیں اس لئے کہ ہم کہیں بھاگ نہ جائیں یا یہاں کے بارے میں باہر والوں کو پتہ نہ چلے۔"

"مگر ان باتوں کا ذکر کرنے کا کیا فائدہ ہوگا۔" ندیم نے کہا۔ "یہ فائدہ ہوگا کہ ہم میں اپنی آزادی کا جذبہ جاگے گا۔"

"یہاں تو ہماری سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں کو بھی سلب کر دیا گیا ہے۔"

"ہمارے دلوں میں جذبہ کیسے جاگے گا؟"

"سب سے پہلے ہمیں اپنے دلوں سے یہ خیال نکال دینا ہوگا کہ یہ سب چھوڈائی ہے۔ ان حالات سے ہم نجات حاصل نہیں کر سکتے۔"

"اس سے کیا ہوگا۔"

"اس سے ہم مایوسی کے آسیب سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور جب مایوسی کے بادل چھٹ جائیں گے تو ہم اپنی بقاء کی جنگ لڑنے کے قابل ہو جائیں گے۔"

"اپنی بقاء کی جنگ۔" وارث نے بڑے عجیب انداز میں کہا۔

"کیا ہم اپنی بقاء کی جنگ لڑ نہیں سکتے۔"

"مگر...... وہ...... وہ بلی۔"

"سب کا بندوبست ہو جائے گا۔ میں نے سب کا علاج تلاش کر لیا ہے۔ بلی کا بھی اس کے مالک کا بھی۔" ندیم نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ پھر اس نے ہم سب کو بتانا شروع کیا کہ "سادھو اور اس کے جادو کا توڑ اللہ کے کلام پاک میں ہے۔ ہم اللہ کے کلام سے اس کے جادو کو زائل اور بے اثر کر دیں گے۔" اس کے بعد ندیم نے ہمیں کچھ وظیفے بتائے۔ کچھ دعائیں یاد کروائیں اور کہا کہ "روزانہ صبح اور رات میں آیت الکرسی پڑھ کر اپنے بدن پر پھونک لیا کرو اور جب وہ آسیبی بلی آئے تو آیت الکرسی پڑھ کر اس کے سامنے پھونک دیا کرو۔" اس نے چائے پانی اور کھانے کو بھی دم کر کے کھانے کو کہا۔

جلد ہی ہم سب نے سادھو اور اس کی بلی کو اپنے سامنے بہت بے بس پایا۔ وہ بلی شیر کی طرح غراتی اور پھر بے بسی کے عالم میں واپس چلی جاتی۔

سادھو کو اپنے عمل کے زور سے معلوم ہو گیا تھا کہ ندیم اس کی حکومت کو تباہ کرنے آ گیا ہے لہٰذا اس نے موقع ملتے ہی ندیم پر حملہ کر دیا جس سے ندیم کو جانی نقصان تو نہیں پہنچا پر وہ اپنے ہاتھوں کو لے کر بیٹھ گیا ہم سب ندیم کو اس حال میں دیکھ کر گھبرا گئے تھے مگر اس نے مسکرا کر کہا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تم سب اپنے اپنے ورد اور وظیفے پڑھتے رہو۔ تم لوگوں کو کچھ نہیں ہوگا۔ اور ہاں اب تک میں کھل کر جنگ نہیں کر رہا تھا اب سادھو نے پہل کی ہے تو مجھے جواب تو دینا ہی پڑے گا۔ میرے تکیے کے نیچے ایک تعویز ہے اسے تم میں سے کوئی کسی طرح بلی کے گلے یا اس کے پیر میں باندھ دے۔"

یہ بڑا مشکل کام تھا۔ اور اس کے لئے کوئی تیار نہیں ہو رہا تھا کہ وارث نے کہا۔ "ندیم بھائی، یہ کام میں کروں گا۔"

اور سچ مچ وارث نے یہ کام کر دیا۔ بلی آنکھیں موندے سو رہی تھی کہ وارث نے اس کے پیر میں تعویز باندھ دیا ذرا دیر بعد ہی بلی بیدار ہو گئی۔ مگر لمحہ بہ لمحہ اس کی حالت میں تبدیلی آنے لگی تھی۔ پہلے وہ بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر پھری پھر اسکی غراہٹ بڑھ گئی۔ درمیان میں وہ میاؤں میاؤں بھی کرتی جاتی تھی مگر اس میاؤں میاؤں میں بڑی بے چینی کی سی کیفیت تھی۔

سادھو گھبرا کر اس کے پاس آیا۔ "کیا ہو گیا ہے تم کو، تم کیوں چلا رہی ہو؟" وہ یہ کہتے ہوئے اس کی طرف بڑھا کہ بلی نے سادھو پر اچانک چھلانگ لگائی اور سادھو کے چہرے پر پنجہ مارا اس اچانک افتاد سے سادھو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور دھڑام سے نیچے گر پڑا اور بلی نے جیسے اسے جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔

تماشہ دیکھنے والوں کے لئے یہ حیرانی کا سبب تھا کہ سادھو میں جانے کہاں سے اتنی طاقت آ گئی تھی کہ

اس نے بلی کو دبوچا اور دور اچھال کر پھینک دیا۔

اب بلی اچھل اچھل کر سادھو پر حملہ آور ہو رہی تھی جب وہ دوبارہ اچھلی تو ہمیں یوں لگا تھا کہ جیسے کوئی شیر چھلانگ لگا کر حملہ آور ہو رہا ہو۔ دیکھتے ہی دیکھتے بلی نے سادھو کو لہولہان کر دیا اس کے چہرے پر ہی نہیں جسم کے مختلف حصوں پر زخم نظر آر ہے تھے۔

اچانک سادھو نے کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔

اس کی آواز تیز سے تیز ہونے لگی۔ وہ کس زبان میں بڑبڑا رہا تھا۔

وہ کیا کہہ رہا تھا ہم میں سے کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ غالباً کوئی جادو کے بول تھے۔

ذرا دیر بعد بلی اچھلی اور جب واپس زمین پر آئی تو اس کا جسم بے حس و حرکت تھا۔ پھر بلی کے جسم سے گاڑھا گاڑھا دھواں نکلنے لگا اور جب دھواں چھٹا تو اس کے قریب ہی نہایت بدہیت ایک عورت کھڑی تھی۔ جس نے منمناتی ہوئی آواز میں سادھو سے کہا۔ "سادھو تم نے میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ میں اتنے دنوں تک تمہاری خدمت کرتی رہی اس کا تم نے یہ صلہ دیا۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔" یہ کہتے ہوئے وہ اپنی تمام تر ہیبت ناکیوں کے ساتھ سادھو کی طرف بڑھی۔

"رک جا ... رک جا" میری بات سن۔" سادھو چیخا۔

"سننے کا موقع تم نے خود کھو دیا ہے سادھو۔ میرا پورا وجود تمہارے جادو کے زور سے آگ کی طرح دہک رہا ہے۔"

سادھو نے جب یہ حالت دیکھی تو اپنے بچاؤ کے لئے اور کچھ پڑھنے لگا اس سے بلی کا آسیب اور مشتعل ہو گیا اور اس نے سادھو کی طرف اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔ سادھو کے عمل نے اس ہیبت ناک عورت کے پھیلے ہوئے ہاتھ کو غالباً روک دیا تھا۔ مگر حیرت انگیز طور پر اس عورت کے جسم سے دو ہاتھ مزید نمودار ہوئے اور پھر ان ہاتھ کی تعداد میں منٹوں کے وقفے میں اضافہ ہو گیا پھر اس نے آگے بڑھ کر سادھو کو دبوچ لیا، عجیب منظر تھا اس عورت کے دونوں ہاتھ سادھو کا گلا دبا رہے تھے اور اس کے کچھ ہاتھ سادھو کے جسم کے دوسرے حصوں کو توڑ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سادھو بے حس و حرکت ہو کر ڈھیر ہو گیا اب اس بدروح نے مڑ کر ہم سب کی طرف دیکھا ہم سب کا رواں رواں کانپ اٹھا تھا کہ یہ شاید ہم پر حملہ آور ہو گی۔ مگر اس نے منمناتی ہوئی آواز میں ہمیں مخاطب کیا۔

"مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں دوستو! میں تم سب کی احسان مند ہوں کہ تم لوگوں کی کوشش سے میں اس بدبخت سادھو کی قید سے رہائی حاصل کر سکی۔ اس نے بلی کے اندر مجھے طویل عرصے سے قید کر رکھا تھا۔"

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا ندیم کی ہدایت کے مطابق ہم سب ورد کر رہے تھے۔

بدروح نے سادھو کا بے حس و حرکت جسم اپنے ہاتھوں میں اٹھایا اور چند لمحوں میں ہماری نظروں سے غائب ہو گئی۔

ہم سب نے خوشی کا نعرہ لگایا اور ندیم کی طرف پلٹے میرے علاوہ باقی سب کو اس بات کا دکھ تھا کہ اس جنگ کے چکر میں ندیم اپنے دونوں ہاتھوں سے معذور ہو گیا تھا۔ مگر ہم ندیم کے پاس گئے تو یہ دیکھ کر ہماری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ ندیم کے دونوں ہاتھ پہلے کی طرح بالکل صحت مند تھے۔ ہم سب ایک دوسرے سے گلے ملے۔ ایک دوسرے کو مبارک باد دی کہ اللہ نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے نجات دلائی۔ ندیم نے کہا۔

"دوستو! یہ بات ہمیشہ یاد رکھو کہ جو لوگ اللہ پر بھروسہ کر کے نیک نیتی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں تو وہ بڑی طاقت کو بھی اپنے آگے سرنگوں ہونے پر مجبور کر دیتے ہیں، ہمیشہ اللہ پر توکل کرو، کیونکہ "بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

کالا عمل

ملک نعیم ارشاد۔ ڈجکوٹ فیصل آباد

چند الفاظ زبان سے نکلے ہی تھے کہ ایک ڈراؤنا وجود کمرے میں ظاہر ہوگیا اس کی انگارہ برساتی آنکھیں دہشت زدہ تھیں اور جب اس کی کھرکھراتی ہوئی ڈراؤنی آواز نکلی تو کمرے میں موجود سارے لوگ دہل کر رہ گئے۔

حامد ٹیکسی سے نیچے اترا اور اس نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا اور پیچھے کو مڑا، اس کے سامنے یتیم خانہ کی بلڈنگ موجود تھی، وہ سینٹرل جیل سے سیدھا اسی طرف آیا تھا، وہ یتیم خانے میں اپنی بچپن کی محبت مینی اور اپنے رقیب شہروز سے ملنے آیا تھا۔

یتیم خانے میں داخل ہونے کے بعد وہ میڈم شگفتہ کے دفتر کی طرف بڑھا میڈم شگفتہ یتیم خانے کی انچارج تھیں میڈم شگفتہ نے اسے ناگواری سے دیکھا۔ ''کب چھوٹے تم جیل سے؟'' میڈم شگفتہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''جی ابھی رہا ہوا ہوں اور سیدھا یہیں آیا ہوں۔'' حامد نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہیں کرسی پر بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔'' میڈم شگفتہ نے غصے سے کہا۔

''اس کا مطلب آپ اب بھی مجھے قصوروار سمجھتی ہیں۔'' حامد نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
''تم قصوروار نہیں بلکہ قاتل ہو۔'' آخری الفاظ پر میڈم شگفتہ جیسے چیخیں۔
''نہیں ہوں میں قاتل میڈم شگفتہ۔'' جواباً حامد بھی چیخا۔ ''نہیں ہوں میں قاتل۔''
''اپنی آنکھوں سے میں نے تمہیں دیکھا ہے کلثوم کا قتل کرتے ہوئے۔'' میڈم شگفتہ نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔
''کیا دیکھا تھا آپ نے اس روز؟'' حامد نے پوچھا۔
''میں نے دیکھا میری بہن کلثوم فرش پر خون میں لت پت پڑی تھی اور جس خنجر سے اس کی موت ہوئی تھی وہ تمہارے ہاتھوں میں تھا اور وہ بھی خون سے لت پت۔'' میڈم شگفتہ نے غمگین لہجے میں کہا۔
''آپ نے خنجر کا وار کرتے ہوئے مجھے دیکھا تھا؟'' حامد نے میڈم شگفتہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔
''خون سے رنگا خنجر تمہارے ہاتھ میں تھا، سامنے میری بہن کلثوم مردہ پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کمرے میں کوئی نہیں تھا ظاہر ہے وہ قتل تم ہی نے کیا تھا۔'' میڈم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔
''لیکن آپ نے مجھے میڈم کلثوم پر وار کرتے ہوئے تو نہیں دیکھا تھا، میں آپ کو شروع سے ساری بات بتاتا ہوں۔''
اتنا کہہ کر حامد کچھ دیر کے لئے رکا شاید وہ اپنے ذہن میں بیتے خیالات کے تانے بانے سلجھانے لگا تھا۔
پھر وہ گویا ہوا۔ ''میڈم وہ قتل میں نے نہیں بلکہ شہروز نے کیا تھا۔'' حامد نے کہا۔
''کک...... کیا؟'' میڈم شگفتہ چلائیں۔ ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو تم، وہ تو اس روز کمرے میں ہی نہیں تھا...... بلکہ وہ۔'' میڈم شگفتہ کہتے کہتے رکیں۔
''میڈم میں آپ کو شروع سے ساری بات بتاتا ہوں۔'' دراصل شہروز کا لا عمل کرتا تھا۔'' حامد نے کہا تو میڈم شگفتہ حیرت سے بولیں۔
''کالا عمل...... یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔''
''میں سچ کہہ رہا ہوں میڈم، آپ کو یاد ہوگا جب عینی نے اس کا کھلونا چرایا تھا تو اس نے عینی کو خوب مارا تھا اور آپ نے اتنی بے دردی سے عینی کو مارنے پر شہروز کو سزا دی تھی...... دی تھی ناں۔'' حامد نے کہتے ہوئے تصدیق چاہی۔
''بالکل دی تھی۔'' میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔
''اور دوسرے دن لنچ کے وقت عینی کو چاول کھاتے وقت خون کی الٹیاں آئی تھیں، تو میں نے دیکھا شہروز اس وقت عینی کو غصے سے گھور رہا تھا اور منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔'' حامد نے بتایا۔
''یہ تو اس کے خلاف کوئی خاص ثبوت نہ ہوا......'' میڈم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
''آپ کو وہ بلی تو یاد ہوگی جو آپ کے کمرے میں مری پڑی تھی...... یاد ہے ناں آپ کو؟'' حامد نے کہتے ہوئے ایک مرتبہ پھر تصدیق چاہی۔
''ہاں مجھے یاد ہے......'' میڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔
''اس کا خاتمہ بھی شہروز نے ہی کیا تھا کیونکہ وہ بھی ایک دن پہلے اس کے پیروں پر سے گزر گئی تھی اور بلی کا بچہ اس کے پیر کی چھوٹی انگلی پر لگ گیا تھا اسی وجہ سے اس نے بلی کا خاتمہ کیا تھا...... اور آپ کو شہروز کے بیڈ کے نیچے وہ خوف ناک کھوپڑی کا نشان تو یاد ہوگا۔؟'' حامد نے پوچھا۔ ''ہاں مجھے یاد ہے......''
''عینی شہروز کے بیڈ کے نیچے بندھی پڑی ملی تھی...... عینی ایک دن اور ایک رات غائب رہی تھی ہم نے پورا یتیم خانہ چھان مارا تھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں مل رہی تھی ہم پولیس اسٹیشن خبر کرنے جا ہی رہے تھے کہ اکبر چوکیدار نے ہمیں آ کر بتایا کہ'' اس نے کل رات کے وقت عینی اور شہروز کو اکٹھے دیکھا تھا۔''
''ہم نے شہروز سے پوچھا تو اس نے صاف

لاعلمی کا اظہار کیا لیکن پھر میری بہن کلثوم کی نظر شہروز کے بیڈ کے نیچے پڑی..... ''وہ کیا ہے بیڈ کے نیچے؟'' اچانک کلثوم چلائی سب اس طرف متوجہ ہوئے سب کو شہروز کے بیڈ کے نیچے کسی چیز کی حرکت دکھائی دی اکبر نے جھک کر دیکھا تو وہاں عینی بندھی تھی، اکبر نے اسے باہر نکالا تو عینی کے منہ پر بھی لال پٹی بندھی ہوئی تھی، اکبر نے وہ پٹی ہٹائی تو عینی نے روتے ہوئے کہا..... ''مم..... مم..... مجھے..... مجھے شہروز نے باندھ کر اس بیڈ کے نیچے چھپایا تھا۔''

شہروز خونخوار نظروں سے عینی کو گھور رہا تھا۔

''اوئے..... یہ کیا ہے.....؟'' اکبر نے جھک کر شہروز کے بیڈ کے نیچے جھانکا۔

''کیا ہے بیڈ کے نیچے؟'' کلثوم نے حیرانگی سے پوچھا لیکن اکبر حیرت سے بیڈ کے نیچے دیکھ رہا تھا۔ ''بولتے کیوں نہیں اکبر۔'' میں نے آگے بڑھ کر اکبر سے پوچھا۔

''آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔'' اتنا کہہ کر اکبر اٹھا اور اس نے بیڈ اس جگہ سے کھسکا دیا سب حیرت سے بیڈ کے نیچے فرش کی طرف دیکھنے لگے فرش پر لال رنگ کے بڑے سے دائرے میں لال رنگ سے ایک کھوپڑی اور اس کے نیچے کراس کی شکل میں ہڈیوں کا نشان بنا ہوا تھا۔ ''یہ..... یہ..... کیا ہے؟'' کلثوم نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''پپ..... پتہ..... نہیں.....'' اکبر نے حیرت سے کندھے اچکائے۔

''کیا ہے یہ؟'' میں نے اپنے قریب کھڑے شہروز کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

''میں..... نہیں جانتا میڈم.....'' وہ غصے سے بولا۔

''تو اور کون جانتا ہے..... تمہارے بیڈ کے نیچے ہی تو یہ نشان بنا ہے..... اور تم نے عینی کو باندھ کر بیڈ کے نیچے کیوں چھپایا تھا۔'' میں نے ایک تھپڑ شہروز کے گال پر رسید کرتے ہوئے کہا۔

''میں نے کہا تو ہے میں نہیں جانتا.....'' شہروز نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس عینی کی بچی کو تو میں مار ڈالوں گا۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔

''شگفتہ..... یہ..... یہ تو ہماری سمجھ سے بالاتر ہے..... اس کا کچھ کرنا پڑے گا..... و..... ورنہ..... یہ باقی بچوں کو بھی نقصان پہنچائے گا۔'' کلثوم نے خوف زدہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا شہروز اسے غصے سے گھور رہا تھا۔

''ایسے..... ایسے نشان میں نے فلموں میں دیکھے ہیں..... ایسے نشان کالا عمل کرنے والے لوگ استعمال کرتے ہیں۔''

''کلثوم رات بہت ہو چکی ہے اس کا فیصلہ ہم کردیں گے کل..... آج کی رات یہ تمہارے کمرے میں سوئے گا۔'' میں نے کہا تو کلثوم گھبرا گئی۔

''نا..... نا..... میں تو کبھی بھی اسے کمرے میں نہ رکھوں۔'' کلثوم نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''فکر نہ کرو کچھ نہیں کرے گا۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا..... اس نے ہی عینی کو باندھ کر دو دن سے بیڈ کے نیچے چھپایا تھا۔''

''نا..... بابا..... نہ..... اسے تو آپ پولیس کے حوالے کریں۔'' کلثوم بدستور گھبراتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے پھر..... اسے میں اپنے کمرے میں لے جاتی ہوں.....'' میں نے کہا تو کلثوم نے اطمینان کی گہری سانس کھینچی۔

رات کا نجانے وہ کون سا پہر تھا۔ ''جب اچانک میری آنکھ کھلی میری نظر اس صوفے کی طرف گئی جس پر شہروز لیٹا ہوا تھا مگر اب وہ صوفہ خالی تھا.....''

ارے..... یہ شہروز کہاں چلا گیا۔'' میں پریشانی سے بڑبڑائی اسی وقت مجھے ایسا لگا جیسے کوئی کھڑکی پر زور زور سے ہاتھ مار رہا ہو کھڑکی پر پردہ لٹکا ہوا تھا کھڑکی کے شیشوں پر کوئی بہت زوردار انداز میں دستک دے رہا تھا میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو میری زوردار چیخ نکل گئی۔'' یہاں تک کہہ کر میڈم شگفتہ خاموش ہوگئیں۔

''آپ کیوں چیخیں تھیں میڈم.....؟'' حامد نے

حیرانگی سے پوچھا۔

''ایک جلا ہوا ہاتھ کھڑکی کے شیشے پر دستک دے رہا تھا لیکن وہ صرف جلا ہوا ہاتھ ہی تھا چلتے ہوئے ہاتھ کے وجود کا مالک شخص کہیں بھی نظر نہیں آ رہا تھا پھر وہ ہاتھ یکدم غائب ہوگیا، میں ہاتھ کو دیکھنے کے لئے آگے بڑھی تو میں نے ایک عجیب منظر دیکھا...'' اتنا کہہ کر میڈم ایک مرتبہ پھر رکیں۔

''کیا منظر دیکھا آپ نے میڈم...؟'' حامد نے بے چین لہجے میں پوچھا۔

''ہم...... میں نے دیکھا شہروز یتیم خانے کے پچھواڑے بنے احاطے میں بھاگ رہا تھا۔

''شہروز......'' میں نے اسے آواز دی تو وہ رکا ،اس نے میری طرف دیکھا، وہ بہت گھبرایا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے۔ ''یہ ...... یہ تمہارے ہاتھ کیوں خون سے رنگے ہوئے ہیں ؟'' میں نے ہکلاتے ہوئے اس سے پوچھا لیکن وہ جواب دینے کی بجائے احاطے کی دیوار پھلانگ کر باہر نکل گیا، میں تیزی سے واپس مڑی اور اپنے کمرے سے باہر نکلی تو اسی وقت مجھے ایک نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی کیونکہ وہ چیخ کی آواز کسی اور کی نہیں بلکہ کلثوم کی تھی، میری آنکھوں کے سامنے شہروز کے خون سے رنگے ہاتھ بار بار آ رہے تھے، میں کلثوم کے کمرے کی طرف تیزی سے بھاگی میں نے دروازہ کھولا تو دھک سے رہ گئی میری بہن کلثوم فرش پر مردہ حالت میں پڑی تڑپ رہی تھی اور خون سے رنگا خنجر تمہارے ہاتھوں میں تھا۔'' اتنا کہہ کر میڈم شگفتہ خاموش ہوگئیں ان کی آواز بھرا گئی تھی۔

''دیکھا تھا آپ نے......شہروز کے ہاتھ خون سے رنگے ہوئے تھے اور وہ پچھلی دیوار پھلانگ کر باہر نکل گیا تھا۔ میں سو رہا تھا کہ کسی قسم کے شور کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی مجھے حیرت ہوئی میں اٹھ کر بیٹھا، اسی وقت مجھے ایک تھپڑ کی گونج سنائی دی میں حیران ہوا کیونکہ تھپڑ کی وہ آواز میڈم کلثوم کے کمرے سے آئی تھی، میں تیزی سے میڈم کلثوم کے کمرے کی طرف بھاگا دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے سنا میڈم کلثوم کہہ رہی تھیں۔'' دفع ہو جاؤ یہاں سے ... مجھے دھمکیاں دیتے ہو۔''

''میڈم میں کالے عمل میں ماہر ہوں...... اور اس راز سے تم آگاہ ہو چکی ہو اس لئے تمہیں مرنا ہوگا۔'' مجھے شہروز کی غصے میں بھری آواز سنائی دی ساتھ ہی میڈم کلثوم کی چیخ کی آواز سنائی دی، میں نے دروازہ کھولا تو میں نے دیکھا شہروز میڈم کلثوم کے پیٹ میں خنجر گھونپ چکا تھا، میں ہکا بکا وہ خونی منظر دیکھنے لگا، شہروز نے میری طرف دیکھا تو میں خوف کے باعث تیزی سے پیچھے ہٹ گیا اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا، میں فرش پر تڑپتی ہوئی میڈم کلثوم کی طرف بڑھا، میں نے ان کے پیٹ سے خنجر نکالا تو ان کے منہ سے ایک مرتبہ پھر چیخ نکلی میں حیرانگی سے فرش پر مردہ میڈم کلثوم کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اسی وقت آپ کمرے میں داخل ہوئیں اور مجھے میڈم کلثوم کا قاتل سمجھ بیٹھیں، میں لاکھ چلایا چیخا لیکن آپ نے میری ایک نہ سنی اور مجبوراً مجھے جیل میں جانا پڑا میں دنیا کے سامنے تو گناہ گار ہی لیکن ...... لیکن آپ کے سامنے اپنی بے گناہی ثابت کرنے آیا ہوں۔'' آخری الفاظ پر حامد کی آواز بھرا گئی۔ ''اور یہ صرف اس لئے کہ آپ نے مجھے ایک ماں جیسا پیار دیا تھا۔''

اتنا کہہ کر حامد پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا ،میڈم شگفتہ کی آنکھوں سے بھی آنسو چھلک پڑے۔

''مجھے معاف کردو میرے بچے۔'' میڈم شگفتہ روتے ہوئے شرمسار لہجے میں بولیں۔ ''میری وجہ سے تمہیں اتنی اذیتیں برداشت کرنا پڑیں ...... مجھے معاف کردو میرے بچے۔''

''آپ نے مجھے بے گناہ سمجھا میرے لئے یہی بہت ہے۔'' حامد نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا...... ''آپ مجھے صرف عینی کا پتہ بتادیں۔''

''عینی۔۔۔ اسے تو ایک فیملی نے ایڈاپ کرایا تھا۔۔۔'' میڈم شگفتہ نے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میڈم آپ مجھے عینی کو ایڈوپ کرنے والی فیملی کا ایڈریس دے دیں۔''

''وہاں جانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا حامد'' میڈم شگفتہ نے کہا۔ ''کیونکہ میں تو وہاں کئی مرتبہ جاچکی ہوں۔''

''پھر بھی آپ ایڈریس تو دیں۔'' حامد نے کہا تو میڈم نے اسے ایڈریس دے دیا۔

وہ یتیم خانے سے باہر آیا اور ایک طرف بنے فٹ پاتھ پر چلنے لگا اس کا ذہن کئی طرح کے سوالوں میں الجھا ہوا تھا۔ ''شہروز ایسے عجیب و غریب کھیل کیوں کھیلتا تھا وہ عینی کی چھوٹی سی غلطی سے اس کا دشمن کیوں بن گیا تھا، اس نے میڈم کلثوم کا قتل کیوں کیا تھا؟ اس نے عینی کو باندھ کر اپنے بیڈ کے نیچے کیوں چھپایا تھا؟ کیا وہ نشان جو شہروز کے بیڈ کے نیچے تھا وہ واقعی کالے عمل کا تھا، شہروز کہاں غائب ہوگیا؟ عینی کو ایڈوپ کرنے والی فیملی کون تھی؟'' وغیرہ وغیرہ۔

سڑک پر چلتی ایک سفید رنگ کی وین اچانک اس کی طرف مڑی اور اس کے قریب آ کر آہستہ آہستہ رفتار میں چلنے لگی، حامد چلتے چلتے چونکتے ہوئے رکا اور وین کی طرف مڑا وین بھی اب رک چکی تھی، وین کا پچھلا دروازہ کھلا اور حامد کو ایک نقاب پوش نظر آیا۔

''کیسے ہو حامد۔۔۔؟ وہ نقاب پوش بولا۔

''ٹھ۔۔۔ ٹھیک ہوں، پپ۔۔۔ پر تم کون ہو؟'' حامد نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''وین میں بیٹھو پھر بتاتا ہوں۔'' نقاب پوش کے ہاتھ میں اب ریوالور نظر آرہا تھا۔ ''کم از کم تم عینی کے لئے تو ضرور بیٹھو گے۔''

عینی کے ذکر پر حامد چونکا اور حامد بوجھل بوجھل قدموں کے ساتھ وین میں بیٹھ گیا تو حامد نے دیکھا وین کی پچھلی سیٹوں پر دو نقاب پوش بیٹھے ہوئے تھے اور اگلی سیٹ پر ایک ڈرائیور اس کے چہرے پر کوئی نقاب نہیں تھا لیکن اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اور داڑھی تھی جو نقاب کا کام دے رہی تھی۔

''کہاں ہے عینی؟'' حامد نے پوچھا۔

''صبر کرو۔۔۔ اتنے بے چین کیوں ہوئے جارہے ہو۔'' اتنا کہہ کر ریوالور والے نقاب پوش نے دوسرے نقاب پوش کو اشارہ کیا، اس نے اپنی جیب سے ایک کالے رنگ کا رومال نکالا اور حامد کے چہرے پر ڈال دیا، اب حامد کی آنکھوں کے آگے صرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا تھوڑی دیر بعد وین رکنے کی آواز سنائی دی پھر دو دفعہ ہارن کی آواز حامد کے کانوں میں پڑی اور پھر گیٹ کھلنے کی آواز سنائی دی اور وین رک گئی پھر وین کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔

''اترو نیچے۔۔۔۔۔'' حامد کے کانوں میں ریوالور والے نقاب پوش کی آواز پڑی ساتھ ہی اس نقاب پوش نے حامد کا بازو پکڑ لیا تھا، حامد لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ وین سے نیچے اترا اور پھر نقاب پوش کی رہنمائی میں آگے چلنے لگا، ایک جگہ اسے روکا گیا اور پھر بیٹھنے کو کہا گیا، بیٹھنے کے بعد اس کے چہرے سے رومال ہٹالیا گیا، اندھیرا چھٹنے کے بعد اس کی آنکھوں کے آگے تیز روشنی آئی تو اس نے آنکھیں بند کرلیں، تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں تو سب کچھ معمول پر تھا اس کے سامنے وہی دو نقاب پوش کھڑے تھے۔ ''کک۔۔۔۔۔ کہاں ہے عینی؟'' حامد نے پوچھا۔

''وہ ہمارے قبضے میں ہے۔'' ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

''قبضے میں۔'' حامد حیران ہوا۔

''ہاں۔۔۔۔۔ قبضے میں۔۔۔۔۔'' نقاب پوش نے یہ کہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''لیکن کیوں۔۔۔؟'' حامد چیخا۔

''دنیا میں ہر چیز کسی مقصد کی وجہ سے ہی ہوتی ہے۔۔۔ عینی بھی کسی وجہ سے ہی ہمارے قبضے میں ہے۔'' نقاب پوش بولا۔

''کس مقصد کی وجہ سے؟'' حامد نے غصے سے پوچھا۔

''اگر تم چاہتے ہو کہ عینی تمہیں صحیح سلامت مل جائے تو تمہیں ہمارا ایک کام کرنا ہوگا...'' ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

''کام... کیسا کام......؟'' حامد نے حیرانگی سے پوچھا۔

''بڑا آسان سا کام ہے۔'' نقاب پوش نے کہا۔ ''کام کیا ہے...؟'' حامد نے سخت لہجے میں لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تمہیں تقریباً ایک ماہ تک ایک فیملی میں رہنا ہوگا۔'' ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

''کسی فیملی میں ایک ماہ کے لئے مجھے کیوں رہنا پڑے گا؟'' حامد نے پوچھا۔

''عینی کی سلامتی کے لئے کیونکہ اگر تم نے ہمارا حکم نہ مانا تو عینی کی بے آبرو لاش تمہیں مل جائے گی۔'' نقاب پوش سخت لہجے میں بولا۔

''نہیں نہیں تم جو کہو گے وہ میں کروں گا...... بولو کیا کرنا ہے مجھے۔'' حامد نے تیز لہجے میں کہتے ہوئے پوچھا۔

''تمہیں ایک فیملی میں رہنا ہوگا اور میں جو حکم دوں گا تمہیں وہ کرنا ہوگا۔'' ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

''لیکن ......لیکن پہلے میری عینی سے بات کراؤ۔'' حامد نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' اتنا کہہ کر نقاب پوش نے جیب سے موبائل فون نکالا اور نمبر ڈائل کرنے کے بعد موبائل کان سے لگالیا۔ ''ہیلو بات کراؤ اس سے۔'' نقاب پوش نے کہا اور موبائل حامد کے کان سے لگا دیا۔

''ہیلو۔'' حامد بولا۔

''ہیلو۔'' ایک خوبصورت سریلی آواز نے حامد کے کانوں میں رس گھولا۔

''عینی میں حامد بول رہا ہوں۔'' حامد نے بتایا۔

''حامد... حامد مجھے ان کے چنگل سے بچالو۔'' عینی کی پریشان زدہ آواز حامد کے کانوں میں پڑی۔

''عینی جب ہم پہلی مرتبہ ملے تھے تو تم رو رہی تھی...... میں نے تمہیں ہنسانے کے لئے کیا کیا تھا؟'' حامد نے بظاہر تصدیق چاہی کہ بولنے والی عینی ہی ہے۔

''حامد مجھے ان کے چنگل سے بچالو...... میں کئی سالوں سے ان کی قید میں ہوں۔'' عینی کی بھرائی ہوئی آواز حامد کے کانوں میں جڑی۔

''عینی میں نے جو پہلے پوچھا پہلے اس کا جواب دو۔'' حامد نے سخت لہجے میں لفظوں پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تم جان بوجھ کر پھسلے تھے اور تمہارے پیر پر کچھ چوٹ لگ جاتی تھی۔'' عینی نے بتایا۔

''اوہ...... عینی میری جان کیسی ہو تم......'' حامد نے اطمینان کی ایک گہری سانس کھینچی۔

''میں ٹھیک نہیں ہوں حامد...... پچھلے کئی سالوں سے انہوں نے مجھے ایک کمرے میں قید کر رکھا ہے...... مم...... مم...... مجھے ان سے بچالو۔'' عینی نے روتے ہوئے کہا۔

''تم فکر مت کرو عینی...... میں اب جیل سے باہر آگیا ہوں...... میں تمہیں ان کے...'' ابھی حامد نے اتنا ہی کہا تھا کہ ریوالور والے نقاب پوش نے موبائل اس کے کان سے ہٹالیا۔ ''اتنی بات ہی بہت ہے... اور میں تمہاری غلط فہمی دور کردوں یہ فلمی ڈائیلاگ فلموں تک ہی محدود رکھو کہ میں تمہیں ان کے چنگل سے بچالوں... ہم عینی کو چھوڑیں گے اور وہ بھی تب جب تم ہمارا کام پورا کرو گے۔''

''ٹھیک ہے میں تمہارا کام کرنے کے لئے تیار ہوں۔'' حامد نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے... چند دنوں کی ٹریننگ کے بعد ہم تمہیں اس فیملی میں بھیج دیں گے اور کسی بھی قسم کی ہوشیاری نہیں کرنا...... اور یہ بات شاید تم بھی جانتے ہوگے کہ میں کالے علم میں ماہر ہوں...'' ریوالور والا

نقاب پوش شاید اس دفعہ مسکرایا بھی تھا۔

''کک...... کک...... کون ہو تم......؟'' حامد نے حیرت سے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''شش...... شہروز......'' ریوالور والے نقاب پوش نے کہا۔

☆......☆......☆

گاڑی ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے رکی ،گاڑی میں اس وقت ڈرائیونگ سیٹ پر حامد بیٹھا ہوا تھا اس وقت اس کے چہرے پر سیٹھ اصغر کے بیٹے نعمان کا میک اپ موجود تھا حامد کو اس بنگلے میں نعمان بن کر جانا تھا وہ شہروز کے معیار پر پورا اترا تھا اور نعمان کی ہر عادت سیکھ چکا تھا نعمان کا ایک بھائی کاشف اور ایک بہن شائستہ تھی ،نعمان کی ماں کا نام شائلہ تھا اصغر کی ایک کار ایکسیڈنٹ میں دونوں آنکھیں اس کا ساتھ چھوڑ گئیں ،ایک بوڑھا ملازم تھا کرم دین جو بہت پرانا تھا حامد نے گاڑی گیٹ کے پاس لے جاکر ہارن دیا تو گیٹ کھل گیا حامد گاڑی اندر لے گیا اس نے گاڑی گیراج میں کھڑی کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا بنگلے میں بنے احاطے میں ہری ہری گھاس کا قالین بچھا ہوا تھا اور کیاریوں میں رنگ برنگے پھول کھلے ہوئے تھے حامد اندرونی حصے کی طرف بڑھا، اندر ہال میں پڑے صوفوں پر شائستہ ایک کتاب پڑھنے میں محو تھی شائستہ تصویریں کھینچنے کی بہت عادی تھی۔''نعمان بھائی ......'' شائستہ کے پکارنے پر حامد رکا۔''پلیز ذرا مسکرائیں۔'' شائستہ نے کہا تو حامد مسکرایا اور شائستہ نے اپنے موبائل میں اس کی تصویر اتارلی۔

حامد کچن کی طرف بڑھا اس نے دیکھا شائلہ کھانا پکانے میں مگن تھی۔

''ہائے مما......'' حامد نے نعمان کے انداز میں کہا۔

شائلہ نے اس کی طرف دیکھا۔

''نعمان بیٹا...... میں نے تمہیں کتنی مرتبہ سمجھایا ہے کہ جب گھر میں داخل ہوتے ہیں یا کسی سے ملتے ہیں تو السلام علیکم کہتے ہیں نا کہ ہائے...... لیکن تمہارے منہ سے یہ ہائے ہیلو کا پہاڑہ ختم ہی نہیں ہوتا۔'' شائلہ نے دوپٹے سے اپنے بھیگے ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''کم آن مما...... جدید دور ہے اور آپ ہیں کہ یہ پرانی باتیں لے کر بیٹھی ہیں۔'' حامد نے نعمان کی طرح ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا نعمان اور اس کی ماں کی ہر وقت یہی بحث چھڑی رہتی تھی۔

''یہ پرانی نہیں بیٹا ہماری دینی باتیں ہیں ہمارا اوڑھنا بچھونا ہیں اور دین کبھی پرانا نہیں ہوتا...... ہائے ،ہیلو یہ انگریزوں کا مذہب ہے۔اسی طرح جب تم کسی سچے مسلمان کو ہیلو کہو گے تو وہ تمہیں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھے گا...... مسلمان دوسرے مسلمان بھائی کو السلام علیکم کہتا ہے یعنی تم پر سلامتی ہو اسی طرح جواباً دوسرا بھائی اسے وعلیکم السلام کہے گا یعنی تم پر بھی سلامتی ہو۔''

شائلہ نے اس گھر کو شروع سے کچھ اصولوں پر رکھا ہوا تھا جن اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی تھا کہ تین وقت کا کھانا وہ اکٹھے کھاتے تھے،شائلہ نماز کے معاملے میں سختی سے پابند تھی لیکن وہ اپنی اولاد کو صرف سمجھاتی رہتی تھی لیکن وہ تینوں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد حامد آفس چلا آیا خاکی رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ اس کے پاس تھا دفتر میں پہنچنے کے بعد وہ کرسی پر بیٹھا تو اس کے موبائل کی رنگ ٹون جاگ اٹھی اس نے جیب سے موبائل فون نکالا اور Answer کا بٹن پریس کرکے موبائل کان سے لگالیا۔''ہیلو'' دوسری طرف سے شہروز کی آواز اس کے کانوں میں پڑی۔''ہاں بولو'' حامد ناگواری سے بولا۔

''وہ لفافہ تو تمہیں مل چکا ہوگا۔'' شہروز نے بظاہر پوچھا۔''ہاں...... مل چکا ہے۔'' حامد نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''کھولو اسے۔'' شہروز نے کہا تو حامد نے اس لفافے کو کھولا اس میں ایک چھوٹی خوبصورت لڑکی کی

تصویر تھی۔

''کیا ہے لفافے میں؟''

''تم جانتے ہو...'' حامد نے منہ بناتے ہوئے کہا۔'' جانتا ہوں میں لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔شہروز نے مسکراتے ہوئے کہا۔ایک لڑکی کی تصویر ہے۔'' حامد نے بتایا۔

''اس تصویر کو الٹو۔'' شہروز نے کہا حامد نے تصویر کو پلٹا تصویر کی پچھلی سائیڈ پر ایک ایڈریس لکھا ہوا تھا۔'' یہ لڑکی اس ایڈریس کے ہوٹل میں رہتی ہے اور اس کا نام ماریہ ہے یہ نعمان کی خفیہ گرل فرینڈ ہے۔'' شہروز کی بات ابھی جاری تھی کہ حامد نے اسے ٹوکا

''خفیہ گرل فرینڈ.....کیا مطلب؟''

''خفیہ اس لئے کہ سوائے نعمان کے کوئی بھی نہیں جانتا کہ یہ نعمان کی گرل فرینڈ ہے اس کا نام ماریہ ہے.....دونوں رنگ رلیاں بھی مناتے ہیں ماریہ چاہتی ہے کہ دونوں کی جلد سے جلد شادی ہو جائے لیکن نعمان ابھی اسے ٹالتا رہتا ہے اب آفس ٹائم کے بعد تم اس کے پاس جاؤ گے اور تمہیں وہاں کیا کرنا ہے وہ میں تمہیں گاڑی میں بتا دوں گا۔'' اتنا کہہ کر شہروز نے دوسری طرف سے رابطہ منقطع کر دیا حامد نے گہری سانس لیتے ہوئے موبائل جیب میں ڈال دیا۔

☆......☆......☆

اصغر کی موت کی وجہ ڈاکٹروں کی پہنچ سے باہر تھی پوسٹ مارٹم کرانا شائلہ نے بہتر نہ سمجھا کیونکہ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ نجانے کیسے اصغر کے پورے جسم پر سوراخ بن گئے تھے جن سے خون نکلا تھا اور شاید یہی وجہ اصغر کی موت کی تھی...... اسی وجہ سے شائلہ نے اصغر کی چیر پھاڑ کرانا مناسب نہ سمجھی کیونکہ اصغر بہت بھیانک موت مرا تھا۔

ایک عورت کے پوچھنے پر شائلہ نے بتایا کہ ''میں کمرے میں اصغر کے لئے دودھ لے کر گئی تھی کمرے کا نظارہ دیکھ کر دودھ کا گلاس میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، اصغر وہیل چیئر سے گرے پڑے تھے، میں تیزی سے ان کی طرف بھاگی۔'' کک...کیا ہوا اصغر...آپ وہیل چیئر سے کیسے گر پڑے۔'' میں نے گھبراتے ہوئے پوچھا۔

''شم...شا...ئلہ...مم......میرے پورے جسم میں بہت درد ہو رہا ہے...... ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے جسم میں سوئیاں چبھو رہا ہے۔'' اصغر نے درد کے باعث ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں ساری بات بتائی، میں نے دیکھا ان کی ساری قمیض خون سے بھری پڑی تھی، پھر ان کے چہرے سے وقفے وقفے سے خون نکلنے لگا، میں جلدی سے نیلی فون کی طرف بھاگی اور ڈاکٹر کو انفارم کیا اس کے بعد میں نے شائستہ کو آواز دی میں نے اسے ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔

وہ تیزی سے نعمان اور کاشف کے کمروں کی طرف بھاگی ڈاکٹر کے آنے سے پہلے اصغر دم توڑ چکے تھے۔'' اتنا کہہ کر شائلہ نے رونا شروع کر دیا باقی عورتیں اسے دلاسہ دینے لگیں کاشف اور شائستہ کی آنکھیں بھی نم آلودہ تھیں جبکہ حامد عرف نعمان پریشانی کے باعث اپنے ناخن چبا رہا تھا۔

اسی وقت بیرونی دروازے سے انسپکٹر جمشید اور دو کانسٹیبل اندر داخل ہوئے جسے دیکھ کر حامد کے چہرے کا رنگ اڑ گیا وہاں بیٹھے سارے افراد حیرت سے انسپکٹر جمشید اور دونوں کانسٹیبلوں کی طرف دیکھنے لگے، حامد اپنی جگہ سے اٹھا اور انسپکٹر کے قریب آیا۔''جی انسپکٹر صاحب......'' حامد نے سوالیہ نگاہوں سے انسپکٹر جمشید کی طرف دیکھا۔'' میں اصغر صاحب کے بیٹے کاشف کو گرفتار کرنے آیا ہوں۔'' انسپکٹر جمشید نے بظاہر دھماکہ کیا۔

''کیا مطلب......؟'' حیرت کے باعث حامد کے منہ سے نکلا۔''یہ......یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

''میں بالکل ٹھیک کہہ رہا ہوں مسٹر نعمان مسٹر کاشف کے نام کا اریسٹ وارنٹ نکلا ہے۔'' انسپکٹر نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

''لیکن کیوں انسپکٹر صاحب۔ میں نے ایسا کیا

کردیا کہ میرے نام کا اریسٹ وارنٹ نکل آیا۔''
کاشف ان کے قریب آتے ہوئے بولا۔
''آپ نے اپنے کالج کی ایک لڑکی فائزہ کی عزت لوٹی ہے۔'' انسپکٹر نے اصل دھماکہ اس دفعہ کیا۔
''ہائے اللہ ......'' وہاں بیٹھی سب عورتوں کے منہ سے بے اختیار نکلا۔
''عزت یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ انسپکٹر صاحب ......م ......میں نے ......'' گھبراہٹ کے باعث کاشف کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔
''وہ لڑکی ابھی بھی اسپتال میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی ہے تم نے اس کی عزت پامال کرنے کے بعد اس پر تشدد کرکے اسے مارنے کی کوشش کی لیکن ''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔'' انسپکٹر جمشید نے عزم سے کہا۔
''انس...... پکٹر...... صاحب ...... آپ کو ضرور غلط فہمی ہوئے ......م ......م......میں ان کی ماں ہوں۔ میں اپنی ...... اپنی اولاد کو اچھی طرح جانتی ہوں...... میرا بیٹا ایسا گھناؤنا کام نہیں کرسکتا۔'' شمائلہ نے انسپکٹر جمشید کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
''ماں جی قانون دل کی گواہی نہیں مانتا کاشف کے خلاف پختہ ثبوت ملے ہیں اور آپریشن تھیٹر میں جانے سے پہلے فائزہ نے کاشف کا نام لیا تھا۔'' اتنا کہہ کر انسپکٹر نے اپنے پیچھے کھڑے کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا انہوں نے آگے بڑھ کر کاشف کو ہتھکڑی لگادی۔
''انسپکٹر صاحب پلیز آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے...... میرے بیٹے کو چھوڑ دیں ......'' شمائلہ انسپکٹر التجائیہ انداز میں بولی۔
''ہم بڑے سے بڑا وکیل کریں گے۔'' حامد نے انسپکٹر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''آپ کا حق بنتا ہے نعمان صاحب......'' انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا اور کاشف کو لے کر باہر نکل گیا۔

☆......☆......☆

بھیا کیا بنا کیس کا۔ شائستہ نے دودھ کا گلاس حامد کو پکڑاتے ہوئے کہا۔
''وکیل نے تسلی تو دی ہے۔ ابھی فائزہ کو ہوش بھی نہیں آیا، اگر اسے ہوش آجائے تو ساری حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی۔'' حامد نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔
شائستہ نے یقین نہ کرنے والی نگاہوں سے حامد کی طرف دیکھا۔
''مگر ثبوت بھی کہہ رہے ہیں......'' حامد نے کھوئے کھوئے لہجے میں ہے۔
''ثبوت...... کیسے ثبوت؟'' شائستہ مزید حیران ہوئی۔
''پہلے نمبر پر تو لڑکی فائزہ کے منہ سے جو نام نکلا وہ کاشف کا تھا دوسرا جس کمرے میں اس لڑکی کا ریپ ہوا وہاں سے کاشف کا پرس بھی ملا ہے...... تیسرا فائزہ کی سہیلیوں کا کہنا ہے کہ جس رات فائزہ کا ریپ ہوا اس دن دوپہر کے وقت کاشف نے اس سے کہا تھا کہ'' مجھے رات کو ملنا...... لیکن......'' حامد کہتے کہتے رکا۔
''لیکن کیا بھیا......؟'' شائستہ نے تیز لہجے میں کہا۔
''لیکن کاشف کا کہنا ہے کہ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی وہ اس رات فائزہ سے ملا بلکہ اس وقت تو وہ اپنے دوست قاسم کے ساتھ تھا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ قاسم کا تو ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا اور وہ موقع پر ہی جاں بحق ہوگیا تھا۔'' اتنا کہہ کر حامد خاموش ہوگیا۔
''بھیا مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کاشف بھائی کے خلاف کوئی سازش ہے۔'' شائستہ نے خدشہ ظاہر کیا۔
''مت فکر نہ کرو کاشف جلد ہی باہر آجائے گا۔'' حامد نے شائستہ کو دلاسہ دیتے ہوئے کہا ساتھ ہی اس نے بیڈ پر پڑا خاکی رنگ کا بڑا سا لفافہ اٹھایا اور شائستہ کی طرف بڑھادیا۔ ''یہ لو......''
''یہ کیا ہے بھیا......؟'' شائستہ نے وہ لفافہ پکڑتے ہوئے کہا۔

''آج بازار سے گزر رہا تھا تو تمہارے لئے خرید لیا، اسے اپنے کمرے میں جاکر کھولنا۔ تمہارے لئے اسپیشل گفٹ ہے۔'' حامد نے مسکراتے ہوئے کہا تو شائستہ مسکراتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی۔

اسی وقت حامد کے موبائل کی رنگ ٹون جاگ اٹھی، حامد نے Answer کا بٹن پریس کرکے موبائل کان سے لگالیا۔''ہیلو..... حامد.....'' شہروز کی مسکراتی ہوئی آواز حامد کے کانوں میں پڑی۔''دیکھو میں نے اب تمہارا آخری کام بھی کردیا..... اب تو تینی کو چھوڑ دو.....'' حامد کا لہجہ التجائیہ تھا۔

''چھوڑ دیں گے تم فکر کیوں کرتے ہو اگر تم نے ہمارا کام کیا ہے تو ہم بھی تمہارا کام ضرور کریں گے۔'' اتنا کہہ کر دوسری طرف سے شہروز نے کال کاٹ دی اور حامد پریشان نگاہوں سے موبائل کی طرف دیکھنے لگا۔

شائستہ نے اپنے کمرے کا دوازہ بند کیا اور خاکی لفافہ بیڈ پر رکھنے کے بعد کمپیوٹر ٹرالی کے پاس پڑی چیئر پر بیٹھ گئی اس نے موبائل کیبل کے ذریعے کمپیوٹر سے کونکٹ کیا اور موبائل میں موجود تصویریں کمپیوٹر میں Paste کرنے لگی اس کا دل کاشف کی تصویریں دیکھنے کو کررہا تھا اور ویسے بھی تصویریں کھینچا تو شائستہ کی ہابی تھی تصویریں پیسٹ کرنے کے بعد انہیں چیک کرنے لگی تصویریں چیک کرتے ہوئے اسے بار بار حیرت کے شدید جھٹکے لگ رہے تھے جیسے جیسے وہ تصویریں دیکھتی جارہی تھی اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہوتا جارہا تھا وہ جلدی سے چیئر سے اٹھی اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

اسی وقت نجانے کہاں سے تیز ہوا کا جھونکا آیا اور بیڈ پر پڑا خاکی رنگ کا لفافہ اڑ کر شائستہ کے پیروں میں جاکر گر گیا بیرونی دروازے کی طرف بڑھتی شائستہ حامد کا دیا ہوا خاکی رنگ کا لفافہ اپنے پیروں میں گرتا دیکھ کر ٹھٹھک کر رکی اس نے جھک کر وہ لفافہ اٹھایا اور لفافے کو کھولا تو شائستہ نے دیکھا لفافے میں ایک کاغذ تھا شائستہ نے اس کاغذ کو باہر نکالا تو اسے حیرت کا ایک اور شدید جھٹکا لگا اس کاغذ پر لال رنگ سے ایک کھوپڑی بنی ہوئی تھی اور کھوپڑی کے نیچے کراس کی شکل میں دو ہڈیاں بنی ہوئی تھیں۔'' ہیں..... یہ کیسا گفٹ ہے.....'' شائستہ الجھن آمیز لہجے میں بولی۔

اسی وقت شائستہ کو ناک میں خارش سی محسوس ہوئی اس نے ناک کھجائی شائستہ کی نظر ناک کھجانے والی انگلیوں پر پڑی تو وہ حیران رہ گئی کیونکہ وہ انگلیاں خون سے رنگین ہوگئی تھیں، وہ ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے آئی اس کی ناک کے نتھنوں سے خون بہہ رہا تھا۔

شائستہ نے ڈریسنگ ٹیبل پر پڑے ٹشو کے ڈبے میں سے ایک ٹشو نکالا اور ناک سے بہنے والا خون صاف کرنے لگی لیکن خون رکنے کی بجائے مزید بہتا جارہا تھا شائستہ ایک کے بعد ایک ٹشو سے خون صاف کررہی تھی لیکن خون تھا کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا سر درد کی وجہ سے پھٹ رہا تھا شائستہ کو ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس کی دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گیں۔

☆.....☆.....☆

کہتے ہیں جب تیز سیلاب آتا ہے تو اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتا ہے ایسا ہی کچھ شمائلہ کے ساتھ ہوا تھا چند منٹوں کے سیلاب نے اس کی ساری زندگی اجاڑ دی تھی وہ چند لمحوں میں اکیلی پڑگئی تھی۔ بیٹا تھا لیکن وہ بھی عجیب بھنور تھا..... وہ تھا بھی کہ نہیں..... یہ وہ نہیں جانتی تھی.....زندگی کبھی کبھی انسان کو اچھی نہیں لگتی یہی حال اب شمائلہ کا تھا.....لیکن وہ ایک مسلمان تھی اور وہ یہ بخوبی جانتی تھی کہ اسلام میں خودکشی حرام ہے..... اس نے ابھی تک سلاخوں کے پیچھے بند اس لڑکے کو جو خود کو نعمان کہہ رہا تھا کہ متعلق کوئی بھی عملی کام نہیں کیا تھا وہ اندر سے ٹوٹ چکی تھی وہ اپنا سب کچھ کھو چکی تھی وہ اس وقت ہال میں بیٹھی ہال کے در و دیوار کو دیکھ رہی تھی جو اسے کھوکھلی لگ رہی تھی، وہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آئی اور دراز سے فوٹو البم نکال کر چہروں کو دیکھنے لگی

شمائلہ کی آنکھوں سے ایک مرتبہ پھر آنسوؤں کا سیلاب امڈ آیا۔

کافی دیر وہ آنسو بہاتی رہی اسے کوئی بھی چپ کرانے والا وہاں موجود نہیں تھا کافی دیر رونے کے بعد اس نے اپنے آنسو خود ہی صاف کیے فوٹو البم دوبارہ دراز میں رکھا اور شائستہ کے کمرے میں چلی آئی یہ کمرہ بھی اب ویران سا ہو گیا تھا وہ بیڈ کے پاس آئی اور حیرت زدہ نگاہوں سے بیڈ کو دیکھنے لگی اسے یوں محسوس ہوا جیسے شائستہ بیڈ پر لیٹی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی ہو وہ بیڈ پر بیٹھی اور ایک مرتبہ پھر آنسو بہانے لگی... آنسو ہی اب اس کا مقدر تھا کافی دیر بعد آنسوؤں کا طوفان تھما تو وہ اٹھ کر کمپیوٹر ٹرالی کے پاس پڑی چیئر پر آ کر بیٹھ گئی۔

شمائلہ کو بھی تصویریں کھینچنے کا بہت شوق تھا اس نے کمپیوٹر آن کیا اور شائستہ کے فولڈر میں پڑیں تصویریں دیکھنے لگی تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا تقریباً پچھلے ایک ماہ سے کھینچی گئیں نعمان کی تصویریں حیران کن تھیں تصویروں میں موجود باقی افراد تو اپنی بالکل اصلی حالت میں موجود تھے لیکن جن تصویروں میں نعمان تھا لیکن اس کی جگہ تصویروں میں ایک بندر نما شکل کا انسان کھڑا تھا۔

"یہ... یہ... کیا... ان تصویروں میں تو نعمان تھا...؟" شمائلہ الجھن آمیز لہجے میں بولی ایک تصویر میں شمائلہ کچن میں کھڑی نعمان سے بحث کر رہی تھی لیکن اس تصویر میں بھی نعمان کی بجائے بندر کی شکل کا انسان کھڑا تھا۔ "یہ... یہ... کیا چکر ہے۔ ان تصویروں میں تو نعمان تھا... یہ بندر کی شکل کا انسان کہاں سے آ گیا؟" شمائلہ پریشانی سے بڑبڑائی۔

وہ اٹھ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھنے لگی تو وہ ٹھٹھک کر رک گئی اس کے پاؤں میں ایک کاغذ پڑا ہوا تھا شمائلہ نے جھک کر وہ کاغذ اٹھایا کاغذ پر کھوپڑی اور نیچے کراس کی شکل میں ہڈیاں بنی ہوئی تھیں شمائلہ کے دماغ کو ایک زوردار جھٹکا لگا شمائلہ نے آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی اچانک شمائلہ کے ہاتھ میں پکڑے کاغذ میں آگ بھڑک اٹھی شمائلہ نے چیختے ہوئے وہ کاغذ چھوڑ دیا فرش پر گرتے گرتے وہ کاغذ پورا جل چکا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ فرش پر اس کاغذ کی راکھ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

☆ ☆...☆

"یہ تو واقعی بڑی عجیب و غریب بات ہے مسز اصغر..." انسپکٹر جمشید نے شمائلہ کی لائی ہوئی تصویروں کو دیکھتے ہوئے تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

"جی ہاں انسپکٹر صاحب میں خود حیران و پریشان ہوں یہ جو تصویریں آپ کے ہاتھوں میں ہیں تقریباً ایک ماہ پہلے کی ہیں اور سب تصویروں میں نعمان کی بجائے یہ بندر نما شکل کا انسان ہے، میں نے نعمان کی ایک ماہ پہلے کھینچی گئیں تصویریں بھی دیکھیں ہیں وہ بالکل صحیح ہیں اور جیل میں بند نعمان کا بھی یہی کہنا ہے کہ وہ پچھلے ایک ماہ سے کسی جگہ پر قید تھا اور یہ جو تصویر ہے جس میں کچن میں اس بندر کی شکل کے انسان کے ساتھ کھڑی ہوں یہ نعمان ہی ہے اور یہ تصویر ایک ماہ پہلے کھینچی گئی ہے اور پھر میں نعمان کے کمرے میں گئی تو مجھے یہ چیزیں ملیں۔" اتنا کہہ کر شمائلہ نے چند خاکی لفافے اور ایک کھلونا انسپکٹر کی میز پر رکھ دیا کھلونا وہی تھا جس میں سوئیاں چبھوئی ہوئی تھیں۔ انسپکٹر جمشید حیرت سے ان چیزوں کو دیکھنے لگا اس نے خاکی لفافوں سے کھوپڑی والے وہ کاغذ نکالے انہیں دیکھنے کے بعد انسپکٹر جمشید اس کھلونے کی طرف دیکھنے لگا۔ "یہ کیا ہے مسز اصغر..." انسپکٹر نے حیرت سے پوچھا۔

"ایک ماہ پہلے جو نعمان کی شکل میں لڑکا ہمارے گھر آیا تھا اس کے پاس میں نے ایسے کئی لفافے دیکھے تھے اور یہ جو کھلونا ہے اس کھلونے کے ذریعے میرے شوہر کو مارا گیا ہے۔" شمائلہ نے کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ..." انسپکٹر ہنسا "کھلونے کے ذریعے بھلا کوئی کسی کو کیسے مار سکتا ہے۔"

"آپ نے دیکھا ہے ناں... یہ کھلونا بظاہر یہ

ظاہر کر رہا ہے کہ ایک آدمی وہیل چیئر پر بیٹھا ہے یعنی اس کی دونوں ٹانگیں بے کار ہیں... ایسا ہی ہے۔ انسپکٹر صاحب" شمائلہ نے کہتے ہوئے بظاہر تصدیق چاہی۔

"جی... جی... ہاں۔" انسپکٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میرے مرحوم شوہر کی بھی ایک کار ایکسیڈنٹ میں دونوں ٹانگیں ضائع ہوگئی تھیں اور وہ ہر وقت وہیل چیئر پر ہی ہوتے تھے اور جس دن ان کی موت ہوئی میں کمرے میں ان کے لئے دودھ لے کر گئی تھی، میں نے دیکھا وہ وہیل چیئر سے نیچے گرے پڑے تھے اور ان کی قمیض لہولہان تھی میں تیزی سے ان کی طرف بڑھی انہوں نے مجھے بتایا کہ "مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی میرے بدن میں سوئیاں چبھو رہا ہے۔" پھر ان کے چہرے سے بھی خون نکلنے لگا تھا میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسپکٹر صاحب وہ جو کوئی بھی تھا شیطانی عمل میں مہارت رکھتا تھا۔

آپ نے اکثر سنا ہوگا کالے عمل کے ماہر لوگ جب کسی کو پراسرار خاتمہ کرتے ہیں تو کپڑے کے ایک پتلے میں سوئیاں چبھونے لگتے ہیں اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ سلاخوں کے پیچھے میرا اصل بیٹا نعمان ہی ہے۔" اتنا کہہ کر شمائلہ خاموش ہوگئی اور شمائلہ کے تبصرے پر انسپکٹر جمشید داد بھری نظروں سے شمائلہ کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں بھی آپ کی بات سے ایگری ہوں مسز اصغر۔ یہ دیکھئے۔" اتنا کہہ کر انسپکٹر نے اپنی سامنے پڑی ٹیبل کا دراز کھولا اور اس میں سے ایک خاکی لفافے اور سفید رنگ کا لفافہ نکال کر شمائلہ کے آگے رکھ دیا، شمائلہ نے حیرت سے وہ لفافہ اٹھایا۔

"یہ خاکی لفافہ ہمیں ماریہ کے روم سے ملا ہے اور یہ سفید رنگ کا کاغذ جس پر کھوپڑی اور ہڈیاں بنی ہوئی ہیں یہ ہمیں حوالات سے ملا ہے اور ایک قیدی نے ہمیں بتایا ہے کہ یہ کاغذ اسی ہم شکل نعمان نے کاشف کو دیا تھا، کاشف حوالات کی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر اس کاغذ کو دیکھنے لگا پھر وہ دردناک انداز میں چیخنے لگا اس کی آنکھوں اور ناک کے نتھنوں سے خون بہنے لگا۔

قیدی حیرت زدہ انداز میں اس کی طرف بڑھے اسپتال لے کر گئے تو کاشف زندگی کی قید سے آزاد تھا۔" یہاں تک کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہوگیا۔

"پتہ نہیں ہم نے اس کا کیا بگاڑا ہے جو اس نے ہمارے ساتھ ایسا کیا۔" شمائلہ غمگین لہجے میں بولی۔

"اب وہ زیادہ دن ہماری نظروں سے چھپا نہیں رہ سکتا۔" انسپکٹر دانت پیستے ہوئے بولا۔ "سلاخوں کے پیچھے موجود مسز اصغر واقعی آپ کا بیٹا ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے میں اپنے کچھ خدشات دور کر چکا ہوں۔"

"خدشات... کیسے خدشات انسپکٹر صاحب؟"

شمائلہ نے حیرت سے پوچھا۔

"جس ہوٹل میں نعمان ماریہ سے ملنے جاتا تھا اس ہوٹل کے CCTV کیمرے کی فوٹیج مجھے مل گئیں ہیں، ہوٹل کا منیجر خود لے کر آیا تھا وہ خاصا پریشان تھا۔"

انسپکٹر صاحب CCTV کیمرے کی فوٹیج آ چکیں ہیں... لیکن...!" اتنا کہہ کر ہوٹل کا منیجر رکا۔

"لیکن کیا..." میں نے متوجہ ہو کر پوچھا۔

"لیکن ایک پریشانی والی بات ہے۔" ہوٹل منیجر نے پریشان کن لہجے میں کہا۔

"پریشانی والی بات۔" میں نے حیرت سے ہوٹل منیجر کی بات دہرائی۔ "کیسی پریشانی والی بات۔"

"آپ خود ہی دیکھ لیجیے۔" اتنا کہہ کر منیجر نے سفید رنگ کا بڑا سا لفافہ میرے سامنے رکھ دیا، میں نے وہ لفافہ کھولا تو اس میں تین تصویریں تھیں جس میں ہوٹل منیجر کے سامنے ایک بندر کی شکل کا انسان کھڑا تھا۔" یہ آپ کے سامنے کون کھڑا ہے۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تصویر تو مسٹر نعمان کی ہونی چاہیے مگر... حیرت ہے۔" ہوٹل منیجر الجھن آمیز لہجے میں بولا۔

"مسٹر نعمان کی... میں حیرت کے باعث ہنسا۔" یہ تو کہیں سے بھی مسٹر نعمان نہیں لگ رہے۔"

"لگ تو نہیں رہے... لیکن انسپکٹر صاحب یہ

تصویر مسز نعمان کی ہے۔'' ہوٹل منیجر نے پختہ لہجے میں کہا۔
''یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ منیجر صاحب۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
''میری طبیعت بالکل ٹھیک انسپکٹر صاحب اس دن نعمان صاحب نے یہی کپڑے پہنے تھے لیکن اب تصویروں میں۔'' ہوٹل منیجر نے کہتے ہوئے بات ادھوری چھوڑی میرے کانوں میں اب نعمان صاحب کی باتیں گونجنے لگیں جب میں انہیں گرفتار کرنے آیا تھا۔ ''انسپکٹر صاحب میں تو پچھلے ایک ماہ سے کسی جگہ پر قید تھا۔ جو یہاں موجود تھا وہ کوئی میرا ہمشکل ہوگا، میں تو پچھلے ایک ماہ سے کسی جگہ پر قید تھا اور کہیں نعمان صاحب سچ تو نہیں کہہ رہے تھے۔'' میں نے سوچا۔ ہوسکتا ہے وہ نعمان صاحب کا کوئی ہمشکل ہو جس نے یہ سازش کی ہو۔ لیکن تصویروں میں یہ بندر کی شکل کا انسان۔ کوئی بھی بات میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہی تھی میں اٹھ کر نعمان صاحب کے پاس آیا اور انہیں یہ تصویریں دکھائیں وہ بھی یہ تصویریں دیکھ کر حیران ہوئے اور پوچھا ''یہ کون ہے؟'' میں نے انہیں ساری بات بتائی تو وہ بھی حیران ہوئے۔

پھر مجھے یقین دلانا شروع کردیا کہ میں تو پچھلے ایک ماہ سے کسی جگہ پر قید تھا اور اب آپ کی لائی ہوئی تصویروں نے یہ تصدیق کردی ہے کہ وہ واقعی نعمان صاحب نہیں تھے لیکن یہ تصویریں الجھن میں ڈال رہی ہیں مجھے تو لگتا ہے یہ کوئی شیطانی عمل ہوگا۔'' اتنا کہہ کر انسپکٹر جمشید خاموش ہوگیا۔

''شیطانی عمل۔'' حیرت کے باعث شمائلہ کے منہ سے نکلا۔

''جی ہاں مسز اصغر مجھے شاہ صاحب سے ملنا پڑے گا۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا۔

''شاہ صاحب۔۔۔؟'' شمائلہ نے حیرت سے لفظ دہرایا۔

''جی ہاں۔۔۔ شاہ صاحب۔ بہت نیک اور عبادت گزار بزرگ ہیں وہ ضرور ہمیں کوئی نیک مشورہ دیں گے۔۔۔۔۔ آپ بھی میرے ساتھ چلئے۔ نعمان صاحب کو بھی ساتھ ہی لے لیتے ہیں فی الحال تو ان کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔'' انسپکٹر جمشید نے کہا تو شمائلہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆......☆......☆

میں اسے ہر حال میں پانا چاہتی ہوں۔۔۔ اس نے میری راتوں کی نیندیں اور دن کا چین چھین لیا ہے جہاں دیکھتی ہوں وہی نظر آتا ہے۔ میں نے اسے پہلی مرتبہ ہوٹل روز ینہ میں دیکھا تھا وہ وہاں ویٹر تھا۔۔۔۔۔ وہ ایک ہی نظر میں میری نظروں کے ذریعے میرے دل میں سما گیا میں روزانہ اسی ہوٹل میں کھانا کھانے جاتی ایک دن وہ ہوٹل میں موجود نہیں تھا میں نے دوسرے ویٹر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ آج بیمار ہے، میں نے ویٹر سے اس کا ایڈریس لیا اور اس کے گھر پہنچ گئی۔

لیکن اس کے گھر جانا میرے لئے کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ ''وہ۔۔۔ وہ شادی شدہ تھا۔'' اتنا کہہ کر وہ لڑکی رکی وہ ایک آفس نما کمرہ تھا جس میں ایک خوبصورت لڑکا کرسی پر بیٹھا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اس لڑکے کی آنکھوں پر بلیک گلاسز تھے لڑکے کے سامنے ایک بڑی سی میز پڑی ہوئی تھی ٹیبل کے پاس پڑی کرسیوں میں سے ایک پر فریادی لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر تقریباً سترہ اٹھارہ سال کے لگ بھگ تھی۔

کمرے کی دیوار کے ساتھ دو کرسیوں پر ایک 24-23 سال کی لڑکی اور دوسری کرسی پر 45-40 سال کا ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا ہوا تھا۔۔۔۔۔

شادی شدہ بلیک گلاسز والا وہ لڑکا ہنسا ''ہاں شادی شدہ۔'' میز کے سامنے بیٹھی اس لڑکی نے افسردہ لہجے میں کہا۔ ''وہ شادی شدہ ہے تو کیا ہوا۔ میں پھر بھی اس سے محبت کرتی ہوں اور اسے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتی ہوں۔''

''ایک شادی شدہ مرد کو تم حاصل کرنا چاہتی ہو۔ یہ تو پاگل پن ہے۔ تم کسی اور لڑکے سے محبت

کر سکتی ہو..... اس دنیا میں بے شمار خوبصورت مرد ہیں۔" بلیک گلاسز والے لڑکے نے بظاہر مشورہ دیا۔

"میں صرف اسی لڑکے کو حاصل کرنا چاہتی ہوں..... اور میں اسی لئے تمہارے پاس آئی ہوں..... مجھے میری یہ فرینڈ تمہارے پاس لے کر آئی ہے۔" اس لڑکی نے دیوار کے پاس پڑی کرسیوں پر بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"کام تو میرے لئے یہ مشکل نہیں..... ٹھیک ہے اس کام کے پانچ لاکھ روپے لگیں گے۔" بلیک گلاسز والے لڑکے نے اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے اپنے کام کی قیمت بتائی۔

"مجھے منظور ہے میں سیٹھ امجد کی بیٹی ہوں پانچ لاکھ تو میرے لئے معمولی رقم ہے۔" وہ لڑکی فخریہ لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے۔" بلیک گلاسز والے لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم دونوں باہر جاؤ۔"

دیوار کے پاس پڑی کرسیوں پر بیٹھی لڑکی اور ادھیڑ عمر آدمی چپ چاپ اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے لڑکے نے اپنی گلاسز اتار کر سامنے پڑی میز پر رکھے۔

"اب تم میری بات غور سے سنو میں تمہاری کمر پر ایک منتر لکھوں گا..... تم روزانہ اس لڑکے سے ملنا وہ تمہارا عاشق ہو جائے گا اور اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔" لڑکے نے غور سے لڑکی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس لڑکی کی آنکھوں کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ "مم..... مم..... مجھے منظور ہے۔" لڑکی نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے اب تم اپنی قمیض اتار دو۔" لڑکے نے کہا تو لڑکی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اٹھ کر کھڑی ہوئی اور اس نے اپنی قمیض اتار دی لڑکے کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی وہ اٹھ کر لڑکی کے سامنے پڑی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا لڑکی نے منہ دوسری طرف کیا اب لڑکی کی کمر لڑکے کی طرف تھی اب لڑکا لڑکی کی کمر پر اپنی انگلی سے کچھ لکھنے لگا۔

اچانک دوسرے کمرے میں شور کی آواز سنائی دی لڑکے نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا اسی وقت شائلہ نعمان اور انسپکٹر اندر داخل ہوئے ان کے ساتھ وہ لڑکی اور ادھیڑ عمر آدمی ہتھکڑیاں پہنے ہوئے تھے اور چار پانچ کانسٹیبل بھی تھے۔

وہ لڑکا اور لڑکی گھبراتے ہوئے اپنی کرسیوں سے اٹھ کر کھڑے ہوئے، لڑکی اپنی بانہوں سے اپنا ننگا بدن چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگی، انسپکٹر نے ایک زوردار تھپڑ اس لڑکے کے چہرے پر دے مارا۔

"انسپکٹر۔" وہ لڑکا چیخا..... "تم نے مجھ پر ہاتھ اٹھا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔" انسپکٹر نے جواب دینے کی بجائے اس پر تھپڑوں کی مزید بارش کر دی وہ لڑکا مار کھاتے کھاتے زمین پر جا گرا تو انسپکٹر نے اسے ٹھڈے مارنے شروع کر دیئے۔

وہ لڑکی اب اپنی قمیض پہن چکی تھی اور اب سب کی طرف شرمسار نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

"حرام زادے لوگوں پر کالا عمل کرتا ہے تو..... کالا جادو کرتا ہے تو..... شریف لوگوں کے گھر تباہ کرتا ہے تو..... تیرا تو میں مار مار کر بھرکس نکال دوں گا۔" انسپکٹر بولنے کے ساتھ ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں بھی چلا رہا تھا۔

اس لڑکی کو آفس سے باہر لے جایا جا چکا تھا جبکہ دوسری لڑکی اور وہ ادھیڑ عمر آدمی ہتھکڑیاں پہنے بے بسی کے عالم میں اس لڑکے کو انسپکٹر جمشید سے مار کھاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"انسپکٹر صاحب آپ پیچھے ہٹ جائیں مجھے اس سے چند باتیں کرنی ہیں۔" جب انسپکٹر کسی بھی طرح باز نہ آیا تو شائلہ نے آگے بڑھتے ہوئے کہا انسپکٹر کا ارادہ شاید اس لڑکے کو جان سے مارنے کا تھا۔

انسپکٹر نے پیچھے ہٹتے ہٹتے بھی کئی ٹھڈے اس لڑکے کو دے مارے اس لڑکے کی حالت کافی بری تھی اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے اور چہرہ بھی کئی جگہ سے لہولہان ہو چکا تھا وہ لڑکا کراہتے ہوئے فرش پر اٹھ کر بیٹھا۔

شائلہ اس کے سامنے پڑی کرسی پر بیٹھتے ہوئے

بولی۔ "بولو تم نے ایسا کیوں کیا... کیوں میرا ہنستا بستا گھر اجاڑ دیا...... کیوں میرے شوہر، میرے بیٹے اور بیٹی کو مجھ سے چھین لیا...... بولو کیوں ایسا کیا تم نے...... آخر ہم نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔"

شمائلہ کا لہجہ غمگین تھا...

"وہ......وہ...... میں نے نہیں بلکہ...... بلکہ مجھ سے کروایا گیا..." اس لڑکے نے اپنے ہونٹوں سے نکلنے والے خون کو اپنی قمیض کی آستین سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

"دیکھو جھوٹ مت بولو...... ہم تمہاری حقیقت سے آگاہ ہوچکے ہیں... شاہ صاحب نے ہمیں تمہارے متعلق کافی کچھ بتادیا ہے..... تم ہی اس سارے کھیل کے مالک ہو اور تمہارا نام حامد ہے۔" شمائلہ نے عجیب بات کہی۔ "تم جان بوجھ کر اپنا موبائل بھی میرے گھر چھوڑ آئے تھے جس میں تم نے اپنی کالیں ریکارڈ کی تھیں اور کوئی شہروز نامی لڑکا تمہیں یہ سب کچھ کرنے کو کہتا تھا... لیکن وہ بھی تمہارے اس کھیل کا حصہ تھا تاکہ تم جب کل پکڑے جاؤ تو سب سے یہی کہو گے کہ تم تو بالکل بے قصور ہو..... اور تم سے یہ سب کچھ کروایا گیا ہے۔

لیکن شاہ صاحب نے ہمیں بتادیا ہے کہ یہ سب کچھ تم ہی نے کیا ہے اور یہ بھی جس نے اغوا ہونے کا ڈرامہ رچایا تھا وہ بھی اور ہمارا یہ ملازم کرم دین بھی تمہارے ہی ساتھی ہیں۔" شمائلہ نے ہتھکڑیاں پہنے اس لڑکی اور ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ کرم دین ہی شہروز بن کر تم سے موبائل پر بات کرتا تھا اور یہی اکبر کے بھیس میں یتیم خانے کا چوکیدار تھا...... لیکن..... لیکن میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم نے ہمارے ساتھ ایسا کیوں کیا......؟"

تمہارے اس کمینے اور لنگڑے شوہر اصغر کی وجہ سے......" حامد چیخا۔

"اصغر کی وجہ سے......" شمائلہ حیران ہوئی۔

"اس نے تم لوگوں کا کیا بگاڑا تھا؟"

"اس نے..." حامد نے جبڑے بھینچتے ہوئے... "اس نے ہماری ہنستی بستی دنیا اجاڑ کر رکھ دی۔"

"کیا کیا، انہوں نے..." شمائلہ نے کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھا۔

"پوچھو میرے باپ سے۔" حامد نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "کک...... کون ہے تمہارا باپ؟..." شمائلہ نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ "وہ ہے میرا باپ..." حامد نے ہتھکڑیاں پہنے اس ادھیڑ عمر شخص کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ... یہ تمہارا باپ ہے۔"

شمائلہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہاں میں ہی ہوں اس کا بدنصیب باپ ساجد...... ہم نے تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا..... تمہارے شوہر نے ہی ہماری دنیا اجاڑ دی اور ہم نے بھی تمہاری دنیا اجاڑ دی حساب برابر۔" اس مرتبہ حامد کا باپ ساجد بولا۔

"کیا کیا تھا اصغر نے......؟" شمائلہ اس مرتبہ چیخی۔

"میری بیوی اور حامد کی ماں کی عزت لوٹی تھی اس کمینے شخص نے۔" اس مرتبہ ساجد چیخا۔

"کک...... کیا......؟" اس مرتبہ ساجد اور نعمان چلائے۔

"ہاں...... اس کمینے نے ہماری ہنستی بستی زندگی کو جہنم سے بدتر بنادیا...... ہم ایک تھیٹر چلاتے تھے جس میں طنز و مزاح کے ڈرامے ہوا کرتے تھے ایک رات تمہارا شرابی شوہر اصغر اس تھیٹر میں آیا اور میری بیوی پر فقرے کسنے لگا تھیٹر کی سیکورٹی کی سختی پر یہ اس کے ساتھی اس وقت تو باہر چلے گئے مگر ڈرامہ ختم ہونے پر یہ میری بیوی کو خیمے سے اٹھا کر لے گئے اور اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں باقی لڑکیوں نے ہمیں آکر بتایا کہ تین چار لڑکے میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

ہم حامد کی ماں ثانیہ کی تلاش میں نکلے تو ثانیہ ایک جگہ ہمیں زخمی حالت میں ملی وہ بے آبرو ہو چکی تھی، اس نے ہمیں اصغر اور اس کے ساتھیوں کے متعلق بتایا، اس سے پہلے کہ میں ثانیہ کو اسپتال لے کر جاتا وہ

راستے میں ہی دم توڑ گئی۔

میں نے اور حامد نے قسم کھائی کہ ہم ثانیہ کے قاتلوں کو بھیانک موت دیں گے، ابھی ہم وہیں بیٹھے ثانیہ کی لاش پر آنسو بہا رہے تھے کہ وہاں ایک شخص آیا جو ہمارے لئے مہربان ثابت ہوا اس نے ہم سے کہا کہ ''اگر تم اپنی بیوی کا بدلہ لینا چاہتے ہو تو تمہیں میری پیروی کرنا ہوگی۔''

''تم کون ہو.....؟'' میں نے اس شخص سے پوچھا۔

''میں تمہارا مہربان ہوں اگر تم چاہتے ہو کہ وہ قاتل بھیانک موت مریں اور ان کے خاندانوں کو بھی بھیانک موت ملے تو تمہیں میرا راستہ چننا پڑے گا۔'' اس خوف ناک شکل کے مالک شخص نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کیسا ہے تمہارا راستہ اور تم اصل میں کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں...... میں شیطان ہوں۔'' اس شخص نے حیران کن بات کہی۔ ''میرا راستہ بدی کا راستہ ہے تمہیں کالا جادو سیکھنا پڑے گا۔''

کالا جادو کا سن کر میں حیران ہوا لیکن جب ہم نے اس شخص کی کہی ہوئی باتوں پر عمل کرنا شروع کردیا تو ہمارے لئے آسانیاں ہی آسانیاں پیدا ہوگئیں میں نے اصغر کے تینوں ساتھیوں کو بھیانک موت دی اور جس دن اصغر کا ایکسیڈنٹ ہوا...... ''تمہیں یاد ہوگا تمہارا بیٹا بھی اس میں تھا...... یاد ہے ناں۔'' اتنا کہہ کر ساجد رکا۔

''ش...... شہروز......'' شمائلہ کے منہ سے نکلا۔

''میں اس دن ڈرائیور کے دماغ پر حاوی ہوگیا تھا میں نے اس سے کہا کہ وہ کار سامنے والی چٹان میں دے مارے اور ڈرائیور نے میرا حکم مانا اور کار سامنے والی چٹان میں دے ماری، کار چٹان سے ٹکرانے سے پہلے شہروز دور جھاڑیوں میں جاگرا، کار چٹان سے ٹکراتے ہی اصغر مرا تو نہیں ہاں البتہ وہ اپنی دونوں ٹانگیں کھو بیٹھا۔

مجھے اپنے کالے عمل کے ذریعے پتہ چلا کہ شہروز یتیم خانے میں ہے میں نے وہاں کے ملازم کو تگڑی رقم دے کر فارغ کروایا اور خود وہاں ملازمت پر لگ گیا پھر میں ایک دن منصوبہ کے تحت حامد اور عینی کو یتیم خانے میں لے آیا اور میڈم شگفتہ سے کہا کہ مجھے سڑک پر یہ دو یتیم بچے ملے ہیں میں انہیں یہاں لے آیا۔

عینی بھی ایک یتیم تھی اور وہ بچ میں ثانیہ کو یتیمی کی حالت میں ملی تھی وہ بھی بعد میں ہمارے ڈراموں کا حصہ بنی اب حامد شہروز کے پیچھے پڑ گیا، اسے وہ بھی اپنی ماں کا قاتل لگتا تھا وہ یتیم خانے میں شہروز کو سب کی نظروں میں برا ثابت کرنے لگا عینی نے پہلی مرتبہ حامد کے کہنے پر شہروز کا کھلونا چرایا۔

عینی کو جو خون کی الٹیاں آئیں تھیں وہ بھی حامد کے کالے عمل کا کمال تھا اور وہ جو میڈم شگفتہ کے کمرے میں مردہ بلی ملی تھی اس کا خاتمہ بھی حامد نے ہی کیا تھا پھر حامد نے ہی شہروز کے بیڈ کے نیچے کالے عمل کا نشان بنایا اور پھر عینی کو باندھ کر اس بیڈ کے نیچے چھپادیا اور میں نے ہی میڈم شگفتہ کو بتایا کہ میں نے عینی اور شہروز کو اکٹھے دیکھا تھا اور خود ہی شہروز کے بیڈ کے نیچے سے عینی کو دریافت کیا اور سب کے سامنے کالے علم کا نشان واضح کیا یعنی سب کے سامنے یہ ظاہر کیا کہ شہروز کالا علم کرتا ہے۔

شہروز اب سمجھ چکا تھا کہ یہ سب کچھ حامد اس کے خلاف کررہا ہے اور وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ حامد اس کے ساتھ ایسا کیوں کررہا ہے جب میڈم شگفتہ سوگئی تو وہ میڈم شگفتہ کے کمرے سے باہر آیا تو اس نے دیکھا حامد میڈم کلثوم کے کمرے کی طرف جارہا تھا حامد میڈم کلثوم کو شہروز بن کر مزید ڈرانا چاہتا تھا شہروز چپ چاپ اس کے پیچھے چلنے لگا حامد نے اپنے کالے علم کے بل بوتے پر میڈم کلثوم کے کمرے کی کنڈی اندر سے گرائی کنڈی کی آواز سن کر میڈم کلثوم جاگ تو گئیں مگر ڈر کی وجہ سے اپنے بستر سے نہ اٹھیں حامد میڈم کلثوم کے کمرے میں داخل ہوا تو شہروز نے اسے آواز دی اور پوچھا کہ وہ اس کے ساتھ ایسا کیوں کررہا ہے آخر اس نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔

حامد نے اسے ساری حقیقت سے آگاہ کیا کہ ہم اس کے ساتھ اس کے باپ کی وجہ سے یہ سب کچھ کررہے ہیں ہم اسے اور اس کی فیملی کو ختم کردیں گے

میڈم کلثوم بیڈ سے اتر کر نیچے آئیں اور حامد کے گالوں پر تین چار تھپڑ لگا دیئے، غصے میں حامد نے اسے چاقو کے ذریعے ختم کر دیا اور شہروز کو میڈم کلثوم کی طرف دھکا دے دیا جس سے اس کے ہاتھ اور قمیض خون سے رنگ گئے۔

شہروز اٹھا اور باہر کی طرف بھاگ گیا میں نے اپنی طاقتوں سے میڈم شگفتہ کو بیدار کیا اور اس طرف متوجہ کیا کہ شہروز یتیم خانے سے بھاگ رہا ہے ادھر حامد نے کمرے کا دروازہ بند کیا اور میڈم کلثوم کے پیٹ سے خنجر نکالا جس سے میڈم کلثوم کی آخری چیخ نکلی۔

میڈم شگفتہ نے رنگے ہاتھوں حامد کو پکڑ لیا تھا مجبوراً حامد کو جیل جانا پڑا جب حامد جیل چلا گیا تو میں بھیس بدل کر ایک عورت کے ساتھ عینی کو اغوا کرنے کے لئے آ گیا فرضی پتہ لکھوایا جیل سے رہا ہونے کے بعد حامد میڈم شگفتہ کی طرف گیا اور فرضی کہانی سے اسے اپنی طرف کیا میں نے حامد کے جیل میں جانے کے بعد کرم دین کے نام سے تمہارے گھر ملازمت کر لی تھی پھر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہم نے نعمان کا اغوا کیا اور نعمان کی شکل میں حامد تمہارے گھر آیا اس نے تمہارے علاوہ سب کو نعمان بن کر ہی ختم کیا اور ایک ماہ کے بعد ہم نے نعمان کو چھوڑ دیا۔

ماریہ کے قتل کے سلسلے میں انسپکٹر جمشید نے اصل نعمان کو گرفتار کر لیا تھا اور باقی ثبوت ہم نے تمہارے ذریعے کرنے تھے کیونکہ نعمان کی شکل کے پیچھے چھپے حامد کے ہاتھ میں کالے جادو کے لفافے تم اکثر دیکھ چکی تھی کاشف کو بھی ریپ کے سلسلے میں حامد نے ہی پھنسایا تھا اور جیل میں کالے علم کے کاغذ کے ذریعے اسے ختم کیا۔

کالے علم کے لفافے اور اس کھلونے کے ذریعے تم یہی فیصلہ کر پاتی کہ نعمان نے ہی یہ سب کچھ کیا ہے۔ نعمان ادھر جیل میں قتل کی سزا بھگتا اور تم اکیلی تڑپتی۔ لیکن اس شاہ کے بچے نے ہمارا سارا کام خراب کر دیا..... خیر پھر بھی یہ پولیس اور تم ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... لیکن ایک حیرانگی والی بات ہے کہ میں کافی دیر سے تم لوگوں پر منتر پڑھ پڑھ کر پھونک رہا ہوں لیکن..... تم لوگوں کو کچھ ہو نہیں رہا۔'' ساجد نے بتاتے ہوئے حیرت ظاہر کی۔

سب سے بڑی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے کمینے انسان..... اندھیرا چاہے کتنا ہی گہرا کیوں نہ ہو روشنی کی ایک چھوٹی کرن ہی کافی ہوتی ہے، یہ تو واقعی حقیقت ہے کہ کرے کوئی اور بھرے کوئی..... اصغر کے کئے کی سزا ہم سب کو بھگتنا پڑی..... تمہارے منتر ہم پر اس لئے اثر نہیں کر رہے کیونکہ شاہ صاحب نے ہم پر کلام الٰہی پڑھ کر پھونکا ہے..... اور نوری علم پر کالا علم نہیں چلتا۔

''اب تم یہ بتاؤ کہ میرا بیٹا شہروز کہاں ہے.....؟'' شمائلہ نے عزم کے ساتھ کہتے ہوئے پوچھا۔

''اسے تو میں نے اسی رات ختم کر دیا تھا جس رات وہ یتیم خانے سے بھاگا تھا۔'' دکھیاری ماں کے سینے پر ساجد نے ایک وار پھر کیا۔

''حرام زادے، کمینے، ذلیل انسان میں تم تینوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی۔'' شمائلہ یکدم بھڑک کر کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی، اس نے اپنے دوپٹے کے پلو میں چھپی شاہ صاحب کی دی ہوئی پانی کی بوتل نکالی سب حیرانگی سے شمائلہ کی طرف دیکھنے لگے، شمائلہ نے بوتل کا ڈھکنا کھول کر بوتل کا پانی ساجد پر ڈال دیا۔

کمرہ ساجد کی چیخوں سے گونج اٹھا شمائلہ نے باقی بچا پانی عینی اور حامد پر بھی ڈال دیا تو ان کی چیخوں سے بھی کمرہ گونج اٹھا تینوں کے جسموں میں یکدم آگ بھڑک اٹھی۔

سب پیچھے ہٹ گئے حیرت کی بات یہ تھی کہ آگ نے ان تینوں کے سوا کسی چیز کو نہ چھوا سب حیران کھڑے حامد، ساجد اور عینی کا بھیانک انجام دیکھ رہے تھے۔

اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھنے والے چند لمحوں میں جل کر راکھ ہو گئے۔

تاریکی کا عفریت

ایس امتیاز احمد۔ کراچی

تابوت میں مردہ لیٹا تھا کہ اچانک اس کی آنکھیں کھل گئیں اس کی آنکھوں میں جیسے شرارے ناچ رہے تھے کہ اچانک اس کا استخوانی ہاتھ اوپر کو اٹھا اور چشم زدن میں خوبرو حسینہ کا گلا دبوچ لیا اور جب حسینہ کی چیخ نکلی تو......

خوف کے خونی لبادے میں لپٹی ہوئی دماغ کو مبہوت کرتی اور دل کو دہلاتی خونچکاں کہانی

ٹونی چھوٹی سڑک پر بگھی آگے بڑھ رہی تھی۔ کارپیتھیا کا یہ علاقہ اپنے گھنے جنگلوں اور سبزہ زاروں کی وجہ سے سیاحوں کے لئے دلچسپی اور توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا لیکن اس علاقے میں ذرائع آمدورفت محدود تھے۔ اس لئے بہت کم لوگ ادھر کا رخ کرتے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے ہوئے چاروں مسافر بے چینی سے پہلو بدل رہے تھے۔ گاڑی پتھریلی اور ناہموار سڑک پر بری طرح ہل رہی تھی۔

باہر شام کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ اگر ان لوگوں کو راستے کی خرابی اور اپنی تھکن کا علم ہوتا تو وہ اس علاقے میں آنے کی بجائے اپنی چھٹیاں ویانا میں ہی گزار لیتے۔ لیکن اب اوکھلی میں سر دیا تھا تو موسلوں سے گھبرانا لاحاصل تھا۔ بہر حال یہ سب کیا دھرا چارلس کا تھا جس کے اصرار پر ان لوگوں کو یہاں آنا پڑا تھا۔

ان کی ہڈیاں بری طرح دکھ رہی تھیں، ان کے جوڑ جوڑ میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ خدایا یہ سفر جلدی ختم ہوتا کہ وہ کچھ دیر آرام کرسکیں اور تازہ دم ہوجائیں تاریکی بڑھ رہی تھی اور یہ بات بعید از قیاس معلوم ہوتی تھی کہ اس تاریکی میں کوچوان کو راستہ صاف نظر آرہا ہوگا۔

چند لمحوں بعد بگھی کے رکنے کی آواز آئی اور اندر بیٹھے ہوئے مسافران جانے خوف اور وسوسوں میں گھر گئے...... وہ سوچ رہے تھے کہ کہیں وہ راستہ بھٹک کر ان جنگلوں میں گم تو نہیں ہوگئے! لیکن وہ ایک سرائے میں آگئے تھے کوچوان کود کر نیچے اترا اور دروازہ کھول دیا۔ دن بھر کی صبر آزما مسافت اور تھکن کے بالآخر انہیں آرام وطعام کی سہولت میسر آگئی تھی۔

مہمانوں کا کمرہ اجنبی مسافروں کا منتظر تھا یہ سرائے چھوٹی تھی لیکن سرائے کا مالک اپنے برطانوی مہمانوں کو خوش کرنے کے لئے پوری تندہی سے مصروف کار نظر آنے لگا۔ گرم پانی تیار کیا گیا اور جتنی دیر میں یہ برطانوی سیاح نہادھو کر تازہ دم ہوئے کھانا لگایا جاچکا تھا۔

کھانے سے فارغ ہوکر یہ لوگ آتش دان کے گرد اکٹھے ہوگئے اور قہوہ کا دور چلنے لگا۔ سب لوگ گھل مل کر باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ تمباکو کی مہک اور قہوے کی تیز خوشبو نے مل جل کر سرائے پر ایک خوابناک ماحول طاری کردیا تھا۔ یورپ کے اس تفریحی دورے کا پروگرام۔ چارلس کینٹ نے بنایا تھا وہ ہمیشہ سے ایڈونچر اور سیر وتفریح کا دلدادہ تھا اور نت نئے تفریحی پروگرام بنانا اس کا دلچسپ اور محبوب ترین مشغلہ تھا۔

اس نے سرائے کے مالک کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی

جرمن میں گفتگو شروع کردی اور دوستی کرلی۔ سرائے میں موجود چند اور لوگوں کو اپنے برطانوی مہمان سے بات چیت کرنا گوارہ نہیں تھا۔ پھر بھی جب چارلس نے انہیں قہوہ پینے کی دعوت دی تو وہ زیر لب مسکرائے۔ کچھ لوگ پائپ پی رہے تھے اور اس گہما گہمی میں بظاہر بڑی بے نیازی سے شامل نظر آتے تھے۔ پھر وہ لوگ جوا کھیلنے میں مصروف ہوگئے۔ چارلس نے سکہ دوبارہ اچھالا اور وہ دونوں بار جیت گیا۔

دوسرے لوگوں میں جھنجھلاہٹ سی ہونے لگی لیکن چارلس نے ماحول کی کشیدگی کے پیش نظر تقریباً ہر شخص کو شراب پلانے کی پیشکش کی اور ماحول پھر سے پرسکون ہوگیا۔ ہیلن کو یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا یہی نہیں بلکہ چارلس کے بڑے بھائی ایلین نے ابھی اپنی رائے محفوظ رکھی اور کسی قسم کا کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

بہرحال ایلین مسکراتے ہوئے یہ سب کھیل دیکھ رہا تھا چارلس نے بمشکل تمام ایلین اور اس کی بیوی ہیلن کو اس مہم پر آنے کے لئے رضامند کیا تھا۔ ان دونوں بھائیوں کو ورثے میں تھوڑی سی جائیداد ملی تھی۔ چارلس زندگی میں اچھی اچھی چیزوں تفریحات اور عیاشیوں کا قائل تھا اس کے برعکس ایلین کو اپنی بیوی ہیلن کا ساتھ دینا پڑتا تھا جو کنجوس تو نہیں تھی لیکن کفایت شعار ضرور تھی۔ اسی لئے ایلین نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ ایک کاروبار میں لگا رکھا تھا اور اپنی سیاسی اور معاشی حالت خاصی مستحکم کرلی تھی۔ وہ چارلس کی طرح نئی نئی دلچسپیوں اور ایڈونچرز کی تلاش میں کوشاں نہیں رہتا تھا۔

ایلین کی شادی کو سات آٹھ برس گزر چکے تھے لیکن اس کی بیوی ہیلن اب بھی پہلے کی طرح شاداب اور شگفتہ نظر آتی تھی۔ ہیلن تیس برس کی ہوچکی تھی لیکن اس کی جلد شفاف اور بے داغ تھی وہ اپنے بال بہت کس کے باندھا کرتی تھی۔ اس کے باوجود اس کے چہرے کی معصومیت میں کمی نہیں آتی تھی۔ وہ اپنے پتلے پتلے ہونٹوں کو دانتوں میں دبا کر چوستی رہتی تھی۔ چارلس اور ایلین نے کئی بار اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا تھا

لیکن اب یہ چیز ہیلن کی عادت بن چکی تھی۔

چارلس کی بیوی ڈیانا جو اس سفر میں ان کے ہمراہ تھی بڑی دلکش اور خوبرو عورت تھی۔ چارلس سرائے کے مسافروں میں قہوہ تقسیم کررہا تھا اور ہیلن اس کی اس فضول خرچی پر بڑبڑا رہی تھی۔ ڈیانا کے چہرے پر ایک دلفریب مسکراہٹ رقص کررہی تھی اور وہ بڑی دلچسپی سے اپنے شریک حیات کو قہوہ پیتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

ڈیانا کا جسم لوچدار اور گداز تھا اور اس کے گدرائے ہوئے جسم کی چاشنی اسی وقت چارلس کے دل ودماغ میں گھلی جارہی تھی۔ ڈیانا نے بے تکلفی سے اپنا پیالہ آگے بڑھایا اور چارلس نے اسے ارغوانی رنگ کے قہوے سے بھردیا۔ ہیلن بے بسی سے سرہلا کررہ گئی۔ وہ اس کے سوا بھلا کر بھی کیا سکتی تھی؟

وہ سوچ رہی تھی کہ سرائے میں قیام پذیر دوسرے لوگ یقیناً چارلس کو احمق سمجھ رہے ہوں گے۔ آخر اس سے رہا نہ گیا۔ ’’وہ بولی چارلس بس بہت ہوچکی۔ اب تم یہ بچکانہ حرکتیں ختم کرو۔ اتنی فضول خرچی سے بھلا کیا فائدہ؟‘‘

’’مجھے اپنی خوشی سے مطلب ہے۔ لوگ کیا سوچ رہے ہیں مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔‘‘ چارلس نے سردمہری سے جواب دیا پھر اپنے بھائی ایلین کی طرف متوجہ ہوا۔ ’’کیا تم بھی ہیلن کی طرح میری فیاضی کو ناپسند کرتے ہو۔‘‘ ایلین مسکرایا۔ ’’میرے بھائی میں تو مدت ہوئی تمہارے متعلق پسند یا ناپسند والی حد سے بہت آگے نکل چکا ہوں۔‘‘

’’حماقت تو بہرحال حماقت ہی ہوتی ہے۔‘‘ ہیلن بڑبڑائی! ڈیانا بالکل خاموش رہی۔ اور اپنی خمار آلود آنکھوں میں مستی کے ڈورے لئے نشلی مسکراہٹ لبوں پر سجائے محبت پاش انداز میں چارلس کو دیکھنے لگی۔

’’میرا خیال ہے رات بہت بیت چکی۔ اب ہمیں سوجانا چاہئے!‘‘ چارلس نے ڈیانا کی آنکھوں کا پیغام پڑھ لیا تھا۔ ہیلن بھی دوسری صبح پھر اسی تکلیف دہ سفر پانے کی تیاری کرنے کے لئے خود کو جلد از جلد تازہ دم

کرلینا چاہتی تھی اسی لئے آرام کی طلب اسے بری طرح ستا رہی تھی۔

ابھی وہ کمرے سے نکل کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ ہی رہے تھے کہ سرائے کا صدر دروازہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ کھلا اور سرد ہوا کا ایک تیز جھونکا کمرے میں داخل ہوا۔ سرائے میں موجود لوگوں کے جسم میں سردی کی لہری دوڑ گئی اور وہ خوف زدہ ہوکر دروازے کی طرف دیکھنے لگے۔

دروازے کے بیچوں بیچ ایک قوی ہیکل لمبا چوڑا راہب کھڑا تھا۔ اس نے تیزی سے اپنی عقابی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ تیزی سے اس نے اپنے دانتوں سے ہونٹ کاٹے پھر بڑی بے نیازی سے دروازہ زور سے بند کردیا۔ کمرے میں ایک بار پھر آتش دان کی گرمی آہستہ آہستہ بڑھنے لگی۔

وہ تیزی سے آتش دان کی طرف بڑھا اور غرایا۔" مجھے ایک بوتل سرخ شراب کی شدید طلب ہے۔ سردیوں کی اس برفانی رات میں تو کوئی درندہ بھی باہر نہیں رہ سکتا!" یکایک اس کے سر سے کوئی چیز ٹکرائی۔ اس نے جھنجلا کر اوپر دیکھا۔ وہاں کسی نے لہسن کی ایک پوتھی سیاہ ڈوری میں باندھ کر لٹکا رکھی تھی۔ اس نے جنگلی پن سے بڑے وحشیانہ انداز میں اس ڈوری کو توڑ دیا اور لہسن کی پوتھی اٹھا کر آتش دان میں جھونک دی۔ "احمق کہیں کے خبیث بدروحوں کو روکنے اور شیطانی قوتوں سے سرائے کو محفوظ رکھنے کا یہ کیا دقیانوسی طریقہ اختیار کر رکھا ہے۔" فادر شینڈور! سرائے کا مالک کھسیانے لگا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا آخر تم لوگوں کی کھوپڑیوں میں کیا بھوسا بھرا ہوا ہے۔" وہ پھر غرایا۔" دس برس ہوچکے اب یہ سب بکواس ختم ہوچکی ہیں۔"

کمرے میں جہاں کچھ دیر پہلے آوازوں کا شور تھا۔ ایک روح فرسا خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فادر شینڈور نے شعلہ بار نگاہوں سے کمرے میں موجود لوگوں کو گھورا اور بولا!۔ "یہاں آنے سے کچھ دیر پہلے ایک معصوم بچے کی لاش کو میں نے اس عذاب سے نجات دلائی۔ وہ بدبخت لوگ اسے جلا ڈالنے پر مصر تھے۔ آخر کب تک ہم لوگ یونہی وسوسوں، ضعیف الاعتقادی اور توہمات کا شکار ہوتے رہیں گے۔"

سب لوگ خاموش تھے۔ یکایک پہلی بار فادر کی نظر برطانوی باشندوں پر پڑی۔ اس نے بھرپور نظروں سے چاروں سیاحوں کا جائزہ لیا اور آہستہ سے احتراماً ڈیانا کی تعظیم کے لئے جھکا۔ وہ جواباً مسکرائی اور سر کے اشارے سے اسے سلام کیا۔ فادر شینڈور نے ہیلن کو بھی تعظیم دی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی، ٹکٹکی باندھے اس کی جانب دیکھتی رہی۔

"زندگی میں سوائے دکھوں کے اور بھلا رکھا بھی کیا ہے۔ میں اسی لئے جو لمحہ بھی عیش و آرام سے گزر جائے اسے زندگی کا حاصل سمجھتا ہوں! آرام اور عیاشی تفریح اور سکون روح کے لئے ضروری ہیں۔"

چارلس نے حیرت سے راہب کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی باتوں میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔" فادر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ زندگی کی گہما گہمیوں سے بڑی رغبت رکھتے ہیں؟" چارلس نے کہا۔

"زندگی میں سکون اور عیش بے حد ضروری ہیں میرے بچے اور اس کے علاوہ بھلا کیا دھرا ہے زندگی میں جہنم کی آگ مرنے کے بعد انسان کی منتظر ہوتی ہے اور ویسے بھی تو زندگی ایک جہنم سے کم نہیں ہوتی!" فادر شینڈور نے کہا۔

ہیلن نے بے زاری سے ناک سکوڑی۔ فادر شینڈور نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔" اچھا تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ میرے پیارے برطانوی مہمان یہاں کارپتھیا میں کیا کر رہے ہیں؟"

چارلس نے اپنا اور دوسرے ساتھیوں کا مختصر سا رسمی تعارف فادر شینڈور سے کرایا۔ پادری نے نرمی سے اور خوش دلی سے گردن ہلائی اور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔" اور مجھے فادر شینڈور کہتے ہیں۔ میں کلین برگ کے گرجا کا بڑا پادری ہوں۔"

چارلس نے اپنے ذہن میں کلین برگ کے محل

وقوع کے بارے میں ایک مبہم سی تصویر بنانی چاہی لیکن وہ ناکام رہا۔" فادر نے اس کے تذبذب کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میرے بچے یہ جگہ یہاں سے کافی دور ہے۔ ہاں یہ تو بتاؤ کیا تم شکار کھیلنے کے شوقین ہو؟"

چارلس نے جواب دیا۔ "نہیں مجھے کوہ پیمائی کا بہت شوق ہے۔ ویسے بھی مجھے سیاحت اور قدرتی مناظر سے لطف اندوز ہونے سے جنون کی حد تک عشق ہے!"

"خوب بہت خوب۔" فادر شینڈور مسکرایا۔ "مجھے اپنے ساتھیوں سے یہی کہنا ہے کہ یہاں کے لوگوں کے بارے میں میری رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ میری خواہش ہے کہ تم چاروں وہاں کلین برگ جاؤ اور چند دن دوسرے راہبوں کی پرلطف رفاقت میں بھی گزارو! ہم سب خلوص دل سے تمہارے لئے چشم براہ رہیں گے۔"

چارلس کی باچھیں اس دعوت پر کھل گئیں۔ وہ سوچنے لگا یہ بھی ایک دلچسپ تجربہ ہوگا۔ اسے ہمیشہ نت نئے اور دلچسپ پروگرام بہت پسند آتے تھے۔ اس نے ابھی کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ ہیلن نے اس کی بات کاٹتے ہوئے سختی سے کہا۔ "لیکن کلین برگ جانا ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے! ہم وہاں نہیں جاسکتے۔"

چارلس نے کہا۔ "میرا خیال ہے اگر ہم ایک آدھ دن وہاں گزار آئیں تو کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

ہیلن بولی۔ "لیکن کل ہمیں جوزف سباد جانا ہے!

فادر شینڈور نے بڑی سنجیدگی سے کہا میرا خیال ہے آپ لوگوں کو اپنا پروگرام ہر قیمت پر بدل لینا چاہئے!" ہیلن کے تن بدن میں جیسے چنگاریاں سی لگ گئیں۔

ایلن نے بھی اس لمحے میں ہیلن کا ساتھ دینا مناسب سمجھا، وہ نرمی سے بولا۔ "آپ کی بے حد نوازش بڑی عنایت کہ آپ ہمیں کلین برگ کی دعوت دے رہے ہیں۔ ہم سب اس خلوص کے لئے آپ کے تہہ دل سے شکر گزار ہیں، لیکن ہم نے وہاں سے چلنے سے پہلے ہی اپنا پروگرام ترتیب دے لیا تھا۔ اس نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے معذرت چاہی۔

"لیکن میرے خیال میں جوزف سباد جانا ایک فاش غلطی ہوگی۔ یہ خیال ہی ایک حماقت سے کم نہیں۔ میں آپ لوگوں کو کلین برگ آنے کے لئے تو مجبور نہیں کرسکتا لیکن یہ مشورہ ضرور دوں گا کہ آپ لوگ جوزف سباد ہرگز ہرگز نہ جائیں!" فادر نے نرم لہجے میں تنبیہ کی۔

"لیکن ہم نے تو سنا ہے وہ بڑی خوبصورت جگہ ہے!" ڈیانا نے اصرار کیا۔ "ویسے بھی فادر ہم لوگ بڑے تجربہ کار کوہ پیما ہیں۔ کیا وہاں بہت خطرناک اور دشوار گزار چٹانیں اور راستے ہیں؟"

چارلس کی بات سن کر فادر شینڈور نے ایلن کی طرف دیکھا اور کہا۔ "لیکن میں صرف یہ جانتا ہوں کہ جوزف سباد سے دور رہنا ہی تم لوگوں کے حق میں بہتر ہوگا!"

ڈیانا سے نہ رہا گیا۔ "لیکن آخر کیوں؟" وہ تجسس سے بولی۔

"میرے بچو! اگر میں تمہیں ساری تفصیلات بتادوں تو تم شاید میری باتوں کا یقین نہیں کروگے۔ میں خود بھی توہمات کا قائل نہیں ہوں، لیکن خطرے سے دور رہنا ہی بہتر ہوگا۔ جوزف سباد بدروحوں کا مسکن ہے اور مجھے ڈر ہے کہ وہاں کے رہنے والے لوگ تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ اس ملک میں اور بھی بہت خوبصورت جگہیں موجود ہیں۔ جہاں دل چاہے جاکر زندگی کا صحیح لطف اٹھاسکتے ہو لیکن جوزف سباد نہ جانا ہی اچھا ہے۔" فادر شینڈور نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

چارلس بولا۔ "تو گویا یہ چیزیں بھی اب ہمارے لئے چیلنج بن گئی ہیں! فادر شینڈور نے کوئی جواب نہیں دیا اور چلایا۔ "سرائے کا مالک کہاں ہے؟"

"سرائے کے مالک نے آگے بڑھ کر سراسیمگی کے عالم میں پادری کے ہاتھ سے شراب کا خالی جام لے لیا۔ "اپنے آدمی سے کہو میرا گھوڑا باہر تھان سے کھول کر لے آئے مجھے ابھی بہت دور جانا ہے!" پھر وہ چارلس وغیرہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "اچھا میرے بچو یسوع مسیح تمہاری حفاظت کرے بہتر تو یہی ہے کہ تم میری ہدایت پر عمل کرو۔ لیکن اگر تم ایسا نہ کرسکو، تو بھی قلعے کے قریب مت جانا اسی میں تمہاری بھلائی ہے!"

قلعہ۔'' ایلین نے حیرت سے دہرایا۔'' نقشے میں تو قلعہ نام کی کوئی چیز موجود نہیں ہے!''

''ضروری نہیں کہ جو چیز نقشے میں نہ ہو اس کا وجود سرے سے نہ ہو! بہرحال تم لوگ قلعہ سے دور ہی رہنا!'' یہ کہہ کر فادر تعظیماً جھکا اور پھر تیزی سے باہر نکل گیا۔ دروازہ پھر سے مقفل کرلیا گیا اور وہ رات کے سناٹے میں اس کے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز رفتہ رفتہ معدوم ہوتی چلی گئی۔

سرائے میں ہلکی ہلکی آوازیں ابھرنے لگیں۔

یکا یک ایلین نے سرائے کے مالک سے پوچھا۔'' فادر نے کس قلعہ کے متعلق بتایا تھا کیا تمہیں معلوم ہے وہ کہاں پرواقع ہے۔...'' سرائے کے مالک نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایلین کی طرف دیکھا۔ ...قلعہ؟ کیسا قلعہ؟ جہاں تک میرے علم میں ہے مجھے کسی قلعے کا پتہ نہیں ہے! سرائے کے مالک نے بے اعتنائی سے جواب دیا۔

''ظاہر ہے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے رخ موڑتے ہی ڈیانا نے حیرت سے کہا...'' یہ کم بخت آخر اتنا خوف زدہ کیوں ہے...؟

''میرا خیال ہے فادر شینڈور کی باتوں نے ان لوگوں کے دل ودماغ پر بہت اثر کیا ہے!'' چارلس نے اپنی رائے ظاہر کی۔

''ہیلین کا خیال تھا کہ انہیں ان فضول باتوں پر دھیان دیئے بغیر جوزف سباد کی طرف اپنا سفر جاری رکھنا چاہئے۔ ویسے بھی ہیلن خواہ مخواہ رسک۔ لینے کی عادی نہیں تھی۔ چارلس نے زبان ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے اپنی گل اندام بیوی ڈیانا کی طرف دیکھا۔ اس کے آتش بدن کی آنچ اور دھیمی دھیمی آگ کی لپٹیں اس کے دل کو چھورہی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ سوچ رہا تھا کون جانے واقعی وہاں کوئی قلعہ بھی ہو۔ ہوسکتا ہے کوئی مہم درپیش آجائے۔ کتنا مزہ آئے گا اگر ایسا ہوگیا تو......

!'' پھر اس نے ڈیانا کا گلابی ہاتھ چوما اور بریاجانے لگا۔

دوسرے دن علی الصبح وہ لوگ سرائے سے چل دیئے۔ ایک بار پھر بگھی کا سفر ان کا منتظر تھا۔ کافی دیر تک چلنے کے بعد کوچوان نے بگھی روکی۔ اور ان لوگوں سے اتر جانے کا کہا۔'' لیکن ہم نے تو تم سے جوزف سباد کا کنٹریکٹ کیا تھا۔ آخر ہم یہاں کیوں اتریں۔ یہ بھی بھلا کوئی شرافت ہے!'' چارلس نے احتجاج کیا۔

کوچوان نے بے نیازی سے کہا۔'' تم لوگ وہاں تک پیدل جاسکتے ہو!''

چارلس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ اور ایلین بضد تھے کہ کوچوان انہیں آگے لے جائے لیکن وہ کم بخت انہیں وہیں اتارنے پر بضد تھا۔ جھگڑا سنگین نوعیت اختیار کرتا جارہا تھا اور خاصی تو تو میں میں کے بعد آخر نوبت انھا پٹخ تک جا پہنچی۔

لیکن اس سے پہلے مار دھاڑ شروع ہوتی یکا یک دور چارلس کی نظر ایک پرانے قلعہ پر مرکوز ہوکر رہ گئی۔ اس نے حیرت سے اس طرف دیکھا اور اشارہ کیا۔'' وہ دیکھو... قلعہ...... وہ رہا قلعہ!'' کوچوان نے یکلخت پلٹ کر دیکھا...... اسی اثناء میں ایلن بھی قلعے کی طرف دیکھے جارہا تھا۔'' یہ کیسی جگہ ہے؟'' چارلس نے کوچوان کا شانہ تھپتھپایا۔

''کون سی جگہ؟'' کوچوان جان بوجھ کر انجان بن رہا تھا۔ وہ قلعے کی طرف سے نظریں چرارہا تھا اور دوسری طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی دوران چارلس نے اس کا گریبان پکڑلیا اور اسے گھسیٹ کر نیچے گرالیا۔ وہ دونوں گتھم گتھا ہوگئے اور چٹان کی ڈھلوان سے لڑھکتے ہوئے نیچے جاگرے! لیکن پلک جھپکتے میں کوچوان نے ایک تیز دھار چاقو اپنے ڈب میں سے نکال کر اسے گھماتا ہوا چارلس کی طرف بڑھنے لگا۔

''اچھا اب بہت ہوچکی۔ سیدھی طرح خواتین کو باہر نکالو اپنا سامان اٹھاؤ اور چلتے پھرتے نظر آؤ!'' کوچوان نے بڑی کمینگی اور سفاکی سے ایلین اور چارلس کو وارننگ دی! اس کی آواز میں ہلکا سا ارتعاش تھا جس نے چارلس اور ایلین کو اور خوف زدہ کردیا تھا! وہ اس کی درندگی اور وحشت کو نظروں میں تول رہے تھے۔

پھر انہوں نے سوچا کہ حالات کی سنگینی کے پیش

نظر یہی مناسب ہوگا کہ وہ بگھی خالی کردیں! ہیلن اور ڈیانا بگھی سے اتر آئیں۔ چارلس کا جسم غصے سے کانپ رہا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا لیکن ڈیانا نے مضبوطی سے اس کا بازو جکڑ لیا۔ وہ سہمی ہوئی نظروں سے کوچوان کے ہاتھ میں چمکتے ہوئے چاقو کو دیکھ رہی تھی۔

کوچوان بجلی کی سی تیزی سے مڑا اور ایک چھلانگ مار کر بگھی میں جا بیٹھا۔ اس نے تیز دھار چاقو سے سامان کی ڈوری کاٹ ڈالی اور ایک ایک کر کے سارے سوٹ کیس سڑک پر گر گئے۔ کوچوان نے لگامیں سنبھالیں اور بولا۔ ''میں کل صبح سورج نکلنے کے دو گھنٹے بعد یہاں پھر آؤں گا۔ میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا، لیکن جوزف ساتھ نہیں۔ یہاں سے واپس ہاں بس شرط یہی ہے کہ تم لوگ اگر صبح تک مجھے زندہ مل گئے تو!''

ہیلن اور ڈیانا نے خوف سے جھرجھری لی اور ڈیانا نے چارلس کے بازو پر اپنی گرفت مضبوط کردی۔ کوچوان نے چابک لہرایا اور گھوڑے ہنہناتے ہوئے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ چند لمحوں میں بگھی دور ہوتی ہوئی ایک سیاہ دھبا بن کر رہ گئی اور پھر اس کا نشان بھی باقی نہ رہا۔

چارلس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے وہ تاریکی سے خوف زدہ تھا! لیکن خدا کا شکر ہے کہ وہ ڈاکو یا رہزن نہیں تھا۔''

اب آہستہ آہستہ شام کے سائے ڈھل رہے تھے اور دور فاصلے پر قلعہ کی چند کھڑکیوں سے جھلکتی ہوئی روشنی تاریک رات میں ستاروں کی طرح ٹمٹمارہی تھی۔ دور سے دیکھنے پر قلعہ کی عمارت بڑی بوسیدہ اور پرانی نظر آتی تھی۔ دن کی روشنی میں چاہے قلعہ کیسا بھی لگتا ہو لیکن رات کی تاریکی میں قلعہ خاصا بھیانک اور پراسرار نظر آرہا تھا۔

چارلس نے کہا۔ ''فادر شینڈور نے ٹھیک کہا تھا۔ قلعہ وہاں موجود ہے یہ کوئی وہم یا نظر کا دھوکہ ہرگز نہیں ہے!''

ڈیانا نے پوچھا۔ ''لیکن خدا معلوم ایسا کیا راز ہے جو ہر شخص اس قلعے کا ذکر آتے ہی پہلوتہی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تم نے دیکھا ہوگا کہ خود کوچوان بھی ہمیں بے وقوف بنانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا!''

ہیلن نے کہا۔ ''میرا خیال ہے فادر شینڈور کا خدشہ بے بنیاد ہرگز نہیں ہے۔ ہمیں اس قلعہ سے ہر وقت دور رہنا چاہئے!'' چارلس نے چونک کر ہیلن کی طرف دیکھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہیلن نے اپنی ضدی طبیعت کے برعکس کسی دوسرے کی رائے کی تائید کی تھی! وہ حیرت سے ہیلن کی طرف دیکھنے لگا۔ خود ڈیانا بھی ہیلن کی بات کی تائید کررہی تھی؟

چارلس نے خاموشی سے ایلن سے مشورہ کیا کہ اس معاملے میں اس کی رائے کیا ہے۔ ایلن نے جو ایسے معاملات میں زیادہ تر چارلس پر اعتماد کیا کرتا تھا اس مرتبہ بھی خاموش رہا پھر بولا۔ ''میرا خیال ہے ہمیں رات یہاں قلعہ سے باہر ہی گزار لی چاہئے!'' غالباً وہ بھی ان حالات میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

چارلس نے ایک لکڑہارے کی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا اور کہا۔

''میرا خیال ہے ہم رات کو یہاں آگ جلا کر شب باشی کر سکتے ہیں!''

''یہ بہت اچھا ہوگا!'' ہیلن نے اطمینان ظاہر کیا دونوں آدمیوں نے بھاری بھاری سوٹ کیس خود اٹھائے اور ہلکا پھلکا سامان خواتین کے سپرد کردیا۔ پھر یہ چاروں چھوٹی سی چٹان پر سے ہوتے ہوئے اس چوراہے کے قریب بنی ہوئی جھونپڑی کی طرف بڑھنے لگے۔ جھونپڑی کا دروازہ مضبوطی سے بند تھا۔ چارلس نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں کھلا۔ بالآخر اس نے اپنے شانے کا زور لگا کر دروازہ کھولا جو ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔

جھونپڑی خالی تھی۔ اس کے فرش پر ایک کونے میں خشک اور سوکھی ہوئی لکڑیوں کا ایک ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔ چارلس نے اپنے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے دونوں سوٹ کیس فرش پر رکھ دیئے اور خالی خالی نظروں سے جھونپڑی کا جائزہ لینے لگا۔

پھر اس نے اپنے ہمراہیوں کو مخاطب کیا۔ ''میرا

خیال ہے رات گزارنے کے لئے یہ جگہ مناسب ہے؟"
ہیلن نے اطمینان کا سانس لیا۔ اسے تو قلعہ کے خیال سے ہی وحشت ہو رہی تھی۔ اس نے دل ہی میں خدا کا شکر ادا کیا۔ لیکن چارلس کچھ بے چین نظر آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا آخر یہ لوگ کیوں اتنے بزدل واقع ہوئے ہیں! قدرتی نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے جھونپڑی میں گھسے رہنے کا آخر کیا فائدہ! وہ دل ہی دل میں بہت کڑھ رہا تھا اور اس کوچوان کو کوس رہا تھا جس کی وجہ سے وہ بجائے جوزف سباد جانے کے اس ویرانے میں مقید ہو کر رہ گئے تھے۔

یہ سب لوگ اپنا سامان اٹھائے جھونپڑی میں آ گئے۔ انہیں یہ سوچ کر کچھ سکون اور اطمینان ہوا کہ اب وہ نسبتاً محفوظ جگہ پر ہیں۔ ڈیانا کا خیال تھا کہ انہیں آگ باہر جلانی چاہئے لیکن ہیلن اور چارلس کو یہ آئیڈیا اچھا نہیں لگا۔ ابھی وہ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ باہر دور سے گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز آتی سنائی دی۔

"میرا خیال ہے کوچوان نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے اور اب ہمیں لینے آ رہا ہے؟" ایلین نے خوش فہمی سے کہا۔

ہیلن کی باچھیں بھی کھل گئیں۔ وہ چاروں جھونپڑی سے باہر نکل کر چوراہے کے قریب کھڑے ہو گئے اور شام کے دھندلکے میں ادھر دیکھنے لگے جدھر سے آواز آ رہی تھی لیکن بالکل غیر متوقع طور پر ایک بگھی اس سمت سے آتی نظر آئی جدھر قلعہ واقع تھا۔ ڈیانا نے سہم کر چارلس کا بازو تھام لیا ڈیانا کا ہاتھ برف ہو رہا تھا۔

درختوں کے جھنڈ میں سے سیاہ بگھی نمودار ہوئی جسے دو شاندار نسل کے گھوڑے بڑی شان سے کھینچ رہے تھے۔ لیکن وہاں کوئی کوچوان نہیں تھا۔ ہیلن کا حلق خوف سے خشک ہونے لگا۔ اس کے شوہر ایلین نے چارلس سے کہا۔ "کیا ہم اسے روک سکیں گے؟"

یہ سنتے ہی چارلس نے جو ہمیشہ مہم جو واقع ہوا تھا سڑک کے درمیان کھڑے ہو کر اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر دیئے۔ گھوڑے برق رفتاری سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی خوبصورت ایال میں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور ان کے سیاہ جسم شیشے کی طرح چمک رہے تھے۔

ڈیانا بے قرار ہو کر چیخی۔ "چارلس۔"

لیکن چارلس اپنی جگہ جما رہا۔ اسی دوران بگھی اس کے بہت قریب آ چکی تھی پھر اچانک چارلس سے دو گز کے فاصلے پر آ کر بگھی رک گئی۔ گھوڑے ہنہنانے لگے اور بار بار اپنے سم زمین پر مارنے لگے۔ چارلس نے آگے بڑھ کر ایک گھوڑے کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کی لگام تھام لیں۔ ہیلن اور ڈیانا بڑی نروس ہو رہی تھیں چارلس نے کہا۔ "مجھے یقین ہے یہ حالات بڑے غیر معمولی ہیں لیکن مجھے بڑی مایوسی ہو گی اگر اس ٹور میں حیرت انگیز اور دلچسپ واقعات پیش نہ آئے۔"

پھر اس نے سب لوگوں کو بگھی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈیانا اور ہیلن سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ یہ سب کچھ بڑا پراسرار، بڑا غیر معمولی اور بہت سنگین نظر آتا تھا، لیکن اس دور دراز ویران اور پر ہول سناٹے سے بہتر تھا کہ وہ لوگ بگھی میں بیٹھ جاتے، ہو سکتا ہے اس طرح وہ کسی سرائے میں جا سکیں اور یوں سفر کی کوفت اور الجھن کسی حد تک دور ہو جائے۔

آخر چارلس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "ٹھیک ہے آؤ سامان لاد دیں اور چلنے کی تیاری کریں۔" اسے یقین تھا کہ ہیلن کے مقابلے میں ڈیانا زیادہ ہمت اور جرأت کا مقابلہ کرے گی اور فوراً بگھی میں بیٹھ جائے گی۔ اور ہوا بھی یہی ہیلن جھجکتے ہوئے بگھی میں سوار ہو گئی۔ ایلین نے پوچھا۔ "جوزف سباد؟"

"ہاں جوزف سباد۔" چارلس نے بڑے اعتماد اور یقین سے کہا پھر اس نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچیں اور وہ ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ لیکن چارلس کی آنکھیں خوف اور دہشت سے ابل پڑیں گھوڑے اپنا رخ تبدیل کر رہے تھے اور بجائے جوزف سباد کی سڑک پر جانے کے قلعہ کے طرف جانے والی سڑک پر سرپٹ دوڑ رہے تھے۔

چارلس زور سے چیخا لیکن رات کی بڑھتی ہوئی تاریکی اور سناٹے میں اس کی آواز زیادہ دور تک نہ گونجی۔ گھوڑے بہت تیزی سے قلعے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

چارلس کو یقین ہوگیا کہ وہ ان جانوروں کا رخ تبدیل کرسکے گا۔ اس نے لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں لیکن گھوڑوں کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی وہ بدستور برق رفتاری سے بھاگ رہے تھے۔ ''ہوسکتا ہے قلعہ کا مالک کوئی خوش اخلاق اور نیک دل آدمی ہو اور چند گھڑیاں سکون کی مل سکیں۔'' چارلس نے دل ہی دل میں سوچا۔

رات کی اس تاریکی میں گھوڑے یوں بے خبر و خطر اور آسانی سے آگے بڑھ رہے تھے جیسے ان کے سم ان راستوں سے اچھی طرح آشنا ہوں۔ پھر قلعہ کی کھڑکیوں کی زرد روشنی قریب آنے لگی اور پانی سے بھری ہوئی ایک خندق عبور کرکے گھوڑے بڑے وقار سے قلعہ میں داخل ہوگئے۔ یہ ایک بڑا سا صحن تھا اب گھوڑوں کی رفتار آہستہ ہوگئی تھیں۔ پہیوں کی گڑگڑاہٹ میں بھی کمی آگئی تھی اور آخرکار بگھی صدر دروازے کے سامنے رک گئی۔

ہر طرف بھیانک سی خاموشی تھی اور سناٹا چاروں مسافروں کی رگوں میں سنسنی بن کر اترتا چلا جارہا تھا۔ ایلن نے درشتگی سے کہا۔ ''کیا ہوا تم ہمیں یہاں کیوں لے آئے ہو۔؟''

یہ میں نہیں لایا یہ کام ان گھوڑوں کا ہے!'' اس کے لہجے میں حیرت اور خوف کے اثرات نمایاں تھے، چارلس نے کہا اور بگھی سے چھلانگ لگادی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ قلعے کا مالک نجانے کیسا آدمی ہوگا۔ پھر ان سب کی نگاہیں بڑے سے دروازے پر جم گئیں۔ وہ جب آئے تھے تو رات کے سناٹے میں خاصا شور ہوا تھا، لیکن یہ بڑی عجیب بات تھی کہ اب تک کوئی باہر نہیں نکلا تھا۔ کم از کم کسی کو تو باہر آنا چاہئے تھا۔ آخرکار چارلس نے خوش دلی سے کہا۔ آیئے خواتین ہم سب اندر چلتے ہیں اور صاحب خانہ سے خود ہی مل لیتے ہیں۔ ہیلن کو چارلس کی بات سے اتفاق نہیں تھا اسے ان سب باتوں سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

چارلس دروازے کے قریب گیا۔ ایک گھوڑے نے زور زور سے اپنی ٹانگیں زمین پر مارنی شروع کردیں اور بری طرح ہنہنایا۔ اس کے گلے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پھر چاروں طرف وہی روح فرسا خاموشی چھاگئی۔ چارلس نے دروازے پر دستک دینی چاہی لیکن دروازہ ایک ہلکی سی آواز کے ساتھ کھل گیا۔ چارلس نے مڑکر اپنے قریب کھڑے ہوئے ایلن کی طرف دیکھا اور پھر وہ سب اندر جانے کے لئے تیار ہوگئے۔

یہ ایک بڑا سا ہال تھا جس کے خاتمے پر ایک گیلری بنی ہوئی تھی۔ فرش سے لے کر گیلری تک بے حد خوبصورت نقشین سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ دیواریں اور فرش بڑے قیمتی پتھر سے بنی ہوئی تھیں اور ہال کے ایک گوشے سے لے کر دوسرے گوشے تک دبیز قالین بچھے ہوئے تھے ایک دیوار میں بہت وسیع و عریض آتش دان تھا جس میں لکڑی کے بڑے بڑے ٹکڑے پڑے تھے اور آتش دان میں شعلے اٹھ رہے تھے۔

''ہیلو، کوئی ہے؟'' چارلس کی آواز ہال کی دیواروں میں گونجی لیکن کوئی جواب نہیں ملا۔ لیکن آگ میں ابھی تازہ لکڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ چارلس نے دیکھا کہ ہال کے ایک کونے میں ساگوان کی ایک میز پر چار آدمیوں کے لئے کھانا چنا ہوا تھا۔ ابھی وہ حیرت سے بت بنا یہ سب چیزیں دیکھ رہا تھا کہ باہر گھوڑوں کے ٹاپوں اور گھنٹیوں کے بجنے کی آواز نے ان سب کو چونکادیا۔

حیرت اور خوف سے ان کے منہ پھٹے کے پھٹے رہ گئے۔ وہ تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔ بگھی بہت تیزی سے باہر کی طرف جارہی تھی۔ ان کا تمام اسباب بگھی پر لدا ہوا تھا اور گھوڑے بجلی کی سی تیزی سے بگھی کو کھینچے لئے جارہے تھے پتھریلے فرش پر گھوڑوں کی ٹاپیں گونج رہی تھیں اور چند ہی لمحوں میں بگھی ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی۔

ہیلن نے ہسٹریائی انداز میں سسکی لی اور بولی۔ ''مجھے معلوم تھا ایسا ہی ہوگا۔ ہمیں ہرگز یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ کاش تم لوگ میرا کہا مان لیتے تو ہم بھی اس مصیبت میں گرفتار نہ ہوتے۔ کاش!''

''اگر ہم تمہارا کہنا مان لیتے تو ابھی تک انگلینڈ

میں ہی ہوتے۔" چارلس نے احتجاج کیا۔ "کیا یہ کوئی بری بات ہوتی؟" "میرا خیال تھا کہ تم زندگی میں کچھ دیکھنا اور سیکھنا چاہو گی تم تو گھڑے کی مچھلی نکلیں......" چارلس نے ہیلن پر چوٹ کی۔ ان کی نوک جھونک سے ایلن بیزار ہو چکا تھا۔ اتنے میں ڈیانا میز کے قریب گئی اور بولی۔ "دیکھو ہماری آمد یہاں غیر متوقع نہیں تھی۔ پہلے وہ بگھی ہمیں یہاں لائی اور اب جبکہ ہم یہاں ہیں یہ کھانے کی میز اور یہ سب تکلف۔ آخر ان سب کا کیا مطلب ہے؟" وہ حیرت سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

چارلس نے اب تک اپنی بیوی سے متفق نہیں تھا۔ اس کا خیال تھا ابھی گیلری کی سیڑھیوں سے چار آدمی اتر کر آئیں گے اور کھانے کی میز پر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن اس کے اعصاب بھی اب تھک سے گئے تھے۔ کیا اس قلعہ میں رہنے والے سب لوگ گونگے اور بہرے ہیں۔ پھر بھی ان سب باتوں کا جواب جاننے کے لئے کسی نہ کسی کا اوپر جانا بے حد ضروری ہے۔

چارلس بے خوفی سے آگے بڑھا اور سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ "نہیں نہیں رک جاؤ۔" ہیلن نے چیخ کر اسے روکنے کو کہا۔ "ہمیں اس محل نما قلعہ سے چلے جانا چاہئے ہم یہاں نہیں رہ سکتے!" وہ بے حد خوف زدہ تھی!

ایلن نے اپنا بازو اس کی کمر میں ڈال دیا، لیکن ہیلن نے خود کو چھڑا لیا۔ وہ بری طرح ہانپ رہی تھی۔ "ڈارلنگ تم تو خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" چارلس نے بھی ہیلن کو تسلی دی لیکن وہ بدستور ہاتھ پھیلائے التجا کرتی رہی۔ "خدا کے لئے تم وہاں مت جاؤ میں خدا کا واسطہ دیتی ہوں تم اوپر مت جاؤ۔" چارلس نے اس کی التجا کو نظر انداز کر دیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گیلری کی طرف بڑھنے لگا۔ گیلری ختم ہوتے ہی چارلس نے خود ایک کاریڈور کے سرے پر پایا۔ یہ ایک طویل سی راہداری تھی جس میں زرد مشعلیں جل رہی تھیں اور راہداری کی دونوں طرف دور تک بند کمروں کا ایک طویل سلسلہ چلا گیا تھا۔

چارلس نے پوری قوت سے آواز دی۔ "کوئی ہے؟"

پھر وہ چند لمحے جواب کا منتظر رہا پر روح فرسا خاموشی اسے بے چین کئے دے رہی تھی۔ اگر اس عمارت میں یہ روشنیاں مشعلیں وغیرہ نہ ہوتیں تو شاید وہ یقین بھی کر لیتا کہ صدیوں سے کسی انسان نے اس قلعہ میں قدم نہ رکھا ہوگا۔ بغیر کسی سے ملے وہ نیچے جانے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ وہ دبے پاؤں پہلے کمرے کے دروازے تک گیا اور دستک دی اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ اس نے آہستہ سے ہینڈل گھمایا دروازہ کھل گیا اور چارلس اندر چلا گیا۔

کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی اس روشنی میں اس آگ کے شعلوں کی سرخی بھی شامل تھی جو آتشدان میں جل رہی تھی کمرہ خوب گرم تھا اور کمرے کے ایک کونے میں اوپر تلے چند سوٹ کیس کھلے تھے باہر جاتے جاتے چارلس کے قدم جیسے کسی نے جکڑ لئے ہوں۔ اسے ان سوٹ کیسوں پر لکھے ہوئے اے کے کے الفاظ واضح نظر آرہے تھے۔ یہ ایلن کین کا سوٹ کیس تھا جسے خود چارلس نے بگھی پر لادا تھا۔

وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکلا اور گیلری میں کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے لگا۔ ہیلن نے ایک ہاتھ اپنے منہ پر رکھا ہوا تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی خوف سے چیخنے لگے گی۔ وہ سب نیچے کھڑے اسی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"ایلن تم ایک منٹ کے لئے ذرا اوپر آؤ!" چارلس نے کہا۔ ہیلن نے آگے بڑھ کر اپنے شوہر کو روکنا چاہا لیکن وہ زینے پر چڑھ چکا تھا اور گیلری کے قریب آ گیا تھا۔ چارلس اسے کمرے میں لے گیا اور یہ سب چیزیں دکھائیں۔ ایلن کو کسی صورت ان باتوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ انہیں اپنی نظر کا فریب سمجھ رہا تھا لیکن جب اس نے اپنا سوٹ کیس اور اپنی قمیض دیکھی جو اس کے سرہانے تہہ کی ہوئی رکھی تھی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

چارلس نے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہاں بھی آتش دان میں آگ روشن تھی اور صورت حال

پہلے کمرے سے بالکل مختلف نہیں تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ کمرہ چارلس کے لئے مخصوص تھا کہ اس کا سامان بھی یہاں رکھا ہوا تھا۔ ابھی وہ ان بھول بھلیوں میں گم تھے کہ یکا یک ہال میں ایک وحشت ناک چیخ ابھری جو بڑی دیر تک گونجتی رہی۔ یہ ہیلن کی چیخ تھی۔

ایلن اور چارلس بے قرار ہوکر باہر کی طرف دوڑے۔ ڈیانا اور ہیلن ہال کے وسط میں کھڑی خوف سے لرز رہی تھیں اور ان کے چہرے سفید ہورہے تھے انہوں نے دیکھا ہال کی ایک دیوار کے قریب ایک بلند قامت، بدصورت اور خوف ناک آنکھوں والا اجنبی شخص چپ کھڑا تھا۔ اس نے سیاہ ماتمی لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی بھنوئیں گھنی اور سیاہ تھیں اور اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔

ایلن غرایا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟ یہ کیا طریقہ ہے؟ کیا تم اس سے زیادہ بہتر انداز میں ہمارا خیر مقدم نہیں کرسکتے تھے۔'' اس کی آواز غصے سے کانپ رہی تھی۔ خود چارلس کی حالت بھی غصہ سے غیر ہورہی تھی۔ اجنبی نے تعظیما جھکتے ہوئے بڑی شائستگی سے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میرے آنے سے معزز خواتین ڈسٹرب ہوگئیں۔''

''لیکن تم نے آخر اتنی دیر کیوں لگائی۔ ہم لوگ تو یہاں جانے کب سے پاگلوں کی طرح آوازیں دے رہے تھے۔'' چارلس نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ میں آپ لوگوں کا سامان درست کررہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کمرے آپ کو پسند آئے ہوں گے؟'' اجنبی نے جھک کر کہا۔

''ہر چیز قابل تعریف ہے، لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا۔'' چارلس نے کچھ کہنا چاہا۔

اجنبی کراہیت سے مسکرایا۔ ''میرے آقا کی مہمان نوازی تو دور دور تک مشہور ہے۔''

''لیکن ہم تو تمہارے آقا کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔'' چارلس نے کہا۔

اجنبی نے اس کی بات نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔ ''اگر آپ لوگ تیار ہوں تو میں کھانا پیش کروں۔''

چارلس کے ذہن میں سینکڑوں سوال کلبلا رہے تھے، لیکن وہ جانتا تھا کہ یہ ذلیل آدمی اس کے سوالوں کے جواب نہیں دے گا۔ ویسے بھی اب بھوک اسے بری طرح ستا رہی تھی لہٰذا ان باتوں کو پھر کسی وقت پر بھی اٹھایا جاسکتا تھا۔ اس نے اجنبی کی تائید میں سر ہلایا اور وہ ایک دروازہ کھول کر غائب ہوگیا۔

''شکر ہے۔'' ہیلن نے اطمینان کا سانس لیا۔ ''میں اب بھی کہتی ہوں ہمیں فوراً یہاں سے چل دینا چاہئے۔''

''میری سمجھ میں خود کوئی بات نہیں آتی۔ اس وقت بھوک اتنے زوروں کی لگی ہوئی ہے کہ کچھ نہیں سوجھ رہا!'' ڈیانا نے بھی چارلس کی تائید کی ڈیانا سوچ رہی تھی کہ اب اسے ایک ڈیڑھ گھنٹے پہلے وہ ایک ویران جنگل میں بھوکے پیاسے کھڑے تھے اور اب گرم بستر عمدہ کھانا اور ایک مہمان نواز میزبان ان سب کے انتظار میں تھے۔

چارلس نے ان سب سے کھانے کی میز پر بیٹھنے کو کہا۔ ابھی وہ بیٹھے ہی تھے کہ اجنبی جو شاید یہاں کا ملازم تھا سوپ لے کر آگیا اور سرو کرنا شروع کردیا۔

چارلس نے اس سے پوچھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''جناب خادم کو کلو کہتے ہیں۔'' اس نے جھک کر کہا۔

''بہت خوب کلو کیا تمہارے آقا کھانے میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہوں گے؟'' چارلس نے پوچھا۔

''مجھے افسوس ہے وہ ایسا نہیں کرسکتے!'' کلو نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''کیا وہ بیمار ہیں؟'' ایلن نے پوچھا۔

''جی نہیں...... وہ مرچکے ہیں.....؟'' کلو نے سردمہری سے جواب دیا۔ ہال میں گرمی کے باوجود چارلس کو جھرجھری آگئی۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے ہال کے دروازے کھول دیئے ہوں اور سردی کی لہر اس کے جسم میں دوڑ رہی ہو۔

چارلس نے بڑے اعتماد سے کلو کی طرف دیکھا۔ ''کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ... کبھی کمروں ڈنر

اوران سب چیزوں کا آخر کیا مطلب ہے۔ آخر اس میں کیاراز ہے؟" کلوو نے چارلس کی طرف دیکھا اور بولا۔

"یقیناً جناب! میرے آقا اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ لیکن انہوں نے جو ہدایات مجھے دی ہیں اور جن پر عمل کرنا میرا فرض ہے ان کے مطابق اس قلعے کے دروازے اجنبیوں اور مہمانوں کے لئے ہمیشہ کھلے رہیں گے۔ میں صرف ان کی آخری خواہشات کا احترام کرنے کے لئے زندہ ہوں۔" اس کی آواز رندھ سی گئی۔

"تمہارے آقا کا نام کیا تھا؟" چارلس نے پوچھا۔

کلوو نے پراسرار طور پر آتش دان کی طرف دیکھا جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو پھر کہا۔ "ان کا نام کاؤنٹ ڈریکولا تھا، وہ ایک بہت اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ مجھے ان کی خدمت کا موقع ملا۔"

"کیا ان کے بعد اب اور کوئی اس قلعہ میں نہیں رہتا؟"

"جی نہیں میرے آقا کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اچھا اب مجھے اجازت دیجیے۔" یہ کہہ کر کلوو وہاں سے چل دیا۔ اس کے جاتے ہی وہ سب حیرت اور خوف کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے سوپ پینا شروع کر دیا اور اس کی لذت نے خوف اور وہم کے جذبات کو ان کے ذہن سے وقتی طور پر دور کر دیا۔

چارلس نے سوپ پی کر نیپ کن سے ہاتھ پونچھے اور بولا۔ "میرا خیال ہے کل ہمیں بل پیش کیا جائے گا۔" ڈیانا نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا وہ سوچ رہی تھی کہ چارلس کو ایسے سنگین حالات میں بھی مذاق سوجھ رہا ہے۔ اس نے سوچا کم از کم انگلینڈ میں تو ایسے شاہ خرچ اور فراخدل لوگ کم ہی ملتے ہیں جو مرنے سے پہلے یہ وصیت کر جائیں کہ ان کے بعد ان کے محلات کے دروازے ہمیشہ اجنبیوں کے لئے کھلے رہیں۔

پھر وہ سب کھانے کے متعلق باتیں کرنے لگے اس اجنبی جگہ پر کلوو اور اس کے آقا کے حسن سلوک اور مہمان نوازی کی تعریفوں میں مگن ہو گئے۔ ان کا خیال تھا کہ کوچوان خواہ مخواہ اتنی اچھی جگہ سے خوف زدہ تھا۔

ہیلن نے اپنا خوف چھپاتے ہوئے کہا۔ "ڈرتی تو میں نہیں ہوں۔ ہاں یہ جگہ کچھ ایسی بھیانک اور دہشت انگیز ہے کہ مجھے کچھ عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔" ایلین نے ہیلن کا بازو تھاما اور اسے پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"ڈارلنگ پہلے پہل یہ سب بڑا عجیب سا لگا تھا۔ لیکن اب تو ہر بات عیاں ہو چکی ہے اب کس بات کا خوف ہے؟"

ہیلن نے اپنا بازو چھڑایا اور بولی۔ "حیرت ہے تم اتنی جلدی فادر ضیفڈ ور کی نصیحت بھول گئے ہو۔ تمہیں یاد نہیں انہوں نے کتنی سختی سے ہمیں اس قلعہ سے دور رہنے کو کہا تھا۔"

چارلس نے شراب کا گلاس اٹھایا اور بولا۔ "وہ صرف اس لئے یہ کہہ رہے تھے کہ ہم ان کے ہمراہ کلین برگ جائیں۔ میں تو کہتا ہوں یہ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمیں یہاں آنے کا موقع مل گیا۔ ہمیں مرحوم کاؤنٹ کی عنایات کا شکر گزار ہونا چاہئے اور لطف اٹھانا چاہئے۔ میں شراب کا پہلا جام کاؤنٹ کے نام تجویز کرتا ہوں۔ خدا اسے کروٹ کروٹ سکون نصیب کرے؟"

اسی لمحے باہر بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک نے پوری عمارت کو ہلا کر رکھ دیا۔ آتش دان میں آگ بہت زور سے بھڑک اٹھی۔ ڈیانا اور ایلین نے بھی اپنے جام ٹکرائے پھر ڈیانا نے کہا۔ "کاؤنٹ ڈریکولا۔" اور اس کی آواز ہال میں گم ہو گئی۔

بغیر کسی آہٹ کے کلوو قلعہ کے اندر سے ہال میں آ گیا اور سوپ کے پیالے اکٹھے کرنے لگا۔ ایلین نے نرمی سے اپنا گلاس اٹھایا اور کہا۔ "کاؤنٹ ڈریکولا" کلوو نے محسوس کیا کہ ہیلن کا جام ابھی تک شراب سے لبریز تھا۔ اس نے دوسروں کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

☆......☆......☆

کاؤنٹ ڈریکولا کو گزرے ہوئے ایک طویل عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ اس علاقے کا سب سے ظالم اور خونخوار درندہ تھا۔ گاؤں کے لوگ اس کی دہشت

اور خونریزی سے خائف رہتے تھے اور ہمیشہ اس تاک میں رہا کرتے تھے کہ جب بھی موقع ملے وہ اسے کیفرکردار تک پہنچادیں۔ اس کے متعلق بڑی بھیانک اور پراسرار کہانیاں مشہور تھیں اور اسے اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا ایک دن موقع پاکر کچھ لوگوں نے اسے دبوچ لیا اور ختم کردیا تھا۔

ڈریکولا ایک بدروح تھی۔ اس کی بچی ہوئی راکھ کو کلو نے مدتوں سے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ شیطانی قوتوں نے اب اسے یہ زریں موقع فراہم کردیا تھا کہ ڈریکولا کی خون آشامی اور اس کی پیاس کو بجھانے کا سامان ہوگیا تھا۔ نہ صرف یہ کہ چار افراد خوف اور دہشت کے اس جال میں خود آکر پھنس گئے، بلکہ یہ کہ وہ چاروں مطمئن تھے جیسے وہ کسی بہت اچھی جگہ آگئے ہوں۔

کلو اپنے آقا کو دوبارہ زندگی دینے کے لئے بےقرار تھا۔ اس وقت وہ راہداری میں بےچینی سے ٹہل رہا تھا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ وہ طرح طرح کے منصوبے بنا رہا تھا۔ مدتیں گزر گئی تھیں کہ ان ایوانوں میں خون اور قتل وغارت کے ہوشربا مناظر دیکھنے کو نہیں ملے تھے۔ صرف اس لئے کہ اس کا آقا ڈریکولا راکھ کی صورت میں چنگاری بننے کا طویل عرصے سے منتظر تھا۔

کلو نے آہستہ سے ہیلن کے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور آواز دی۔ ہیلن بےچینی سے اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ اس نے اپنے شوہر ایلن کو جگایا۔ ہیلن کی بےچینی کو دیکھتے ہوئے ایلن نے موم بتی اٹھائی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر آیا۔ کلو اسی موقع کا منتظر تھا۔ اس نے کونے میں کھڑا ہوا تابوت اٹھایا اور اسے اپنی کمر پر لاد کر گیلری کا زینہ اترنے لگا۔ وہ تابوت لے کر دانستہ طور پر آہستہ آہستہ گھسیٹ رہا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ احمق ایلن اس کا تعاقب کررہا ہوگا۔

وہ تابوت اٹھاکے نیچے تہہ خانے میں چلا گیا۔

اس کے آقا کی خواہش یہی تھی کہ قربانی کی مہم یہاں انجام دی جائے۔ کلو نے تابوت ایک طرف رکھ دیا اور خود تاریکی میں چھپ کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر بعد تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور ایلن موم بتی سنبھالے اندر آیا۔ اس کے چہرے پر فکر اور تجسس کے آثار نمایاں تھے وہ دبے پاؤں تابوت کے قریب گیا اور موم بتی کی بھڑکتی ہوئی لو میں اس پر لکھی ہوئی عبارت پڑھنے لگا۔ تابوت پر کوئی تاریخ یا فقرہ درج نہیں تھا صرف کاؤنٹ ڈریکولا لکھا ہوا تھا۔

کلو نے چشم زدن میں بھانپ لیا کہ اب موقع آگیا ہے کہ وہ اس سنہری لمحے کا بہترین مصرف کرسکے۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنے لباس میں چھپا ہوا خنجر نکالا اور اس سے پہلے کہ ایلن چیخ سکے یا کوئی آواز نکال سکے ایک ہی وار میں خنجر اس کے سینے میں اتار دیا۔ ایلن بےجان ہوکر فرش پر گرنے لگا تو کلو نے اسے سنبھالا اور تابوت کا ڈھکنا کھول کر اسے تابوت کے ساتھ لگا کر کھڑا کردیا۔

پھر اس نے تیزی سے کونے میں رکھا ہوا مرتبان اٹھایا اور ڈریکولا کی راکھ اس تابوت میں ڈال دی۔ تابوت کے عین اوپر ایک رسی کنڈے سے بندھی ہوئی لٹک رہی تھی۔ کلو نے ایلن کی لاش کو کھینچ کر اس کے دونوں پاؤں رسی میں باندھے اور لاش کو الٹا کرکے تابوت کے اوپر لٹکا دیا۔ پھر اس نے اپنے تیز دھار خنجر سے ایلن کی شہ رگ کاٹ ڈالی لاش تڑپنے لگی اور خون کا فوارہ راکھ پر گرنے لگا۔

خون بڑی تیزی سے راکھ پر گررہا تھا۔ کلو نے خنجر کا ایک اور وار کیا اور گرم گرم تازہ گاڑھا خون مزید تیزی سے گرنے لگا۔ ایک جھٹکے سے کلو نے لاش کی گردن کاٹ ڈالی اور سر کو دھڑ سے علیحدہ کرکے اسے ایک طرف اچھال دیا۔ اب وہ دوزانوں ہوکر تابوت کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں خوف اور احترام کی وجہ سے جھکی ہوئی تھیں۔

باہر بجلی بہت زور سے چمکی اور پھر بادل گرجنے

لگے۔ روشنی کا ایک تیز جھماکہ سا ہوا اور پھر تابوت کے ایک سرے پر ایک غیر انسانی ہاتھ نمودار ہوا۔ ہاتھ پر خون کی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور یہ شیطانی ہاتھ ڈریکولا کا تھا۔

کلوو گھٹنوں کے بل کھڑا تھا۔ تہہ خانے میں ڈریکولا کی خوف ناک آواز گونجی اور اپنے آقا کا حکم سن کر کلوو کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ ایک طویل عرصے کے انتظار کے بعد اپنے آقا کی آواز سن رہا تھا۔

اس نے سر جھکا دیا اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل کر گیلری کی طرف چل پڑا۔ انہی سیڑھیوں پر کچھ دیر پہلے ایلن چل کر تہہ خانے تک آیا تھا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

کلوو کے دونوں ہاتھ خون آلود تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ چھپالئے۔ پھر آہستہ سے ہیلن کے کمرے کے سامنے جا کر سرگوشی کی۔ ''ہیلن!'' ہیلن نے سمجھا کہ شاید ایلن واپس آ گیا ہے، اس نے بے دھڑک دروازہ کھولا پھر کلوو کے اپنے سامنے پاکر ٹھٹھک گئی۔

''مادام مجھے افسوس ہے لیکن ایک حادثہ ہو گیا ہے۔ آپ کے شوہر کی حالت خراب ہے جلدی سے میرے ہمراہ چلئے۔'' کلوو جیسے کہیں دور سے بولا۔

ہیلن فوراً اس کے پیچھے چل پڑی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی لیکن کلوو سنی ان سنی کر کے آگے چلتا رہا۔ وہ تیزی سے تہہ خانے کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں کاؤنٹ ڈریکولا اپنے شکار کا منتظر تھا۔ اس نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا اور ہاتھ سے ہیلن کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

ہیلن نے دیکھا کہ اس کے شوہر ایلن کی بغیر سر کی لاش رسی سے بندھی ہوئی الٹی ہوئی ہے ہیلن نے زور زور سے آنکھیں ملیں پھر جیسے وہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو، زور سے چیخی دور تک اس کی چیخ گونج کر رہ گئی۔ وہ ہذیانی انداز میں بڑبڑا رہی تھی۔

اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ وہ دیوانہ وار دروازے تک بڑھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ اس جگہ سے فرار ہو جائے لیکن اسے راستہ نظر نہیں آ تا تھا۔ زینے پر سیاہ دھاریوں والا سرخ چغہ اوڑھے ڈریکولا اس کا منتظر تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ہیلن کا بازو جکڑ لیا۔

کلوو نے دیکھا اس کے آقا کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور اس کے تیز نوکیلے دانت جبڑوں میں سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ مسکرا رہا تھا۔ ہیلن نیم غنودگی اور بے ہوشی کے عالم میں اس کے بازوؤں میں کسمسا رہی تھی۔ ڈریکولا نے اسے اپنا شکار بنا لیا تھا! پھر ڈریکولا کے تیز خون آشام دانت ہیلن کی خوبصورت گردن میں اترتے چلے گئے اور وہ تڑپتی رہی۔

☆.....☆.....☆

صبح ہو چکی تھی۔ چارلس ابھی تک سویا ہوا تھا کہ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر زور زور سے ہلانا شروع کر دیا۔ یہ ڈیانا تھی اور نہا دھو کر بے حد تروتازہ اور شاداب نظر آ رہی تھی۔ چارلس کو اکثر ڈیانا سے یہی شکایت رہتی تھی کہ بہت صبح سویرے اٹھ جایا کرتی ہے اور پھر اسے بھی جگا دیا کرتی ہے۔ وہ اس وقت بھی بہت چاق چوبند نظر آ رہی تھی۔

''ہوں کیا بات ہے؟'' چارلس نے ناگواری سے کہا۔ ''اٹھو بھی۔ دن کے گیارہ بج رہے ہیں، میں تم کو جگا جگا کر تھک چکی ہوں، خدا کے لئے اٹھو ایلن اور ہیلن دونوں غائب ہیں۔ وہ شاید جا چکے ہیں!'' ڈیانا کی آواز میں تفکر جھلک رہا تھا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا...... کہاں جا چکے ہیں......؟'' چارلس نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ڈیانا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''وہ چلے گئے ہیں سامان بھی جا چکا ہے۔ سب کچھ چلا گیا۔'' وہ زور زور سے رو رہی تھی۔ چارلس نے صورت حال کی نزاکت کو فوراً بھانپ لیا۔ اس نے چادر ایک طرف پھینکی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ لوگ واقعی اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ کمرے میں بستر پر چادر بڑے سلیقے سے بچھا ہوا تھا۔ آتش دان میں راکھ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ لیکن یوں

لگتا تھا جیسے ایلین اور ہیلن بھی بیڈ پر لیٹے ہی نہ ہوں۔ ہر چیز بڑی عجیب اور پراسراری نظر آ رہی تھی۔ وہ دونوں حیران تھے کہ آخر کلوو کہاں جا کر دفعان ہوگیا۔ چارلس فوراً کمرے سے باہر نکلا اور گیلری کی سیڑھیاں اتر کر ہال کے وسط میں کھڑا ہو کر کلوو کو آوازیں دینے لگا۔ اس کی آواز ہال میں گونج رہی تھی۔ اس نے مڑ کر دیکھا تو خون اس کی رگوں میں جمنے لگا۔ ڈیانا غائب تھی ۔"اف خدایا! اس نے سوچا کیا لوگ یہاں ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔"

وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا واپس کمرے میں آیا۔ ڈیانا جلدی جلدی سوٹ کیس میں اپنے کپڑے ٹھونس رہی تھی۔ "یہ تم کیا کر رہی ہو؟"

"میں فوراً یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔" ڈیانا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"لیکن ایلین اور ہیلن کے بغیر ہی ...!" چارلس نے پوچھا۔

"تو اور کیا وہ بھی تو ہم دونوں کو یہاں چھوڑ کر خود چل دیئے!" ڈیانا نے بے نیازی سے کہا۔

اب کسی قسم کی بحث کرنی بے کار تھی۔ چارلس نے اس کا ہاتھ بٹانا شروع کردیا۔ ڈیانا زور زور سے سسکیاں لے رہی تھی اور اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ لرز رہے تھے اور وہ بے حد پریشان نظر آ رہی تھی۔ سوٹ کیس وزنی تھے پھر بھی دونوں میاں بیوی نے وہ دو سوٹ کیس اٹھائے اور ڈگمگاتے ہوئے پگڈنڈی پر چل پڑے وہ جلد از جلد اس بھیانک قلعہ سے دور چلے جانا چاہتے تھے۔ وہ بے حد آہستہ آہستہ پہاڑی کی ڈھلان سے اتر رہے تھے۔ ڈیانا کو یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی انجانی ان دیکھی قوت بار بار انہیں واپس قلعے کی طرف بلا رہی تھی۔

بالآخر وہ نیچے پہنچے۔ دن کے وقت قلعہ اجنبیوں کے لئے خاصا پرکشش لگ رہا تھا۔ چارلس سوچ رہا تھا اگر اس کے بھائی ایلین اور اس کی بیوی ہیلن کو کچھ ہوگیا تو وہ خود کو کبھی معاف نہیں کر سکے گا۔ ڈیانا نے اس کے چہرے سے اس کے دل کی بات جان لی اور شدت سے اس بات کی مخالفت کرنے لگی کہ چارلس واپس چلا جائے۔

اس نے کہا۔ "تمہیں میرا کوئی خیال نہیں۔ میری خاطر ہی سہی۔ تم واپس نہیں جا سکتے!" ڈیانا کا دل بھر آیا اور وہ سسکنے لگی۔

"اور ہیلن ... اور ایلین کا کیا بنے گا۔ ڈیانا ذرا سوچو تو سہی میں ان دونوں کو وہاں اکیلا کیسے چھوڑ دوں خدا خیر کرے وہاں کیا واقعات پیش آئے ہوں نہیں نہیں مجھے جانا ہی ہوگا ...!" چارلس نے قطعی فیصلہ دے دیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں جوزف سباد جا کر لوگوں کو مدد کے لئے بلا لینا چاہئے!" ڈیانا نے تجویز پیش کی۔

لیکن چارلس کو اس کی تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ "تم معاملے کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہی ہو۔ تم نے دیکھا لوگ قلعہ کے تذکرے سے ہی خائف ہیں۔ کوئی اس بات کا ذکر بھی سننا گوارا نہیں کرتا۔ ہماری مدد کو کوئی نہیں آئے گا۔" پھر اس نے ڈیانا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لیا اور اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔ "جان من تم یہاں شام چھ بجے تک میری منتظر رہنا میں ہر قیمت پر چھ بجے تک لوٹ آؤں گا۔ مجھے پراسرار معمہ ضرور حل کرنا ہے۔ آخر ہیلن اور ایلین کہاں جا سکتے ہیں۔"

ڈیانا بری طرح لرز رہی تھی۔ بے حد خائف تھی وہ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے اور چارلس اسے الوداعی سلام کر کے قلعہ کی جانب چل پڑا۔ چارلس قلعہ کے صدر دروازے سے ہو کر عمارت کے اندر گم ہوگیا اور ڈیانا جھونپڑی میں آ گئی۔ چارلس نے ایک بار پھر کمروں کا جائزہ لیا، لیکن اسے ایلین اور اس کی بیوی ہیلن کی گمشدگی کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اس نے کچن اور صحن کے علاوہ دوسرے کمروں میں اچھی طرح جھانکا لیکن کسی آدم نہ آدم زاد کا کوئی نشان نہیں تھا۔ خالی کمرے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔

یکا یک ہال میں اس کا ہاتھ ایک دیوار سے لٹکے ہوئے پردے پر پڑا ارے ... یہ ایک تہہ خانہ تھا،

اندر ہلکی ہلکی روشنی تھی جو آگے جا کر تاریکی میں بدل گئی تھی۔ یقیناً..... یقیناً ایلین اور ہیلن اسی تہہ خانے میں ہوں گے اس نے سوچا اور پھر دل کڑا کر کے آہستہ آہستہ تہہ خانے کی سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیاں ختم ہوتے ہی اس نے خود کو ایک نیم روشن کمرے میں پایا۔ اوپر کی طرف ایک چٹان پر بڑا سا تابوت رکھا تھا۔ وہ تابوت کے قریب گیا اس پر کاؤنٹ ڈریکولا کے الفاظ کندہ تھے۔

وہ اس ماحول سے خود کو خوف زدہ محسوس کر رہا تھا۔ لیکن تحیر اور تجسس نے اسے مجبور کر دیا۔ اسی تابوت کے قریب ایک بڑا سا صندوق موجود تھا جس کا ڈھکنا کھلا تھا۔ اس نے جھانک کر اس صندوق میں دیکھا اور پھر تیورا کر پیچھے ہٹا، ایلین کا بے جان اور سرد چہرہ اسے گھور رہا تھا۔ گردن بے حد غیر قدرتی انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ چارلس نے محسوس کیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ ذرا غور کیا تو معلوم ہوا کہ گردن اور دھڑ علیحدہ تھے۔ خون کے دھبے ایلین کے جسم اور کپڑوں پر جمے ہوئے تھے یوں لگتا تھا جیسے ایلین نے بے حد اذیت میں تڑپ تڑپ کر جان دی ہو۔

چارلس بڑے دل گردے والا آدمی تھا لیکن یہ صورت حال دیکھ کر خوف سے اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سردی کی ایک لہر سی اس کے ریڑھ کی ہڈی میں اترتی چلی گئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی ٹانگیں جواب دے گئی ہوں اور وہ زمین پر گرتے گرتے بچا۔ لیکن اس نے بمشکل تمام اپنے حواس جمع کیے اور دوسرے تابوت کا ڈھکنا اٹھانے کی کوشش کی۔ تابوت کا ڈھکنا بہت وزنی تھا جونہی اس نے ایسا کیا وہ پھسل کر دوسری جانب جا گرا اور ڈھکنا گرنے کی گونج تہہ خانہ میں پرہول سناٹے کو چیرتی ہوئی گزر گئی۔ چارلس کو یوں لگا جیسے اس کے دل و دماغ میں ایک سنسنی پھیل گئی ہے۔ اس کے سر میں ہتھوڑے سے بجنے لگے اور وہ خوف سے بری طرح کانپنے لگا۔

تابوت کے اندر سیاہ کفن میں ملبوس ایک بلند قامت لاش رکھی تھی۔ اس کے دونوں استخوانی ہاتھ اس کے سینے پر دھرے ہوئے تھے۔ چارلس نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا کہ یہ کوئی خبیث روح تھی۔ لاش کے چہرے پر بے حد مکروہ اور غلیظ مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور دونوں بھینچے ہوئے جبڑوں کے گوشوں میں نوکیلے تیز دانت باہر کی طرف نکلے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ چارلس کو غش آ گیا جونہی اس کی انگلیاں تابوت کے کونے سے ٹکرائیں تابوت میں لیٹے ہوئے عفریت نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور آہستہ آہستہ اٹھنے لگا۔

چارلس کو اپنی چیخ کی آواز دور کسی کنویں میں سے آتی ہوئی سنائی دی۔ وہ فرش پر اوندھے منہ جا گرا پھر گھسٹتا ہوا سیڑھیوں تک پہنچا اور بغیر مڑ کے دیکھے ہوئے تیزی سے گرتا پڑتا تہہ خانے سے باہر کی طرف دوڑا۔ وہ جلد سے جلد تہہ خانے سے نکل جانا چاہتا تھا وہ سمجھ رہا تھا اب اس کی جان پر بن گئی ہے۔

ادھر ڈیانا کافی دیر سے جھونپڑی میں آگ روشن کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن گیلی لکڑیوں کی وجہ سے اندر دھواں بھر گیا تھا اور اب رات کی تاریکی بھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ اس کا دل خوف کی وجہ سے زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ دور سے اسے گھوڑوں کے ٹاپوں اور گھنٹیوں کی آواز قریب آتی سنائی دی اور اس کے دل کی دھڑکن اور تیز ہو گئی۔

گھوڑے بالکل پرانے انداز میں بگھی کھینچتے ہوئے جھونپڑی کے قریب آ کر رک گئے، ڈیانا کی جان ہی تو نکل گئی۔ پھر جیسے کسی نے اسے سوتے سے چونکا کے جگا دیا ہو۔ جھونپڑی کے دروازہ کھلا اور کلوو اندر آیا۔ ڈیانا کی چیخ اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔ ”مجھے افسوس ہے مادام کہ میں نے آپ کو پریشان کیا آپ کے خاوند قلعہ میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ اس نے ہاتھ سے ڈیانا کو باہر چلنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر بگھی کا دروازہ کھول دیا۔ ڈیانا نے غصے سے کلوو کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”میں پوچھتی ہوں وہ سب کہاں ہیں۔ ایلین چارلس، ہیلن آخر سب کیا ہو رہا ہے؟“

کلوو نے احتراماً جھک کر کہا۔ ''آپ کے خاوند آپ کو تمام تفصیلات سے آگاہ کردیں گے آپ تشریف لے چلیے۔''

ڈیانا کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ایک بار پھر قلعہ میں جائے۔ عین ممکن ہے چارلس سے اسے کچھ معلوم ہو سکے۔ وہ آگے بڑھی اور بگھی میں سوار ہوگئی۔ گھوڑے پھر برق رفتاری سے بگھی کو لئے ہوئے قلعہ کی طرف بڑھنے لگے۔

جونہی بگھی قلعہ کے اندر پہنچی۔ کلوو نے تیزی سے اتر کے بڑے ادب سے ڈیانا کے لئے دروازہ کھولا اور ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ڈیانا کو یوں لگا جیسے کلوو اس کا مذاق اڑانے کی حد تک مودب ہوا جا رہا تھا۔

ڈیانا ہال میں داخل ہوئی اور ہیلن کی بدلی ہوئی اجنبی سی آواز نے اس کا استقبال کیا۔ ''ہم لوگ تمہارا ہی انتظار کررہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ تم کب تک لوٹو گی!'' ہیلن کی آواز بے حد مختلف اور عجیب سی تھی۔ ڈیانا کو یوں لگا جیسے اس کے سارے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگی ہوں۔

ہیلن سیڑھیوں کے قریب کھڑی تھی۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھوئی کھوئی سی تھیں جیسے ابھی ابھی وہ نیند سے جاگی ہو۔ ڈیانا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ ہیلن کو کیا ہوگیا ہے۔ اس نے چارلس کے بارے میں پوچھا۔ اور ہال کے وسط میں جاکر رک گئی۔ ''ہیلن، ایلن کہاں ہے یہ سب کیا ہے۔ ضرور کوئی بات ہوگئی ہے؟''

ہیلن نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''آؤ...... کوئی بات نہیں ہے؟'' لیکن ڈیانا پیچھے ہٹ گئی۔ ''چارلس کہاں ہے؟'' اس نے تشویش سے پوچھا......

''کیا تم چارلس سے نہیں ملنا چاہتی ہو؟'' ہیلن نے کہا۔ ڈیانا نے اپنے چہرے کے تاثرات چھپانے کی ناکام کوشش کی۔ اسے یقین ہوگیا تھا کہ وہ ہیلن نہیں تھی جسے وہ ایلن کی بیوی کی حیثیت سے جانتی تھی۔ اس کے چہرے پر غباثت اور شیطانیت کے سائے رقصاں تھے۔

وہ فوراً تیزی سے مڑی اور باہر کی طرف دوڑی۔

ہیلن زور سے ہنسی دروازہ بند تھا سرخ دھاریوں والا سیاہ چغہ پہنے ہوئے بلند قامت ڈریکولا نے اپنے بازو وا کردیئے اور ڈیانا کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے آگے بڑھا، ہیلن اب بھی ہذیانی انداز میں ہنس رہی تھی۔

ہیلن کی ہنسی کو نظر انداز کر کے ڈیانا نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ڈریکولا کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کردی لیکن ڈریکولا نے اپنے بازوؤں کی گرفت اور مضبوط کردی۔

''ڈریکولا۔ اسے چھوڑ دو!'' یہ چارلس کی آواز تھی۔

ہیلن لپک کر دروازے کے قریب کھڑی ہوگئی لیکن ڈیانا کی جان میں جان آئی کہ چارلس یہاں موجود تھا۔

ہیلن نے آگے بڑھ کر چارلس کا بازو تھام لیا...... ''پیارے میرے پاس آؤ۔ میں تمہیں پیار کرنا چاہتی ہوں!''

چارلس ہیلن کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا وہ بدستور ڈیانا کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ہیلن اسے اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور ڈریکولا سے خود کو چھڑانے کے لئے ڈیانا جدوجہد کررہی تھی۔

ہیلن کا چہرہ چارلس کے چہرے پر جھکا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے سے درندگی اور وحشت عیاں تھی۔ چارلس اس سے ہاتھ چھڑانے کی پوری کوشش کررہا تھا۔ ڈیانا نے بمشکل تمام خود کو ڈریکولا کی گرفت سے چھڑایا اور تیزی سے چارلس کے پاس چلی گئی۔ وہ اس بھیانک خواب سے بچنے کے لئے خود کو چارلس کی آغوش میں سمو دینا چاہتی تھی۔

چارلس نے ڈیانا کو اپنے پیچھے چھپا لیا۔ اس نے ایک لمحے کے لئے بھی اپنی آنکھیں ڈریکولا پر سے نہیں ہٹائیں پھر وہ چیخا...... ''ڈیانا جاؤ...... بگھی لے کر یہاں سے جلد از جلد نکل جاؤ......''

''میں تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی!'' ڈیانا

نے کہا۔

"جو میں کہتا ہوں وہی کرو......" چارلس پھر چلایا۔

ڈریکولا حالات سے بے نیاز ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ جیسے کوئی بلی دو چوہوں کو دبوچنے کے لئے آگے بڑھ رہی ہو۔ جیسے اسے یقین ہو کہ دونوں میں سے ایک چوہے کو شکار تو وہ کر ہی لے گی۔ ڈیانا اس عالم میں چارلس کو تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ لیکن چارلس نے اسے باہر کی طرف دھکیلا تو وہ وہاں سے باہر کی جانب لپکی۔ ہیلن اب پھر ہنسی اور آگے جھپٹ کر ڈیانا کا بازو تھام لیا۔ دونوں عورتیں گتھم گتھا ہو کر فرش پر گر گئیں۔

ڈریکولا چارلس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ چارلس نے ایک دو ہنٹر ڈریکولا کے سینے پر مارا لیکن وہ صاف وار بچا گیا۔ پھر جھک کر کسی بچے کی طرح چارلس کو اٹھا لیا اور ہال کی دیوار سے دے مارا۔ چارلس کو خاصی چوٹیں آئیں تھیں وہ ایک زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گرا پھر بمشکل تمام اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈریکولا ہنسا اور پھر اپنے شکار کی طرف متوجہ ہو گیا۔

چارلس نے بے بسی سے دیوار کے سہارے کھڑا ہو گیا اور لڑکھڑاتے ہوئے ادھر ادھر کسی ہتھیار کی تلاش میں دیکھنے لگا۔ اس سے کچھ فاصلے پر ایک زنگ آلود تلوار پڑی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی پوری طاقت جمع کر کے وہ تلوار اٹھائی اور اپنی طرف بڑھتے ہوئے ڈریکولا پر ایک زور کا وار کیا۔ ڈیانا بدستور ہیلن سے لڑ رہی تھی، لیکن دونوں عورتوں کی نگاہیں ڈریکولا اور چارلس پر جمی ہوئی تھیں۔

ڈریکولا نے تلوار کا وار بچایا اور تلوار کا پھل اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپک رہا تھا۔ پھر اس نے ایک ہی جھٹکے سے تلوار کھینچ لی اور طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اسے دو ٹکڑے کر کے پھینک دیا۔ پھر آگے بڑھ کر اپنے دونوں ہاتھ چارلس کی گردن میں پیوست کر دیئے۔ وہ تیزی سے چارلس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ چارلس بے بسی سے زمین پر گرا جا رہا تھا۔

ڈیانا نے ایک چیخ ماری۔ وہ ایک جنونی عورت کی طرح ہیلن سے لڑ رہی تھی۔ وہ دونوں ہال کے وسط میں بری طرح لڑ رہی تھیں ڈیانا کی قمیض تار تار ہو چکی تھی اور جسم پر جگہ جگہ سے خون بہہ رہا تھا۔ یکایک اس کے گلے میں لٹکی ہوئی سونے کی کراس ہیلن کے بازو سے ٹکرائی۔ اس بار ہیلن زور سے چیخی اس نے ہانپتے ہوئے ڈیانا کو چھوڑ دیا اور خوف زدہ ہو کر الگ ہٹ گئی۔

ڈیانا بھی بری طرح ہانپ رہی تھی۔ پھر اس کی سمجھ میں سارا معاملہ آ گیا۔ اس نے کراس اپنے ہاتھ میں لی اور اسے ہیلن کی طرف بلند کیا۔ ہیلن تیورا کر پیچھے ہٹی وہ بے حد خوف زدہ تھی۔ چارلس کی آنکھیں حلقوں سے باہر ابل آئی تھیں۔ ڈریکولا اب بڑے اطمینان سے اس کا گلا گھونٹ رہا تھا اور اسے اذیت اور تکلیف میں دیکھ کر لطف اٹھا رہا تھا۔

ڈیانا چیخی...... " چارلس ایک کراس بناؤ جس طرح بھی ہو سکے کراس کا نشان بنالو۔" چارلس ایک طرف جھکا اور ٹوٹی ہوئی تلوار اٹھا کر اس کا نشان بنالیا۔ پھر اس نے یہ نشان ڈریکولا کے چہرے کے سامنے کر دیا۔ ڈریکولا نے ایک بھیانک چیخ ماری اور چارلس کو چھوڑ کر دور ہٹ گیا۔ وہ بے حد خوف زدہ اور پریشان نظر آ رہا تھا۔ ڈیانا فوراً ہیلن کی طرف دیکھتی ہوئی دوڑ کر چارلس کے قریب پہنچی اور اٹھنے میں اس کی مدد کی۔

وہ دونوں کراس کے نشان اٹھائے ہوئے الٹے پاؤں چلتے ہوئے صدر دروازے کی طرف چل دیئے۔ یکایک ہال میں ایک دروازہ کھلا اور کلو وا ایک تیز دھار چاقو لئے اندر داخل ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ چاقو اٹھا کر وار کرتا چارلس نے بجلی کی سی تیزی سے تلوار کا ٹکڑا اس کی طرف پھینکا، کلو کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی اور تلوار کا آدھا سرا اس کے سر میں گڑ گیا۔ وہ بے سدھ ہو کر زمین پر گر گیا۔

چارلس نے ڈیانا کا ہاتھ تھاما اور وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے ہال سے نکل کر صحن میں آ گئے۔ باہر رات کی دھندلی تاریکی میں بگھی اور گھوڑے نظر آ رہے

تھے۔ بغیر ایک لمحہ ضائع کئے وہ دونوں بگھی میں سوار ہوگئے۔ چارلس نے لگامیں سنبھالیں اور گھوڑے برق رفتاری سے قلعہ سے باہر کی جانب دوڑنے لگے۔ قلعہ کے صدر دروازے میں انہوں نے دو سایوں کو ایک دوسرے میں مدغم ہوتے دیکھا۔ یہ ہیلن اور ڈریکولا تھے جو ایک دوسرے کے گلے میں باہیں ڈالے راز و نیاز کررہے تھے۔

بگھی بے حد تیز رفتاری سے سڑک پر ڈھکتی جارہی تھی وہ جلد از جلد موت اور خوف کے اس قلعہ سے دور ہوجانا چاہتے تھے۔ ڈیانا بگھی میں بیٹھی بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی اور چارلس گھوڑوں کو تیز سے تیز دوڑانے میں مشغول تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہیں ڈریکولا کسی مافوق الفطرت طریقے سے گھوڑوں کو واپس نہ بلالے۔

ڈھلان بہت تیکھی تھی۔ ایک موڑ پر بگھی مڑی تو بے قابو ہوگئی گھوڑے فضا میں اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر ہنہنائے۔ بگھی کا توازن بگڑ گیا اور اس کے پہیئے فضاء میں بلند ہوگئے ایک زوردار چیخ فضاء میں بلند ہوئی، یہ ڈیانا کی چیخ تھی جو زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔

بگھی ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہوچکی تھی اور اب تیزی سے ڈھلان سے نیچے گہری اور تاریک کھائی میں گررہی تھی۔ لیکن یہ سب ڈیانا کا واہمہ تھا۔ وہ بگھی سے باہر گر چکی تھی۔

پھر جیسے چاروں طرف ہولناک اندھیرا چھا گیا۔ ڈیانا کا جسم بری طرح کسی سخت اور نوکدار چیز سے ٹکرایا اور چھل گیا۔ وہ بے حد زخمی ہوگئی تھی اور بے ہوش ہوکر ایک طرف گرپڑی۔ ہر طرف پراسرار اور ویران سی خاموشی چھا گئی۔

رات کی تاریکی میں بھی خون کی سرخی کا گہرا رنگ شامل تھا۔ چارلس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ وہ بھیگی بھیگی گھاس پر اوندھے منہ گرا ہوا تھا اور اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے جسم کا جوڑ جوڑ بری طرح دکھ رہا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اٹھا۔ اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ پھر جیسے اس کے دل و دماغ میں ایک ہی سوال گونجنے لگا۔ "ڈیانا.... ڈیانا.... ڈیانا کہاں تھی۔"

چند لمحوں تک وہ خالی الذہن ہوکر سوچتا رہا۔

پھر اس نے دیکھا کہ ڈیانا گھاس پر پڑی ہوئی تھی۔ چارلس نے ایک سسکی لی اور ڈیانا کے بے حس و حرکت زرد چہرے کی طرف دیکھا۔ خون اس کے جسم پر جم کر سیاہ ہوگیا تھا۔ وہ بولا۔ "ڈیانا....." لیکن ڈیانا کے جسم کو کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ اس نے ڈیانا کے سینے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کا دل آہستہ آہستہ دھڑک رہا تھا۔ وہ زندہ تھی اور یہ بات چارلس کے لئے کسی معجزے سے کم نہیں تھی۔ چارلس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے ڈیانا کو اپنے بازوؤں پر اٹھالیا۔ وہ بڑی مشکل سے چل رہا تھا، لیکن وہ جلد از جلد کسی محفوظ مقام تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔

سوکھی ہوئی پتیاں اس کے قدموں تلے چیخ رہی تھیں وہ تھکے تھکے قدموں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ اور دل ہی دل میں ڈیانا کی زندگی کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس کی ہمت جواب دے رہی تھی، لیکن پھر بھی کوئی انجانی قوت اسے بار بار آگے چلنے پر مجبور کررہی تھی۔ ڈیانا کا چہرہ زرد اور ستا ہوا تھا، اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پیشانی پر خون جما ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ لگا کر ڈیانا کے زرد اور سرد گال کو چھو کر دیکھا اور اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔

اس لمحے اس نے محسوس کیا جیسے کوئی انسانی سایہ اس پر جھک رہا ہو۔ اس نے کھڑے ہونا چاہا، لیکن ٹانگوں نے اس کا ساتھ دینے سے انکار کردیا۔

ویران سناٹے میں فادر شینڈ ور کی آواز گونجی "میرے بچے میں نے تمہیں پہلے ہی وارننگ دی تھی۔ میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کردیا تھا کہ قلعہ کے پاس نہ جانا لیکن تم نے میری ایک نہ مانی۔"

چارلس بڑی دقت سے کھڑا ہوا ساری کائنات اسے گھومتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ وہ زمین پر گرنے ہی والا تھا کہ فادر شینڈ ور نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے تھام لیا۔ جب چارلس کو ہوش آیا تو وہ ایک نرم اور آرام

وہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ کمرہ میں چند اور دوسری ضروریات زندگی رکھی تھیں اور ایک کونے میں چھوٹی سی میز اور ایک کرسی پڑی تھی۔ یہ کسی ہوٹل کا کمرہ نہیں تھا چارلس اس وقت کیمن برگ کے گرجا گھر میں تھا۔ آنکھ کھلتے ہی وہ چیخا۔ ”ڈیانا..... ڈیانا کہاں ہے۔“ وہ اٹھنے کی کوشش میں ایک بار پھر بستر پر گر پڑا۔

کمرے میں ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک راہب خاموشی سے اندر داخل ہوا۔

”مسٹر تمہاری بیوی خیریت سے ہے وہ بہت کمزور ہوگئی ہے لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں وہ ابھی تک سوئی ہوئی ہے!“

”میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔“ چارلس نے بے یقینی سے کہا چند دنوں میں اس پہ جو قیامتیں گزر گئی تھیں انہوں نے اس کے دل میں ہر بات کا اعتماد ختم کر دیا تھا۔

”وہ بالکل ٹھیک ہے۔ تم قطعی مطمئن رہو۔ وہ جیسے ہی اٹھے گی۔ میں فوراً تمہیں اس سے ملوا دوں گا!“ راہب نے بڑے یقین سے کہا۔

پھر اس نے چارلس کو بتایا کہ فادر شینڈ ور اس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں وہ لباس تبدیل کر کے اور تازہ دم ہو کر ان کے پاس چلا جائے۔ خود چارلس کو بھی شینڈ ور سے ملنے کا اور اس موضوع پر تفصیلی بات چیت کرنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے اور فادر شینڈ ور کی اسٹڈی روم میں اس سے ملنے جا پہنچا۔

اس نے فادر شینڈ ور کو ساری رام کہانی کہہ سنائی ”ہونہہ“ فادر شینڈ ور نے سختی سے دانت بھینچتے ہوئے کہا۔ ”تو ڈریکولا دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ بنی نوع انسان پر ایک بار پھر مردہ خبیث عفریتوں کا راج ہو رہا ہے۔“

فادر شینڈ ور نے چارلس کو خون آشام درندوں کے بارے میں تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ غول کی شکل میں رہتے ہیں۔ تمہارے بھائی کی جان

زندگی کا فلسفہ

زندگی ایک حقیقت ہے، زندہ دل ایسے جیتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران رہ جاتا ہے کہ یہ شخص کتنا خوش ہے حالانکہ اس کے اندر غموں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہوتا ہے۔ زندہ دل اپنے غم، دکھ، کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ زندگی کو صرف خوابوں کے سہارے نہیں گزارا جا سکتا ہے۔ خواب دیکھنا اچھی بات ہے۔ لیکن خوابوں میں اتنا ڈوبنا بھی نہیں چاہئے کہ زندگی مشکل ہو جائے۔

خواب تو تنزیلہ ہے۔ جس کا تعلق تنزل کی صورت میں اللہ تعالیٰ دکھاتا ہے۔ خواب چند لمحے تسکین تو دے سکتے ہیں۔ مگر زندگی کو اپنے زور بازو اور محنت سے کامیاب کیا جا سکتا ہے۔ یہی زندگی کا خوبصورت فلسفہ ہے۔

(عثمان غنی - پشاور)

لے کر ڈریکولا زندہ ہوا ہے۔ اب ہیلن اور کلو اس کے خاص کارندے بن چکے ہیں۔ یہ کہہ کر شینڈ ور نے ایک کتاب اٹھائی اور اسے کھولتے ہوئے بولا۔ ”ڈریکولا خون آشام انسانوں کا آخری فرد باقی بچا تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈریکولا مر چکا ہے۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا تھا۔ وہ ابھی زندہ تھا لیکن اسے زندہ کرنے کے لئے بھی کسی زندہ انسان کے خون کی ضرورت تھی اور یہ کام ایلن کے خون سے لیا گیا۔“

چارلس نے وعدہ کیا کہ ”وہ ہر قیمت پر ڈریکولا کو نیست و نابود کر دے گا۔“ فادر شینڈ ور نے اسے بتایا۔ ”اسے ختم کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ دن کے وقت اس کی کمین گاہ تلاش کی جا سکتی ہے اور وہ تابوت میں لیٹا ہوا ہی میں اس کے سینے میں میخ گاڑ کر اسے ختم کیا جا سکتا ہے اسے براہ راست دھوپ یا سورج

کی شعاعوں کے سامنے لاکر ختم کیا جاسکتا ہے۔ گراس کے ذریعے جلا کر بلاک اور خاکستر کیا جاسکتا ہے۔ غرض یہ کہ اسے تباہ کرنے کے بے شمار طریقے ہیں۔ وہ غیر فانی ہرگز نہیں ہے۔"

فادر شینڈ ور نے چارلس کو بتایا کہ "یہ کام اتنا آسان نہیں ہے کیونکہ قلعہ سے متعلق بہت سے لوگ ڈریکولا کی مدد کریں گے اور ویسے بھی اس کا خاص مصاحب کلود ہر قیمت پر اپنے آقا کی مدد کرنا اپنا اولین فرض سمجھے گا۔" شینڈ ور نے کہا۔ "ضرورت اس بات کی ہے کہ یہ خون آشام انسان بڑھنے نہ پائیں۔ انہیں محدود رکھنے اور ختم کرنے کے لئے ڈریکولا کا خاتمہ بے حد ضروری ہے۔ اس حیوانی نسل کے خاتمے میں ہی بنی نوع انسان کی عافیت ہے۔"

پھر شینڈ ور چارلس کو ڈیانا کے پاس لے گیا۔ چارلس نے محسوس کیا کہ خون آشام لوگوں سے بچنے کے لئے اس گرجا گھر سے زیادہ محفوظ جگہ اور کوئی نہیں تھی! ڈیانا ایک پلنگ پر ہلکا سا کمبل اوڑھے آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر اب بھی زردی موجود تھی۔ چارلس کا دل بھر آیا..... وہ ابھی تک بے ہوش تھی اس نے تیزی سے کمرے سے باہر نکل کر فادر شینڈ ور کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ "آپ..... آپ تو کہہ رہے تھے وہ بالکل ٹھیک ہے!"

"ہاں میرے بچے میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے چوبیس گھنٹے کے آرام کے بعد وہ اس قابل ہو جائے گی کہ تم اس سے دل بھر کر باتیں کرسکو! تمہیں فکر مند ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں۔ آخر میں جو یہاں ہوں۔!"

چارلس چند لمحے کچھ سوچتا رہا، پھر یک لخت اس نے پشیمان ہو کر فادر کے ہاتھ چھوڑ دیئے اور اس کے ہمراہ اس کے کمرے میں چلا آیا۔

اسی گرجا گھر کے ایک راہب لڈوگ نے بھی چارلس کو تفصیلی طور پر ان سب باتوں کے بارے میں بتایا کہ "کس طرح خون آشام درندے دن کے وقت اپنی کمین گاہوں میں آرام کرتے ہیں اور کیسے رات کے وقت تاریکی میں اپنے شکار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں۔"

اسی دوران برادر مارک (ایک اور راہب) نے فادر شینڈ ور کو کسی گاڑی بان کے آنے کی اطلاع دیتے ہوئے کہا۔ "فادر ایک گاڑی بان آیا ہے وہ کہتا ہے میں بہت تھکا ہوا ہوں رات یہاں گزارنا چاہتا ہوں۔"

فادر شینڈ ور مسکرایا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "درست ہے عام حالات میں شاید گرجا گھر کے دروازے ہر آدمی کے لئے ہر اجنبی کے لئے کھلے تھے۔ لیکن اب حالات بہت سنگین اور مختلف ہیں۔ اسے اندر آنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ہوسکتا ہے رات کو ڈریکولا ادھر آ نکلے لیکن وہ اندر گرجا گھر میں آنے کی جرأت ہرگز نہیں کرسکے گا۔"

پھر اس نے چارلس سے کہا۔ "گزشتہ شب ڈریکولا اپنے شکار یعنی ڈیانا سے محروم رہ گیا تھا۔ ہیلن بھی اس معاملے میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکی تھی۔ اس لئے وہ ڈیانا کو اپنا شکار بنانے کے لئے تڑپ رہا ہوگا۔ بہرحال اگر وہ یہاں آ بھی گیا تو اندر نہیں آئے گا۔ تم نے دیکھا ہوگا اس قصبے کے لوگ کس قدر احمقانہ انداز میں سوچتے ہیں۔ محض لہسن کے پھول ہی لٹکا دینے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اگر پہلے ہی عمارت میں موجود کوئی بدروح کسی خون آشام کو بلانا چاہے تو پھر دنیا بھر کے لہسن کے پھول بھی اسے وہاں آنے سے نہیں روک سکتے۔"

کچھ وقت گزرنے کے بعد چارلس دوبارہ اپنی بیوی ڈیانا کو دیکھنے گیا وہ ابھی تک آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ چارلس اس کے بیڈ کے قریب بیٹھ گیا۔ ڈیانا نے آنکھیں کھولیں اور محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگی اس نے چارلس کا ہاتھ تھام لیا اور اسے اپنے گال کے ساتھ رگڑ کر رونے لگی۔ چارلس نے جھک کر اس کے بال چوم لئے۔ گھر جانے کا تذکرہ سن کر ڈیانا کے چہرے پر رونق آ گئی لیکن جب چارلس نے دوبارہ اسے بتایا کہ وہ واپس قلعہ میں ایک بار ضرور جائے گا

اور ڈریکولا سے اپنے بھائی کی موت کا انتقام لے گا۔

''وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی ...... ''نہیں نہیں تم ہرگز وہاں نہیں جاسکتے۔ میں مرجاؤں گی لیکن تمہیں وہاں نہیں جانے دوں گی۔ وہ بری طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔

فادر شینڈور نے کمرے میں آکر اسے دلاسا دیا۔ ''چپ ہوجاؤ میری بچی اس حالت میں تمہیں زیادہ سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ تم سکون سے سوجاؤ۔'' پھر فادر نے چارلس کا بازو تھاما اور اسے باہر لے گیا۔ ڈیانا نے انہیں آواز دینی چاہی پھر تھک کر اپنا سر تکیئے پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کرلیں۔

فادر نے چارلس سے کہا کہ ''وہ جاکر سکون سے سو جائے۔ گرجا گھر ایک قلعہ سے زیادہ مضبوط اور محفوظ ہے اور اسے یا اس کی بیوی ڈیانا کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

باہر برف گر رہی تھی اور ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔ رات کے سائے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ دروازوں کو سختی سے بولٹ کردیا گیا اور کھڑکیوں پر پردے گرادیئے گئے تھے۔

ڈیانا کے لئے یہ پناہ گاہ ایک قید خانہ بن کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ دوبارہ ڈریکولا کے قلعہ میں قید کردی گئی ہو۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی اوپر چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے گھور رہی تھی کہ کھڑکی کے شیشوں پر کسی کی دستک کی آواز سنائی دی۔ کسی نے تین بار کھڑکی پر دستک دی۔ ڈیانا خوف زدہ ہوکر کھڑکی کی طرف دیکھنے لگی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

باہر ہلکی ہلکی دھند سی تھی اور اس دھند میں کھڑکی کے قریب ایک پیارا اور ستا ہوا چہرہ نظر آرہا تھا۔ یہ ہیلن تھی۔ ڈیانا کانپنے لگی وہ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ساکت سی ہوگئی۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

''پلیز ...... پلیز۔'' ہیلن کے خون آلود ہونٹ کانپے، ڈیانا بیڈ سے اتری۔ اس کے پاؤں ٹھنڈے فرش پر لگے تو اس کے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ڈیانا کسی غیر مرئی کشش کے زیر اثر کھڑکی کے قریب کھنچتی چلی گئی۔ ہیلن کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا اور اس کی آواز شیشوں میں سے سرگوشی کی طرح اندر آرہی تھی۔ ''پلیز ...... ڈیانا میں تم سے التجا کرتی ہوں۔ مجھے اندر آجانے دو میری اچھی بہن باہر بہت سردی ہے میں مرجاؤں گی؟''

ڈیانا جھجکی وہ سوچ رہی تھی کاش اس وقت چارلس یا فادر شینڈور اس کے قریب ہوتے، ہیلن بدستور آواز دینے میں مصروف تھی۔ اب سب ٹھیک ہوگیا ہے میں ڈریکولا کی قید سے فرار ہوگئی ہوں۔ مجھے بچالو مجھے اندر آنے دو ہیلن پھر گھگھیائی۔

ڈیانا نے بے اختیار کھڑکی کا پٹ کھول دیا۔ برفانی ہوا کا سرد جھونکا اندر آیا اور ایک تیز طرار بلی کی طرح ہیلن لپک کر اندر آگئی۔ اندر آتے ہی اس نے سفاکی اور درندگی سے ڈیانا کی کلائی جکڑ لی اور اس سے پہلے کہ ڈیانا چیخ سکتی۔ اپنے دانت اس کی کلائی میں گاڑ دیئے۔ ڈیانا زور سے چیخی۔ ہیلن نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور جیسے فضا میں تحلیل ہوگئی۔

اسی لمحے کھڑکی کے فریم میں ڈریکولا کا خبیث سراپا نمودار ہوا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے تھے جیسے ڈیانا کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے بے تاب ہو۔

ڈیانا فرش پر گرنے لگی اس نے خود کو چارلس کے بازوؤں میں گرا ہوا پایا کیا ہوا؟ یہ فادر شینڈور کی آواز تھی فادر نے آگے بڑھ کے کھڑکی بند کردی۔ پھر وہ مڑا اور ڈیانا کے دونوں شانے پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ ڈیانا نے بے بسی سے اپنی کلائی فادر کی طرف بڑھادی۔ چارلس کی آنکھیں فرط حیرت اور خوف سے باہر کی جانب ابلی ہوئی تھیں۔

فادر شینڈور نے چارلس سے ڈیانا کو تھامنے کے لئے کہا۔ ڈیانا کی کلائی پر دانتوں کے دو گہرے نشان تھے جن پر خون کی دو بوندیں سرخ یاقوت کی طرح چمک رہی تھیں۔ فادر نے کونے میں رکھا ہوا لیمپ اٹھایا اور ان نشانوں پر لیمپ کی لو رکھ دی۔ ڈیانا کا چہرہ درد اور تکلیف

کی شدت سے سیاہ ہوگیا، یہ تکلیف اور اذیت اس کے لئے ناقابل برداشت تھی وہ خود کو چارلس اور فادر کی گرفت سے آزاد کرانے کے لئے تڑپنے لگی۔ ''فادر بس کیجیے۔ خدا کا واسطہ اس پر رحم کیجیے۔'' چارلس نے شینڈ ور سے التجا کی لیکن فادر شینڈ ور ڈیانا اور چارلس کی التجاؤں اور چیخوں سے بے نیاز اپنے کام میں تندہی سے مگن رہا۔ سرد ہوا نے زخم میں جیسے مرچیں سی بھر دیں تھیں اور اب آگ سے جھلس جانے کے بعد جلد میں خوف ناک جلن ہو رہی تھی! ڈیانا نے ایک سسکی لی اور بے ہوش ہوگئی۔

جب اسے ذرا ہوش آیا تو برادر مارک اور فادر شینڈ ور اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی کلائی میں اب پہلی سی آگ نہیں تھی۔ اس پر کوئی ملائم ٹھنڈی اور سکون بخش سی مرہم لگادی گئی تھی۔ ''کیا گرجا گھر میں کوئی اور اجنبی موجود ہے؟'' فادر شینڈ ور نے سختی سے پوچھا۔ برادر مارک نے نرمی سے انکار میں سر ہلایا۔ ''ہم نے آپ کے احکامات پر سختی سے عمل کیا ہے۔'' پھر مارک جھک کر ڈیانا کی کلائی پر پٹی باندھنے لگا اور فادر شینڈ ور چارلس کو مطمئن رہنے کی تسلی دینے لگا۔ ''خطرہ ٹل گیا ہے میرے بچے، ڈیانا بالکل ٹھیک ہے تم کوئی فکر نہ کرو۔'' شینڈ ور کے چہرے سے اطمینان جھلک رہا تھا۔

شینڈ ور اور چارلس کے جانے کے بعد کمرے میں ڈیانا کے پاس بچھی ہوئی ایک کرسی پر برادر مارک بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ دیر ہی ہوئی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ مارک نے دروازہ کھولا لولڈوگ اندر آیا۔ اس نے بتایا کہ ''شینڈ ور نے ڈیانا کو اپنی اسٹڈی میں بلایا ہے۔ وہ اور چارلس ڈیانا کو کسی خاص معاملے پر بات چیت کرنے کے لئے وہاں بلا رہے ہیں۔'' مارک نے اس بات پر احتجاج کیا، لیکن فادر شینڈ ور کے حکم سے سرتابی کی مجال اسے نہیں تھی۔ بادل نخواستہ اس نے ڈیانا لولڈوگ کے ہمراہ جانے کی اجازت دے دی لڈوگ تیزی سے ڈیانا کو لے کر فادر شینڈ ور کی اسٹڈی کی طرف بڑھا۔ جونہی ڈیانا اندر داخل ہوئی اس نے باہر سے دروازہ لاک کر دیا۔

دیوار کی طرف منہ کئے...... ڈریکولا...... کھڑا تھا۔ ڈیانا کا منتظر اور عیار ڈریکولا مڑا۔ اس کے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے اور اپنی مقناطیسی آنکھیں ڈیانا کی آنکھوں میں گاڑ دیں۔ ڈیانا بے بسی کے عالم میں اس کی مقناطیسی آنکھوں والی قوت سے مسحور اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔ ڈریکولا نے ہاتھ بڑھایا اور سامنے سے ڈیانا کی قمیض ناف تک پھاڑ دی۔ پھر اپنے لمبے ناخنوں سے اس کا سینہ لہولہان کر دیا۔ ڈیانا کی چھاتیوں سے خون رسنے لگا۔ ڈریکولا نے اپنا بازو ڈیانا کی کمر میں حائل کر دیا اور ایک ہاتھ سے اس کا سر اس کے سینے پر جھکا دیا۔ پھر اس نے اپنے بھیانک اور خبیث ہونٹ ڈیانا کے سینے پر رکھ دیئے۔ خون کا تیز ذائقہ اس کی زبان پر چڑھنے لگا۔

ڈیانا اب اپنے آپ کو ڈریکولا کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اپنی پوری قوت یکجا کر کے مدد کے لئے چیخی، دور گرجا کے کسی کونے میں چارلس کی آواز ابھری۔ ''ڈیانا...... ڈیانا!'' پھر کمرے کی ایک کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی اور فرش پر شیشے کی کرچیاں بکھرنے لگیں۔ یہ سب کچھ ڈیانا کو ایک بھیانک خواب کی طرح محسوس ہو رہا تھا۔

ڈریکولا اسے دور بہت دور لئے جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ چارلس کو کبھی نہ دیکھ سکے گی۔ اس سے کبھی نہ مل سکے گی۔ ڈریکولا کی جہنمی رفاقت اور شیطانی دنیا اس کی منتظر تھی۔ اس نے ایک اور چیخ ماری اور اس کی چیخ راہداری میں دور تک گونجتی چلی گئی۔

فادر شینڈ ور چارلس کو لئے ہوئے گرجا گھر کے صحن میں چلا آیا یہاں ایک بگھی پر دو تابوت رکھے ہوئے تھے۔ ان تابوتوں میں فادر نے دو کراس رکھ دیں تاکہ دن کے وقت ڈریکولا اور ہیلن اپنی کمین گاہوں کو استعمال نہ کرسکیں۔ فادر شینڈ ور نے بڑی

سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے اس بات کا اعتراف ہے کہ میں نے کوچوان کو گھر جا گھر کے باہر بھی آخر کیوں ٹھہرنے دیا۔ یہ سب کچھ اس مردود ڈریکولا کے خبیث ملازم کلوو کا کیا دھرا ہے۔ یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں کہ ہیلن بھی یہیں کہیں چھپی ہوگی۔ ہمیں جلد از جلد اسے بھی تلاش کرنا ہوگا۔ اگر اس سے پہلے اس نے کسی اور کو کاٹ لیا تو وہ بھی ڈریکولا کا شکار ہو جائے گا۔ ہم اس معاملے میں کوئی رسک نہیں لے سکتے۔''

اسی اثناء میں دو پادریوں نے آ کر بتایا کہ'' ہیلن کو تلاش کر لیا گیا ہے وہ اصطبل میں چھپی ہوئی تھی۔''

فادر شینڈ ور نے ہیلن کو لڈوگ کے تہہ خانے میں لے جانے کا حکم دیا اور چارلس کو لے کر پھر گرجا کی طرف چل دیا۔ اندر پہنچ کر جونہی چارلس کی نگاہ ہیلن کے دہشت ناک چہرے پر پڑی وہ ہر چیز بھول گیا۔ اسے ساری دنیا گھومتی ہوئی معلوم ہوئی یہ کسی زندہ عورت کا چہرہ ہرگز نہیں تھا۔ وہ ایک زندہ لاش کی مانند تھی، اپنی ان دیکھی قوتوں کے ساتھ خود کو چھڑانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ چار آدمیوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا۔ آخر اسے کھینچ کر ایک چوڑی سی میز پر گرا دیا گیا۔

چارلس نے منہ پھیر لیا۔ وہ اس نظارے کو دیکھنے کی تاب نہیں رکھتا تھا۔ فادر شینڈ ور نے کونے میں رکھی ہوئی تقریباً ایک فٹ لمبی لکڑی کی نوکیلی اور تیز میخ اٹھائی اور ہیلن کی بائیں چھاتی پر دل کے قریب رکھ دی پھر آسمان کی طرف دیکھ کر زیر لب کچھ دعائیں پڑھیں اور کونے میں رکھی ہوئی وزنی ہتھوڑی اٹھا کر فضا میں بلند کی، ایک بھیانک چیخ نے پوری عمارت کو لرزا دیا۔ چارلس کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ اس نے اپنے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں ہیلن کا جسم بجلی کی ننگی تار کی طرح تڑپا اور پھر ساکت ہو گیا۔

چارلس دوسرے پادریوں کے ساتھ ہیلن کی لاش کے قریب گیا، اب وہ بے حد پرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک معصوم اور دلکش مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اور اس جہنمی ہیلن کا کوئی پتہ نہ تھا جو چند لمحے پہلے ان لوگوں سے خود کو چھڑانے کی جدوجہد کر رہی تھی؟

ابھی وہ لوگ کمرے سے باہر جانا ہی چاہتے تھے کہ فادر شینڈ ور کا پاؤں لوہے کی ایک سلاخ سے ٹکرایا جو زمین پر پڑی ہوئی تھی۔ ''ہونہہ۔ تو یہ لڈوگ یہاں سے فرار ہونا چاہتا تھا۔'' شینڈ ور نے کھڑکی سے اکھڑی ہوئی سلاخ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ابھی وہ لوگ یہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ دور گرجا میں کسی کی چیخ نے ان کے قدم روک لئے۔ یہ ڈیانا کی آواز تھی۔ چارلس کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

وہ سب تیزی سے اندر کی طرف دوڑے، فادر شینڈ ور نے اپنی اسٹڈی کا دروازہ کھولا۔ اندر ڈریکولا ڈیانا کو اپنے بازوؤں میں سنبھالے کھڑکی سے باہر کودنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے ایک زقند لگائی اور باہر کھڑی ہوئی بگھی میں چڑھ گیا۔ کوچوان کی سیٹ پر کوئی آدمی منہ ڈھانپے بیٹھا تھا۔ یہ کلوو تھا جو اپنے آقا کی خدمت بجالانے کے لئے یہ بگھی یہاں لایا تھا۔ ڈریکولا نے تیزی سے ڈیانا کو بگھی میں پھینکا اور کلوو کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے گھوڑوں کی لگامیں سنبھال لیں، چابک فضا میں لہرایا اور گھوڑے برق رفتاری سے آگے بڑھے۔ کچھ فاصلے پر لڈوگ کھڑا ڈریکولا سے التجائیں کر رہا تھا کہ وہ اسے بھی ہمراہ لئے جائے، لیکن ڈریکولا نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا ایک طرف اوندھے منہ جا گرا اور ذرا سی دیر میں بگھی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

فادر شینڈ ور نے لڈوگ کو مارک اور دوسرے لوگوں کے حوالے کیا اور چارلس کے ہمراہ اندر گرجا گھر میں آ گیا۔ ''اس وقت صبح ہونے والی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''دن کے اجالے میں ڈریکولا اپنے تابوت میں آرام کرے گا اور یہ تابوت کلوو اس کے لئے تیار کرے گا۔ جب تک شام کی تاریکی نہ پھیل جائے ڈریکولا ڈیانا کے پاس نہیں جائے گا۔ اس وقت تک کلوو ڈیانا کا پہرہ

دیتا رہے گا۔ تم شاید نہیں جانتے کہ ڈریکولا کا قلعہ یہاں سے پورے ایک دن کی مسافت پر واقع ہے۔''

پھر شینڈ ور نے چارلس کی رائفل بھری اور اسے دے دی۔ پھر کہا۔ ''ہوسکتا ہے کلوو کو ہم اپنے فائدے کے لیے استعمال کرسکیں۔ بہر حال ہمیں کچھ اور منٹوں کی ضرورت بھی ہوگی تم اور مارک گھوڑے سنبھالو اور میں اپنی تیاری کرتا ہوں۔''

دن کی روشنی آہستہ آہستہ ہر طرف پھیل رہی تھی اس ہلکے اجالے میں آگے بڑھتے ہوئے بگھی کے نشانات انہیں باآسانی نظر آرہے تھے۔ چارلس کے دل و دماغ میں سوائے ڈیانا کے کوئی اور بات نہیں تھی۔ وہ بدستور اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

چارلس بہت تیزی سے گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ اس کے دل کو عجیب سی بے چینی اور بے قراری نے گھیر رکھا تھا، انہیں سفر کرتے ہوئے دوپہر ہوگئی تھی۔ گھوڑے تھک کر بری طرح ہانپ رہے تھے۔ سہ پہر کے وقت روشنی آہستہ آہستہ کم ہونی شروع ہوگئی۔ چارلس نے سسکی لی۔ ''ہم وہاں کبھی نہیں پہنچ سکیں گے..... اف میرے خدایا..... ڈیانا کی حفاظت کرنا۔''

بگھی ناقابل یقین رفتار کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ شینڈ ور نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے ڈھلان کو دیکھا اور گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔ شام کے سائے آہستہ آہستہ برف پوش پہاڑوں سے اتر کر ان ڈھلوانوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ فادر شینڈ ور اور چارلس نے اپنے گھوڑے درختوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ ابھی وہ سانس بھی نہ لینے پائے تھے کہ قلعہ کی طرف جانے والی سڑک پر بگھی کے پہیوں اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی آواز ابھرنے لگی۔ بگھی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ کلوو اکیلا بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے بگھی پر تابوت رکھے ہوئے تھے۔ چارلس نے رائفل کا رخ کلوو کی طرف کردیا۔ کلوو کا منہ اس غیر متوقع صورت حال پر کھلا رہ گیا۔ اس نے گھوڑوں کی لگامیں کھینچ لیں، شینڈ ور نے اسے بگھی سے نیچے آنے کا حکم دیا۔ لیکن کلوو اپنی سیٹ پر سے بلے بغیر ہی پلک جھپکتے میں شینڈ ور کی طرف کود کر لپکا۔ اس کے ہاتھ میں ایک چمک دار خنجر تھا۔ چارلس نے فوراً ٹریگر دبا دیا۔ گولی کلوو کے سینے کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ وہ لڑھکتا ہوا زمین پر آگرا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ دونوں گھوڑے بگھی کو کھینچتے ہوئے برق رفتاری سے ان کے قریب سے گزرے اور قلعہ کی طرف چل دیئے۔ بجلی کی سی تیزی سے چارلس اور فادر شینڈ ور نے اپنے گھوڑے کھولے اور بگھی کے تعاقب میں ہوا سے باتیں کرنے لگے۔

بگھی ایک طرف کو جھکی اور اس پر رکھا ہوا ایک تابوت زمین پر جا گرا۔ چارلس اور شینڈ ور نے اپنے گھوڑے روکے اور تابوت کے قریب جا کر اس کا ڈھکنا ہٹادیا۔ تابوت میں ڈیانا لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں بندھے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں بھیانک انداز میں پھٹی ہوئی تھیں۔ چارلس نے سمجھا کہ شاید وہ بھی ڈریکولا کا شکار ہوچکی ہے۔ لیکن اسی لمحے ایک آنسو ڈیانا کے رخسار پر بہہ نکلا اور وہ مسکرانے کی کوشش کرنے لگی۔ چارلس اس کی طرف لپکا۔ لیکن فادر نے اس کا بازو تھام لیا۔ ''تم جاؤ میں اس کی حفاظت کروں گا! جاؤ جلدی کرو روشنی کم ہوتی جارہی ہے۔'' شینڈ ور نے تقریباً چیخ کر کہا۔

چارلس زمین پر گرتے ہوئے دوسرے تابوت کی طرف بڑھا۔ تابوت برف کی موٹی سی تہہ پر پڑا ہوا تھا۔ یہ ڈریکولا کا تابوت تھا ڈریکولا رات اور تاریکی کے سحر کا عفریت۔

اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی۔ چارلس تابوت کے قریب پہنچا اور دونوں کنڈے کھول دیئے۔ فادر شینڈ ور پل کے قریب ڈیانا کے ہمراہ کھڑا ہوا تشویش ناک انداز میں چارلس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ تابوت کا ڈھکنا ایک زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور ایک استخوانی ہاتھ باہر نکلا۔ لوہے کی طرح سرد اور سخت انگلیاں چارلس کے ہاتھ سے ٹکرائیں۔ ڈیانا نے ایک زوردار چیخ ماری چارلس نے قدم جمالئے تاکہ

ڈریکولا سے دست بدست لڑائی کر سکے۔

''گولی چلاؤ...... تم گولی کیوں نہیں چلاتے!'' فضا میں ڈیانا کی چیخ گونجی۔ لیکن چارلس جانتا تھا کہ گولی چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا چارلس نے دیکھا کہ ڈیانا نے شینڈور کے ہاتھ سے رائفل چھین لی۔ اسی دوران ڈریکولا تابوت سے باہر آ چکا تھا اور اب اپنی تمام خباثتوں کے ساتھ پوری طرح چارلس پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہا تھا۔

ڈریکولا نے چارلس کا بازو جکڑ لیا اور اسے برف پر گھسیٹنے لگا، گولی چلنے کی آواز آئی اور ان سے چند گز کے فاصلے پر ایک تودے میں بڑا سا شگاف پڑ گیا۔ پانی کا ایک فوارہ اس شگاف میں سے پھوٹنے لگا۔ فادر شینڈور چلایا۔'' ہاں ہاں بالکل ٹھیک ہے ایک گولی اور چلاؤ...... '' اور ڈیانا نے لگاتار فائرنگ کرنی شروع کردی۔ وہ اندھا دھند گولیاں برسا رہی تھی۔

ڈریکولا نے چارلس کا خیال چھوڑ دیا اور تیزی سے آگے بڑھ کر فادر شینڈور اور ڈیانا کو زور سے دھکا دیا۔ اسی دوران ایک گولی اور چلی۔ چارلس برف پر پھسل کر گرا پھر اٹھ کر دوڑا اور پھر گر پڑا گرتا پڑتا وہ ڈیانا اور شینڈور کی مدد کے لئے دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جونہی وہ ڈریکولا کے نزدیک پہنچا۔ برف کا تودہ گرنے کی کرخت آواز نے اسے چونکا دیا۔

اس کے ساتھ ہی وہ جگہ جہاں ڈریکولا کھڑا ان لوگوں پر نیا حملہ کرنے کے لئے پر تول رہا تھا ایک بھیانک آواز کے ساتھ شق ہوگئی۔ ڈریکولا ڈوبنے سے بچنے کے لئے ادھر ادھر دوڑنے لگا۔ وہ بے حد پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ ایک اور گولی چلی برف کا ایک اور تودہ ٹوٹ کر علیحدہ ہوگیا تو نیچے سے یخ ٹھنڈا پانی ابل ابل کر اوپر آ رہا تھا۔

جگہ جگہ شگاف پڑ چکے تھے اور ہر طرف پانی کے فوارے ابل رہے تھے۔ چارلس بری طرح ہانپ رہا تھا وہ جلد از جلد اوپر ڈیانا کے پاس پہنچ جانا چاہتا تھا لیکن وہ بری طرح تھک چکا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل ہو چکے تھے۔ شیطانی طاقتوں سے برسرپیکار ہونے کے بعد اس میں اب پل تک جانے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔

شینڈور نے بندوق ڈیانا کے ہاتھ سے چھین لی اور نشانہ لے کر ایک اور دھماکہ خیز فائر کیا۔ اس بار گولی بہترین جگہ پر لگی کہ برف کا وہ تودا جس پر ڈریکولا کھڑا تھا۔ درمیان سے شق ہوگیا، خون آشام ڈریکولا نے ایک خوفناک چیخ ماری اور اپنی استخوانی بانہیں پل کی طرف پھیلا دیں۔ وہ اس چھوٹے سے پل کا کوئی نہ کوئی سرا پکڑنے کے لئے بری طرح کوششیں کر رہا تھا لیکن موت اس کا مقدر بن چکی تھی۔

ڈیانا نے شینڈور کی مدد سے چارلس کے بازو تھامے اور اسے اوپر کھینچ لیا۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ڈریکولا تاریکی کا عفریت بے بسی اور لاچاری سے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ برف درمیان سے چٹختے ہی وہ نیچے ہی نیچے کھنچا چلا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے لئے برف کے پانی پر اس کا مکروہ چہرہ سطح پر ابھرا۔ اس نے منہ کھولا اور بھیانک انداز میں بین کرنے لگا جیسے وہ ہزاروں بدروحوں کو اپنی مدد کے لئے پکار رہا ہو۔

پھر پانی کا ایک زوردار ریلا آیا اور ڈریکولا برف کے اس بھنور میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گم ہوگیا۔ برف کا بڑا سا گلیشیر تیرتا ہوا اس خلا میں آ گیا اور برف کی سطح برابر ہوگئی چارلس، ڈیانا اور شینڈور بے یقینی کے عالم میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس جگہ کو دیکھ رہے تھے جو کہ اب ڈریکولا کا مدفن بن چکی تھی۔

وہاں اب سطح پر سرخ دھاریوں والا ایک سیاہ چغہ تیر رہا تھا۔ وہ لوگ سوچ رہے تھے۔'' کہیں ایسا تو نہیں کہ کاریشیا کا یہ عفریت مکمل تباہی سے اب بھی بچ نکلا ہو۔'' لیکن کچھ لمحے بعد برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے وجود نے اس حقیقت کا اعتراف کرلیا تھا کہ کاؤنٹ ڈریکولا ختم ہو چکا تھا۔ وہ کبھی نہ آنے کے لئے جا چکا تھا اس جہنم میں جہاں بدروحیں خدا کے عذاب میں گرفتار اس کے خیر مقدم کی منتظر تھیں۔

کمرہ نمبر 78

ضرغام محمود۔ کراچی

تین سال پہلے مردے کو دفنادیا گیا تھا مگر اچانک ایک روز وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر روبہ صحت موجود تھا، دیکھنے والا کسی صورت بھی اپنی آنکھیں جھپک نہیں سکتا تھا، حقیقت کہانی میں موجود ھے۔

دماغ میں تہ آنے والا حیرتناک اور خوفناک واقعہ مگر حقیقت کو دیکھ کر کوئی انکار بھی نہیں کرسکتا

انتظار رضا نے اپنی گاڑی نئی ہسپتال کے پارکنگ کی جانب موڑی اور پارکنگ ایریا میں داخل ہوگیا۔

''اوہ۔۔ پارکنگ تو مکمل بھری ہوئی ہے یہاں تو گاڑی کھڑی کرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔۔۔'' انتظار نے پارکنگ ایریا میں کھڑی گاڑیوں کو دیکھتے ہوئے اپنے برابر بیٹھے اپنے چھوٹے بھائی منتظر سے کہا۔

''واقعی بھائی۔۔۔ پارکنگ میں تو کوئی جگہ نہیں ہے جہاں ہم اپنی کار پارک کرسکیں۔'' منتظر نے گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکال کر چاروں طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، ہسپتال کی پارکنگ میں ہر طرف مختلف اقسام کی گاڑیاں کھڑی تھیں، ابھی دونوں بھائی اپنی گاڑی پارک کرنے کے لئے جگہ کی تلاش میں نظریں دوڑا رہے تھے کہ اچانک منتظر بول اٹھا۔

''بھائی۔۔ وہ دیکھئے۔۔۔ وہ لال کار باہر نکل رہی ہے۔۔ آپ اس کی خالی کی ہوئی جگہ پر گاڑی پارک کرسکتے ہیں۔۔'' منتظر نے اپنے بڑے بھائی کی توجہ پارکنگ ایریا کے ایک جانب دلاتے ہوئے کہا جہاں سے ایک لال رنگ کی کار گاڑیوں کے ہجوم سے باہر نکل رہی تھی۔

انتظار نے جلدی سے اپنی گاڑی کو اس جگہ پارک کیا جہاں سے تھوڑی دیر قبل ہی لال گاڑی نکل کر گئی تھی، گاڑی پارک کرنے کے بعد دونوں بھائی گاڑی سے نیچے اترے اور ہسپتال کے مرکزی دروازے کی جانب بڑھے، ہسپتال کے دروازے کے سامنے پہنچ کر انتظار نے منتظر کے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''منتظر۔۔ گلدستہ کہاں ہے؟''

''ارے۔۔ گلدستہ۔۔ وہ۔۔ وہ تو گاڑی ہی میں رہ گیا۔۔۔ بھائی۔۔'' منتظر نے بوکھلا کر جواب دیا تو انتظار کا منہ بن گیا۔

''جاؤ جلدی سے گلدستہ لے کر آؤ۔۔'' انتظار نے گاڑی کی چابی منتظر کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا تو منتظر نے اپنے بھائی کے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لی اور دوڑتا ہوا واپس پارکنگ ایریا کی جانب چلا گیا، تھوڑی دیر میں منتظر واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا خوبصورت گلدستہ تھا۔ انتظار کے پاس آکر منتظر نے گاڑی کی چابی اپنے بھائی کو واپس کی، چابی لیتے ہی انتظار نے ہسپتال کے اندرونی حصے کی جانب اپنے قدم بڑھا دیئے، منتظر بھی گلدستہ سنبھالتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کے پیچھے چل دیا۔

"کون سے فلور پر ہیں عبدالحلیم صاحب؟" چلتے چلتے انتظار نے منتظر سے پوچھا۔

"سیونتھ فلور پر۔۔۔" منتظر نے اپنی سانسیں درست کرتے ہوئے جواب دیا، پارکنگ ایریا تک بھاگ کر جانے اور واپس آنے کی وجہ سے منتظر کی سانسیں بے ترتیب ہو رہی تھیں۔

دونوں بھائی انتظار اور منتظر ہسپتال میں اپنے ایک کولیگ کی عیادت کے لئے آئے تھے جو کچھ دنوں پہلے ہی السر کی بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ منتظر سے سیونتھ فلور کا سن کر انتظار سر ہلاتے ہوئے لفٹ کی جانب بڑھا منتظر بھی بھاری سا گلدستہ سنبھالتے ہوئے بھائی کے پیچھے لفٹ کی جانب چل دیا۔ لفٹ کے سامنے پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ لفٹ خراب ہے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ زینہ استعمال کیا جائے اور سیڑھیاں چڑھ کر ساتویں منزل تک پہنچا جائے لہٰذا دونوں بھائی زینے کی جانب بڑھ گئے۔

جب دونوں بھائی ساتویں منزل پر اپنے مطلوبہ کمرے کے سامنے پہنچے تو پسینے میں شرابور ہو چکے تھے اور زور زور سے سانس لے رہے تھے اس پر ستم یہ ہوا کہ وہاں پہنچ کر انہیں معلوم ہوا کہ وہ جس شخص کی عیادت کرنے کے لئے یہاں تک آئے تھے وہ تھوڑی دیر پہلے ہی ہسپتال سے جا چکا ہے۔ دونوں بھائی دیر سے ہسپتال آنے کے لئے ایک دوسرے کو مورد الزام ٹھہرانے لگے۔ پھر دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کو دیکھنے لگے، منتظر نے اپنے ہاتھ میں پکڑا گلدستہ سامنے رکھی بنچ پر رکھ دیا، دونوں بھائیوں کے چہرے کا تناؤ آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور ان کے سانسیں بھی معمول پر آ گئیں پھر منتظر نے ادھر ادھر گردن گھما کر دیکھا اور ایک انوکھے جذبے کے ساتھ اپنے بڑے بھائی کا ہاتھ دباتے ہوئے دھیمی مگر پرجوش آواز میں بولا۔

"بھائی۔۔۔ یہ۔۔۔ یہ وہی وارڈ نہیں ہے۔۔۔"

"آں۔۔۔ ہاں۔۔۔" انتظار ایسا لگا جیسے گہری نیند سے جاگا ہو اس کے ماتھے پر پسینہ چمکنے لگا اس نے زور سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں اور وارڈ کو چاروں طرف سے دیکھنے لگا اس کی نظریں ہر کمرے کے دروازے پر چند لمحوں کے لئے رکتیں اور آگے بڑھ جاتیں۔

"وہ۔۔۔ وہ کمرہ۔۔۔ کونسا والا۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیا نمبر تھا۔۔۔ ہاں یاد آیا اٹھتر نمبر کمرہ۔۔۔ ہاں کمرہ نمبر 78 تھا۔۔" انتظار غائب دماغی کی عالم میں

بڑبڑایا۔

''ہاں۔۔۔وہی کمرہ ہے کمرہ نمبر اُنھتر۔۔۔'' منتظر کی سانسیں پھر بے ترتیب ہونے لگیں۔

''ہاں۔۔۔اُنھتر نمبر کمرہ ہی تھا۔۔۔اوہ۔۔۔آج۔۔۔آج تین برس بیت گئے ہیں۔۔۔لگتا ہے۔۔۔کل کا واقعہ ہے۔۔۔'' انتظار ماضی میں کھو گیا۔

انتظار کی بات سن کر بے اختیار منتظر کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''امی۔۔۔امی۔۔۔'' منتظر نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں کی ہتھیلیوں سے چھپا لیا اور رونے لگا۔

منتظر کی یہ حالت دیکھ کر انتظار کی آنکھیں بھی بھر آئیں اور اس نے آگے بڑھ کر منتظر کو اپنے سینے سے لگا لیا، منتظر کے آنسو انتظار کی قمیض گیلی کرنے لگے خود انتظار کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

''امی۔۔۔امی۔۔۔'' منتظر کے منہ سے روتی ہوئی آواز نکلی تو پاس سے گزرنے والے ایک آدمی نے رکتے ہوئے کہا۔

''اللہ نے ماں بڑی عجیب چیز بنائی ہے جو اولاد کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے تیار رہتی ہیں، شائد ہی دنیا میں کوئی انسان ایسا ہوگا جس کے آنسو ماں کی موت پر بے اختیار نہ بہہ نکلے۔۔۔''

اس آدمی کی بات سن کر وہ دونوں ذرا سنبھلے وہ آدمی دونوں بھائیوں کا کندھا تھپکتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ انتظار نے عجیب سی نظروں سے جاتے ہوئے آدمی کو دیکھا وہ۔۔۔وہ۔۔۔دونوں اس آدمی کو کیسے بتاتے کہ ان کی ماں آج نہیں مری بلکہ تین سال پہلے اس وارڈ کے کونے والے کمرہ نمبر انھتر میں اللہ کو پیاری ہوگئی تھی اور۔۔۔اور ان دنوں دونوں بھائی اتنے مجبور اور بے بس تھے کہ ہسپتال کا بل بھی ادا نہیں کر سکے تھے اور۔۔۔انہیں اپنی ماں کی لاش کو ہسپتال میں چھوڑ کر فرار ہونا پڑا تھا۔

اس بات کو آج تین سال گزر چکے ہیں اور اب دونوں بھائی ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدوں پر کام کر رہے ہیں، اب ان کی جیب میں پیسہ ہے مگر۔۔۔مگر اب ماں نہیں ہے۔

''بھائی۔۔۔وہ کمرہ دیکھ لیں جہاں امی بیٹھی ہمارا انتظار کرتی رہی ہوں گی۔۔۔'' منتظر نے اپنی خواہش کا اظہار کیا تو انتظار نے اقرار میں سر ہلا دیا، پھر دونوں بھائی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے کمرہ نمبر اُنھتر کی جانب بڑھے، ان کے سر جھکے ہوئے تھے ان کا سارا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا، ایسا لگتا تھا جیسے ان کے کندھوں پر ان کی ماں کا جنازہ ہو۔ کمرہ نمبر اُنھتر کے سامنے پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔ ان کی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں کا محبت بھرا چہرہ گھومنے لگا۔

کمرہ نمبر اُنھتر کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور دروازے پر دبیز پردہ پڑا ہوا تھا۔ منتظر نے آگے بڑھ کر دروازے کا لہراتا پردہ ہٹایا اور کمرے کے اندر جھانکا۔

''بھ۔۔۔بھائی۔۔۔'' منتظر نے کمرے کا پردہ چھوڑا اور دبی آواز میں انتظار کو پکارا۔ اس کا سر چکرانے لگا اور وہ دھپ سے ہسپتال کے فرش پر بیٹھ گیا۔ انتظار نے آگے بڑھ کر منتظر کو سہارا دیا اور اسے کھڑا کیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھا

''اند۔۔۔اندر۔۔۔'' منتظر کے منہ سے ٹوٹے ہوئے الفاظ نکلے۔ انتظار نے دیوار کے سہارے سے منتظر کو کھڑا کیا اور پھر آگے بڑھ کر دروازے پر پڑا پردہ ہٹایا اور کمرے کے اندر جھانکا۔۔۔تو بے اختیار اس کے منہ سے بھی ایک دبی دبی چیخ نکل گئی اور وہ پردہ چھوڑ کر منتظر کے پاس آ گیا، دونوں بھائی خوفزدہ نظروں سے کمرہ نمبر اُنھتر کے دروازے پر پڑے ہلتے ہوئے پردے کو گھور رہے تھے، دونوں کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا ان کی آنکھوں میں خوف کا سایہ صاف دیکھا جا سکتا تھا، ان کا چہرہ سفید پڑنے لگا، وہ دونوں بے جان مجسموں کی طرح کھڑے کمرہ نمبر اُنھتر کے دروازے پر پڑے پردے کو گھور رہے تھے۔

اتنے میں کمرہ نمبر اُنھتر کے دروازے کا پردہ ہلا اور ایک نرس ہاتھ میں ٹرے لئے کمرے سے باہر نکلی اس

نے دونوں بھائیوں کو سر جھکا کر سلام کیا اور راہداری میں آگے بڑھ گئی۔

انتظار نے اپنے بھائی منتظر کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور آگے بڑھ کر ایک بار پھر کمرہ نمبر اٹھہتر کے دروازے پر پڑا پردہ ہٹایا اور کمرے کے اندر دیکھا، کمرے کے اندر پلنگ پر۔۔ان کی ماں۔۔۔

ہاں وہ ان کی ماں ہی تھی ان کی ماں پلنگ پر بیٹھی تھی اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں کھانا تھا، ماں کے دوسرے ہاتھ میں ایک چمچہ تھا جس سے ماں پلیٹ میں رکھا کھانا کھا رہی تھی۔ وہ ان کی ماں تھی۔

یا ان کی ماں کی طرح کی کوئی اور عورت تھی۔ وہ دونوں دنیا جہاں کی حیرت اپنی آنکھوں میں سمیٹے سامنے بیٹھی اپنی ماں کو دیکھ رہے تھے، ماں کا چہرہ جھریوں بھرا تھا، ان کی آنکھوں کے پپوٹے ڈھلکے ہوئے تھے روئی کی طرح سفید بال چھت پر لگے پنکھے کی ہوا سے ماں کے ماتھے پر لہرا رہے تھے، اس ہاتھ میں جس سے ماں نے چمچہ پکڑا ہوا تھا اس ہاتھ میں ہلکا سا رعشہ تھا، مگر اس کے باوجود ماں کا چہرہ حسب معمول پرسکون تھا، ماں نہایت اطمینان سے کھانا کھا رہی تھی۔

دونوں بھائی بت بنے کھڑے ماں کو دیکھ رہے تھے، جب پلیٹ میں کھانا ختم ہو گیا تو ماں نے پلیٹ سائیڈ پر رکھی، اور نظر اٹھا کر دروازے کی جانب دیکھا، ان دونوں پر نظر پڑتے ہی ماں کی آنکھوں میں محبت کے دیپ جل اٹھے۔

"انتظار اور منتظر بیٹا۔ تم دونوں باہر کیوں کھڑے ہو اندر آؤ۔۔۔" ماں نے نرمی سے دونوں کو کہا تو وہ دونوں تیزی سے ماں کے پلنگ کی جانب بڑھے۔ وہ دونوں ماں کے پلنگ کے پاس پہنچے تو ماں نے دونوں کا چہرہ باری باری اپنے ہاتھوں کے ہالے میں لے کر ان کی پیشانی پر پیار کیا، ماں کی یہ خاص عادت تھی وہ اسی طرح دونوں کی پیشانی پر پیار کرتی تھی۔

"تم دونوں نے بہت دیر کی آنے میں۔۔۔ نرس کئی بار کہہ چکی ہے کہ اب میں ٹھیک ہو گئی ہوں اور گھر

> ## قول حضرت علی
>
> کوئی چیز اس عقل سے بہتر نہیں جس کی زینت علم سے ہو اور کوئی چیز اس علم سے بہتر نہیں جس کو حلم اور بردباری نے زینت بخشی ہو اور کوئی چیز اس صداقت اور سچائی سے بہتر نہیں جس کو نرمی نے حسن بخشا ہو اور کوئی چیز اس نرمی سے خوب تر نہیں جس کو تقویٰ سے آراستگی ملی ہو۔ بلاشبہ اخلاق کریمانہ اور عقلمندی کا دار و مدار آبرو کی حفاظت، فرض کی ادائیگی اور عہد کی پابندی اور وعدوں کو پورا کرنے پر ہے۔
>
> (شاہد علی شاہد۔ کراچی)

جا سکتی ہوں۔۔ وہ کئی بار بل کی ادائیگی کا تقاضہ بھی کر چکی ہے۔۔" ماں نے اپنی عادت کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر جملہ مکمل کیا۔

"وہ۔۔امی۔۔وہ دراصل۔۔۔" انتظار نے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس کے منہ سے نہ نکل سکے۔

"نرس۔۔" ماں نے کمزوری کے باوجود تیز آواز میں نرس کو پکارا تو ایک نرس کمرے میں داخل ہوئی۔

"جاؤ نرس بل لے آؤ۔۔۔ دیکھو میرے بیٹے مجھے لینے آئے ہیں، اب میں گھر جاؤں گی، صبح سے تم مجھے طعنہ دے رہی تھی کہ "میرے بیٹے ہسپتال کا بل ادا کرنے کے قابل نہیں تھے، لہٰذا وہ مجھے چھوڑ کر فرار ہو گئے ہیں۔۔۔" اب تم خود دیکھ لو میرے بیٹے معاملات کے کتنے سچے ہیں وہ یہ کیسے گوارا کر سکتے ہیں کہ ان کی ماں پر ہسپتال کا قرض باقی رہ جائے۔۔۔ اور ہاں ڈاکٹر ارسلان کو میرا سلام کہنا وہ تو شاید اب ڈیوٹی پر نہیں ہوں گے، انہوں نے نہایت توجہ سے میرا علاج کیا ہے، کل جب وہ ڈیوٹی پر آئیں تو تم میری جانب سے ان کا شکریہ ادا کر دینا۔" ماں نے طویل جملے بغیر کسی دقت کے نہایت روانی سے ادا کئے۔

ماں کی بات سن کر نرس نے جواب میں ٹھیک ہے کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

دونوں بھائی اتنے خوفزدہ تھے کہ بے حس مجسموں کی طرح کھڑے رہے، تھوڑی دیر میں نرس بل لے کر آ گئی اور اس نے بل ماں کے حوالے کیا۔

''یہ لو انتظار تم دیکھو۔۔۔'' ماں نے بل انتظار کو پکڑا دیا، انتظار نے بل ہاتھ میں لیا اور اس پر لکھی رقم دیکھی اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کا اپنا بٹوا نکالا، انتظار کو آج ہی تنخواہ ملی تھی لہٰذا اس کے پاس کافی رقم تھی، اس نے اپنے بٹوے میں سے رقم نکالی اور رقم گن کر نرس کو بل کی ادائیگی کی، نرس نے رقم لینے کے بعد ادائیگی کی، رسید انتظار کو دی، نرس سے ادائیگی کی رسید لے کر انتظار نے جیب میں رکھ لی۔

بل ادا کر کے دونوں بھائیوں نے ماں کو سہارا دے کر پلنگ سے نیچے اتارا، ماں دونوں بھائیوں کے سہارے سے کھڑی ہو گئی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر کی جانب چل دی، وہ دونوں ماں کو سہارا دے کر راہداری میں لائے اور لفٹ تک پہنچے، اب لفٹ ٹھیک ہو چکی تھی لہٰذا انہیں نیچے اترنے میں چند سیکنڈ لگے۔

جب وہ سب ہسپتال کی عمارت سے باہر نکلے تو اچھا خاصا اندھیرا پھیل چکا تھا، سڑکوں پر برقی قمقمے روشن ہو چکے تھے۔ انتظار نے جلدی سے ہسپتال کی پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالی اور منتظر نے سہارا دے کر ماں کو گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بٹھایا، چند قدم کی مسافت سے ماں بہت تھک گئی تھی لہٰذا سیٹ پر بیٹھتے ہی وہ سیٹ پر لیٹ گئی۔ منتظر نے ماں کو آرام سے سیٹ پر لیٹا دیا اور دروازہ بند کر دیا اور خود گاڑی کا اگلا دروازہ کھول کر انتظار کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سیٹ پر بیٹھتے ہی منتظر نے گردن گھما کر ماں کو دیکھا، ماں کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہولے ہولے سانسیں لے رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا۔ منتظر کے بیٹھتے ہی انتظار نے گاڑی آگے بڑھا دی،

گاڑی کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں اور روشنی میں راستہ صاف نظر آ رہا تھا، انتظار نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کے اندر کی لائٹ بند کر دی تو گاڑی کے اندر اندھیرا چھا گیا۔

انتظار اپنی نظریں سڑک پر جمائے گاڑی چلا رہا تھا، سڑک پر ٹریفک معمول سے کم تھا لہٰذا تھوڑی ہی دیر میں گاڑی اس بلڈنگ کے سامنے پہنچ گئی جہاں ان کا فلیٹ تھا، انتظار نے بلڈنگ کے سامنے پہنچ کر گاڑی کو بریک لگائے تو گاڑی ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ رک گئی۔

گاڑی کے رکتے ہی دونوں بھائی گاڑی سے نیچے اترے، منتظر نے نیچے اترتے ہی گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا تا کہ ماں کو سہارا دے کر نیچے اتار سکے مگر دروازہ کھولتے ہی اس کے منہ سے ایک تیز چیخ نکل گئی اور وہ چکرا کر سڑک پر گرنے لگا، انتظار جلدی سے آگے بڑھا اور اس نے گرتے ہوئے منتظر کو سنبھالا دیا تو منتظر، انتظار کے ہاتھوں میں جھول گیا۔

''کیا ہوا؟'' انتظار نے پوچھا۔

''اند۔۔۔اندر۔۔۔'' منتظر نے نے گاڑی کے اندر کی جانب اشارہ کیا تو انتظار نے منتظر کو گاڑی کے سہارے سے کھڑا کیا اور جلدی سے گاڑی کے کھلے دروازے کے اندر سے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر دیکھا۔

''امی۔۔۔'' انتظار کے منہ سے بے ساختہ نکلا، اندر گاڑی کی پچھلی سیٹ خالی تھی، ماں کا کہیں پتا نہیں تھا، ایسا لگتا ہی نہیں تھا کہ جیسے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی بیٹھا تھا۔

انتظار نے جلدی سے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا تو اس کی انگلیاں ہسپتال کی رسید سے ٹکرائیں انتظار نے رسید اپنی جیب سے نکالی اور رسید پر نظر دوڑائی تو وہ حیران رہ گیا۔

رسید پر تین سال پہلے اس دن کی تاریخ پڑی ہوئی تھی جب ان کی ماں کا انتقال ہوا تھا۔

بریکنگ نیوز

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

شہرت کی بھوکی خوبرو دوشیزہ جذبات کے تھپیڑے میں بہتی چلی گئی اسے اپنے روز و شب کا بھی خیال نہ رہا کہ حالات اسے کس طرف لے جارہے ہیں اس نے بریکنگ نیوز کی مکمل تیاری کرلی تھی لیکن افسوس کہ وہ خود بریکنگ نیوز کا حصہ بن گئی

خراماں خراماں دل و دماغ پر اثر انداز ہوتی دلکش دلفریب دلنشیں انوکھی کہانی

کرن چوہدری نے برق نیوز کی وین میں لگے آئینے میں اپنے دلکش سراپا پر ایک تنقیدی نظر ڈالی۔ اس نے ہلکا میک اپ کر رکھا تھا۔ لپ اسٹک نیچرل شیڈ کی تھی، لمبے چمکدار ریشمی بال ایک سادہ جوڑے کی شکل میں گردن کے پیچھے بندھے ہوئے تھے۔

وہ اپنا یہی انداز پسند کرتی تھی جو اس کے لباس میں بھی نمایاں تھا۔ چست مگر سادہ شرٹ کے بٹن جو اس کی دلکش جوانی کو سنبھالنے میں بظاہر ناکام نظر آرہے تھے اوپر تک بند تھے۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹی تاکہ آئینے میں اپنے پورے جسم کا عکس دیکھ سکے۔ وہ پرکشش نظر آرہی تھی۔ اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے وہ مسکرانے لگی۔ اس کا انداز اتنا ہی سنجیدہ تھا جتنا ایک نیوز رپورٹر کا ہوسکتا ہے۔

''میں ہوں کرن چوہدری.... اور آپ دیکھ رہے ہیں برق نیوز۔''

اس نے یہ لائنیں ایک دو دفعہ دہرائیں۔ ہر دفعہ آواز کا اتار چڑھاؤ مختلف تھا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آج رپورٹ پیش کرتے ہوئے کون سا انداز مناسب رہے گا۔ کرن چوہدری برق نیوز پر موسم کے متعلق اسٹوری پیش کیا کرتی تھی۔ اس کا خوب صورت چہرہ اور دلکش انداز خوف ناک طوفان کی خبر کو بھی لوگوں کے لئے دل چسپ بنادیا کرتا تھا۔

وہ برق نیوز سے گزشتہ پانچ سال سے منسلک تھی اور اپنے کام میں دل چسپی بھی لیتی تھی مگر وہ کچھ مزید کرنا چاہتی تھی اس نے صحافت کی ڈگری اس لئے نہیں لی تھی کہ ٹی وی اسکرین پر لوگوں کو صرف موسم کا حال سنایا کرے۔ وہ تحقیقاتی رپورٹر بننا چاہتی تھی اور سنسنی خیز خبریں لانا چاہتی تھی۔ اس بارے میں اس نے اپنے اسٹیشن منیجر بابر وحید سے بھی بات کی تھی۔ اس نے کرن کو اپنے دفتر میں بلایا تو کرن نے اپنا مسئلہ بیان کردیا مگر اس نے کرن کی پوری بات سنے بغیر ہی کہہ دیا۔

''مس کرن چوہدری......! آپ کا موجودہ کام بھی کچھ اہم نہیں ہے اور سب سے بڑھ کر یہ لوگ آپ سے موسم کا حال سننا چاہتے ہیں۔''

''مگر......میں اسٹوڈیو تک محدود رہ کر اکتا گئی ہوں۔ میں اب معاشرتی طوفانوں کی خبر بھی لینا چاہتی ہوں۔''

''ہم اس پر غور کریں گے۔'' اسٹیشن منیجر بولا۔ ''ابھی تو میری توجہ شہر میں ہونے والی ان وارداتوں کی طرف ہے جس میں کوئی جنونی قاتل اور سیریل کلر، نوجوان لڑکیوں کو قتل کرکے اور ان کی گردن کاٹ کر سمندر کنارے پھینک رہا ہے۔'' اس نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

اس کا جواب سن کر کرن غصے سے کھول اٹھی۔ اس کا چہرہ لال ہو رہا تھا اور آنسو آنکھوں میں بھرے پڑے تھے۔ وہ اپنے ڈریسنگ روم کی طرف جاتے ہوئے خود کو حوصلہ دے رہی تھی۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی کہ منیجر نے اس کی بات کیوں نہیں سنی۔ اسے اپنے اوپر بھی غصہ آرہا تھا کہ وہ منیجر کے سامنے اپنا مسئلہ پوری طرح بیان نہیں کرپائی۔

انہی سوچوں میں گم وہ ایک راہداری میں مڑی تو سیدھی رانا نوید سے جا ٹکرائی۔ اس اچانک ٹکراؤ سے وہ سنبھل نہ پائی اور اگر رانا نوید پھرتی سے اسے اپنی بانہوں میں سنبھال نہ لیتا تو وہ یقیناً زمین پر گر پڑتی۔ جب وہ پھسلی تو اس کا ٹخنہ تھوڑا سا مڑ گیا اور پاؤں دہرا ہوا تو درد کی ایک تیز لہر ٹخنے کی ہڈی میں ابھری۔

''کیا آپ ٹھیک ہیں؟'' رانا نوید نے پوچھا۔

کرن نے رانا نوید کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر فکرمندی کے آثار تھے۔ کرن کے آنسو بہہ نکلے۔

''ارے ارے......سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' وہ تسلی دیتا ہوا بولا۔ ''کیا آپ ٹھیک ہیں......ہڈی تو نہیں ٹوٹ گئی۔''

کرن بلک اٹھی منیجر سے ملاقات کا سارا غصہ آنسو بن کر بہہ نکلا اور وہ سسکنے لگی۔

رانا نے ادھر ادھر مدد کے لئے کسی کو دیکھا مگر راہداری بالکل خالی پڑی تھی۔

''ٹھیک ہے......ٹھیک ہے......مس کرن میں آپ کو آپ کے کمرے میں چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ اپنا ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دیں اور اپنا بوجھ اس پر ڈال دیں۔''

کرن نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے رانا کا سہارا لیا اور آہستہ آہستہ اپنے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھی۔ اندر پہنچ کر رانا نوید نے کرسی پر بیٹھنے میں اس کی مدد کی۔ اس کے بعد اس نے میز پر پڑا ٹشو کا ڈبا اٹھایا اور ایک ٹشو نکال کر کرن کی طرف بڑھا دیا۔

کرن کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ وہ زخمی ضرور تھی مگر خوش قسمتی سے ٹخنے کی ہڈی ٹوٹنے سے بچ گئی تھی۔ وہ پاؤں کو ہلا جلا کر تھوڑا گرم کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

رانا نوید خاموش کھڑا اس کو دیکھتا رہا۔ چند لمحے بعد اس نے آہستگی سے کرن کو متوجہ کیا۔

''کیا تم اب ٹھیک ہو؟''

اس کو اس طرح وہاں کھڑے رہنا عجیب محسوس ہو رہا تھا۔ کرن نے چند ایک گہرے سانس لئے

اور اپنے آپ کو سنبھال لیا۔
"مجھے بہت افسوس ہے آپ کو زحمت ہوئی۔"
"افسوس کی کوئی ضرورت نہیں۔" وہ بولا۔ "میرے لائق کوئی کام ہو تو بتائیں۔"
"میرا خیال ہے میں اب ٹھیک ہوں۔" وہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔ وہ کچھ رکی پھر رانا نوید کی طرف دیکھ کر دوبارہ کہنے لگی۔
"مجھے بہت افسوس ہے کہ تمہیں میری وجہ سے پریشان ہونا پڑا دراصل میں اسٹیشن منیجر سے میٹنگ کی وجہ سے پریشان ہوں۔ اب تو حد ہوگئی ہے۔ میرا صبر ختم ہورہا ہے۔" کرن کی آنکھیں لال ہورہی تھیں۔
"وجہ کوئی بھی ہو... مسئلہ کوئی بھی ہو... اسٹیشن منیجر سے ملاقات کے بعد کوئی خوش نہیں رہ سکتا۔" رانا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔
کرن بھی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مسکرادی۔ "تم نہیں جانتے میں کیا محسوس کررہی ہوں وہ مجھے موقع نہیں دے رہا۔"
"کیسا موقع......؟"
اس سادہ سوال کے جواب میں کرن نے اپنے دل کا سارا حال بیان کردیا۔ اپنے خوابوں کے متعلق بتادیا۔ دل کا سارا بوجھ ہلکا کردیا۔
رانا کے جانے سے پہلے اس نے ساری بات سننے کے لئے اس کا شکریہ ادا کیا۔ رانا نے بھی جوابی مسکراہٹ اچھال دی۔ پھر باہر نکلنے سے پہلے رک کر ایک بار مڑا، اس کی طرف دیکھا اور بولا۔
"مس کرن......اپنے خوابوں کو ٹوٹنے مت دینا۔ تم بہت خاص ہو۔ لوگوں کو تمہاری ضرورت ہے۔" پھر وہ ہاتھ ہلاتا ہوا دفتر سے نکل گیا۔
اس کے جانے کے بعد کرن سوچنے لگی کہ یہ اچھا آدمی ہے۔
وہ رانا نوید کے متعلق اس سے زیادہ نہیں جانتی تھی کہ وہ اس اسٹیشن پر نیمرہ مین تھا اور اس کو یہاں کام کرتے چھ ماہ ہوچکے تھے۔ کرن کی اس سے زیادہ ملاقات نہیں تھی۔ اس نے سوچا کاش اس آدمی سے کبھی پہلے اور بہتر حالات میں ملاقات ہوئی ہوتی۔
اس واقعہ کے تقریباً دو ماہ بعد ایک روز کرن کے ڈریسنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی اس نے دروازہ کھولا تو سامنے رانا نوید کھڑا تھا۔ اس دن کے واقعہ کے بعد کئی دفعہ ٹی وی اسٹیشن کی راہداری میں ان کا آمنا سامنا ہوا تھا مگر ملاقات نہ ہو پائی۔ ہیلو اور مسکراہٹوں کے تبادلے سے آگے نہ بڑھ سکی تھی۔
"ہیلو مس کرن کیا تمہارے پاس میری بات سننے کا کچھ وقت ہوگا۔" اس کی آواز میں جوش نمایاں تھا۔
کرن اپنے پروگرام کی تیاری کررہی تھی جو کچھ ہی دیر میں آن ائیر ہونے والا تھا مگر اس کے جوش کو دیکھتے ہوئے وہ منع نہ کرسکی۔
"میرے پاس صرف چند منٹ ہیں اندر آجاؤ۔"
رانا نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ وہ کچھ محتاط نظر آرہا تھا پھر اندر آکر اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا۔
"میرا پروگرام شروع ہونے والا ہے۔" وہ بولی۔ "ماریہ میرا میک اپ کرنے آنے والی ہے اس لئے جلدی بتاؤ کیا بات ہے؟"
رانا نے سر ہلاتے ہوئے ایک نظر دیوار گیر گھڑی کو دیکھا پھر کہنے لگا۔
"ٹھیک ہے......تو جلدی جلدی سنو۔" اس نے کرن کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ آواز ہلکی مگر لہجہ تیز تھا۔
"مس کرن... !مجھے ایک اسٹوری ملی ہے۔ ایک اسٹوری......تمہارے لئے اسٹوری... جو تہلکہ مچادے گی۔ ہر ایک کی نظر تم پر ہوگی پھر وہ تمہیں نظر انداز نہیں کرسکے گا۔"
کرن نے غیر یقینی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ایک بار پھر اس کے چہرے پر جوش سے سائے

حرکت کرنے لگے۔

"میں اپنا آپ منوانے کے لئے کچھ بھی کرسکتی ہوں میں دنیا کو... اور اسٹیشن منیجر کو بتانا چاہتی ہوں کہ میرے اندر کتنا ٹیلنٹ ہے۔ جلدی بتاؤ کیا خبر ہے۔ کیا اسٹوری ہے؟"

اس سے پہلے کہ رانا کچھ بولتا اسی وقت ڈریسنگ روم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں نے بیک وقت مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ چونک گئے تھے۔ کرن کو اس وقت یہ مخل اندازی بری لگی۔

"تم پہلے اپنا پروگرام کرلو میں تفصیل بعد میں بتاتا ہوں۔ فارغ ہوکر پہلی منزل کے میٹنگ روم میں مجھے ملو میں وہاں تمہارا انتظار کروں گا۔" اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ دی۔

اس دوران ایک بار پھر باہر دروازے پر دستک ہوئی اور کرن کی میک اپ گرل کی آواز ابھری۔ "کرن... کیا تم اندر ہو؟"

"ہاں... بس ایک سیکنڈ ماریہ۔"

"کرن جلدی سے مجھ سے ایک وعدہ کرو۔" رانا اسی طرح دھیمی آواز میں بولا۔ "میں تمہیں ایک بڑی اسٹوری دوں گا اور تم مجھے وہ دو گی جو میں چاہوں گا۔"

"یقیناً... یہ ہم دونوں کے لئے ایک بڑی کامیابی ہوگی اور میں تمہیں نہیں بھولوں گی۔"

"وعدہ...؟"

"وعدہ..." کرن کا لہجہ مستحکم تھا۔

وہ مسکرایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دباتے ہوئے بولا۔

"تھوڑی دیر بعد پھر ملتے ہیں۔" اس نے مڑ کر دروازہ کھول دیا اور ماریہ کو اندر آنے کا موقع دیا پھر وہ خود باہر نکل گیا۔

کرن کے اندر ایک جوش بھر گیا اور وہ عجیب سی بے چینی کا شکار ہوگئی۔ پروگرام ختم ہوتے ہی اس نے جلدی سے لباس تبدیل کیا وہ رانا سے اسٹوری کی تفصیل جاننے کے لئے مری جارہی تھی۔ جلدی سے لفٹ کی طرف بھاگی۔ ایک دو لوگوں نے بات کرنے کے لئے اس کو روکا مگر وہ ہاتھ لہرا کر نکل گئی۔ مطلوبہ منزل پر پہنچ کر جونہی لفٹ کا دروازہ کھلا وہ باہر نکل کر بھاگی۔ راہداری میں دائیں مڑی اور پھر ہال میں آگئی۔ میٹنگ روم کے دفاتر خالی پڑے تھے اور پورا ہال تاریک اور ویران پڑا تھا۔ صرف کمپیوٹرز چلنے کی ہلکی آواز آرہی تھی۔ میٹنگ روم کے ایک کونے والے کمرے میں روشنی دیکھ کر اس نے اپنی رفتار تیز کردی۔

رانا نے بھی اس کو آتے دیکھ لیا تھا اس لئے وہ دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ کرن کمرے میں داخل ہوئی۔ اپنا بیگ لمبے چوڑے میز پر پھینکا خود ایک کرسی پر ڈھیر ہوگئی اور رانا کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ اس کا جوش اور تجسس صاف عیاں تھا۔

"مجھے ایک بہت عمدہ اسٹوری ملی ہے۔" رانا نوید مسکراتے ہوئے بولا۔

کرن دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ منتظر تھی کہ وہ پوری بات تفصیل سے بتائے۔

"تم جانتی ہو کیسے اس شہر کا میئر شہر میں چلنے والے مساج سینٹر اور بازار حسن کو بند کرنے کی پورے زور و شور سے کوشش کررہا ہے۔ اس کا ایک ہی نعرہ ہے کہ شہر کو اپنے بچوں کے لئے صاف اور پاک بنادو۔ اس کی یہ مہم شروع ہوچکی ہے۔"

کرن نے کچھ کچھ سمجھتے ہوئے اپنا سر ہلادیا اور بولی۔ "ہاں... شاید اس لئے کہ انتخابات کا موسم قریب آرہا ہے۔"

"ہاں یہی بات۔" رانا بولا۔ "اور... اب اگر میں تمہیں اس پاک صاف میئر کا ایک گندا راز بتاؤں تو... وہ اتنا پاک صاف نہیں جتنا خود کو ظاہر کرتا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ اس کا انداز ڈرامائی تھا۔

"کیا مطلب..." کرن نے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا یہ بات اس کے لئے ایک دھماکے سے کم نہ تھی۔

رانا مسکرانے لگا وہ سمجھ گیا کہ کرن اب پوری طرح

اس کی طرف متوجہ ہے۔ وہ رازدارانہ انداز میں کہنے لگا۔

۔دوست انڈر ورلڈ کے لئے کام کرتا ہے

۔وں کے لئے وہ کام کرتا ہے ان میں سے ایک کا بظاہر ہوٹل کا کاروبار ہے مگر در پردہ وہ ایک نائٹ کلب چلاتا ہے جس کا تعلق بازار حسن کے لوگوں سے ہے۔"

کرن اس کے ایک ایک لفظ پر توجہ دے رہی تھی۔ ایک توقف کے بعد وہ دوبارہ بولا۔ "اس کلب کی خاص بات یہ ہے کہ شہر کے بڑے بڑے رؤساء اور میدان سیاست کے کئی اہم کھلاڑی اس کلب کے رکن ہیں مگر کوئی بھی دوسرے کو نہیں جانتا کہ وہ بھی اس کلب کا رکن ہے اور اس بات کا خاص اہتمام کیا گیا ہے اور... اس سے بھی بڑھ کر خاص بات......" وہ کہتے کہتے رک گیا ایک وقفہ لیا اور پھر کرن کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرامائی انداز میں کہنے لگا۔

"یہ کلب ایک رہائشی علاقہ میں بنایا گیا ہے اور میئر اس کا خاص رکن ہے۔"

"نہیں..." کرن حیرت کے مارے اچھل پڑی۔ "کیا تمہیں یقین ہے کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں پورے یقین سے یہ بات کہہ رہا ہوں۔ میں نے وہ عمارت دیکھی ہے جہاں یہ کلب قائم ہے مگر صرف باہر سے۔ میں نے ایک دوبار میئر کو بھی اس عمارت کے اندر جاتے دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے دوست کی خبر جھوٹی نہیں کہ اس عمارت کے اندر کیا ہو رہا ہے۔"

"اوہ میرے خدا... رانا یہ صرف ایک اسٹوری نہیں... یہ ایک دھماکہ ہے۔ یہ خبر سارے شہر کو ہلا کر رکھ دے گی۔"

"ہاں... اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ تم اس اسٹوری کو رپورٹ کرو۔ تم اس کا انتظار کر رہی تھیں اور یہ تمہارا..." رانا بولا۔

"ہمیں کیا کرنا ہوگا؟"

رانا اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا کہ انہیں اس وقت کا انتظار کرنا ہوگا جب میئر اس عمارت کے اندر جائے اور یہ وقت اس کا دوست اسے بتائے گا اور اس کی اطلاع دے گا۔

"تب... تب... ہم ایک کیمرہ لے کر رپورٹر کی طرح وہاں چھاپہ ماریں گے۔ ساری کارروائی براہ راست ٹی وی پر دکھائیں گے اور میئر کو رنگے ہاتھوں پکڑیں گے۔"

کرن سب کچھ سمجھ کر سر ہلانے لگی۔ وہ تو خود اس لمحے کا انتظار کر رہی تھی جب وہ اپنی صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کر سکے اور لوگوں سے اپنا آپ منوا سکے۔

"کب مجھے بتاؤ گے؟" وہ رانا سے پوچھنے لگی۔

"میں رابطے میں رہوں گا۔ جونہی اطلاع ملی تمہیں بتادوں گا۔" رانا نے کہا پھر دونوں وہاں سے اٹھ گئے۔ کرن پہلے وہاں سے نکلی پھر اس کے بعد رانا گیا تاکہ کوئی ان کو ایک ساتھ دیکھ کر کسی شک میں نہ پڑ جائے۔

اگلے چند دن تک کرن اونچی ہواؤں میں اڑتی رہی اور خوب بنتی رہی۔ اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے۔ وہ ڈریسنگ روم کے آئینے اور گھر میں واش روم کے آئینے کے سامنے اپنے لباس اور بولنے کے انداز کی پریکٹس کرتی رہی۔

کئی روز تک کوئی خبر نہ آئی۔ اس نے کئی بار رانا کو ادھر ادھر آتے جاتے دیکھا وہ عموماً ہاتھ ہلا کر گزر جاتا تھا۔ کرن کو بے چینی لگی ہوئی تھی۔ تقریباً پانچ روز بعد کا واقعہ ہے راہداری میں سے گزرتے ہوئے رانا نے اسے چپکے سے ایک رقعہ تھمادیا۔ وہ جلدی سے اپنے ڈریسنگ روم کی طرف بھاگی اندر سے دروازہ بند کیا اور کاغذ کی تہہ کھولی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کاغذ پر صرف ایک جملہ تحریر تھا۔

"آج رات...... آٹھ بجے... گورنمنٹ اسکول کے عقب میں۔"

کرن نے اس جملے کو بار بار پڑھا۔ دل کی دھڑکن تیز سے تیز ہوتی جارہی تھی۔ وہ رات آج کی رات تھی اور وہ تیار تھی۔

اسکول کے قریب پہنچ کر رانا کی تلاش میں اس نے محتاط انداز میں اسکول کے گرد ایک چکر لگایا پھر واپس اپنی گاڑی میں آکر اس کا انتظار کرنے لگی کیونکہ وہ اس کو کہیں نظر نہیں آیا تھا۔ اس نے عقبی آئینہ دوبارہ

ایڈجسٹ کیا اور اس میں اپنے آپ کو دیکھ کر جملوں کی ادائیگی کی ریہرسل کرنے لگی۔

"میں ہوں کرن چوہدری۔ براہ راست آپ سے مخاطب ہوں برق نیوز سے......"

کرن نے کھنکھار کر دوبارہ اپنا گلا صاف کیا اس کا خیال تھا کہ آواز صاف اور واضح نہیں ہے۔ دوبارہ کوشش کی۔

"میں ہوں کرن چوہدری براہ راست برق نیوز سے......"

اس بار وہ مسکرائی اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو داد دینے لگی۔ اسی وقت اس نے برق ٹی وی کی وین کو اسکول کے ایک کونے سے گلی میں مڑتے ہوئے دیکھا۔ وہ وین اس کی کار کے سامنے آئی بہت تیزی سے مڑی اور اس طرح قریب آ کر رکی کہ دونوں گاڑیوں کی کھڑکیاں پہلو بہ پہلو آ گئیں۔

وین کی ڈرائیونگ سیٹ پر رانا نوید بیٹھا ہوا تھا اس نے کھڑکی کھول کر کرن کی کار کی طرف دیکھا اور ہاتھ کے اشارے سے اسے کھڑکی کا شیشہ نیچے گرانے کو کہا۔ وہ پرجوش نظر آ رہا تھا۔ کرن نے کار کی کھڑکی کا شیشہ تیزی سے نیچے کیا۔

"اپنا سامان سمیٹو اور جلدی سے وین میں آ جاؤ۔ مجھے اپنے دوست کی کال کا انتظار ہے پھر اس کے بعد چلتے ہیں۔" رانا فوراً ہی تیزی سے بولنا شروع ہو گیا۔

"اوکے......" کرن نے سر ہلا دیا۔ شیشہ واپس چڑھایا۔ چابی اگنیشن سے نکالی۔ اپنا بیگ سمیٹا۔ آئینے میں ایک نظر اپنا چہرہ دیکھا اور کار کا دروازہ کھول دیا۔ گھوم کر وین کی طرف آئی اور پسنجر سیٹ پر بیٹھ گئی۔

"سب ٹھیک ہے نا......" اس کے بیٹھتے ہی رانا نے سوال داغ دیا۔

"میرا خیال ہے ہاں۔" وہ بولی۔

"مجھے ایک فون کال کا انتظار ہے فون آنے کا مطلب ہے کہ میٹر بلڈنگ کے اندر ہے۔ ہم دروازے پر پہنچیں گے۔ تیزی سے اندر داخل ہوں گے اور اس کے سر پر پہنچ جائیں گے۔ میری اطلاع کے مطابق یہ ایک عام سا گھر ہے۔ سارا گروہ دھندا تہہ خانے ۳۰ ہے۔ ہمیں کچن سے ہو کر ایک سفید دروازے تک پہنچ ہمیں ہماری منزل تک پہنچائے گا۔ ہم صدر دروازے پر براہ راست سین شوٹ کریں گے۔ دروازہ کھولیں گے اور تہہ خانے کی سیڑھیاں اتریں گے وہاں میٹر ایک سیاہ رنگ کے دروازے والے کمرے میں موجود ہوگا۔"

کرن کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینہ پھاڑ کر باہر نکل پڑے گا، وہ اپنی سانسوں پر قابو پانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ خود کو سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی کہ کرن یہ ایک بہت بڑی خبر ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے دل کی دھڑکن سنبھلنے لگی۔

رانا اٹھا اور وین کے عقبی حصے میں آ گیا۔

"ایک دفعہ اپنا سامان چیک کر لیں۔ میں ایک چھوٹا کیمرہ لایا ہوں۔ بڑے کیمرے کو دیکھ کر وہ لوگ خبردار اور محتاط ہو سکتے ہیں اس لئے چھوٹا کیمرہ مناسب رہے گا۔"

"یہاں بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔" کرن یہ کہتے ہوئے اٹھ کر وین سے باہر آ گئی۔ آئینے میں دیکھ کر دوبارہ اپنے جملوں کی ریہرسل کی اور لہجے کے اتار چڑھاؤ کو قابو میں کیا۔ اسی وقت اس نے رانا کے فون بجنے کی آواز سنی تو کرن کی سانسیں رکنے لگیں۔ چند لمحے بعد رانا نے وین کا دروازہ کھولا اور سرگوشی کی۔

"چلو...... وقت آ گیا۔"

رانا نے اسے ایک ٹوپی والی لمبی سی جیکٹ تھما دی اور بولا۔

"مکان کے اندر گھسنے تک اسے اوڑھ لو۔ اگر کسی نے دیکھ لیا کہ مشہور کرن چوہدری اس وقت ان گلیوں میں پھر رہی ہے تو لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔"

کرن نے نہ چاہنے کے باوجود ہاتھ بڑھا کر جیکٹ تھام لی۔ اس کو پہنا اور اس کا ہڈ اس طرح سر پر چڑھا لیا کہ بال خراب نہ ہونے پائیں۔ وہ کیمرے کے سامنے نفیس نظر آنا چاہتی تھی۔ رانا نے

اسے ایک مائیکروفون تھما دیا جسے کرن نے جیکٹ کی جیب میں چھپا لیا۔

رانا کے پاس موجود کیمرہ اپنے بیگ میں تھا اور وہ ایک بڑا سا بریف کیس نظر آ رہا تھا۔ رانا نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور پوچھنے لگا۔

''تم تیار ہو؟''

''تم جانتے ہو۔'' کرن کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''تم بہت اہم کام کرنے جا رہی ہو۔ بہت خاص۔''

جواب میں کرن صرف مسکرا دی۔ رانا نے کیمرے والا بریف کیس اٹھایا اور دونوں چل دیئے۔

''اپنا وعدہ بھولنا نہیں۔ جب تم مشہور ہو جاؤ تو میرا حصہ مجھے ملنا چاہئے۔'' وہ اسے یاد دہانی کراتے ہوئے بولا۔

''فکر مت کرو۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہم دونوں ہی وہ کچھ حاصل کریں گے جو ہم چاہتے ہیں۔'' وہ چلتے ہوئے بولی۔

''ہمیں ٹھیک گیارہ بجے اپنا کام شروع کرنا ہے۔'' وہ بولا۔

مطلوبہ گھر تک پہنچتے پہنچتے ان کو مزید پانچ منٹ لگ گئے۔ وہ بالکل خاموش تھے۔ دروازے پر پہنچ کر رانا نے سرگوشی کی۔

''اب تم جانتی ہو جو تمہیں کرنا ہے۔ پورچ میں پہنچ کر ہم ایک ابتدائی سین شوٹ کریں گے جلدی سے ''انٹرو'' دینا شروع کر دینا۔ کیمرہ پر لگی روشنی جلد ہی کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی ہے۔''

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔'' وہ بولی۔

''جب ہم اندر پہنچ گئے تو میں کیمرہ آن کر دوں گا جلدی کرو ہمیں ان کے سنبھلنے سے پہلے سب کام کرنا ہے۔'' رانا کا لہجہ تیز تھا۔

کرن نے جیکٹ کی ٹوپی سر سے اتار دی مائیک نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا پھر جیکٹ بھی اتار دی اور اسے سیڑھیوں کے قریب گھاس پر ڈال دیا۔ اپنے بالوں میں انگلیاں پھیر کر انہیں سنوارنے کی کوشش کی۔ آہستگی سے بے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ ایک گہری سانس لی اور سر ہلا کر رانا کو اشارہ کیا۔

رانا نے بریف کیس سے کیمرہ نکال لیا۔ پھرتی سے اس کو چیک کیا اور بولا۔ ''میں بھی تیار ہوں چلو شروع کرو۔''

کرن قدم بڑھا کر پورچ میں پہنچ گئی۔ گلا ایک بار پھر صاف کیا اور دروازہ کے سامنے ایک خاص انداز سے کھڑی ہو گئی۔ انگوٹھے کو اوپر اٹھا کر رانا کو اشارہ کیا تو اس نے کیمرہ اپنے کندھے پر رکھ لیا اس میں سے پہلے منظر کو دیکھا پھر کرن کو دیکھا۔ اب اس نے الٹی گنتی شروع کی۔

''پانچ، چار، تین، دو......''

ایک پر اس نے روشنی آن کر دی اور کرن کی طرف کیمرہ کا رخ کر کے ریکارڈنگ شروع کر دی۔

کرن نے ایک دفعہ اپنی آنکھیں جھپکائیں ان کو کیمرہ کی روشنی سے ہم آہنگ کیا گہری سانس لی اور بولنا شروع کر دیا۔

''میں ہوں کرن چوہدری اور آپ دیکھ رہے ہیں برق ٹی وی...... براہ راست آج رات ہم آپ کو آپ کے اس شہر کے میئر کا وہ غلیظ راز اور رخ دکھانے جا رہے ہیں جو وہ خود کبھی دکھانا پسند نہیں کرے گا اور یہ سب ہو رہا ہے آپ کے پڑوس میں۔ اس شہر کے وسط میں...... شرافت داروں کی اس بستی کے بیچوں بیچ۔''

کرن ایک لمحہ کو رکی پھر اس نے رانا کو ایک مخصوص اشارے سے سین کٹ کرنے کو کہا۔ اس کے بعد وہ اس کی طرف امید افزا نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا سب ٹھیک ہو گیا؟''

رانا نے کیمرے کی روشنیاں بند کر دیں اور بولا۔ ''بہت عمدہ...... آؤ اب اندر چلیں۔''

کرن نے مکان کا دروازہ کھول دیا اور رانا کو کیمرے سمیت پہلے اندر جانے کا موقع دیا۔ اس کے بعد خود اندر داخل ہو کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ کرن کمرے کی حالت دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ دیواروں کا رنگ دھبوں اور میل کے نیچے چھپ چکا تھا۔ قالین جو شاید کبھی

سبز تھا اب کالا نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں موجود واحد صوفہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ اس کا کپڑا جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ دو چھوٹی کرسیاں ایک کالے رنگ کے چوبی میز کے گرد پڑی تھیں۔ اس میز کا اوپری حصہ سگریٹ کی راکھ سے جلا پڑا تھا اور جا بجا چائے کی گرم پیالیاں رکھنے کی نشانات تھے۔ میز پر ایک ایش ٹرے اور کافی کا کپ بھی نظر آ رہا تھا۔ فضاء میں سگریٹ کے دھوئیں کی بو رچی ہوئی تھی۔ کرن ایسے ماحول کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

کرن رانا کی طرف مڑی تو اس نے دیکھا وہ دروازے کو اندر سے تالا لگا رہا تھا۔ کرن اس کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی تو وہ دھیمی آواز میں بولا۔

''میں نہیں چاہتا کہ کوئی یہاں سے بھاگے یا باہر سے ہمارے پیچھے اندر آئے۔ اب شروع ہو جاؤ۔ تم تیار ہو؟''

''ہاں...... میں تیار ہوں۔'' وہ کمرے کا ماحول نظر انداز کرتے ہوئے بولی اور دوبارہ اپنی خبر کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ایک دفعہ پھر گلے کو صاف کیا اور انگوٹھے سے رانا کو اشارہ کیا۔ رانا نے کیمرہ کندھے پر رکھا اور روشنی آن کردی پھر پانچ تک گنا اور بٹن دبا دیا۔

''میئر اپنی انتخابی مہم اپنی شخصیت کے بل پر لڑ رہا ہے۔ خاندانی اقدار کا فروغ اس کا موقف ہے۔ وہ فحاشی اور عریانی کے خلاف ہے لیکن...... ہماری یہ رپورٹ آپ کو بتائے گی کہ میئر کے قول و فعل میں کتنا تضاد ہے۔ آج برق نیوز پر ہم میئر کی شخصیت کا یہ دوسرا اور گھناؤنا رخ آپ کو دکھائیں گے کہ وہ جس غلاظت کو ختم کرنا چاہتا ہے خود وہ اس میں ڈوبا ہوا ہے۔ اب دیکھئے اس بند دروازے کے پیچھے میئر کا ایک گندا راز......'' کرن نے ڈرامائی انداز میں اندرونی دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد وہ کچھ وقفے سے دوبارہ بولی۔ ''یہ ایک ایسا گھر ہے جو آبادی کے بیچوں بیچ ہے اور بچوں کے اسکول سے صرف چند قدم کے فاصلے پر اس گھر میں عریانی کے سبق پڑھائے جاتے ہیں۔ دراصل یہ گھر نہیں بلکہ ایک کلب ہے، ایک ایسا خفیہ کلب جس کا میئر رکن ہے اور اکثر یہاں آتا ہے۔ یہاں راتیں بکتی ہیں اور خریدار ہوتے ہیں نام نہاد شرفاء، ہمارے ساتھ آیئے ہم براہ راست آپ کو دکھاتے ہیں اس قحبہ خانے میں کیا ہوتا ہے۔''

کرن اپنی ایڑیوں کے بل گھومی۔ اس کا لہجہ پیشہ ورانہ مہارت سے بھرپور تھا۔ اس کی زبان رواں تھی وہ میئر کے چہرے پر ابھرنے والے خوف اور پریشانی کو ابھی سے صاف دیکھ سکتی تھی۔ وہ اس کی حالت پر من ہی من محظوظ ہو رہی تھی۔

رانا کیمرے سمیت اس کے پیچھے تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے آگے ایک کچن تھا۔ کیمرے کی روشنی میں کچن کی دیواروں پر سائے لہرا رہے تھے۔ کچن سے نکل کر ان کو تہہ خانے میں جانے والا راستہ نظر آ رہا تھا۔ اس دروازے پر دور کی کیمرے کی طرف رخ کیا اور بولی۔

''میرے ساتھ آیئے۔'' پھر اس نے دروازہ کھولا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔

وہاں عجیب سی بوجھیلی ہوئی تھی۔ کرن کی توقع سے زیادہ سڑاند اٹھ رہی تھی۔ اس کو اپنی ناک پر رومال رکھنا پڑ گیا مگر اس کو اطمینان تھا کہ کیمرہ اس کے چہرے پر نہیں ورنہ سب کچھ ریکارڈ ہو جاتا اس کے چہرے کے تاثرات بھی۔

وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔ وہ کسی کو چوکنا اور خبردار ہونے کا موقع دینا نہیں چاہتی تھی مگر حیرت کی بات تھی کہ ان کا ابھی تک اس عمارت میں کسی انسان سے ٹکراؤ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کسی حرکت کی کوئی آواز سنائی دی تھی۔ ہر طرف ایک گہرا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ تہہ خانہ ایک عام سا تہہ خانہ تھا کوئی خاص قابل ذکر چیز وہاں نہ تھی سوائے ایک کالے رنگ کے دروازے کے۔

یہاں نیچے بدبو زیادہ تھی۔ کرن نے اپنا ایک ہاتھ کالے رنگ کے دروازے کے ہینڈل پر رکھ دیا۔ ان کی توقع اور اطلاع کے مطابق اس کالے دروازے کے پیچھے اس شہر کا میئر کسی جسم فروش عورت کے ساتھ موجود تھا۔

''آیئے دیکھتے ہیں کیا میئر اندر ہے...؟'' وہ

بولی اور دروازہ ایک جھٹکے سے کھول دیا۔ کمرہ کیمرے کی روشنی میں جگمگا اٹھا۔

کرن نے دوبارہ بولنا شروع کردیا اور ساتھ ہی اپنا سر موڑ کر کمرے کے اندر جھانکا۔ اس کو وہی نظر آیا جس کی وہ توقع کررہی تھی۔ سامنے ایک بڑا سا میز تھا جس پر ایک خوب رو نوجوان لڑکی مکمل برہنہ حالت میں پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ اور پاؤں سیاہ چمڑے کی مدد سے میز کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ لڑکی کے منہ میں ایک سرخ کپڑا ٹھنسا ہوا تھا۔ وہ بری طرح کسمسا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور دہشت تھی۔ یہ چیز کرن کے لئے غیر متوقع تھی۔

وہ لڑکی چیخنا چاہ رہی تھی مگر اس کی آواز منہ میں ٹھنسے کپڑے کی وجہ سے گھٹ رہی تھی۔ اس کی گھٹی گھٹی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ پوری قوت سے اپنی بندشوں سے آزاد ہونے کی کوشش کررہی تھی۔ کمرے میں اس کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

''میئر کہاں ہے؟'' کرن نے سوچتے ہوئے گہری نظر سے کمرے میں ادھر ادھر دیکھا۔ لڑکی خوف زدہ تھی مگر اس کی نگاہیں کرن پر نہیں تھیں بلکہ اس کی نظریں کرن کے پیچھے کسی چیز پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ کرن کے کندھے کے اوپر سے پیچھے دیکھ رہی تھی۔

کرن مڑی اور لڑکی کی نظروں کا تعاقب کیا۔

کرن کے عقب میں رانا بالکل سیدھا کھڑا تھا۔ اس نے اپنا کیمرہ نیچے رکھ دیا تھا اور اب وہ اس کے اور دروازے کے بیچوں بیچ رکاوٹ بن کر کھڑا تھا۔ مگر کیمرے کی روشن لائٹ بتارہی تھی وہ اب بھی آن ہے اور ریکارڈنگ کررہا ہے۔ بندھی ہوئی لڑکی کی خوف زدہ نظریں رانا پر جمی ہوئی تھیں۔

کرن نے کچھ نہ سمجھنے کے انداز میں رانا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''رانا نوید..... یہ سب کیا ہے..... کہاں ہے میئر؟'' اس کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی کیونکہ اس نے دیکھا کہ رانا کے ہاتھ میں ایک بڑا چاقو تھا اور وہ آہستہ آہستہ اس کے قریب آرہا تھا۔

''میئر اپنے گھر یا اپنے دفتر میں ہوگا..... اور جو تم دیکھ رہی ہو..... یہ سب وہ کچھ ہے جو تم چاہتی تھی کرن..... ایک بریکنگ نیوز میں تمہیں شہرت دے رہا ہوں اور تم ایک بڑی خبر کا حصہ بننے جارہی ہو۔ تم نوجوان لڑکیوں کے سیریل کلر کی شناخت جاننے جارہی ہو۔'' وہ بولا تو اس کے چہرے پر عجیب سی شیطانی مسکراہٹ تھی۔

کرن بے ساختہ چیخ اٹھی۔ وہ اس کے قریب آیا اور چاقو بلند کرتے ہوئے بولا۔

''یہ سب وہ ہے کرن..... جو تم چاہتی تھی۔ معاہدہ ہوا تھا تم سے..... اب مجھے میرا حصہ دے دو۔ تم نے وعدہ کیا تھا اس کا۔'' پھر اس نے چاقو کرن کی گردن کے پاس اس کے کندھے پر رکھ کر دبا دیا۔

''مجھے تمہارا خون چاہئے۔'' اس نے ایک جھٹکے سے چاقو کرن کے جسم میں گھونپ دیا۔

کرن کی گردن سے خون پھوٹ پڑا۔ سرخ گرم اور تازہ خون۔ رانا نے چاقو کے پھل پر لگا خون چاٹ لیا اور زبان ہونٹوں پر پھیر کر مزے لینے لگا۔

''میں جانتا ہوں کرن تم بہت خاص ہو، اور تمہارا خون بہت زیادہ مزیدار ذائقے والا۔'' اس کے لہجے میں عجیب ہوس تھی۔

کرن سسک اٹھی۔ پھر رانا نے ایک دم چاقو کے پے در پے تیز وار کئے اور کرن کے جسم کو چھلنی کردیا۔ چاروں طرف خون پھیل گیا۔ کرن کی چیخیں دم توڑنے لگیں۔ رانا کو جو چاہئے تھا اس نے حاصل کرلیا۔

زمین پر گرتے ہوئے کرن نے ایک دفعہ کیمرے کی طرف دیکھا جو ابھی بھی آن تھا۔ پھر اس کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔ اس کی زندگی کا کیمرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کٹ ہوگیا اور وہ خود ایک بریکنگ نیوز کا حصہ بن گئی۔

زندہ صدیاں

ایم اے راحت

قسط نمبر:14

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے در یچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

لیکن کمال تھا۔اس شخص نے چلتی کار سے مجھے پہچان لیا تھا۔ دل اندر سے چیخ رہا تھا کہ بھاگ جاؤں، لیکن یہ بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ قدم بھی تو نہیں اٹھا سکتا۔ کار کے اندر عبدالحکیم صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے۔اشتیاق احمد نے کہا۔

"برتن ہے تمہارے پاس۔"

"ایں؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

"یہ ناشتہ لے لو۔ ہماری بچی کا چالیسواں ہے۔ اس کی مغفرت کی دعا کرنا۔" اس نے کہا۔ ایک لمحے تک تو اس کی بات ہی سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جب ان کے ملازموں نے کھانے پینے کی کچھ چیزیں آگے بڑھائیں، تب سب کچھ سمجھ گیا۔ برتن نہیں تھے وہ بھی انہوں نے خود دیے اور پھر گاڑی آگے بڑھ گئی۔

میں سناٹے میں تھا۔ جو کچھ ہوا تھا وہ اتنا انوکھا تھا کہ میرے اعصاب ابھی تک کشیدہ تھے۔

"کیا ہوا، کیا بات ہے۔؟" کوروتی نے آواز دی تو میں چونکا۔" کیا ہوا اتنے پریشان کیوں ہو گئے۔ وہ دوبارہ بولی۔

"ان لوگوں کو پہچانا نہیں تم نے۔"

"نہیں۔ کون تھے۔" اس نے حیرانی سے کہا۔

اور میں اسے ثنا کے گھر والوں کے بارے میں بتانے لگا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ثنا کے روپ میں کئی دن ان کے ساتھ گزار چکی ہے پھر بھی انہیں نہیں پہچان سکی۔

"تو میں کون سی ثنا تھی۔ ویسے ایک بات کہوں۔ جب میں ثنا کے روپ میں تھی تو تم...... بہت خوش تھے۔"

پہلے تو میں اس کی بات نہیں سمجھا لیکن جب اس کی بات سمجھ میں آئی تو مجھے اس سے بڑی نفرت محسوس ہوئی۔ تاہم میں نے اسے کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ یہاں بھی مجھے عورت کی فطرت کا ایک اور اندازہ ہوا۔ وہ کسی بھی شکل میں اپنا رقیب برداشت نہیں کر سکتی۔ اس نے پھر کہا۔

"چلو۔ تمہارے کھانے پینے کا تو بندوبست ہوا۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو۔ یہی کسر رہ گئی تھی کہ اب خیرات کا کھانا کھاؤں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تمہارا ہی شوق تھا بھکاری بننے کا۔ میرے لئے سردخانے میں ایک بھکارن کی لاش ہی رہ گئی تھی۔ کوئی اور بھی بدن لے سکتے تھے۔ اب بھی پیشکش کرتی ہوں کوئی بہت اچھی فیملی تلاش کرتے ہیں۔ میں وہاں کسی خوبصورت لڑکی کو تاڑلوں گی۔ تمہارے بھی عیش ہو جائیں

گئے۔'' وہ فرمائشی انداز میں ایک آنکھ دبا کر بولی۔

''اور تم اس خوبصورت لڑکی کو قتل کر دوگی۔'' میں نے کہا۔

''کیا کروں۔ یہ میری مجبوری ہے۔''

''کوروتی۔ مجھے پاگل مت کرو۔'' میں نے شدید غصے سے کہا۔

''کیوں۔ آخر کیوں تم چاہتے ہو میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے صرف تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ گوتم بھنسالی میرے ساتھ ایسا سلوک صدیوں نہ کرتا۔ اگر وہ تم سے رقابت کا شکار نہ ہوجاتا۔''

''آہ.... کاش میں تمہیں قانون کے حوالے کرسکتا۔'' میں نے کہا۔

''قانون میرا کیا بگاڑ لیتا۔''

''تمہارے لئے ایک ایسا قید خانہ بنادیتا۔ جہاں تم زندہ تو رہتیں، وہاں سے باہر نہ نکل سکتیں۔''

''خام خیالی ہے تمہاری۔ میں وہاں سے نکلنے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرلیتی۔ آخر میں نے اتنے علوم سیکھے ہیں۔'' وہ مجھے چھیڑنے والے انداز میں بولی۔ بھکارن کی حیثیت سے اس کے چہرے پر شرارت کے آثار تھے۔

''تم اب ایک بھی قتل نہیں کروگی سمجھیں۔''

''ایک شرط پر۔''

''کیسی شرط؟''

''تم مجھے اس حیثیت میں بھی قبول کروگے۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔'' مجھے خاموش ہونا پڑا تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی کرسکتی تھی اور میں اسے نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن میں اپنے وطن کی معصوم اور پیاری بچیوں کو موت کے گھاٹ اترتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لئے مجھے قربانی دینی ہوگی۔ اپنے ظرف کی، اپنے ہر احساس کی بظاہر اس بلا سے پیچھا چھڑانے کے امکانات نہیں نظر آرہے تھے۔ کوئی معجزہ ہی اب مجھے اس سے بچا سکتا تھا۔ ابھی تو اسے ہوش میں لانا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ ثنا کے رشتے دار کردیکھ کر میری جان نکل گئی تھی۔ اشتیاق احمد انٹیلی جنس کا آدمی تھا اور پولیس بے وقوف نہیں ہوتی۔ اس وقت بھیک دیتے ہوئے بھی اس نے مجھے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ ممکن ہے اسے میرے خدوخال پر شک ہوا ہو۔ اور.... اور۔

''اٹھو'' میں نے بدحواسی سے کہا۔ اور کوروتی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں اٹھا تو وہ بھی بادل نخواستہ اٹھ گئی۔

بتاؤ تو.... کیا ہوا؟'' وہ بولی لیکن میں نے قدم آگے بڑھادیئے تھے۔ اس کے بعد وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتی رہی۔ پھر اس نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں چلتا رہا، میرا ذہن سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا میں سوچ رہا تھا کہ اب میں کہاں جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ کسی اسی جگہ جہاں اور بھی بہت سے فقیر پائے جاتے ہیں۔

اپنے شہر سے کوئی پچاس کلومیٹر ایک ایسا مزار شریف تھا جہاں دو تین بار جانا نصیب ہوا تھا بڑے پہنچے ہوئے بزرگ کا مزار تھا اور وہاں عقیدت مند منتیں مرادیں پوری کرانے جاتے تھے۔ میں نے وہاں فقیروں کے ڈیرے دیکھے تھے۔ مزار کے اس پاس لاتعداد درخت تھے۔ جن کے نیچے فقیر اور دوسرے حاجت مند قیام کرتے تھے اور وہاں کافی رونق رہتی تھی۔

بس یہ خیال میرے دل میں جڑ پکڑ گیا کہ مجھے وہاں جانا چاہئے جس حلئے میں اس وقت تھا اس کے لئے وہ مناسب ترین جگہ تھی۔ پہلے جب بھی وہاں گیا اپنی کار لے گیا تھا لیکن اکثر میں نے وہاں بسیں اور ویگنیں جاتے ہوئے دیکھی تھیں۔ مجھے ان بسوں کے روٹ اور نمبر بھی یاد تھے۔ چنانچہ کافی پیدل چل کر میں نے ان بسوں کے اڈے کے پاس پہنچ گیا۔

''اب بھی کچھ نہیں بتاؤ گے۔'' کوروتی نے کہا۔

''کوروتی۔ تم جانتی ہو ہمیں پولیس کا خطرہ ہے۔''

''ہاں۔ جانتی ہوں۔''

''ہم ایک ایسی جگہ چل رہے ہیں جہاں اس حلئے میں آسانی سے رہ سکتے ہیں۔'' میں نے مختصراً اسے مزار کے بارے میں بتایا تو وہ ایک دم خوش ہوگئی۔

"ہاں تو میں خوشی سے جاؤں گی۔"
"کوئی خاص وجہ۔"
"تمہیں بتایا نہیں تھا۔" کوروتی نے کہا۔
"کیا؟ دوبارہ بتاؤ۔"
"میں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کی کہانی مجھے نہیں بھولتی جس کے ہاتھ پاؤں ٹیڑھے تھے اور جسے کسی بزرگ کے بتائے ہوئے تیل نے ٹھیک کردیا تھا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے بھی کسی ایسے ہی بزرگ کے مزار پر لے چلو۔ ہوسکتا ہے میرے لئے بھی ایسا کچھ ہوجائے۔"
مجھے ہنسی آگئی تو اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ پھر بولی۔ "کیوں...... ہنسے کیوں؟"
"وہ لڑکی بعد میں مرگئی تھی۔"
"یہی تو افسوس ہے۔"
"کیا؟"
"کاش یہ آسانی مجھے بھی حاصل ہوتی، کاش میں بھی مرجاتی۔" اس کے لہجے میں اتنی حسرت تھی کہ میرا دل کانپ کر رہ گیا۔ قدرت آہ قدرت کتنی مہربان ہے۔ موت بھی انسان کے لئے ایک نعمت ہے۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا۔
بس آگئی اور ہم اس میں بیٹھ کر چل پڑے۔ اچھا خاصا طویل سفر تھا جو آخر کار طے ہوگیا۔ میں نے یہ جگہ پہلے دیکھی ہوئی تھی۔ سب کچھ حسب معمول تھا۔ عقیدت مندوں کی کافی تعداد موجود تھی۔ فقیر بھی مزار پاک پر مکھیوں کی طرح بھنبھنا رہے تھے اور لوگوں کو تنگ کررہے تھے۔ ہم نے بھی ایک درخت کے نیچے ڈیرہ ڈال لیا۔ مجھے بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ میں نے کھانے پینے کی وہ اشیا نکال لیں جو مجھے وہ لوگ دے کر گئے تھے۔ پیٹ بھرا تو وہیں لیٹ گیا۔ کوروتی نے بھی درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔
ذہن میں پھر خیالات کا جھکڑ چل پڑا۔ کاش کسی رائٹر کے بجائے کسی دفتر میں کلرک کی نوکری کررہا ہوتا۔ حال تو نہ ہوتا انہیں سوچوں میں نیند آگئی۔ جاگا تو شام ہوچکی تھی درگاہ پر خوب رونق تھی کوروتی وہ سب دیکھ رہی تھی مجھے جاگتا دیکھ کر بولی۔
"وہ سامنے پانی ہے۔ منہ ہاتھ دھولو۔"
چشمہ جیسی جگہ تھی، پانی ابل رہا تھا اور نیچے جمع ہوکر ایک چوڑی لکیر بناتا ہوا دور نکل گیا تھا۔ وہاں جاکر منہ ہاتھ دھویا واپس آیا تو کوروتی نے ایک دسترخوان سا بچھا رکھا تھا۔ اس پر مختلف چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ نمکین میٹھے چاول، کھیر کے دوپیالے، جلیبیاں وغیرہ۔
"ارے...... یہ کہاں سے آئے۔"
"جو بھی آتا ہے کچھ نہ کچھ دے کر چلا جاتا ہے۔ یہ تو بڑی اچھی جگہ ہے۔ کاش میں بھی یہ سب کھا سکتی مگر یہ لوگ ایسا کیوں کرتے ہیں۔"
"تمہارے دھرم میں نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔
"ہاں...... اسے پرساد کہتے ہیں۔" وہ بولی۔
"ہمارے ہاں اسے لنگر کہتے ہیں۔"
"عالی تمہیں میری بات یاد ہے۔" وہاں بزرگ کے دوار کب چلو گے؟
"جیسے تم کہو۔" آج ہی چلتے ہیں۔ مگر کسی بات کی گارنٹی تو نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔
"چلو تو سہی، یہاں کچھ نہ ہوا تو کہیں اور چلیں گے۔" ان مہاراج کو تلاش کریں گے جنہوں نے ان بنجاروں کو تیل بتایا تھا۔ کوروتی نے کہا اور میں خاموش ہوگیا۔
رات ہوگئی۔ یہاں کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ مزار پر قوالیاں، شروع ہوگئیں قوال سازوں پر سر ملارہے تھے۔ کوروتی نے اس بارے میں پوچھا تو میں نے اسے تفصیل بتائی۔ مزار کی بلندیوں پر جانے کے لئے تین طرف سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں سامنے والی سیڑھیوں سے زائرین اوپر جارہے تھے۔ بلندی پر پہنچ کر بہت کشادہ جگہ تھی جہاں قوالیاں ہورہی تھیں۔
ہم دونوں تیار ہوکر چل پڑے۔ سیڑھیوں کے سامنے کے حصے پر داخلی دروازہ تھا جس سے زائرین

اندر جا رہے تھے یہی مین دروازہ تھا جبکہ دوسری سیڑھیاں ٹوٹی پھوٹی تھیں اور ان پر اندھیرا بھی تھا ہم دونوں میں دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ ابھی ہم نے اندر قدم رکھا تھا کہ دونوں طرف سے دو غلام جو سبز بھارے پہنے ہوئے تھے نکل آئے ان کے ہاتھوں میں لمبی نوکدار چھریاں دبی ہوئی تھیں جنہیں انہوں نے سیدھا کر کے ہمارے سینوں پر رکھا اور ہمیں اندر جانے سے روک دیا۔

''کافر... کافر... پیچھے ہٹو... پیچھے ہٹو...'' دونوں بیک وقت بولے۔

''کون کافر...؟'' میں نے کہا۔

''یہ... یہ... کافر... کافر... باہر جاؤ۔''

''اور میں...؟'' میں نے کہا۔

''بے دین... بے دین... مشرک مشرک پیچھے ہٹ جاؤ۔ لوگوں کو پتہ چل گیا کہ تم مزار پاک کو ناپاک کرنے جا رہے ہو تو تمہیں مار مار کر ہلاک کر دیں گے۔ چلو، باہر نکلو۔'' انہو نے چھری سے اتنا دباؤ ڈالا کہ مجھے سینے میں سخت تکلیف کا احساس ہوا۔

ہم باہر آ گئے۔ کوروتی بھی صورت حال سمجھ گئی تھی۔ اس نے حیرانی سے کہا۔ ''انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں ہندو دھرم سے ہوں۔''

''یہ مزار پاک ہے۔ یہاں کیا کیا ہے کوئی نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ اور پھر بات ہندو مسلمان کی نہیں ہے۔ بہت سے مزارات پر ہندو عقیدت مند بھی جاتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں لیکن تمہارا ماضی جادو ٹونوں سے بھی منسلک رہا ہے اور جادو ہر مذہب میں حرام ہے۔''

''اور تمہیں کیوں روک دیا گیا۔'' ''تم تو مسلمان ہو۔''

''مجھے آج ایک اور غم ملا ہے کوروتی۔'' میں نے مغموم لہجے میں کہا۔

کوروتی چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

''کیوں؟ تمہیں کیا غم ملا؟''

''تمہارے ساتھ رہ کر میں بھی بے دین اور مشرک ہو گیا۔ آہ میرا ایمان بھی گیا۔'' میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ بات سچ تھی نادانستہ ہی سہی کوروتی کے ساتھ رہ کر میں نے جو کچھ کیا تھا وہ میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

ہم مایوس وہاں سے واپس چل پڑے۔ اچانک کوروتی نے کہا۔ ''عالی، ہم بابا دوارا ضرور جائیں گے۔''

''کیسے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''وہ دوسری سیڑھیاں، ادھر تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اور وہاں اندھیرا بھی ہے۔ اس نے ان سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا جن کا تذکرہ میں کر چکا ہوں۔''

''وہ بری طرح ٹوٹی پھوٹی ہیں۔ ادھر سے کوئی اوپر نہیں جاتا۔''

''ہم جائیں گے۔''

''یہ غلط ہوگا کوروتی۔ مجھے منع کر دیا گیا ہے۔ میں یہ گناہ نہیں کروں گا۔''

''میں کروں گی میں ان سیڑھیوں کے اوپر جاؤں گی۔ پہلے میں جاؤں گی اور اگر میں اوپر پہنچ جاؤں تو پھر تم بھی آ جانا۔'' اس نے منہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانی، میں نے دل میں سوچا کہ بھاڑ میں جائے مرتی ہے تو مرے۔ اسے جو بھی نقصان پہنچا اس کی وجہ میں نہیں ہوں گا۔ وہ سیڑھیوں کے پاس پہنچ گئی۔ پھر اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہوئے میری طرف دیکھا اور اوپر چڑھنے لگی۔ میں نے نیچے کھڑا اسے اوپر جاتے دیکھتا رہا۔ اوپر... بالکل اوپر مزار پاک کے گنبد پر روشنی کے بلب لگے ہوئے تھے جن سے کچھ روشنی اس طرف آ رہی تھی وہ کوئی بیس فٹ اوپر پہنچ گئی اچانک میں نے اسے ٹھٹکتے ہوئے دیکھا۔ اور پھر ٹھٹکنے کی وجہ بھی مجھے نظر آ گئی۔ وہ ایک کالا ناگ تھا جس نے اس کا راستہ روکا تھا۔

کوروتی رک گئی تھی۔ کالے ناگ نے پوری سیڑھی پر اپنا پھن پھیلا رکھا تھا۔ اچانک مجھے کوروتی کی آواز سنائی دی۔ ''میں بابا دوارا ضرور جاؤں گی ناگ مہاراج۔ زیادہ سے زیادہ تم مجھے ڈس لوگے مگر میرا کیا بگڑے گا تم اتنا بھی نہیں جانتے میں۔'' ''امر'' ہوں۔

لیکن اس کی امرتا دھری رہ گئی۔ سانپ نے اپنا

بھی اونچا اٹھا کر اس کے سینے پر مارا اور میں نے اسے فضا میں اچھلتے ہوئے دیکھا۔ وہ بیس فٹ کی بلندی سے نیچے آرہی تھی۔ میں جلدی سے ایک طرف ہٹ گیا کہ کہیں میری ہڈیاں پسلیاں ایک نہ ہو جائیں۔ وہ دھب سے نیچے آ گری تب میں آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گیا۔

"میں نے منع کیا تھا کوروتی، آؤ اٹھو۔ تمہیں چوٹ تو لگی ہوگی۔" میں نے اسے ہاتھ کا سہارا دینا چاہا مگر اس نے قبول نہیں کیا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "چوٹ لگی ہے۔؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں..... میں جھلے دار آواز میں بولی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیس فٹ سے گری تھی اور انسانی بدن میں تھی۔ چوٹ لگنا تو فطری بات تھی۔ مگر وہ بھی ہٹ اٹھرم تھی۔ اس نے میرا سہارا بھی قبول نہیں کیا اور آگے بڑھنے لگی۔ میں اس کے ساتھ چل پڑا تھا۔ وہ اس درخت کے پاس نہیں رکی جہاں میں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔

"سنو کوروتی۔" میں نے اسے آواز دی۔

"خاموشی سے میرے ساتھ چلے آؤ۔" اس کی آواز میں ایک حکم تھا۔ میرے قدم رک گئے مجھے اس کے لہجے پر غصہ آ گیا تھا۔ میں اس کا محکوم تو نہیں ہوں۔ وہ تھوڑی سی آگے نکل گئی پھر اسے احساس ہوا کہ میرے قدم اس کے ساتھ نہیں اٹھ رہے۔ اس نے رک کر مجھے دیکھا اور بولی۔

"ارے۔ کیا ہوا۔"

"کہاں جارہی ہو۔"

"آگے کہیں رکیں گے۔"

"کیوں..... یہاں کیوں نہیں..... میں نے سرد لہجے میں کہا۔ اور وہ مجھے دیکھتی رہی، پھر ہنس پڑی۔

"بڑے کٹھور ہو تم۔ مجھے بدصورت بھکارن بنا دیا اور خود۔"

"خود کیا؟" میں نے بدستور غصے سے کہا۔

"اتنے کے اتنے سندر ہو۔" وہ پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی بولی۔

عورت کیا شے ہے۔ برے حالات سے گزر رہی تھی پتہ سے کچھ بن گئی تھی بیس فٹ کی بلندی سے نیچے گری تھی لیکن نہ جانے اس وقت اسے میری کون سی بات پسند آ گئی تھی کہ ایک دم عورت بن گئی تھی۔ اور اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھر آئے تھے۔

"آؤ نا....." اس نے ناز بھرے انداز میں کہا۔

"اب کہاں جارہی ہو؟"

"بس تھوڑی دور۔"

"یہاں کیوں نہیں؟"

"اب یہاں کیا کریں گے، جس کام سے آئے تھے وہ نہیں ہوا۔ باباجی نے سوئیکار نہیں کیا۔ ہر کوشش کر لی۔ اب یہاں نہیں رکیں گے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور خاموشی سے قدم آگے بڑھا دیئے۔ وہ پتہ نہیں ان راستوں کے بارے میں کیسے جانتی تھی۔ ہم بہت دور نکل آئے۔ میں بری طرح تھک گیا تھا۔ ایک جگہ میں رک گیا۔ تو وہ بھی رک گئی۔

"میں تھک گیا ہوں کوروتی۔" اب آگے نہیں جاؤں گا۔

"ٹھیک ہے۔" اس نے کہا۔ اور ہم ایک جگہ منتخب کر کے بیٹھ گئے۔ اس نے کہا۔ "بھوک لگی ہے۔"

"نہیں۔" میں نے جھلے دار آواز میں کہا۔

وہ پھر ہنس پڑی۔ "اتنے اونچے سے میں گری ہوں اور ناراض تم ہو رہے ہو۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک عجیب سی شرم کا احساس ہو رہا تھا وہ ہندو تھی، دوسرے مذہب سے تعلق رکھتی تھی مجھے اس مزار پاک پر اسے لے جانا ہی نہیں چاہئے تھا۔ پتہ نہیں دل میں یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ کوئی میرے اندر کہہ رہا تھا کہ تمہیں ایک گندی اور ناپاک روح کو مزار مقدس پر لے جانا ہی نہیں چاہئے تھا خود تمہارا بھی ایمان خراب ہو چکا ہے۔ میں نے اس بات کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ اچانک اس نے مجھے آواز دی۔

"عالی۔"

"ہوں۔" میں نے بھاری لہجے میں کہا۔

"ایک بات کہوں۔"

''بولو۔''

''میں نے ہندو دھرم کا اپمان تو نہیں کیا ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''تمہارے دھرم کے بزرگ نے تو میری مشکل دور نہیں کی۔ لیکن ہمارے دھرم میں بھی تو بھگت ہوتے ہیں۔ دھرماتما ہوتے ہیں سادھو سنیاسی ہوتے ہیں۔ اور کالے جادو والے ہوتے ہیں کیوں نہ اب کسی ایسے مہاتما کو تلاش کیا جائے۔''

''تم چاہو تو ایسا کرلو۔''

''صرف میں؟''

''تو پھر کیا.....؟''

''نہیں۔ تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔ اور ایسی بات مت کرو، میں تم سے دور بھی ہوگئی تو بھی اب تو تم مجرم بن گئے ہو۔'' تمہارے اپنے ہی تمہیں جیتا نہیں چھوڑیں گے میں تو پھر بھی تمہارے لئے کچھ نہ کچھ کرتی رہوں گی۔

''مجھ پر احسان مت رکھو۔''

''پریم احسان نہیں ہوتا۔ میں تم سے پریم کرتی ہوں۔'' اس نے کہا۔ میں خاموش ہوگیا، ایک طرح سے ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرے پاس اب کیا رہ گیا تھا سوائے اس کے کہ جان بچانے کے لئے چھپتا پھروں۔ نہ ذیشان رہا نہ عالی۔

بہت بہ گزرگئی تو میں نے کہا۔ ''تو تم اب کسی مہاتما کو تلاش کروگی۔''

''ہاں.....''

''کہاں ملے گا وہ تمہیں۔''

''تلاش کرنے سے تو بھگوان بھی مل جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔

دوسرے دن ہم چل پڑے۔ فقیروں کے تو بڑے مزے ہوتے ہیں۔ یہ اب پتہ چلا تھا۔ ہم ترس کھا کر اور خدا کے خوف سے انہیں اپنی ضرورتیں روک کر دیتے ہیں اور یہ عیش کرتے اور ہم پر ہنستے ہیں۔ ہمیں بھی خوب بھیک مل رہی تھی حالانکہ ہم بنے کٹے تھے کسی سے مانگتے بھی نہیں تھے۔

میرا دل ہر وقت کنتار بنا تھا۔ آہ کیا حسین زندگی تھی اور اب...... واہ ذیشان عالی واہ۔ آوارہ گردی، صرف آوارہ گردی، کہیں بھی بسیرا کر لیتے، کہیں بھی نکل چلتے۔ میری حالت بھی بس عجیب تھی، کبھی کوئی پولیس والا نظر آ جاتا تو جان نکلنے لگتی۔ حالانکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ لیکن میں جانتا تھا کہ اگر پکڑا گیا تو اس بار پھانسی کی سزا سنائی جائے گی۔ ان سوچوں کے درمیان دم گھٹتا تھا۔ کم بخت کوروتی ان حالات میں بھی خوش تھی اور مجھ پر اپنی اداؤں کے تیر برساتی رہتی تھی۔

اس دن بھی ہم ایک بستی کی طرف سفر کررہے تھے۔ اب کہیں ایک جگہ تو ٹکتے نہیں تھے۔ بس کوروتی کو کسی بھگت کی تلاش تھی اور مجھے زندگی کی۔ اس دن ہم نے ابتداء میں ایک بس سے سفر شروع کیا تھا ہم ایک بستی جارہے تھے جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا تھا کہ بس راستے میں خراب ہوگئی۔ بستی زیادہ دور نہیں تھی اس لئے بس کے مسافروں نے بس ٹھیک ہونے کا انتظار نہیں کیا اور چل پڑے۔ ہم دونوں بھی چل پڑے تھے۔ لیکن تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ ہم پریشان ہوگئے۔ پھر ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت نظر آئی تو ہم اس کی طرف دوڑے۔ عمارت بہت پرانی اور کاہی زدہ تھی لیکن اس میں بارش سے پناہ مل گئی۔ اور ہم دونوں ایک چھت کے نیچے بیٹھ گئے۔

بارش کا زور بڑھتا گیا۔ پھر کسی اور نے بھی اس عمارت کے نیچے پناہ لی۔ یہ ایک جٹا دھاری سادھو تھا کوروتی اسے دیکھ کر خوش ہوگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر کہا۔

''جے رام جی کی مہاراج۔''

''جے درگا کنڈنی، جے کرم کنتھالی۔''

''آپ درگاہ پنتھ سے ہیں؟'' کوروتی نے پوچھا۔

''ہاں، درگا مائی کا داس۔''

''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر مہاراج۔''

''تو کون ہے۔؟'' سادھو نے پوچھا۔

''بس ایک دکھوں کی ماری ہوں۔ جیون کو روگ لگ گیا ہے۔ کسی رشی منی کی تلاش میں ہوں۔''

"پنڈت تلک کشوری سے بڑا اودوانی کون ہوسکتا ہے دیوی، ان کے پاس سارے دکھوں کے علاج ہیں۔"

"اچھا... کہاں ملیں گے پنڈت تلک کشوری۔"

"یہاں سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ میں انہیں کے دوار جا رہا تھا کہ راستے میں برکھا رانی آ گئیں اور میں یہاں گھس گیا۔" سادھو نے بتایا۔

"وہ بھی درگا پنتھی ہیں۔؟" کوروتی نے پوچھا۔

"پکے درگا پنتھی۔ پر تمہیں کیا روگ ہے دیوی۔"

"آپ مجھے ان سے ملا دیں گے مہاراج۔" کوروتی نے سادھو کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔

"ادھر ہی جا رہا ہوں۔" میرے ساتھ چل پڑنا۔" سادھو نے کہا۔

رات ہوگئی۔ سادھو ہم سے دور ایک کونے میں پڑ کر سو گیا۔ ہم دونوں نے بھی ایک گوشہ اپنا لیا۔ میں نے کوروتی سے پوچھا۔

"تم تلک کشوری کو اپنے بارے میں کیا بتاؤ گی؟"

"پہلے تو یہ دیکھوں گی کہ وہ خود کتنا گیانی ہے۔ میرے بارے میں اس کا گیان اسے کچھ بتاتا ہے یا نہیں پھر کوئی فیصلہ کروں گی۔"

"یہ درگا پنتھی کیا ہوتا ہے۔"

"پنتھ مسلک کو کہتے ہیں۔ کالے جادو کے کئی مدارج ہوتے ہیں۔ اور اسے سیکھنے والے جادو کے دیوی دیوتاؤں کے داس ہوتے ہیں۔ ان کا واسطہ کالے جادو کے تمام استھانوں سے پڑتا ہے۔ پہلے درجے کے "ویر، چھپر، بیر، مُجھیر وں، لونا چماری، سرکٹے، اچھر پدما، شتاھا اور کھنڈوے، بھوت اور چڑیل دوسری آتما میں ہوتی ہیں۔ جس طرح کالی دیوی کلکتے والی کالے جادو کی کھنڈولی ہے اسی طرح درگا دیوی کا پنتھ الگ ہے اور دونوں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔

"تو تلک کشوری کالے جادو والا ہے۔"

"ہاں......"

میں خاموش ہوگیا۔ پتہ نہیں کیا ہو رہا ہے۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا ہے۔ دوسری صبح بارش رک گئی تھی۔ ہمارے پاس کھانے پینے کی کچھ چیزیں تھیں جو ہمیں خیرات میں ملی تھیں کوروتی کو تو کچھ کھانے پینے کی حاجت نہیں ہوتی تھی میں نے کچھ کھایا پیا اور اس کے بعد ہم سادھو کے ساتھ چل دیئے۔

سفر زیادہ لمبا نہیں تھا۔ دوپہر کے وقت ہم اس پرانے مندر کی عمارت کے پاس پہنچ گئے جو ویرانے میں تھی اور بہت بھیانک نظر آ رہی تھی۔

"یہ تلک مہاراج کا استھان ہے۔" سادھو نے بتایا۔

"وہ یہاں رہتے ہیں؟"

"ہاں پاتال میں۔"

"پاتال میں؟"

"ہاں... مندر کی اس عمارت کے نیچے تہہ خانہ ہے۔ وہیں پر وہ درگا دیوی کے جاپ کرتے رہتے ہیں اور وہیں رہتے ہیں۔"

"ہمیں ان کے پاس لے چلئے مہاراج۔"

"تھوڑا سے بتالو۔ سورج ڈوب جانے دو۔" سادھو نے کہا۔

مندر کی اس بھیانک عمارت کو دیکھ کر میرے دل پر وحشت طاری ہو رہی تھی۔ لیکن بس تقدیر پر گزارہ کر رہا تھا جو بھی تقدیر میں لکھا ہو۔

شام ہوگئی اور سادھو ہمیں تلک کشوری سے ملانے لے چلا۔ مندر کے ایک گوشے میں نیچے جانے کے لئے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ سادھو نے کہا۔" میرے پیچھے پیچھے آ جاؤ......" یہ کہہ کر وہ تہہ خانے میں اتر گیا میں اور کوروتی وس کے پیچھے چل رہے تھے۔

سیڑھیاں جو کہ شیطان کی آنت۔ کم ہی نہیں ہو رہی تھیں۔ اوپر سے گھور اندھیرا۔ نہ جانے کتنی دیر ہم سیڑھیاں اترتے رہے۔ تب کہیں جا کر روشنی نظر آئی۔ یہ مشعلوں کی روشنی تھی جو تہہ خانے کی دیواروں میں لگی ہوئی تھیں۔ آخری سیڑھی عبور کر کے ہم تہہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہاں مشعلوں سے کافی روشنی ہوئی تھی اور اس

روشنی میں تہہ خانے کے بیچوں بیچ ایک اور سادھو ایک مرگ چھالہ پر آسن جمائے بیٹھا تھا۔

''جے درگا مائی کی۔'' ہمارے ساتھ آنے والے سادھو نے دوسرے سادھو کو ڈنڈوت کیا۔

مگ چھالا پر بیٹھے سادھو نے نگاہیں اٹھا کر ہمیں دیکھا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔ ''اس مسلے کو بھی ساتھ لے آئی کوروتی۔''

میرے پورے بدن میں سرد لہریں دوڑ گئیں۔ مسلے، یعنی مسلمان، تلک کشوری کو کیسے پتہ چلا کہ میں مسلمان ہوں۔ دوسری طرف کوروتی بھی دنگ رہ گئی تھی۔ کیونکہ اسے تو سادھو نے اس کا نام بھی لے کر پکارا تھا۔ دوسرے لمحے وہ پہلے گھٹنوں کے بل بیٹھی پھر سجدے میں چلی گئی۔

''امھو چون۔'' تلک کشوری نے پکارا۔

''جی مہاراج۔''

''یہ لونڈا مسلمان ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم تھا مہاراج۔''

''ہمیں معلوم ہے۔''

''بھول ہوگئی مہا کبھی۔''

''کوئی بات نہیں۔ ہمارے دوارا سب کے لئے جگہ ہے۔ بیٹھ جائو کے۔'' تلک کشوری نے کہا۔ میرے پیروں کی جان نکل رہی تھی اس لئے میں جلدی سے بیٹھ گیا۔ کوروتی اب تک سجدے میں پڑی تھی۔ تب تلک کشوری نے کہا۔ ''اٹھ جا کوروتی۔'' تب کوروتی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ''دیکھا جیون مرن کا کھیل کوروتی۔ ان دونوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ چولی نہ ہو تو دامن بیکار ہے اور دامن نہ ہو تو چولی۔''

''جی مہاراج۔''

''تو امرت جل پی کر امر تو ہوگئی، پر اب جیون کے نہ کور میں جلتی رہ۔'' تلک کشوری نے کہا۔

میں حیرت سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔ یہ سادھو تو کوروتی کی پوری کہانی سنا رہا تھا۔ مجھ سے زیادہ کوروتی حیران تھی اور دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

''میں کیا کروں مہاراج۔'' کوروتی نے کہا۔

''اپنے کیئے کا پھل بھوگ اور کیا کرے گی۔''

''میرے ساتھ اور جو کچھ ہوا ہے اس کے لئے کیا کروں گر نہتی۔''

''اپائے ہے اس کا۔''

''میں واری جاؤں مہاراج۔ میری سہائتا کریں۔'' کوروتی بولی۔

''آپ مجھے جو بتائیں گے کروں گی۔''

''وچن دیتی ہے۔''

''جی مہاراج۔''

''پھر تجھے اس مسلے کا خون پینا پڑے گا۔'' تلک کشوری نے کہا اور ہم دونوں دھک سے رہ گئے۔ کچھ منٹ خاموشی رہنے کے بعد سادھو نے کہا۔ ''بول کرے گی ایسا؟''

''نہیں مہاراج۔'' کوروتی نے سرد لہجے میں کہا۔ اور میرے دل پر ایک عجیب سا احساس ہوا۔ کوروتی نے جواب دینے میں ایک لمحہ تاخیر نہیں کی تھی۔

''پھر ہمیشہ اسی میں رہے گی۔''

''ٹھیک ہے مہاراج اسی میں رہ لوں گی۔''

''بہت پریم کرتی ہے اس سے؟''

''ہاں۔'' وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ اور سادھو خاموش رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ پھر بولا۔

''اپائے یہ نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے۔؟'' اس کے ان الفاظ پر کوروتی چونک پڑی۔ ''ہم نے بس تیرا امتحان لیا تھا کہ تو اس مسلے سے کتنا پریم کرتی ہے۔''

''میں اسے بہت چاہتی ہوں مہاراج۔'' اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتی۔

''چل چھوڑ۔ اپائے یہ ہے کہ تجھے پورا ایک چندر ماہ ایک قبر میں دفن رہنا پڑے گا پورے ایک ماہ تو اس اندھیری قبر میں رہے گی اس کے بعد جب اس سے نکلے گی تو تیرا گوشت پوست واپس آجائے گا اور تیرا شریر پہلے جیسا ہو جائے گا۔'' سادھو نے کہا۔

''میں اس کے لئے تیار ہوں۔'' کوروتی جلدی

سے بولی۔

''تو قبر میں رہے گی۔'' سادھو نے پوچھا۔

''ہاں مہاراج۔'' کوروتی نے جواب دیا۔

میرے دل پر اس وقت ایک عجیب اثر ہوا تھا۔ اس سے پہلے میں کوروتی سے نفرت کرتا آیا تھا۔ اور ہر وقت اس سے پیچھا چھڑانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا۔ لیکن اس وقت اس نے میرے لئے جس ایثار کا اظہار کیا تھا وہ قابل قدر تھا۔ میں بولے بغیر نہیں رہ سکا۔

''نہیں کوروتی، یہ کیسے ممکن ہے کہ تم ایک قبر میں زندہ دفن رہو۔''

''میں جہاں بھی رہوں گی عالی، جیتی رہوں گی، کیونکہ موت مجھ سے دور چلی گئی ہے تم اس کی چنتا مت کرو۔''

''لیکن کوروتی۔'' میں نے کہا۔

''میری بات سن لو۔ جیسا کہ بھگت مہاراج نے کہا اس کے بعد جب میں قبر سے نکلوں گی تو پہلے جیسی ہوں گی۔''

''مگر میری بات سنو۔''

''نہیں عالی۔ میں خوشی سے تیار ہوں، لیکن مجھ سے ایک وعدہ کرو۔''

''کیا......؟''

''جب میں پہلی جیسی ہو کر آؤں گی تو تم پیار سے میرا سواگت کرو گے۔ اس بیچ تم میری لگن لگا کر یہاں مندر کے آس پاس میرا انتظار کرو گے۔ ایک چندر ماں، ایک مہینے کی ہی تو بات ہے آنکھ بند کئے بیت جائے گا۔''

''تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو......؟''

''تمہارے یہ شبد میرے لئے نئے جیون جیسے ہیں۔ تمہیں میرے نقصان کی فکر ہے، یہ میرے پریم کی جیت ہے۔ پورے مہینے قبر میں دفن رہ کر میں تمہارے ان شبدوں میں کھوئی رہوں گی میں سخت پریشان ہو گیا تھا۔''

اس وقت بھگت کی آواز ابھری۔

''تمہاری پریم کتھا ختم ہوگئی۔''

''جے ہو مہاراج کی۔'' کوروتی نے کہا۔

''تم تیار ہو۔''

''ہاں بھگوکی پورن۔'' وہ بولی۔

''اسھو چرن۔'' تلک کشوری نے ہمارے ساتھ آنے والے سادھو کو آواز دی۔

''جے بھگوکی۔'' وہ بولا۔

''اس کے لئے قبر تیار کر۔ ہمارے بیروں کو ساتھ لگا لے۔''

''جو آ گیا پربھو۔'' سادھو نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔

''تم لوگ بھی باہر جا کر بیٹھو۔'' اور غور کرلو۔

ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ نہ جانے مجھے کیا ہو گیا تھا۔ حالانکہ میں ایک ایک لمحہ کوروتی سے جان چھڑانے کی ترکیبیں سوچتا رہتا تھا لیکن اس وقت کچھ عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ آخر کار اسھو چرن آ گیا۔

''چلو دیوی، تمہارا استھان تیار ہو گیا ہے۔ تم بھی آؤ۔'' اس نے مجھے اشارہ کیا اور میں بھی اٹھ گیا بہت برا وقت تھا مجھ پر وہ کچھ دیکھنے جا رہا تھا جس کا خواب میں بھی تصور نہیں کیا تھا۔

اسھو چرن پھر ہمیں ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں اور یہ سیڑھیاں واقعی تحت الثریٰ تک گئی تھیں۔ ہمیں سینکڑوں فٹ کی گہرائیں اترنا پڑا تھا۔ پھر ہم جس ہال نما جگہ پہنچے وہاں خوب روشنی تھی، یہ روشنی مشعلوں کو جلا کر کی گئی تھی۔ یہاں انتہائی بھیانک شکلوں کے بے شمار مجسمے نظر آ رہے تھے۔ ہال میں کئی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن میں سے ایک پر تلک کشوری بیٹھا ہوا تھا۔ تلک کشوری سے کچھ گز کے فاصلے پر زمین پر ایک قبر کھدی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

تلک کشوری نے کہا۔ ''یہ تیری قبر ہے کوروتی جس میں تو مہینہ بھر رہے گی۔ تو بتا دے۔''

''جی مہاراج۔''

''چل پھر اس میں اتر جا۔'' تلک کشوری نے کہا۔

بھکارن کے روپ میں کوروتی نے آخری بار

میری طرف دیکھا۔ مسکرائی اور قبر کی طرف بڑھ گئی۔ اس وقت میرے دل کی حالت کیا ہو رہی تھی میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ کوروتی آرام سے قبر میں اتر گئی میں زندگی میں پہلی بار کسی زندہ انسان کو دفن ہوتے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی وہ قبر میں لیٹی چاروں طرف سے کوئی ڈھائی فٹ کے قد والے بونے نکل آئے۔ ان کی تعداد کافی تھی۔ وہ قبر کے نزدیک آ کر اس پر مٹی ڈالنے لگے۔ اور کچھ ہی منٹ میں قبر برابر ہوگئی۔

تب تلک کشوری اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے کسی دھات سے بنا ہوا ایک ترشول قبر کے بیچوں بیچ گاڑ دیا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''کام پورا ہوگیا میاں جی۔'' مجھے اس کا انداز عجیب سا لگا تھا۔ میں نے کہا۔

''اسے کوئی نقصان تو نہیں پہنچے گا۔''

''اس کا جواب مہا لکھ ترو تیری سنگھاں شری دیں گے۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا اور میری نظریں اس کے اشارے کی طرف اٹھ گئیں۔ پھر میں نے جو کچھ دیکھا اس نے میری رگوں میں خون جما دیا۔ سامنے کی دیوار میں ایک درندہ نمودار ہوا اور اس سے ..... گوتم بھنسالی باہر نکل آیا۔ رنگین دھوتی میں ملبوس تھا اوپری جسم برہنہ تھا اور اس پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ پیٹھ پر ابھرے گوبڑ پر بارہ سنگھے کی تصویر بنی ہوئی تھی اور بے حد بھیانک نظر آ رہی تھی۔

میرے بدن میں ایک لمحے کے لئے تھرتھری دوڑ گئی۔ میری چھٹی حس نے بتایا کہ کوئی بہت بڑا کام ہوگیا ہے۔ گوتم بھنسالی اور یہاں؟ اس کی آنکھوں میں قہر و غضب کی بجلیاں کوند رہی تھیں۔

تلک کشوری، اور اسھو چرن مودب ہو کر کھڑے ہوگئے۔ بونے بیر بھی ایک قطار میں کھڑے ہوگئے تھے، گوتم بھنسالی آگے بڑھا۔ قبر کے پاس پہنچا اور خاموش کھڑا ہوگیا کچھ دیر کھڑا رہا پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ پھر اس کی آواز ابھری۔

''کوروتی۔ اس سنسار میں جتنا پریم میں نے تجھ سے کیا ہے کبھی کسی نے نہ کیا ہوگا۔ میں اب بھی تجھ سے پریم کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ صدیاں بیت گئیں تو نے ہمیشہ مجھ سے نفرت کی، مگر پریمیکا کی نفرت بھی محبت کی جگہ ہوتی ہے۔ میں جانتا تھا کہ تو مجھ سے نفرت کرتی ہے مگر کسی اور سے پریم بھی نہیں کرتی یہ بات میرے لئے اطمینان والی تھی، لیکن۔''

اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر بولا۔ ''اس پاپی نے میری برسوں کی تپسیا بھنگ کردی۔ ارے میں تو اسے سدا سے چاہتا تھا۔ وہ مجھے نہیں چاہتی اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مگر تو نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا، تو نے اس سے وہ سب کچھ لے لیا ہے جسے میں نے اپنا بھگوان مان رکھا تھا اور میں، میں راکھ ہوگیا۔ ہائے تو نے مجھ سے میرا مان چھین لیا۔ میں نے، میں نے مجبور ہو کر وہ کیا اس کے ساتھ جو، جو.....''

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میری تو آواز ہی بند ہوگئی تھی۔ ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ پھر بولا۔ ''میں نے اس کا شریر بھسم کردیا۔ اس پاپن نے میری امانت کسی اور کو دیدی تھی میں نے اسے خاک میں ملا دیا جبکہ میں نے اس کے سر سے ٹوٹ کر گرے ہوئے ایک بال کو بھی دھرتی سے اٹھا کر کلیجے سے لگا کر رکھا۔ میں نے..... میں نے اسے مٹا دیا۔

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر اس نے گہری سرخ نظروں سے مجھے دیکھا اور بولا۔ اس کا کارن تو ہے۔ صرف تو، اور میں۔ میں تجھے ماروں گا نہیں پاپی ہتھیارے وہ سزا دوں گا تجھے..... کہ، کہ ..... وہ ہنس پڑا۔

میں جانتا تھا کہ وہ پاگل ہو رہا ہے۔ بہت بڑا جال پھیلایا گیا تھا میرے بعد کوروتی کے گرد۔ اور کوروتی اس جال میں پھنس گئی تھی وہ ہنستا رہا۔ پھر بولا۔ ''وہ جو کہتے ہیں سو سنار کی ایک لوہار کی۔ میں نے جیون بھر اس کے وار صرف بچائے اس پر کوئی وار نہیں کیا مگر، وہ میرے پہلے وار میں چت ہوگئی۔ ہائے مگر ..... میں بتاؤں۔ میں نے کیا۔''

وہ رکا پھر بولا۔

"بڑا کام کیا ہے میں نے۔ بڑا کام کیا ہے۔"

میں خاموش نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا اب اس نے اپنی حالت سنبھال لی تھی۔ وہ مسکرانے لگا۔ پھر بولا۔ "ہر ترکیب ناکام ہوئی تھی۔ پتہ نہیں تو نے اس کے من میں کیا پھونک دیا تھا۔ میں نے اس کا شریر راکھ کردیا۔ کیونکہ مجھے اس کا شریر نہیں آتما پیاری ہے جب کچھ باقی نہ رہا تو میں نے یہ کیا۔ میں اس کے سامنے کسی بھی روپ میں آتا وہ مجھے پہچان لیتی کیونکہ ہماری صدیوں کی شناسائی ہے۔ اس لئے میں نے ان دونوں کو تیار کیا۔ یعنی تلک کشوری اور امبھو، اور تم پر جال ڈالا تم دونوں یہاں آگئے۔ آہ... میں اسے کوئی نقصان نہ پہنچاتا۔ صرف تیرا کریا کرم کردیتا مگر اس نے اپنے گیان سے تجھے میرے ساتھیوں سے محفوظ کردیا۔ میں تجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا یہ میری سب سے بڑی مجبوری تھی لیکن میرا بھی ایک گیان ہے۔ میں نے اسے قبر میں دفن کردیا ہے وہ وہاں سے نہیں نکل سکتی جب تک میں اسے نہ نکالوں اسے وہاں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچے گا بلکہ اس کے شریر کو کیڑے مکوڑے ٹھیک کردیں گے۔ وہ اس کے پنجر میں اپنے گھر بنالیں گے اور اس کا شریر بھر جائے گا۔ جب وہ اس قبر سے نکلے گی تو پہلے جیسی ہوگی لیکن تو..." اس نے ایک ہذیانی قہقہہ لگایا۔ "تو اس سے تک مر چکا ہوگا۔ مر چکا ہوگا تو..... پھر دیکھوں گا وہ کسے چاہتی ہے۔ میرے من کا بوجھ ہلکا ہوجائے گا۔"

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا۔ آہ، وہ شیطان کا دوسرا روپ تھا۔ کم بخت نے کیا عمدہ ترکیب سوچی تھی وہ پھر بولا۔

"اب تو اپنے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔ کہ تیرا کیا ہوگا کالیا۔"

"کیا ہوگا میرا..." میں نے مضحکہ خیز انداز میں پوچھا۔ اب میرے دل سے خوف دور ہوچکا تھا۔

"وہ جو کسی کا نہ ہوا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟"

"جئے گا تو، جئے گا، لیکن۔ مر مر کر جئے گا۔"

"وہ کیسے.....؟" میں نے پوچھا۔

"بتادو رے اسے، وہ کیسے...؟" گوتم بھنسالی نے ان ننھے بھیانک بونوں کو اشارہ کرکے کہا۔ اور اچانک وہ اس طرح منتشر ہوئے جیسے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں پتھر مار دیا جائے۔ لیکن کم بخت مجھ پر ٹوٹ پڑے تھے۔ ننھی ننھی لاتیں، گھونسے تھپڑ، بظاہر تو سب کچھ ننھا ننھا تھا لیکن میرے ہوش ٹھکانے آگئے تھے۔ خوب مرمت کی انہوں نے میری اور میرے حواس جواب دینے لگے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اور پھر یہ اندھیرا مستقل ہوگیا۔

آنکھ ہی کھلی تھی نہ جانے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا تھا۔ اس کا احساس بھی بدن کی تحریک سے ہوا تھا۔ کیونکہ ایسا بھیانک اندھیرا تھا کہ شاید اس سے گہری تاریکی کسی نے نہ دیکھی ہوگی۔ بدن کے نیچے پکی زمین تھی جس کا احساس ٹٹول کر کیا۔

کیا کم بختوں نے میری آنکھیں نکال لیں۔ میں نے سوچا اور میرا ہاتھ اپنی آنکھوں پر چلا گیا۔ میں نے انہیں اچھی طرح چیک کیا دونوں آنکھیں اپنی جگہ موجود تھیں۔

پھر یہ تاریکی اپنی حسیات سے یہ اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ اس تاریکی کا راز کیا ہے۔ گزرے ہوئے واقعات بھی یاد آئے۔ انہوں نے کوروتی کو قبر میں دفن کردیا تھا۔ تو کیا مجھے بھی کسی قبر میں دفن کردیا گیا ہے۔؟ دل اچھل کر حلق میں آگیا۔ اتنی گہری تاریکی قبر کی ہی ہوسکتی ہے۔

جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ہاتھوں سے ٹٹول کر پھر اندازہ لگایا کہ کیا یہ قبر ہے۔ لیکن فرش تو پکا تھا۔ اور آس پاس بھی کچھ نہیں تھا۔ قبر اتنی کشادہ کہاں ہوتی ہے۔ نہیں یہ قبر نہیں ہے کوئی تاریک کمرہ۔ لیکن روشنی کیوں نہیں ہے۔

"کوئی ہے۔ یہاں کوئی ہے؟" میں نے آواز لگائی اور یوں لگا جیسے میری آواز دور تک گونجی ہو۔ کافی

بڑی جگہ تھی۔ آنکھیں اس اندھیرے سے مانوس ہوتی گئیں۔ کچھ کچھ نظر آنے لگا۔ ایک لمبی سرنگ نما جگہ تھی۔ جو دور تک چلی گئی تھی۔ اس کی چھت اتنی نیچی تھی کہ کھڑا بھی نہیں ہوا جا سکتا تھا۔

میں نے کچھ توقف کیا۔ کھڑے ہونے کی کوشش کی تو صاف اندازہ ہوگیا کہ کھڑا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ جھکے جھکے چلتا ہوا اس سرنگ کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ وہاں سے پلٹا تو دوسرے سرے تک آیا۔ عجیب وغریب جگہ تھی۔ ناقابل یقین حد تک عجیب ہوسکتا ہے مندر کے نیچے کوئی اور تہہ خانہ ہو۔

لیکن اس کا دروازہ کہاں ہے؟...... آہ کم بخت بھنسالی نے کہا تھا کہ وہ میری زندگی عذاب بنا دے گا۔ اور اس عذاب کا آغاز ہوگیا۔ تہہ خانے میں ایسے دوزن بنے ہوئے تھے جن سے ہوا اندر آسکے۔ رات اور دن کا تعین ہوسکے اس وقت گہری رات تھی میں تھک کر زمین پر ایک جگہ لیٹ گیا۔ اور میرے ذہن پر سوچوں کی یلغار ہوگئی۔ پھر نیند آگئی۔

دوسری صبح جاگا تو سورج کی ایک کرن ایک درزن سے سیدھی میری آنکھ پر پڑ رہی تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ شدید پیاس لگ رہی تھی۔ لیکن پوری سرنگ میں کچھ نہیں تھا کافی دیر تک اس طرح بیٹھا رہا۔ اچانک دور سے ایک کھڑ کھڑ کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو ایک چوہا تھا۔ جو بل میں گھس گیا تھا۔

دوپہر ہوگئی، پھر شام، آہ اندازہ ہوگیا تھا اچھی طرح اندازہ ہوگیا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے۔ اس طرح بھوک پیاس سے جان دینی پڑے گی۔

دوسرا دن، تیسرا دن اب زمین پر لیٹ گیا تھا۔ موت کی آہٹیں آس پاس سے گزرتی محسوس ہورہی تھیں بس انتظار تھا۔ موت کا انتظار تھا۔ نیم غشی کے عالم میں کروٹ بدلی تو ہاتھ کسی شے پر پڑا۔ کوئی برتن تھا۔ وہم ہے، میں نے دل میں سوچا۔ لیکن وہم نہیں تھا برتن ہی تھا، اور برتن میں کوئی سیال شے موجود تھی بس کوئی سیال شے ہے چاہے دوزخ کا پیالہ ہی کیوں نہ ہو۔ اٹھا اور اسے منہ سے لگا لیا۔

کیا مزہ ہے۔ کیا شے ہے۔ کچھ نہیں معلوم تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ ہاتھ پیروں میں شدید سستی ہو رہی ہے۔ پلکیں جھکی آرہی ہیں۔ اور پھر دماغ سو گیا۔ پھر دو دن، رات، یہ گزرے دن رات مجھ سے میری ذہنی قوتیں چھین رہے تھے۔ دماغ سن ہو رہا تھا۔ وقت کا احساس بھی ختم ہوتا جارہا تھا۔ یہ بھی خیال نہیں تھا کہ اب کیا ہوگا، یا آگے کیا ہونے والا ہے۔ کھانے پینے کو بھی کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا گلے سڑے پھل، سبزیاں، پینے کے لئے عجیب عجیب سیال آجاتے تھے۔ کہاں سے آتے تھے کون لاتا تھا اب تو یہ خیال بھی دل سے نکلتا جارہا تھا۔

یوں نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اب مجھے کوئی احساس نہیں تھا۔ سب کچھ بھول گیا تھا کیا کھاتا ہوں کیا پیتا ہوں، کہاں سوتا ہوں، لباس کی کیا کیفیت ہے، دماغ سن ہورہا تھا، سوچنے سمجھنے کی قوتیں تقریباً ختم ہوگئیں تھیں، بس کبھی کبھی خیالات کی ہلکی لکیروں میں اپنا تصور جاگ اٹھتا تھا۔

بہت دن گزر گئے، پھر ایک دن جب آنکھ کھلی تو ماحول بدلا بدلا سا تھا۔ میرے بدن کے نیچے کھردری زمین نہیں تھی بلکہ ایک جانی پہچانی سی نرمی تھی۔ یہ نرمی...... میں نے سوچا، پتہ نہیں کیا ہے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جہاں بیٹھا تھا اور اس پر نرم گدا بچھا ہوا تھا۔ اور...... اور میرے بدن پر...... میرے بدن پر نیا لباس تھا مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی میں اس غار میں نہیں تھا بلکہ یہ ایک کمرہ تھا۔ ہاں اتنا میں ضرور جانتا تھا کہ یہ ایک کمرہ ہے۔ اور میں یہاں موجود ہوں۔

کچھ فاصلے پر ایک کرسی پڑی ہوئی تھی۔ میں بستر سے اٹھ کر اس کرسی پر جا بیٹھا۔

نہ جانے کیوں مجھے ایک بات ضرور محسوس ہورہی تھی، وہ یہ کہ مجھے اس جگہ سے نکال کر یہاں لایا گیا ہے اور یہ کوئی نامانوس جگہ ہے۔

پھر دروازے پر آہٹ ہوئی اور کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ میرے جیسا انسان تھا بس کچھ عجیب سا تھا، اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، قد

چھوٹا سا تھا پیٹھ پر جیسے گٹھڑی سی بندھی ہوئی تھی وہ میرے پاس آ گیا۔
"کیسے ہو عاشق نامراد......؟" اس کی آواز ابھری۔
"اچھا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔
"ویسے عاشق نامراد تو میں ہوں۔ تم نے تو گھر بیٹھے ساری مرادیں پوری کرلیں۔ اب بھی یاد آتی ہے۔"
"کون؟" میں غیر اختیاری طور پر بول رہا تھا۔
اب جبکہ اس نے مجھ سے باقاعدہ باتیں شروع کی تھیں تو مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے۔
"کوروتی کی بات کررہا ہوں۔"
"کوروتی......؟" میں نہ سمجھنے والے لہجے میں بولا۔
"بھول گیا اسے۔" اجنبی کبڑے نے کہا۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔
"میں کسی کوروتی کو نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔
"بھول مجھ سے ہوئی تھی۔" وہ بولا۔ نہ جانے کیوں اب مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ یہ منحوس شکل کا کبڑا بکواس کئے جارہا ہے۔ اس کی بکواس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ میرا سر بھی چکرا رہا تھا اور شاید مجھے بھوک لگ رہی تھی۔
"میں بھوکا ہوں۔" میں نے کہا۔
"چل ٹھیک ہے۔ پہلے تیری پیٹ پوجا کرادی جائے اس کے بعد تجھ سے باتیں کریں گے۔ اب مزہ آئے گا تجھ سے باتیں کرنے کا۔ اور سن یہاں سے باہر جانے کی کوشش مت کرنا مزید جو کچھ ہوگا اس کا ذمہ دار تو خود ہوگا۔"
کبڑا کمرے سے باہر نکل گیا۔
میری سوچنے سمجھنے کی قوتیں میرا ساتھ نہیں دے رہی تھیں لیکن میں سوچنا چاہتا تھا۔ میں کون ہوں کیا ہوا ہے میرے ساتھ؟ وہ گندی جگہ مجھے یاد تھی جہاں میں رہتا تھا، وہ تاریک سی جگہ جہاں بدبو پھیلی ہوئی تھی، یہاں ایسا نہیں ہے۔ تاریکی بھی نہیں ہے، بدبو بھی نہیں ہے، اور یہ سب اچھا ہے۔ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔
کیا میں اس جگہ کو پہلے سے جانتا ہوں؟ کیا میں پہلے بھی کسی ایسی ہی جگہ رہتا تھا؟ مگر کہاں اور یہ بدشکل انسان؟ اس سے بلاوجہ نفرت محسوس ہوتی تھی یہ کون ہے۔ اور یہ ایک نام لے رہا تھا۔ وہ کون ہے۔ کیا نام تھا......؟ ہاں کوروتی ضرور کہیں یہ نام سنا ہے۔
ساری باتیں اپنی جگہ، کوئی اہم بات یاد نہیں آرہی تھی لیکن ایک احساس ضرور تھا کچھ تھا کچھ ضرور تھا جو میرے دماغ میں کھو گیا ہے۔
دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ وہ میرے لئے کھانا لائے تھے۔ آیا کیا عمدہ کھانا ہے۔ کیسی اچھی خوشبو اٹھ رہی ہے۔ پیٹ بھر گیا اور آنکھوں میں نیند اترنے لگی۔ میں مسہری پر جاکر سوگیا۔ جاگا تو پھر وہی اندھیرا تھا۔ لیکن یہ اندھیرا اس غار کا نہیں تھا۔ بلکہ رات کا وقت تھا اور میں اسی نرم گدے والے بستر پر سورہا تھا۔
میں نے سست انداز میں نرم تکیہ بازوؤں میں لیا اور پھر سوگیا۔ پھر نہ جانے کب جاگا تھا۔ یہ سب مجھے برا نہیں لگ رہا تھا۔ نہ ہی دل میں کوئی احساس تھا کہ کہیں جاؤں۔ یہاں سب ٹھیک تھا۔ اس وقت خوب تیز روشنی تھی جب وہی کبڑا منحوس میرے کمرے میں آ گیا۔ مجھے بیشک اس کی شکل سے چڑ ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت وہی میرے لئے سب سے مہربان شخص تھا وہی میری ضرورتیں پوری کررہا تھا۔
"کیسے ہو شیام سندر جی۔" اس نے مسکرا کر کہا۔
"مجھ سے کہہ رہے ہو۔" میں نے کہا۔
"ہاں۔ یہاں اور کون ہے۔"
"میرا نام شیام سندر ہے؟"
"ناموں سے کیا ہوتا ہے۔ چلو اپنا نام خود بتا دو۔"
"مجھے نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔
"یہ تو اچھی بات ہے۔" وہ بولا۔
"کیا مطلب؟"
"کہ تمہیں اپنا نام نہیں معلوم۔"
"مجھے میرا نام بتاؤ۔" میں نے غصے سے کہا۔

"سندر تو تم ہو، میں نے شام لگا دیا ہے۔ تمہارا نام شیام سندر ہی ہے۔"

"یہ کون سی جگہ ہے۔" میں نے پوچھا اور وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا پھر گردن ہلا کر بولا۔

"اس کا مطلب ہے تم سوچ سکتے ہو۔ اور کیا کیا سوچ سکتے ہو، تمہیں کوروتی یاد ہے؟"

"نہیں۔ یہ نام تم پہلے بھی لے چکے ہو۔"

"ہائے...... ایسا پہلے ہو جاتا۔ وہ اپسرا ہے سنسار کا سارا حسن اس کے اندر رہتا ہے" وہ رکا پھر بولا۔ "رہتا تھا" اس کے لہجے میں درد تھا۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"سمجھاتا ہوں۔ سمجھانے ہی آیا ہوں۔ وہ اپسرا تھی راجہ اندر کی سبھا میں بھی اس سے سندر اپسرا نہیں ہوگی کوئی۔ میں اس سے پریم کرتا تھا۔ بھگوان تھی وہ میری۔ مگر اسے اپنی سندرتا پر بہت گھمنڈ تھا۔ اور میں، بدصورت تھا پھر اسے امرت جل مل گیا وہ، اسے پی کر امر ہوگئی مگر...... مجھ سے بھول ہوئی۔ بہت بڑی بھول۔"

وہ خاموش ہو کر رکو میں ڈوب گیا۔ مجھے یہ کہانی اچھی لگی تھی۔ میں کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ پھر میں نے کہا۔

"آگے کہو۔"

"ہاں۔ مجھ سے بھول ہوگئی۔"

"کیسی بھول؟"

"بچا کھچا امرت جل میں نے پی لیا۔"

"امرت جل کیا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سنسار کی سب سے بڑی چیز، بھگوان نے جیون، مرن رکھا، جیون اس لئے دیا کہ منش بھگوان کے بنائے ہوئے سنسار سے مزے لے، اس میں رہ کر جیون کے سکھ اٹھائے اور پھر دوسروں کے لئے راستہ چھوڑ دے۔ بھگوان کے سنسار کو چھوڑ کر نرکھ، یا سورگ میں چلا جائے۔ مگر کچھ "جیون کے موہی" (زندگی کے لالچی) سنسار کی جان نہیں چھوڑنا چاہتے۔ وہ موت سے ڈرتے ہیں اور جیون سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ مگر یہ بھگوان کے اصولوں سے اس کے وچاروں سے منہ پھیرنے والی بات ہے۔ اس نے ترازو کھڑی کر دی۔ سچ بولو، پورا تولو اگر اس کے وچاروں سے منہ پھیرو گے تو منہ کی کھاؤ گے۔ جیون تو دیا گیا ہی مرنے کے لئے ہے۔ بھگوان نے امرت جل بھی بتا دیا کہ پیو گے تو تمہیں موت نہیں آئے گی۔ پرنتو، لمبا جیون سنسار کی سب سے بری چیز ہے۔ ہائے کوئی موت کے مزے کو جانے۔

اس کی آنکھیں نشیلی ہوگئیں جیسے وہ موت کی شراب پی رہا ہو۔

دوسری طرف اس کی باتیں کافی حد تک میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔

"کیا نام ہے تمہارا۔"

"ایں......؟" وہ جیسے سوتے سے جاگ گیا۔ پھر بولا "دھت تیرے کی، سارے سپنے توڑ دیئے۔"

"تم سپنا دیکھ رہے تھے۔"

"ہاں رے۔ بڑا ہی سندر سپنا۔" پتہ ہے کیا دیکھ رہا تھا میں؟

"تمہارے سپنوں کا مجھے کیا پتہ۔" میں نے کہا۔ اس سے بات کر کے مجھے مزہ آ رہا تھا۔

"میں دیکھ رہا تھا کہ میرا دیہانت ہوگیا ہے۔"

"دیہانت کیا......؟" میں نے کہا۔

"ابے میں دیکھ رہا تھا کہ میں مر گیا ہوں۔" اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"تو اردو میں مرو نا۔" میں بولا۔

"اردو کا بچہ۔" وہ بڑبڑایا۔

"تو تم نے دیکھا کہ تم مر گئے ہو۔"

"ہاں اور میری ارتھی رکھی ہے۔ میرے کریا کرم کی تیاری ہو رہی ہے۔ مجھ پر سیندور اور گلاب کا عرق چھڑکا جا رہا ہے۔ لوگ رو رہے ہیں اور میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہہ رہے ہیں۔"

"یعنی تم اپنی موت پر تم خوشی سے رو رہے ہو؟"

"تو اور کیا۔ مرنے کے کتنے مزے ہوتے ہیں

تو کیا بنے پاپی۔'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں نے تمہارا نام پوچھا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ حقیقت ہے کہ میں سب کچھ بھول گیا تھا۔ مجھے اس کا نام بھی یاد نہیں رہا تھا۔ ایک طویل عرصہ میں نے خود کو بھولے ہوئے گزارا تھا لیکن بعد میں جب میری یادداشتیں واپس آئیں تو مجھے گزرے ہوئے یہ لمحے بھی من وعن یاد آ گئے جو میں نے اس لمحے میں گزارے تھے۔ اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''گوتم بھنسالی ہے میرا نام۔''

''اوہ ٹیڑھا نام ہے۔'' میں نے کہا۔

''سب بھول گیا سسرے۔ اچھا ہوا۔ اب مزے کر، میری محبوبہ قبضے میں کرلی تھی۔ مجھے جو کرنا پڑا ہے۔ تیری وجہ سے کرنا پڑا ہے۔ ورنہ اور کچھ نہیں تو... تو... وہ کسی اور کی تو نہیں تھی۔''

''کون.....؟'' میں نے پوچھا۔

''کوروتی، کوروتی، کوروتی۔''

''میں کسی کوروتی کو نہیں جانتا، میں نے برا سامنہ بنا کر کہا۔'' وہ سوچتا رہا، پھر بولا۔

''تو میں بتا رہا تھا کہ بچا کھچا امرت جل میں پی گیا۔ ہائے کتنا اچھا ہوتا، میں اسے پریم تو کرتا تھا مگر اسے صدیوں جیتا نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ بھی مر جاتی میں بھی مر جاتا، پریم کہانی ختم ہو جاتی۔ مگر دونوں کشٹ میں آ گئے۔ میں اس پر جان دیتا تھا اور وہ مجھ سے نفرت کرتی تھی، وہ بھی صدیوں کا سفر کرتی رہی میں بھی اس کے ساتھ چلتا رہا۔ وہ بہت چالاک تھی، اس نے بڑے بڑے رشی، منیوں سے گیان سیکھے، گیان چھینے اور انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ میں نے بھی کچھ گیان سیکھے مگر اس کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ پھر ہم تیرے ہاتھ لگ گئے اور برا سمے آ گیا۔

''میرے ہاتھ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''جانے دے جانے دے۔ شیام سندر، آخر تیرا کھیل تو ہو گیا مگر تو پوری کہانی سن۔ وہ پتہ نہیں کیسے تیرے پریم جال میں پھنس گئی اور... اور... وہ ہو گیا جو جیون بھر نہیں ہوا تھا۔ ہائے جو میرا تھا وہ تیرا ہو گیا ہائے ہائے، تو نے مجھے مار دیا پاپی، جب تک برداشت ہوا کرتا رہا۔ پھر..... پھر.....!'' اچانک اس کا سانس میری طرح پھولنے لگا۔

''تم پھر رک گئے۔''

''بتا رہا ہوں ہتھیارے۔ بتا رہا ہوں۔ میں نے تیرا روپ دھارن کر کے اس کا شریر گلا دیا۔ اس سے اس کی سندرتا چھین لی جو میرا تھا اس پر تیرا قبضہ ہو گیا تھا۔ اب نہ کچھ تیرا رہا نہ میرا، وہ ڈھانچہ بن گئی۔ مگر اس نے تیرا پیچھا چھوڑا نہ تو نے اس کا۔ وہ جس میں نے لاکھوں سال پوجا کی اسے میں نے چڑیل بنا دیا۔ چڑیل بنا دیا میں نے۔ پر اس نے تجھے حاصل کرنے کا کام جاری رکھا اور سندر ناریوں کی جان لے کر ان کے ذریعہ تجھے خوش کرنے لگی تو خود سوچ مجھ پر کیا گزری ہوگی۔ اس نے تجھے میرے ہاتھوں سے بچانے کے لئے اپنے گیان سے کام لیا اور اک ایسی چال چلی کہ میں تجھے نہیں مار سکتا ورنہ اب تک تو تیری ہڈیاں بھی بھسم ہو گئی ہوتیں اور پھر میرا صبر ختم ہو گیا۔ میرے من کی آگ نے مجھے پھونک دیا اور میں نے وہ قدم اٹھا لیا۔

اس کی آواز لرز گئی۔

''کون سا قدم۔؟'' میں سوال کئے بغیر نہیں رہ سکا۔

''بتا تو چکا ہوں تجھے ہتھیارے۔ میں نے اسے گلا کر ڈھانچہ بنا دیا۔ اب وہ تیری رہی نہ میری مگر مجھے لگتا ہے میں نے اب ٹھیک کام کر دیا ہے۔''

''وہ کیا.....؟''

''میں نے اسے قبر میں دفن کر دیا ہے اور تجھے۔ تجھے میں نے مہان بے کال کے حوالے کر دیا ہے۔ اب تو بے کالی بن کر رہے گا۔ گیان گردھاری کا داسی کال منی کالی دیوی کا بھرمنگی، سادھومنش، میامنی کے چرنوں کی دھول پھانک لے گا تو لوگ تجھے سادھومنت سمجھ کر تیری سیوا کریں گے، تجھے روکھی سوکھی کہیں نہ کہیں سے مل جائے گی..... پھر..... پھر تو مر جائے گا اور..... اور ہم جیتے رہیں گے۔ میں بھی..... اور کوروتی بھی، میں

اسے قبر سے نکال لوں گا۔ اور تو میری مان لے ایک دن وہ پگھل جائے گی۔ وہ سوچے گی کہ گوتم بھنسالی بدصورت ہے تو کیا مجھ سے لاکھوں سال سے پریم تو کر رہا ہے۔ اور...... اور...... وہ مجھے سویکار کر لے گی۔“

اس کے چہرے پر پھر عجیب سے تاثرات پھیل گئے۔

میری ذہنی حالت جوں کی توں تھی۔ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ ذہن پر کچھ مٹے مٹے سے نقوش تو ضرور تھے۔ یہ احساس تھا کہ میں شیام سندر نہیں کچھ اور ہوں۔ لیکن کچھ اور کیا ہوں، یہ یاد نہیں تھا۔

”جا اور دے دعا دے کہ اس نے تجھے میرے ہاتھوں سے بچا دیا ہے۔ ورنہ......“ وہ کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پھر مجھے اس کی فضول باتیں یاد آنے لگیں۔ پتہ نہیں کیا کیا بکواس کر رہا تھا۔

”آپ سوچ رہے ہوں گے کہ یادداشت گم ہونے کے باوجود یہ باتیں مجھے کیسے یاد رہ گئیں اور میں ان کے بارے میں کیسے لکھ رہا ہوں تو میں اس کے بارے میں آپ کو پوری تفصیل بتاؤں گا پہلے سے بتانا قبل از وقت ہوگا۔

غرض یہ کہ وہ شخص جس نے مجھے اپنا نام گوتم بھنسالی اور مجھے میرا نام شیام سندر بتایا تھا وہ گیا، قبول اس کے کہ وہ دونوں جو مجھے اس مندر میں ملے تھے اس کے ہرکارے تھے جنہوں نے اس کا کام اس لئے کیا تھا کہ وہ عورت کوردلی گوتم کو آسانی سے پہچان گئی اور پھر اسے قبر میں اتارنا ممکن نہ ہوتا۔

سب کچھ بھاڑ میں جائے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اب میں کیا کروں۔ پتہ نہیں یہ کون سی عمارت ہے کہاں واقع ہے میں اس عمارت میں کسی کے قبضے میں ہوں۔ یا آزاد ہوں۔ اور کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ جب اور کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکی تو جا کر بستر پر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

دماغ کسی بھی قوت کی میراث نہیں ہوتا۔ اس پہ صرف مندر کی قوت حاوی ہوتی ہے۔ وہ آزاد ہوتا ہے۔ باقی سب انسان کی غلط کاریاں ہوتی ہیں جو اس سے محبت

چھین لیتی ہیں۔

میں سو گیا، اللہ کی عطا کی ہوئی ساری قوتیں میرے ساتھ تھیں جن میں نیند بھی ہے۔ کیسی مزے کی بات ہے شیطان انسان کو بہکا تو سکتا ہے اس سے گناہ تو کرا سکتا ہے لیکن اس پورے وجود کے ساتھ جو اللہ کی عطا ہے وہ اس سے نیند نہیں چھین سکتا بھوک نہیں چھین سکتا یہاں وہ بے بس ہے۔

خوب جی بھر کر سویا۔ پھر آنکھ کھل گئی۔ وہی کمرہ تھا، وہی جگہ تھی۔ لیکن رات ہو چکی تھی ماحول پر اندھیرا طاری تھا۔ پھر ایک بھاری آواز سنائی دی۔

”تم جاگ گئے؟“

سوال مجھ سے ہی تھا۔ میرے سوا یہاں کون تھا۔ میں نے چونک کر اس طرف دیکھا جدھر سے آواز آئی تھی۔ [illegible] دیوداسی جیسی ایک عورت تھی جو [illegible] لباس میں ملبوس تھی۔ وہی مجھ سے مخاطب تھی۔ اس نے پھر سوال کیا۔

”تم جاگ گئے؟“

”ہاں...... میں جاگ رہا ہوں۔“

”اٹھو...... میرے ساتھ چلو۔“

”کہاں......؟“

”دھونی کنڈ میں۔ سوامی گیان گردھارن کے دوار۔ تاکہ تم ان کے چرنوں میں جا کر پوتر استھان حاصل کر لو۔“

میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ لیکن ان کے درمیان تھا۔ اور ایک بڑی اذیت ناک جگہ سے نکلا تھا اور دوبارہ اس جگہ نہیں جانا چاہتا تھا چنانچہ ان کے ساتھ تعاون ضروری تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

لباس وغیرہ تو انہوں نے دوسرا پہنا ہی دیا تھا۔ اور میں صاف ستھرا ہی تھا چنانچہ میں اس عورت کے ساتھ چل پڑا۔ وہ مجھے لئے ہوئے ایک بڑے سے ہال میں داخل ہو گئی۔ اس ہال کے بارے میں کیا بتاؤں تاحد نظر پھیلا ہوا تھا۔ اور اس میں بے شمار سادھو سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کی شکلیں نہیں نظر آ رہی تھیں لیکن ان کی مدھم

آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہال کے درمیان ایک بہت بڑا بت نظر آرہا تھا جس کے پیروں کے پاس ایک چٹان تھی اور اس چٹان پر ایک لمبے چوڑے بدن کا سادھو بیٹھا تھا جس نے کالے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا اور اس کی گردن سے ایک کالا سانپ لپٹا ہوا تھا جس کا چوڑا پھن کھلا ہوا تھا اور یہ پھن اس کے سر پر پھیلا ہوا تھا۔

یہ نقلی سانپ بھی ہوسکتا تھا لیکن اس کا پھن بھی کبھی ہلتا تھا اور گردن سے لپٹا بدن جگہیں بدل رہا تھا جس کا مطلب تھا کہ وہ زندہ ہے۔

پھر اچانک نیم تاریک ماحول روشن ہونے لگا۔ یہ روشنی اس دیوہیکل مجسمے کی آنکھوں سے نکل رہی تھی۔ ہال اتنا روشن ہوگیا کہ سب کچھ صاف نظر آنے لگا۔ میں ایک کونے میں کھڑا ہوا تھا کہ ایک آواز میرے کانوں میں آئی۔

''شیام سندر۔''

میں نے یہ آواز سنی، لیکن ابھی میں نے اپنا نام پوری طرح یاد نہیں کیا تھا اس لئے میں خاموش کھڑا رہا۔ تبھی آواز دوبارہ ابھری۔ اس نے مجھے شیام سندر کے نام سے ہی مخاطب کیا تھا۔ اسی وقت میرے ساتھ کھڑی اسی عورت نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر مجھے آگے دھکیلتے ہوئے کہا۔

''تمہیں آواز دی جارہی ہے۔''

میں چند قدم آگے بڑھ کر مجسمے کے سامنے پہنچ گیا۔ ''تبھی مجسمے کے قدموں میں بیٹھے پجاری کی آواز ابھری۔''

''مہامنی، تیرا تیاداس تیرے چرنوں میں آیا ہے۔ اس کی سیوا سویکار کر۔'' پھر وہ میری طرف رخ کرکے بولا۔

''چل شیام سندر، مہامنی کو سجدہ کر۔'' یہ تجھے آشیرباد دے گا۔

''کیا کروں۔'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک کھڑا ہے، سجدے میں گر جا مہامنی کے چرنوں میں۔'' اس نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ اسی وقت نہ جانے کیا ہوا ایک مدھم سی آواز میرے کانوں میں اذان کی آواز سنائی دی اور میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔

''تو نے سنا نہیں شیام سندر۔ سجدہ کر مہامنی کے سامنے۔''

''اللہ اکبر..... اللہ اکبر۔..'' آواز پھر میرے کانوں میں گونجی۔ یہ آواز مولوی قدرت اللہ کی تھی جو ہمارے محلے کی مسجد کے پیش امام تھے اور جب بھی کسی کے ہاں بیٹے یا بیٹی کی ولادت ہوتی تھی مولوی قدرت اللہ ہی اس کے کان میں اذان دیتے تھے۔ بڑے ہوکر میں نے اکثر سوچا تھا کہ پیدا ہونے والا بچہ بھلا اس آواز کو کیا سنتا ہوگا وہ تو دنیا سے ناواقف ہوتا ہے۔ لیکن آج وہ آواز میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔ وہ آواز مجھے بتارہی تھی کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اسی کو سجدہ جائز ہے۔ ایسے بت، اور پتھر کے ٹکڑے لاکھوں ہیں انہیں سجدہ کرنا حماقت ہے، گناہ ہے، شرک ہے۔

بہت سی آوازیں ابھریں۔

''کیا یہ مہامنی کو سجدہ نہیں کرے گا۔ کیا یہ مہامنی کا اپمان کرے گا۔ یہ ادھرمی ہے، یہ ہمارا دھرم سویکار نہیں کررہا مارو اسے جیتا جلادو۔ مارو پاپی کو، اس نے گیان گردھاری کا اپمان کیا ہے اس نے.....''

''خاموش۔'' بادلوں میں جیسی گرج ابھری۔ اور آوازیں بند ہوگئیں۔ ''یہ دوسرے دھرم کا ہے۔ مہامنی کا دھرم سویکار کرنے میں اسے سمے لگے گا۔ ہم کون ہوتے ہیں اسے سزا دینے والے جس کا مجرم ہے وہ جانے۔''

یہ آواز مجسمے کے پیروں میں بیٹھے بھگت کی تھی جسے یہ لوگ نہ جانے کیسے کیسے ناموں سے مخاطب کررہے تھے۔ ''تم لوگ اپنی بھگتی کرو، یہ ٹھیک ہوجائے گا اور ایک دن تمہارے ساتھ تمہاری بھگتی میں شامل ہوگا۔'' بھگت نے کہا۔ پھر بولا۔'' جاؤ رے۔ اسے اس کے استھان پر پہنچادو۔'' فوراً ہی چار پانچ لمبے چوڑے سادھو اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے میرے بازو پکڑ لئے۔ وہ مجھے تقریباً گھسیٹتے ہوئے اس جگہ سے باہر نکال لائے۔ یہ مندر نما جگہ بے حد وسیع تھی اور تو اور، بڑے بڑے ہال اور راہداریاں تھیں جن کا ماحول بے حد پُراسرار اور بھیانک

تھا پھر وہ ایک جگہ رک کے ایک دروازہ کھولا جس کے دوسری طرف سیڑھیاں تھیں۔ ان سیڑھیوں کو عبور کرکے مجھے ایک تہہ خانے میں پہنچادیا گیا۔

یہ تہہ خانہ بھی بہت وسیع تھا۔ لیکن اندر قدم رکھ کر خوف کی ایک لہر میرے پورے بدن کو لرزا گئی۔ یہاں دیواروں کے ساتھ اور لاتعداد انسانی جسموں کے سوکھے ہوئے پنجر کھڑے ہوئے تھے۔ دوسری خوف ناک بات یہ تھی کہ ان کی کھوپڑیوں میں چراغ روشن تھے جن کی روشنیاں ان کی آنکھوں کے گڑھوں سے باہر آرہی تھیں۔

"تم یہاں آرام کرو۔" مجھے لانے والوں میں سے ایک نے کہا۔

"سنو.. میری بات سنو۔"

"بولو......"

"تم مجھے یہاں سے کہیں اور نہیں لے جاسکتے۔"

"نہیں۔"

"لیکن یہ......" میں نے کہنا چاہا لیکن جو شخص مجھ سے بات کررہا تھا اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

"تم نے مہامنی کو سجدہ نہ کرکے اپنے لئے برا وقت بلالیا ہے۔ یہ سب جو اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں تم جیسے ہی ہیں۔ آرام کرو۔ اور سوچو۔"

وہ چلے گئے اور میں دہشت زدہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آخرکار میں ایک جگہ زمین پر لیٹ گیا۔ اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس وقت ایک بات کا مجھے خصوصی احساس ہوا۔ حالات کتنے ہی بدلے ہوں وقت کیسا ہی خراب کیوں نہ آگیا ہو قدرت نے انسان کو کچھ سہولتیں دی ہیں جنہیں کوئی نہیں چھین سکتا اگر قدرت نہ چاہے اور ان میں سے ایک نیند ہے۔ ایک زندہ انسان بیدار انسان ڈھانچوں کے ساتھ تنہا ہو اور پھر نیند آجائے۔ لیکن میں زمین پر لیٹ کر سوگیا۔

دوسری صبح بھی بس نیند پوری ہوجانے پر جاگا تھا۔ ورنہ اس تہہ خانے میں روشنی کی طرف سے نہیں آتی تھی۔ اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف ڈھانچوں کی فوج نظر آرہی تھی۔ سب کے سب اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ میں انہیں دیکھتا رہا۔

بہت دیر گزر گئی۔ پھر روشنی کی ایک رمق تہہ خانے میں ابھری۔ اور میں چونک کر ادھر دیکھنے لگا۔ کچھ لوگ تہہ خانے کی سیڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ جب وہ نیچے آئے تو میں نے انہیں دیکھا۔ ان میں سے ایک وہی بے کال تھا جسے میں نے مجسمے کی گود میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ آگے تھا اور باقی لوگ جو سادھوؤں کے لباس میں اس کے پیچھے تھے۔

"کھڑا ہوجا......" وہ میرے قریب آکر بولا اور میں کھڑا ہوگیا۔ "تونے مہامنی کے چرنوں میں سر نہیں جھکایا تھا۔" وہ بولا۔

"ہاں"

"کیوں......؟"

"میں نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔

"یہ جانتا ہے تو کون ہے؟"

"نہیں......!" میں نے جھٹکے دار آواز میں جواب دیا۔

"ہمارے لئے تو کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ لیکن گیان گروھاری تجھ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتے ہیں اس لئے تیری اتنی خبر گیری کی جارہی ہے۔ تجھے پتہ ہے کہ تجھے گوتم بھنسالی ہمارے پاس لایا ہے۔"

"میرا دماغ خراب مت کرو، مجھے کچھ یاد نہیں ہے کہ گوتم بھنسالی کون ہے؟" میں نے غصے سے کہا۔

بے کال نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا پھر بولا۔ "ابھی کچا ہے پکا ہونے میں سمے لگے گا اس کے حال پر چھوڑ دو۔"

"اس کا کیا کریں؟"

"یہی جگہ اس کے لئے ٹھیک ہے۔" بے کال نے کسی قدر غصے سے کہا۔ پھر وہ سب باہر نکل گئے۔ میں نے ایک سرد آہ بھری اور ایک دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ میرے دل میں بہت سے خیالات آرہے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ مجھے بھوک پیاس لگ رہی تھی۔ بدن نڈھال ہورہا تھا۔ یہ دن اور پھر رات بھی گزر گئی۔ اور میرے اندر دہشت بیدار ہونے لگی۔ کیا میں موت کا انتظار کررہا ہوں۔ مگر کیوں۔ کوئی جدوجہد ضروری ہے۔ یادداشت الگ ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ کون ہوں.... کیا ہوں.... یہاں کیوں ہوں۔ سب سے زیادہ اذیت ناک بات یہ تھی کہ مجھے اپنے بارے میں کوئی پتہ نہیں تھا۔

میری نظر ان ڈھانچوں کی طرف اٹھ گئی۔ وہ اسی طرح کھڑے ہوئے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد میرا ڈھانچہ بھی انہیں کے درمیان کھڑا ہوگا۔ میرے ساتھ ایک اور اذیت ناک عمل یہ تھا کہ میں ہوش مند تھا ایک ایک چیز کا احساس تھا بس یہ یاد نہیں تھا کہ میں کون ہوں۔ میرا ماضی کیا ہے، وہ کم بخت گوتم جھنسالی کون تھا جس نے مجھے اس اذیت میں پھنسا گیا تھا۔ اور جس عورت کا وہ نام لے رہا تھا وہ کون تھی، میں تو کسی کوروتی کو نہیں جانتا تھا۔ وہ ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہوگیا تھا۔ لیکن اب میں کیا کروں۔

یہ دن بھی گزر گیا۔ تیسری صبح دو افراد میرے لئے کھانا لائے۔ کھانے میں کیا تھا، میں نے غور بھی نہیں کیا بس کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ خوب ڈٹ کر کھایا اور پھر کچھ دیر کے بعد مجھ پر غنودگی طاری ہوگئی۔ کھانے میں کوئی نشہ آور شے بھی شامل تھی۔ پھر نہ جانے کب آنکھ کھلی۔ بدن میں توانائی کا احساس ہورہا تھا۔ لیکن کچھ ہی لمحوں میں اندازہ ہوگیا کہ جگہ پھر بدل گئی ہے۔ میں پھر کسی بہتر جگہ ہوں۔ یہ تو خاص جدید کمرہ تھا۔ عمدہ بستر، عمدہ فرنیچر دیواروں پر حسین تصاویر آویزاں۔ لیکن یہ سب نامانوس تصویریں تھیں۔

پھر دو لڑکیاں میرے لئے کھانے پینے کا سامان لائیں۔ ''مہاراج نندیتا نے کہا ہے کہ آپ فارغ ہوجائیں تب وہ آپ سے ملیں گے۔''

''مہاراج نندیتا۔'' میں نے کہا۔

''جی۔''

''یہ کون ہیں؟'' میں نے پوچھا تو وہ دونوں ہنس پڑی۔

''مہاراج ہیں اور کون ہیں۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ میں نے کچھ نہ کہا۔ اور کھانا اپنے سامنے کرلیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے دیر نہیں گزری تھی کہ وہی دونوں لڑکیاں پھر اندر داخل ہوئیں لیکن اس وقت وہ اکیلی نہیں تھیں ان کے پیچھے گیروا رنگ کے لباس میں وہی منحوس جے کال تھا، میں نے اسے ایک لمحے میں پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر وہی نحوست طاری تھی۔

''جے گیان گردھاری۔'' اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''تمہیں اپنا نام یاد ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''شیام سندر ہے تمہارا نام۔''

''میرا یہ نام نہیں ہے۔ لیکن مجھے اپنا اصل نام بھی یاد نہیں ہے۔''

''تمہیں تمہارا اصل نام بھی یاد آجائے گا۔ اس سے ہم تمہیں سندر ہی کہیں گے۔ سندر، گیان گردھاری کسی منش کا نام نہیں ہے۔ ایک تحریک ہے۔ ایک منصوبہ ہے اور اس سے سنسار کے بے شمار ملکوں میں اس تحریک پر کام ہورہا ہے۔ میں تمہیں مختصر طور پر اس تحریک کے بارے میں بتاتا ہوں۔ تم دیکھو سنسار میں جو کام منش کو سکون اور اس کے جیون کو خوشیاں دے سکتے ہیں وہ کہاں ہورہے ہیں۔ دو ٹانگوں دو ہاتھوں والا یہ درندہ جسے انسان کہتے ہیں کیا کررہا ہے کون کس کا ہمدرد ہے کسی ایک کا نام بتاؤ گے۔ ہر جگہ وہ ہورہا ہے جس سے انسان تیزی سے تباہی کی طرف جارہا ہے ہم نے ایک پریوار بنایا ہے گیان گردھاری پریوار۔ ہم نیکوں کے خلاف جنگ کررہے ہیں۔ ہم سنسار سے ان بچے کچے نیکوکاروں کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو بلاوجہ نیکوں کی لکیر پیٹ رہے ہیں۔ تم بس مجھے ایسے نام بتادو جو پوری سچائی سے اپنے کام کررہے ہوں۔ کسی ویش، کسی ملک اور اس میں بسنے والوں کا نام لے لو، کہیں سائنس کے نام پر کام کیا جارہا ہے، بیماروں کے حوالے سے اسپتال کھولے

جارہے ہیں، ان کی پبلسٹی ہورہی ہے کہ یہ اسپتال ان غریبوں کے لئے جو اپنا علاج نہیں کرا سکتے۔ ذرا ان اسپتالوں میں جاکر تو دیکھو ان بیمار غریبوں کے ساتھ کتوں سے بدتر سلوک ہوتا ہے۔ اور علاج کے نام پر ٹرخا دیا جاتا ہے۔ جبکہ اس کے کروڑوں کی دولت امداد کے طور پر حاصل کی جاتی ہے۔ گلوکاروں، اداکاروں، کھلاڑیوں نے اور کسی بھی شہرت یافتہ فرد نے یہ منافع بخش کاروبار شروع کردیا ہے۔ یہ تو چھوٹے پیمانے کی بات ہے بڑے پیمانے پر میں نے ان سائنسی تجربات کی بات کی ہے جو بڑے بڑے ممالک میں ہورہے ہیں۔ ایٹمی ہتھیار بنائے جارہے ہیں۔ چاند ستارے اور سیارے تسخیر کئے جارہے ہیں کیمیاوی ہتھیار بنا کر ان کے تجربے کئے جارہے ہیں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو لقمہ اجل بنا کر یہ تجربہ کیا جارہا ہے کہ انہیں بیمار کرکے شفا کیسے دی جاسکتی ہے۔ تندرست انسانی زندگی کی تندرستی کو کیسے گھن لگایا جاسکتا ہے۔ یہ ہورہا ہے شیام سندر تمہارے سنسار میں، لاکھوں تنظیمیں ہیں جو انسانیت کی بھلائی کے نام پر کام کررہی ہیں۔ ہاہاہا.... انسانیت کی بھلائی کے لئے۔ ہاہاہا۔''

وہ قہقہے لگانے لگا پھر بولا۔

''وہ نیکوکاروں کی انجمنیں ہیں وہ نیک لوگ ہیں جن کے پاس دین دھرم کی ٹھیکیداری ہے۔ ذرا ان کے اندر اتر کر دیکھو۔ تمہیں ایک انوکھا سنسار نظر آئے گا۔ اور ہم گیان گردھاری پریوار ہم برے لوگ ہیں۔ جو برائی کے نام پر جمع ہوئے ہیں اور ان اچھوں کو برا بنا رہے ہیں جو سارے سنسار کو اچھا کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔''

میں سن رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔ خاموش تھا۔ وہ پھر بولا۔

''تمہیں بھی اس پریوار کا ایک رکن بنایا گیا ہے۔ تمہیں بہت سے کام دیئے جائیں گے اور تمہیں وہ انجام دینے ہوں گے۔ تم پر ایک تجربہ کیا جارہا ہے۔ جانتے ہو کیا تجربہ ہے۔''

''نہیں۔'' میرے منہ سے نکلا۔

''تم کوئی دھرم داس نہیں ہو، ایک عام آدمی ہو۔ لیکن جب اتنی تکلیفوں کے بعد، جس سے نجات پانے کے لئے منش سب کچھ کرنے پر تیار ہوجاتا ہے۔ تم نے مہامنی کو سجدہ نہیں کیا تھا بار بار کہنے پر بھی سجدہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمارے لئے حیرانی کی بات تھی۔''

''میں بتاؤں کیوں؟'' میرے منہ سے آواز نکلی۔ ''بڑی سے بڑی سے بڑی قسم کھا کر کہتا ہوں یہ آواز میری نہیں تھی۔ یہ الفاظ میرے ساختہ نہیں تھے۔ کوئی اور میرے اندر سے بولا تھا۔''

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔

''ہاں بتاؤ۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑی بات ہوتی۔ ہم جاننا چاہتے ہیں وہ کون سی چیز ہوتی ہے جو ہمارے راستے کی اتنی بڑی رکاوٹ ہے۔''

''ہمارے ہاں۔ مذہب اسلام میں جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کانوں میں سب سے پہلی آواز جو پہنچائی جاتی ہے وہ یہ ہوتی ہے کہ اللہ سب سے بڑا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اور یہ آواز دنیا میں ہماری آمد کی تکمیل کردیتی ہے۔ ہمیں اور کسی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ آواز موت کے وقت تک ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اور ہم جانتے ہیں کہ موت ضرور آنی ہے۔''

اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ بہت دیر تک وہ پتھرایا ہوا بیٹھا رہا۔ پھر جنونی لہجے میں بولا۔ ''ہماری جنگ اسی آواز کے خلاف ہے۔ اور ہم...... اور ہم...... اور ہم......''

وہ ایک بھی جملہ پورا نہیں کرپارہا تھا۔ سخت غصے میں نظر آرہا تھا۔ پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر باہر نکل گیا۔

میرے اندر کوئی تاثر نہیں تھا۔ جو کچھ میں نے کہا تھا وہ میرے اندر کی آواز تھی اور بس۔ اس وقت میری ذہنی حالت ہی ٹھیک نہیں تھی۔

پھر کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ پھر خاص بات ہوگئی۔ وہ جو کچھ کرتے تھے اپنے مخصوص انداز میں کرتے تھے۔ ہوش کے عالم میں نہیں کرتے تھے اور ایک صبح پھر ماحول بدل گیا۔ صبح کو جاگا تو ماحول بدلا

ہوا تھا وہ جگہ نہیں تھی جہاں میں قیدی تھا۔ گویا مجھے قید سے رہا کر دیا گیا تھا سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تھوڑے فاصلے پر آبادی نظر آ رہی تھی۔

یہ سب میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ میں ذہنی طور پر گم ضرور تھا لیکن کسی بھی طرح کے ماحول سے ناواقف نہیں تھا۔ دور تک خوبصورت مناظر بکھرے ہوئے تھے۔ میرے قدم غیر محسوس انداز میں آگے بڑھنے لگے۔ اب میں آبادی کے کنارے آ گیا تھا۔ اور سب سے پہلے جو مجھے نظر آیا وہ ایک نوجوان لڑکی تھی وہ مجھے دیکھ کر رک گئی تھی۔

میں تو اس کے قریب نہیں گیا۔ لیکن وہ چند قدم چل کر میرے پاس آ گئی۔ میرے قدم رک گئے وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے کہا۔

''تم گیان گردھاری ہو۔''

''گیان گردھاری۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

یہ نام مجھے یاد تھا۔ تاہم میں نے کہا۔

''نہیں۔''

''نہیں ہو۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''نہیں۔'' اس بار میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

''مگر تمہارے شریر پر کپڑے تو گیان گردھاریوں جیسے ہیں۔ اس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا اور میں نے چونک کر اپنے لباس کو دیکھا۔ واقعی وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میرے بدن پر سادھوؤں جیسا لباس تھا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ایں......؟'' نام؟

''ارے تم کیسی باتیں کر رہے ہو۔ جیسے اپنے بارے میں سب کچھ بھول گئے ہو۔ ویسے ہو بڑے سندر۔'' اس نے میٹھے لہجے میں کہا۔

''ہاں۔ سندر۔ سندر۔'' میں جلدی سے بولا۔ مجھے اپنا وہ نام یاد آ گیا جو ان لوگوں نے مجھے دیا تھا۔

''کیا سندر۔ سندر۔'' وہ شرارت سے بولی۔

''شیام سندر۔'' میں نے کہا۔

''یہ تمہارا نام ہے۔''

''ہاں۔''

''چلو چھٹی ہوئی۔ تمہارا نام پتہ چل گیا۔ میرا نام سنایہ ہے۔ یاد رہے گا میرا نام۔''

''ہاں۔''

''وہ دو چٹانیں دیکھ رہے ہو۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا اور میں نے اس طرف دیکھا۔ ''رات کو چوتھی چندرما نکلے گا۔ میں وہاں آ جاؤں گی مجھے تم سے کام ہے۔ میں چلتی ہوں مگر تم رات کو وہاں ضرور آ جانا بھولنا مت۔'' یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس وقت پھر میرے ذہن میں کچھ انگلیاں رینگنے لگی تھیں۔ مجھے کچھ یاد آ رہا تھا۔ کچھ نہ جانے کیا۔

مجھے کھانے پینے کی چیزیں مل گئیں۔ وہی چلتے پھرتے انسان، اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف۔ میرے بدن پر چونکہ سادھو کا لباس تھا اس لئے لوگ میری عزت کر رہے تھے۔ مجھے کھانے پینے کے لئے بھی انہوں نے ہی مجھے دیا تھا۔

دن کی باتیں مجھے یاد نہیں رہی تھیں لیکن نہ جانے کہاں سے گھومتا پھرتا البتہ شام کو مجھے وہ دونوں چٹانیں نظر آ گئیں۔ اور ان کے ساتھ ہی سنایہ...... میرے قدم اس طرف اٹھ گئے اور کچھ دیر کے بعد میں ان چٹانوں کے پاس پہنچ گیا۔

چٹانوں کے درمیان وقت گزرنے لگا۔ پھر چاند نکل آیا۔ اور میں نے دور سے اسے آتے ہوئے دیکھا اس نے بڑا خوبصورت لباس پہنا ہوا تھا بالوں میں پھول لگائے ہوئے تھے۔ وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی۔ میرے پاس آ کر وہ مسکرائی۔

''مجھے پہچان گئے۔''

''ہاں۔''

''کیا نام ہے میرا؟''

''سنایہ۔'' میں نے کہا۔

''ارے واہ۔ اس کا مطلب ہے میں تمہیں اچھی

گی، جب کوئی کسی کو اچھا لگتا ہے تب ہی وہ یاد رہتا ہے جیسے مجھے تمہارا نام یاد ہے شیام سندر۔"

"تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے کام ہے۔"

"ہاں۔"

"بتاؤ۔ کیا کام ہے؟"

"اتنی جلدی کیوں کر رہے ہو۔ ابھی تو چند رمانے مکھ دکھایا ہے چاندنی دھرتی پر اتری ہے پھول مہک رہے ہیں جھرنے سونا اگل رہے ہیں۔ ہواؤں کو کچھ اور ٹھنڈا ہونے دو، یہ ہمیں آواز دیں گی ہم سے کہیں گی۔ "آؤ مل جائیں ہم من اور سوگند کی طرح۔" ایک ہو جائیں چلو چاند اور گگن کی طرح۔ اس کی آواز خوابناک ہوگئی اور میں اسے پریشان سے دیکھنے لگا۔

"سنا یہ۔"

"ہوں۔"

"بدھو ہو نرے۔ بدھو کے بدھو۔" سنو بتاتی ہوں۔ میرے پتا کا نام الاگا ہے۔

"ہوں۔"

"بھائی کا نام سلوگا۔"

"اچھا۔ پھر۔؟"

"اور وہ جس سے میری شادی کرنا چاہتے ہیں اس کا نام پوگاس ہے۔ ٹیڑھے منہ اور چندھی آنکھوں والا پوگاس۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ مگر سب مجھے مجبور کر رہے ہیں۔ تب میا منی جے کال نے میرے سپنے میں آ کر مجھے میری مشکل کا اپائے بتایا۔"

"میا منی جے کال کو تم کیسے جانتی ہو؟"

"بس وہ میرے سپنے میں آئے تھے اور انہوں نے کہا تھا کہ اگر میں گیان گردھارن بن جاؤں تو میری مشکل حل ہو سکتی ہے۔ وہ مجھے گیان گردھارنوں کے بارے میں بتانے لگے اور میں تیار ہوگئی۔ تم سامنے آئے تو مجھے پتہ چل گیا کہ تم گیان گردھاری ہو۔"

"کیسے ...؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے کپڑوں سے حلئے سے۔ مجھے یہی بتایا گیا تھا۔"

"وہ اپائے کیا ہے۔" میں نے پوچھا تو اس کے چہرے پر شرم کی سرخی پھیل گئی۔ وہ زمین کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر بولی۔

"تم مجھے اپنے شریر میں سویکار کرلو۔ ہمارے ہاں نرن گپت مندر ہے جہاں نرن گپت کا بت رکھا ہوا ہے۔ جب کسی کی شادی طے ہوتی ہے تو لڑکی کو نرن گپت کے چرنوں میں جا کر سوگند کھانی پڑتی ہے کہ وہ کنواری ہے۔ اگر وہ کنواری ہوتی ہے تو نران گپت مہاراج شانت رہتے ہیں اور اگر وہ کنواری نہیں ہوتی تو وہ غصے سے آگ بگولہ ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے سرخ ہو جانے سے سب کو پتہ چل جاتا ہے کہ کنیا کنواری نہیں ہے سو، میں پوگاس سے شادی سے بچنا چاہتی ہوں۔"

میں اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اور جب اس کی بات میری سمجھ میں آئی تو میں خود نرن گپت بن گیا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ میری کنپٹیاں جل رہی تھیں۔ عجیب پیشکش تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا جواب دوں لیکن میرے دل میں ایک کراہیت سی ابھری تھی۔ اس سے یہ پوچھنے کو دل بھی نہیں چاہا کہ جب نرن گپت یہ بتا دیتا ہے کہ کنیا کنواری نہیں ہے تو پھر کنیا پر کیا بیتتی ہے۔ اس کے اہل خاندان، اس کے قبیلے والے اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں۔"

میں خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا اس کے سانس بوجھل ہوئے جا رہے تھے۔ جب یہ خاموشی طویل ہوئی تو اس کی لرزتی آواز ابھری۔

"سندر جی۔"

ابھی میں اسے کوئی جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ آبادی کی طرف سے کچھ شور ابھرا۔ پھر بہت سی مشعلیں نظر آئیں جو اسی طرف دوڑ رہی تھیں۔

"یہ کون ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔
"بانے دیا۔ کسی کو پتہ چل گیا۔ میں نے تمیا دی سوریا کو بتادیا تھا اس نے کسی کے کانوں میں نہ خبر پھونک دی۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولی۔

وہ جاتی جہنم میں اور سوریا جاتی چولہے میں، میرے ساتھ جو ہونے والا تھا اس کا مجھے اندازہ ہوگیا تھا شعلوں کی روشنی کے سائے میں، میں نے بہت سے لٹھ بردار بپھرے ہوئے لوگوں کو اپنی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا تھا جو ظاہر ہے میرے لئے مٹھائی لے کر نہیں آرہے ہوں گے۔ اب اتنا بے وقوف بھی نہیں تھا کہ وہیں کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرتا۔ میں نے پیچھے کی طرف چھلانگ لگائی اور بھاگتا چلا گیا اس بے چاری مصیبت کی ماری نے اپنے بچاؤ کے لئے کیا کیا مجھے کچھ معلوم نہیں تھا لیکن میں اب رکے بغیر دوڑ رہا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ آگے کیا ہے۔

میری رفتار بہت تیز تھی اور میں کسی گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا۔ پھر میرے کانوں نے ایک مسلسل دہاڑتی۔ یہ پانی کی آواز تھی۔ سمندر...... میرے ذہن میں ایک نام گونجا۔ ہاں سمندر۔ میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا اور پھر مجھے اپنے سامنے سفید جھاگ اڑاتی ہوئی لہریں نظر آئیں کچھ ہی لمحوں کے بعد میں ان کے قریب تھا میرا دل کہہ رہا تھا نکل جاؤ۔ جیسے بھی بن پڑے وہاں سے نکل جاؤ۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ مجھے اس پراسرار طلسم تو نجات مل جائے گی۔

میں سمندر میں کود گیا۔ شاید میں نے تیرنا جانتا تھا۔ طوفانی لہروں کو چیرتا ہوا میں آگے اور آگے نکلتا چلا گیا۔

ایک انوکھا سفر، جس نے سوچنے سمجھنے کی قوتیں سلب کر لی تھیں نہ جانے میں کیوں تیر رہا تھا۔ نہ جانے میں کیوں آگے بڑھ رہا تھا۔ سمندر کوئی مدافعت نہیں کر رہا تھا۔ اس کے بگولے بے حد بردبار تھے جیسے اس نے مجھے میزبان کی حیثیت سے قبول کر لیا ہو۔

مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا کہ میں سمندر میں آگے بڑھنے کے لئے کوئی جدوجہد کر رہا ہوں کہ نہیں لیکن یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میرا بدن متحرک ہے ہوائیں مجھے آگے دھکیل رہی تھیں حیرت کی بات تھی کہ میں ڈوبا نہیں تھا۔

پھر میں سوگیا۔ پانی کا بستر، سورج کی روشنی، اور پھر جاگنے کا احساس، زندگی نے میری حفاظت کی تھی۔ میں اس وقت پانی میں نہیں تھا بلکہ بھورے رنگ کی ریت میرے لئے نرم بستر بنی ہوئی تھی، آسمان پر پرندے اڑ رہے تھے اور ماحول بڑا سہانا لگ رہا تھا میں دیر تک اسی طرح لیٹا رہا پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

کوئی جزیرہ تھا۔ ساحل سے دور درختوں کے جھنڈ نظر آرہے تھے پتہ نہیں یہاں آبادی تھی یا نہیں۔ کاہلوں کی طرح لیٹا رہا۔ مجھے بس وہ لمحات یاد تھے جب میں نے خود کو ان شیطان زادوں کے چنگل میں پایا تھا اور وہ مجھے اپنے پیروکاروں میں شامل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن مجھے یہ شیطانی عمل قبول نہیں تھا اس کے بعد سے اب تک کی صورت حال مجھے یاد تھی۔ آخری عمل اس لڑکی کا تھا۔ پتہ نہیں اس کے قبیلے والوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہو۔

اب یہاں پڑے رہنا بے کار تھا۔ لباس بھی بری طرح گندا ہو رہا تھا۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کچھ لمحے خاموش بیٹھے رہنے کے بعد میں اٹھ کر ان درختوں کی طرف چل پڑا۔ جو دور نظر آرہے تھے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی۔ ہوسکتا ہے وہاں کچھ ایسے پھل مل جائیں جو کھانے پینے میں کار آمد ہوں۔ میں انہیں کی تلاش میں تھا، آخر کار ان درختوں کے پاس پہنچ گیا۔ لیکن اچانک مجھے ایک عجیب سی خوشبو کا احساس ہوا۔ یہ غلط فہمی نہیں تھی خوشبو آرہی تھی اور یہ گوشت بھننے کی خوشبو تھی، میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ درختوں ہی کے درمیان، یہاں سے خاصے فاصلے پر، دھوئیں کا غبار اٹھ رہا تھا۔ ہاں گوشت بھننے کی خوشبو بھی ادھر سے ہی آرہی تھی۔ میرا دل خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کا مطلب ہے وہاں کوئی ہے۔ ضرور وہاں کوئی ہے۔ میرے قدم تیزی سے اس طرف چل پڑے۔

(جاری ہے)

موت کا تعاقب

مدثر بخاری-شہر سلطان

حالات سے مایوس اور دل برداشتہ ہو کر بچہ چھت پر گیا اور چشم زدن میں چھت سے نیچے چھلانگ لگادی، سڑک پر اس کا خون پانی کی طرح بہنے لگا اور پھر چند گھنٹے بعد اس کی روح نے......

لمحہ لمحہ، پل پل خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی اور لرزہ براندام کرتی حقیقی کہانی

میرا نام روزی ہے، جب میں یہ ڈائری لکھ رہی ہوں میری عمر 25 سال ہے۔ میرے لمبے ڈارک براؤن بال ہیں اور میرے شوہر جان کے مطابق "روزی دنیا کی خوبصورت ترین عورت ہے۔" یہ میرے شوہر کا حسن ظرف ہے۔ مجھے بہت پیار کرتے ہیں مجھے ان سے ہمیشہ ایک شکوہ رہا ہے کہ وہ مجھے وقت نہیں دیتے کیونکہ وہ کیلی فورنیا میں جاب کرتے ہیں جبکہ ہمارے گھر سے ان کا آفس قریب 1500 کلومیٹر دور ہے۔ وہ مہینے میں ایک مرتبہ گھر کا چکر لگاتے ہیں۔ میری زندگی کے وہ پل بہت خوبصورت اور کبھی نہ بھلانے والے ہوتے ہیں ہم ایک ساتھ وقت گزارتے ہیں گارڈن جاتے ہیں، وہ مجھے بانہوں میں اٹھاتے ہیں اور مجھے رومانس کی ایک دنیا میں لے جاتے ہیں جہاں مجھے دنیا کا ہوش نہیں رہتا۔

لیکن جب وہ چلے جاتے ہیں تو میں اداس

ہوجاتی ہوں۔ ایک اچھی بات یہ ہے کہ میں نے ایک پرائیویٹ اسکول جوائن کرلیا ہے جہاں ننھے منے بچے پڑھنے آتے ہیں مجھے فطرتی طور پر بچے پسند ہیں مگر میری اپنی گود ہری نہیں ہوئی۔ مجھے اولاد کی خواہش ہے مگر بہت سی دعاؤں اور علاج کے بعد بھی میری گود خالی ہی ہے۔

جان اپنے آفس کے کاموں میں مصروف ہوتے ہیں جبکہ میں دن بھر اسکول میں بچوں کو پڑھاتی ہوں۔ شام 5 بجے میری واپسی ہوتی ہے۔ میں کھانا پکاتی ہوں اور اپنے شوہر کو فون کرتی ہوں پھر ٹی وی دیکھتی ہوں اور چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد سو جاتی ہوں۔

آج کا دن بھی تھکا دینے والا تھا، اسکول میں نئے ایڈمشن ہورہے ہیں۔ اور پرنسپل نے نئے بچوں کو اسکول میں انٹری کے لیے ساری ذمہ داری میرے اوپر ڈال رکھی ہے۔ ڈائری لکھنا روک رہی ہوں کیونکہ میرا سر بھاری ہورہا ہے اور نیند کا غلبہ مجھ پر چھا رہا ہے۔''

نیچے تاریخ اور وقت درج تھا..... اور ڈائری کا صفحہ اختتام کو جا پہنچتا ہے۔

خونی کہانی کا اگلا حصہ ڈائری کے **Next** صفحے سے شروع ہوتا ہے جو کچھ یوں تھا۔

''شام ہوچکی تھی۔ خزاں کا موسم تھا میں نے اپنی گاڑی کو گیراج میں پارک کیا اور اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھی۔ میرے اپارٹمنٹ کے ساتھ روڈ ہے جس کے کنارے خزاں رسیدہ درخت ہیں خزاں کے موسم نے ان درختوں کو پتوں سے بے نیاز کردیا ہے شام کے وقت یہ درخت ٹنڈ منڈ اور عجیب سی صورت میں نظر آتے ہیں۔ میرے اپارٹمنٹ کے قریب ہی ایک درخت ہے جو موسم کی بھینٹ چڑھ رہا ہے اس کے خشک پتے گیلی سڑک پر بکھرے پڑے تھے۔

ایک بات اور بھی لکھتی چلوں کہ تھوڑی دیر پہلے وہاں ہلکی ہلکی بارش ہوئی تھی سڑک گیلی تھی اور درختوں کے خشک پتے نم ہوتے سڑک پر پڑے تھے۔ شام اتر آئی تھی اور میرا جسم تھکن کی وجہ سے ٹوٹ رہا تھا۔ میں نے اپنے اپارٹمنٹ کی طرف بڑھتے ہوئے ان تمام چیزوں کو سرسری نظر سے دیکھا مجھے کچھ خوف محسوس ہوا جیسے ویرانہ سا ہو اور درمیان میں میرا اکلوتا گھر..... حالانکہ میرے گھر کے ساتھ بہت سے گھر تھے۔ لیکن میل جول نہ ہونے کے برابر..... بہرحال پھر مجھے لگا جیسے میرے سامنے سے کوئی گزر رہا ہو۔

ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں..... میری آنکھ جھپکی تھی اور میری نظروں کے سامنے سے کوئی تیز رفتار چیز گزری تھی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کیا چیز تھی۔ میں نے وہم سمجھا اور بیگ سے اپارٹمنٹ کی چابی نکالی۔

لیکن مجھے حیرت کا جھٹکا لگا کیونکہ میری چابی پہلے سے ہی دروازے میں لگی ہوئی تھی یہ ممکن نہیں تھا جبکہ میرے ہاتھ میں بھی میری چابی موجود تھی..... میں نے چابی گھمانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مجھے لگا جیسے چابی اپنی جگہ موجود نہیں تھی..... وہاں خالی دروازہ میرا منہ چڑا رہا تھا۔

آج شاید تھکن کچھ زیادہ ہی تھی کہ کچھ عجیب وغریب سا محسوس ہورہا تھا میں نے اپنی چابی کو کی ہول میں ڈالا اور ہینڈل گھما کر اندر داخل ہوگئی۔

کمرے میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ مکمل خاموشی اور سناٹا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ صبح میں نے ہال روم کی لائٹ آن رکھی تھی لیکن یہ آف کیسے ہوگئی؟ اس ایریا میں لائٹ کا نظام 24 گھنٹے ایکٹو رہتا تھا۔ لائٹ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ میں نے سوچا ہوسکتا ہے کمرے کی ہی فیوز ہوگئی ہو اور کام کرنا چھوڑ دیا ہو۔

میں نے اپنے ہی گھر میں خوف محسوس کیا۔ تنہائی خوف اور ریڑھ میں سرد لہروں نے تنہائی کا احساس دلایا میں نے موبائل کی ٹارچ آن کی اور سوئچ کی طرف گئی۔ وہاں سوئچ آف تھا..... میں نے لائٹ آن کردی۔ ہال روم روشنی میں نہا گیا۔ اور میری جان میں جان آئی۔

لیکن میں نے صوفے کے نزدیک فرش پر خون کے نشان دیکھے..... خون کے نشانات زمین پر بکھرے

ہوئے سانپ کی مانند بل کھاتے ہوئے اپارٹمنٹ سے باہر جاکر رک گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے کسی ذی روح کو مار کر کھینچا گیا تھا۔ گھسیٹتے ہوئے اسے باہر لے جایا گیا۔ لیکن آخر کس کو ....؟ اور کس نے کیا یہ سب ....؟

اچانک مجھے اپنے ٹونی کا خیال آیا.... ٹونی میرا پالتو کتا تھا جو اپارٹمنٹ کے پیچھے حصے میں رہتا تھا۔ اس کے لئے کوئی جگہ مخصوص نہ تھی وہ صرف اسکول نہیں جاتا ورنہ گھر میں وہ ہر جگہ میرے ساتھ رہتا تھا۔

پھر میں، میں نے اسے ہر جگہ ڈھونڈ ڈالا مگر وہ کہیں نہ ملا۔ البتہ اپارٹمنٹ سے باہر درخت کے نیچے ، پچھلی طرف اس کی لاش نظر آئی۔ اس کی گردن کاٹ دی گئی، مجھے دلی افسوس ہوا۔ مجھے اس سے دلی لگاؤ تھا.... میں نے حالات پر غور کیا۔ لیکن کچھ سمجھ نہ آیا ، کوئی چیز میرے گھر میں داخل ہوئی تھی اور میرے ٹونی کو مار ڈالا تھا۔

میں نے جان کو فون کیا مگر اس کا نمبر پاور ڈ آف ملا.... مجھے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے اور نیند آرہی تھی لہٰذا میں نے افسوس کے ساتھ ڈائری کا یہ صفحہ قلمبند کیا ہے.... کل زندگی نے دی اجازت تو کل کچھ لکھوں گی۔ کیونکہ جو میرے کتے کو مار سکتا ہے وہ اتنی راز داری سے مجھے بھی آسانی سے مار سکتا تھا۔"

ڈائری کا یہ صفحہ بھی ختم ہوگیا.... تاریخ کے ساتھ سائن درج تھا۔

ڈائری کا اگلا صفحہ چونکا دینے والا تھا.... کچھ ناقابل یقین حقائق تھے جو درج کئے گئے تھے ایک عام انسان اس قسم کے بیانات پر یقین نہیں کرسکتا۔ تیسرا صفحہ کچھ یوں تھا۔

"آپ یقین کریں یا نہ کریں کل رات میرے ساتھ بہت عجیب ہوا۔ ڈرا دینے والا ، خوف ناک.... کل رات میں تھکن کسی وجہ سے سوگئی تھی۔ رات کے کسی لمحے مجھے محسوس ہوا جیسے کمرے میں کوئی داخل ہوا ہو۔ کسی نے میرے کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے دروازہ بند ہونے کی ہلکی سی آواز کو واضح سنا تھا اور فرش پر ہلکی چاپ کے قدموں نے مجھے نیند سے جگا دیا تھا میں نے غنودگی کے عالم میں آنکھ کھولی میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔

وہاں ایک دس سال کا بچہ تھا جس کے ہاتھ میں چاقو تھا اور وہ میری جانب بڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور وہ غصے میں تھا.... مجھے یقین ہوگیا تھا کہ وہ ننھا بچہ کسی سفاک قاتل کی طرح مجھے مارنا چاہتا تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا اگر میں جلد ہی کوئی فیصلہ نہ کرتی تو وہ مجھے مارنے ہی والا تھا.... میں نے آنکھ کے کھلے ہوئے کونے سے دیکھا وہ میرے سر پر پہنچ گیا تھا۔ اور چاقو کو عین میرے دل کے مقام پر نشانہ بنانے والا تھا کہ میں نے چیخ ماری اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور اس بچے کو پکڑنے لگی میں نے سوچا میں اس بچے کا ہاتھ پکڑلوں گی اور اس پر قابو پالوں گی۔

لیکن جب میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو وہاں کسی بچے کا وجود نہ تھا۔ دروازہ بند تھا اور کمرے میں، میں تنہا تھی۔ میں نے سب سے پہلے اپنے حواس قابو میں کئے اور خواب اور حقیقت کے باہمی لنک کو ملانے کی کوشش کرنے لگی۔

وہ خواب نہیں تھا بلکہ اصل حقیقت تھی....

میں نے خود اپنی آنکھوں سے اس خونی بچے کو دیکھا جو میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو تھا اور اس کا مقصد صرف مجھے قتل کرنا تھا.... لیکن پھر وہ اچانک کدھر گم ہوگیا۔ جب خوف نے میرا پیچھا چھوڑا تو میں نے اسے بیڈ اور صوفوں کے نیچے، واش روم، اور راہداری میں چیک کیا مگر نجانے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ بچہ چھومنتر ہوگیا تھا پھر میں نے غور کیا.... اور اپنے سی سی ٹی وی کیمرے کی ویڈیو ٹیپ نکالی.... اور فلم چلادی.... میں نے فلم کو فارورڈ کیا اور رات تین بجے کا ویڈیو کلپ پلے کردیا۔

وہ دل دہلا دینے والا منظر تھا وہاں دروازہ خود

بجو دکھلا تھا اور پھر بند ہوگیا تھا ایک سایہ نظر آ رہا تھا جو آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہا تھا ..... اس سے آگے میری اپنی ویڈیو ریکارڈنگ تھی جس میں میرا خوف واضح دیکھا جا سکتا تھا..... کیمرے نے صرف ایک سائے کو ریکارڈ کیا تھا..... جبکہ میری آنکھوں نے ایک بچے کو دیکھا تھا۔

ایک بات تو حقیقت تھی کہ کوئی مجھے مارنے والا تھا کوئی آسیب، ویمپائر، ڈریکولا، جن، آتما ..... کچھ بھی ہوسکتا تھا..... اس سائے نے مجھے اندر تک خوف زدہ کر دیا تھا..... آج کی صبح نارمل نہیں تھی..... رات والے واقعہ نے مجھے ذہنی طور پر خوف کا شکار کر دیا تھا۔ صبح میرے سر میں درد تھا اور جسم میں اکڑاؤ تھا..... میں نے سر درد کی ٹیبلٹ لی اسکول سے چھٹی لے کر آرام کرنے کا فیصلہ کیا..... میرا سر بھاری ہوگیا تھا..... اور میرا دایاں بازو بھی بھاری ہونے لگا تھا..... بازو اتنا بھاری ہوگیا تھا کہ میں اسے حرکت نہ دے سکتی تھی بازو کا اتنا وزنی ہونا بہت نقصان دہ اور غیر معمولی تھا۔

لیکن پھر اچانک ہی میرا بازو نارمل ہوگیا۔ بازو کا بھاری پن صرف چند لمحوں کے لئے ہوا تھا۔ گو کہ وہ لمحے خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھے۔ مجھے لگا تھا میری روح نکلی جا رہی تھی اور میرا بازو ہمیشہ کے لئے خراب ہوجائے گا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا ظاہر ہے انسان اس قسم کی سچویشن میں گھبرا ہی جاتا ہے میں بھی گھبرا گئی تھی۔

بس پھر اچانک سے میرا بازو نارمل ہوا اور میں نے آہستہ آہستہ بازو کو حرکت دینا شروع کر دیا..... میرا بازو حرکت کر رہا تھا اور مجھے خوشی تھی ..... اندرونی خوشی.....!

سورج نے میرے اپارٹمنٹ کو بھی مکمل دن ہونے کا پتہ دیا۔ سورج کافی چڑھ آیا تھا لیکن موسم ٹھنڈا تھا۔ مجھے دنا منزڈی کی ضرورت تھی۔ میں نے جیسے تیسے گھر کے چھوٹے موٹے کام نمٹائے اور چھت پر چلی گئی ہوا چل رہی تھی اور سورج کی دھوپ خاص نہ تھی..... ہمارے ہاں ہر موسم نارمل ہوتا ہے اور خاص طور پر دھوپ ٹھنڈی پڑتی ہے میں نے ایک ناول اٹھایا اور چھت پر پڑی کرسی پر آ بیٹھی اور ناول پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ ..... رومانٹک ناول تھا۔ جس میں دلچسپی کے لئے بس کچھ تھا..... میں نے ناول پڑھنا شروع کیا اور پوری طرح ناول میں ڈوب گئی.....

ناول کے لفظ میرے سامنے کسی فلم کی مانند چل رہے تھے کہ اچانک مجھے محسوس ہوا جیسے میرے بالوں کو کسی نے چھوا ہو۔ وہ طلسماتی لمس تھا۔ اس نے میرے بالوں کو میٹھے انداز میں سہلایا تھا اور اس کی سانسیں مجھے اپنی گردن کے گرد محسوس ہوئیں..... وہ ایک ہاتھ تھا جو ساخت کے اعتبار سے ننھا تھا لیکن انداز کے اعتبار سے نوجوان لڑکے کا ہاتھ ..... مجھے اس کا لمس گردن اور پھر اپنے ہونٹوں پر محسوس ہوا تو میں بھڑک اٹھی۔

میں نے ناول سے نظر ہٹائی اور اپنے پیچھے دیکھا..... لیکن وہاں صرف صحن کی جڑائی اینٹیں تھیں ..... میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

میں نے ناول کو سامنے ٹیبل پر رکھا اور پورے صحن کا چکر لگایا چھت سے نیچے تک بغور دیکھا سڑک ویران تھی میرے گھر کے ساتھ جو گھر تھے ان میں گہری خاموشی تھی۔

میں لوٹ کر کرسی کی طرف بڑھی جہاں میں نے ٹیبل پر ناول رکھا تھا۔ میں حیران زدہ آنکھوں سے ٹیبل کو دیکھ رہی تھی۔ جہاں ناول موجود نہیں تھا ..... یہ کیا ہو رہا تھا؟ کتاب غائب تھی..... میں نے کرسی سے اٹھنا چاہا لیکن خود کو اتنا بھاری پایا کہ اٹھ ہی نہ پائی۔ میری آنکھیں کھلی تھیں اور دماغ کام کر رہا تھا مگر حرکت کرنے سے قاصر تھی۔

مجھے لگا جیسے وہ مجھے مار دے گا..... واقعی مار دے گا۔ کون مار دے گا اور کیوں کوئی اس طرح چاہے گا..... میں نے کرسی سے اٹھنا چاہا مگر میرا جسم مکمل طور پر بھاری ہو چکا تھا اور دباؤ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ کوئی نادیدہ خون

آ شام، یا کچھ بھی تھا جو مجھے حد سے زیادہ تنگ کر رہا تھا۔
میں نے محسوس کیا تھا وہاں سانس لینے والی زندہ مگر نظر نہ آنے والی مخلوق تھی۔ میں کرسی پر دراز تھی اور کوئی میرے جسم پر سوار ہونے لگا تھا وہ ہلکا ہلکا لمس تھا جو گدگدانے کے لئے کافی تھا۔ وہ دو ہاتھ تھے جو میری ٹانگوں سے ہوتے ہوئے میرے جسم کے اوپر والے حصے کو پیار بھرے انداز سے چھوتے ہوئے میری گردن تک آ پہنچے تھے۔ اب کی بار مجھے سانس لینے کی آواز آئی۔ گرم گرم سانس کی خارج ہوا مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہوئی۔
میں غصے کے عالم میں اپنا بایاں بازو حرکت میں لائی اس دفعہ میرے ہاتھ نے بھرپور حرکت کی اور پھر میرا ہاتھ کسی پتھر نما چیز سے ٹکرا گیا۔ میرا جسم بھی نارمل ہوگیا تھا اور میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی جبکہ میرے بازو میں شدید درد ہونے لگا...... میری سانسیں بہت تیز ہوچکی تھیں اور آنکھوں کے سامنے ستارے ناچنے لگے تھے...... میں نے ٹیبل پر دیکھا وہاں ناول رکھا ہوا تھا۔ میں نے ناول اٹھایا اور ہانپتی کانپتی سیڑھیاں اترتی نیچے آ گئی۔
میں نے عجلت میں جان کا نمبر ڈائل کیا...... دوسری گھنٹی پر جان نے کال اٹینڈ کرلی۔
''ہیلو...... روزی کیسی ہو؟''
''ٹھیک نہیں ہوں...... جان تم جلدی سے گھر آ جاؤ۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی مجھے بہت تنگ کر رہا ہے۔''
''تم اتنا گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ ہوا کیا ہے؟ اصل معاملے بتاؤ۔'' جان بولا۔
میں نے تفصیل بتانی شروع کی جسے جان نے مذاق سمجھ کر کہا۔
''تم نے ضرور کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ تم آرام کرو اور میرا انتظار کرو...... پلیز! سویٹ ہارٹ...... میں اگلے تین دن تک نہیں آ سکتا...... کام کا بردن ہے تم اپنی بہن کے گھر چلی جاؤ۔ یا اسے اپنے پاس بلالو۔''

محبت اور احسان

محمود غزنوی نے اپنی نوجوانی میں ایک سرسبز و شاداب باغ لگوایا اور اس باغ میں ایک شاندار اور خوبصورت عمارت تعمیر کروائی۔ جب باغ اور عمارت کی تکمیل ہوگئی تو اس نے ایک عام جشن منعقد کیا اور اپنے باپ ناصر الدین سبکتگین اور سلطنت کے دوسرے ارکان کو باغ میں مدعو کیا...... سبکتگین نے عمارت دیکھ کر کہا۔ ''محمود! اگرچہ باغ اور عمارت بہت شاندار اور خوب صورت ہیں لیکن ایسی چیزیں تو تمہارے ملازم بھی بنا سکتے ہیں۔ بادشاہوں کی شان اور شوکت کا تقاضہ یہ ہے کہ وہ ایسی عمارت کی بنیاد ڈالیں جس کی مثال پیدا نہ کی جا سکے۔
محمود نے ادب سے پوچھا۔ آپ کون سی عمارت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ سبکتگین نے جواب دیا۔ وہ عمارت اہل علم کے دل ہیں۔ اگر تم ان کے دلوں کی سرزمین میں اپنی محبت اور احسان کے بیج بو دو گے تو وہ بار آور ہوں گے۔ ان کے پھل ایسے ہوں گے جن کو چکھنے سے تمہیں سعادت کی لذت ملے گی اور تمہارا نام حشر تک زندہ رہے گا۔
(شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈوالہ یار)

''تم جان ہی ہو ناں..... '' مجھے اس سے اس قسم کے برتاؤ کی ہرگز امید نہ تھی... وہ میری بات کو مذاق سمجھ رہا تھا۔

''ہاں روزی..... تم پلیز ریلیکس رہو..... میں کوشش کرتا ہوں جلدی گھر آ جاؤں۔''

میں نے غصے سے فون بند کر دیا وہ مجھ سے پیار کرتا تھا اور مجھے بھی اس سے بہت پیار تھا مگر اس دفعہ اسے گھر سے گئے ہوئے دو ماہ سے بھی زیادہ عرصہ ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ میں اسے گھر بلانے کے لئے بہانے کر رہی ہوں..... تاکہ وہ جلدی لوٹ آئے مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ معاملہ بہت سنگین تھا۔

میں مر گئی تو وہ پچھتائے گا..... میرے آس پاس کوئی ایسا ہمدرد بھی نہیں ہے جو میرے دل کو سمجھے..... جس سے اپنے دل کی بات کروں..... تبھی تو میں اپنی ساری باتیں اپنی ڈائری میں لکھتی ہوں البتہ ایک ذی روح ایسی بھی ہے جو مجھے جان سے مار ڈالنا چاہتی ہے۔ جو نہ ہی نظر آتی ہے اور نہ ہی بولتی ہے۔''

صفحہ ختم ہو چکا تھا نیچے تاریخ اور اپنا کے سائن تھے۔ ڈائری کے کچھ مزید صفحات ابھی باقی تھے..... مزید صفحات پڑھنے سے پہلے میں کچھ اپنے بارے میں بتا دوں تو آسانی رہے گی۔

میں ایک پرائیویٹ جاسوس ہوں، نام مائیکل ہے اور کام آپ کے سامنے..... کچھ دن پہلے ہی مجھے ایک فون کال آئی۔

''ہیلو.....''

''مائیکل اسپیکنگ۔''

''میں جان بات کر رہا ہوں، دیکھئے میری بیوی کی ڈیتھ ہوئی ہے مجھے لگتا ہے اس کی موت طبعی نہیں بلکہ جان بوجھ کے قتل کیا گیا ہے آپ پلیز! میرے ساتھ تعاون کریں۔''

''اوکے۔''

''سرکاری پولیس اپنے طور پر کام کرے گی۔ آپ میرا ساتھ دیں تو تفتیش کی جا سکتی ہے۔''

''میں ہر قسم کے تعاون کے لئے تیار رہوں۔ آپ تفتیش شروع کریں.....!''

میں نے اپنے طور پر کام کرنا شروع کر دیا اور جان کے گھر جا پہنچا۔

وہ خوبصورت گھر تھا۔ آئیڈیل لوکیشن روڈ، گارڈنز، ہر قسم کے موسم کو انجوائے کیا جا سکتا تھا..... میں نے روزی کا مرا ہوا چہرہ دیکھا تھا اس کے آخری رسومات میں حصہ لیا تھا..... جان افسردہ تھا اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ میں نے اسے تسلی دی تھی۔ جو چلا گیا تھا اس کا واپس آنا ناممکن تھا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ نے ہم سب کو حیران کر دیا تھا..... روزی کی موت خون کی کمی کی وجہ سے ہوئی تھی..... اس کے جسم سے خون کی آخری بوند تک بھی نچوڑ لی گئی تھی جبکہ رپورٹ کے مطابق اس کی موت کا وقت رات دو سے تین بجے تک تھا اور اس کے جسم پر کوئی نشان نہ تھا نہ ہی کسی انجکشن کا اور نہ ہی کسی کے دانتوں کا..... دانت سے مراد کسی جانور کے خون خوار دانت..... مگر سوئی تک کا نشان نہ ملا۔

میں نے روزی کا سارا گھر دیکھا..... پائیں باغ بھی جہاں مختلف پودے خشک اور جلے ہوئے تھے ایک طرف چڑیا گھر نما ماحول تھا۔ جہاں پنجروں میں مختلف پرندے تھے مگر سب ہی اداس اور سر جھکائے بیٹھے تھے..... میں نے وہاں ان کی آنکھوں میں خوف دیکھا..... پھر میں روزی کے کمرے میں گیا جہاں جان کی تصاویر چسپاں تھیں درمیان میں بیڈ تھا۔ سائیڈ میں لمبی الماری تھی کونے میں ٹی وی رکھا تھا جس کی اسکرین ٹوٹی ہوئی تھی..... جیسے کسی نے لوہے جیسی سخت چیز سے اسکرین کو توڑ دیا ہو.....

میں نے ہر چیز کو دیکھا..... کافی تلاش کے بعد میں نے ایک سرخ ڈائری دیکھی..... وہ روزی کی ذاتی ڈائری تھی..... اس میں بہت سے صفحے اس کے اپنے ہاتھوں سے لکھے گئے تھے

میں نے جان سے اجازت لے کر اس کو پڑھنا

شروع کیا..... اور اس کو آپ کے سامنے پیش کرتا چلا گیا۔

ابھی کہانی باقی ہے میرے دوست ...

تو جناب..... میں نے ڈائری کا اگلا صفحہ کھولا ہے کچھ یوں تھا۔

''آج میری موت پکی تھی اگر عین ٹائم پر میں اپنی گاڑی کو درخت سے ٹکرانہ دیتی..... جی ہاں..... آج کسی نے میری گاڑی کے بریک فیل کردیئے تھے۔ میں اسکول ٹائم میں تیار ہوکر ڈرائیو کرتی ہوئی جارہی تھی..... اسپیڈ بہت کم تھی کہ مجھے بریک لگانے کی ضرورت پیش آئی۔ لیکن بریک نہ لگی... بریک فیل ہوچکی تھی اور یہ خطرناک صورت حال تھی..... میں نے جلد ہی فیصلہ کیا کہ کسی درخت سے گاڑی ٹکرادی اور یوں میری جان بچ گئی۔

میں نے ٹیکسی لی اور اسکول پہنچ گئی..... مصروف دن رہا مگر میری سوچ صرف آج صبح کے واقعہ پر مرکوز رہی۔ دماغ کسی دوسری طرف مائل ہی نہ ہورہا تھا... میں نے جان کو واقعہ سنایا اور دو دن کے بعد آنے کا کہا... نجانے وہ دفتر کی کون سی مصروفیات میں مگن تھا کہ اسے اپنی بیوی کا ذرا برابر خیال نہ تھا۔

اسکول سے واپسی پر میں نے اپنی گاڑی کو دیکھا جو درخت سے ٹکرا گئی تھی اسے آگ لگ گئی تھی اور کار جل کر خاکستر ہوگئی تھی۔ مجھے گاڑی کا بھی افسوس تھا وہ میرے شوہر نے مجھے شادی پر گفٹ کی تھی۔ میں گھر آئی تو ایک اور آفت میرا انتظار کررہی تھی۔

میں گھر میں داخل ہوئی دروازہ کھولا اور خوف سے میری ہلکی سی چیخ نکل گئی وہاں میرے سامنے ایک لاش تھی۔ خون میں لپٹی ہوئی اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی میرا خوبصورت مور موت کے گھاٹ اتاردیا گیا تھا۔ مور کے نیلے اور سبز پروں پر خون لگا تھا۔

اس کی گردن پر تیز دھار چاقو چلایا گیا تھا اور چاقو پر لگا خون اس کے پروں سے صاف کیا گیا تھا۔ یہ سب کیا ہورہا تھا؟ میری عقل تو کام نہیں کررہی تھی۔

وہ کون تھا اور کیا چاہتا تھا سامنے بھی نہیں آتا تھا۔

میں نے مور کی لاش کو دفن کردیا... وہ بہت پیارا مور تھا لیکن افسوس میں اسے نہ بچاسکی تھی۔

میں مور کو دفنانے کے بعد اپنے کمرے میں گئی..... وہاں ہر چیز بکھری ہوئی لگتی تھی..... جیسے کوئی گھر میں آیا تھا اور میرے سامان کو چھیڑتا رہا تھا میری بہت سی چیزیں فرش پر بکھری ہوئی تھی.....اور میرا ٹی وی ٹوٹا ہوا تھا۔ اسکرین پر خاصی زوردار انداز میں ضرب لگائی گئی تھی جس سے ٹی وی ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے سر پکڑلیا ... ایک عام انسان کے ساتھ غیر معمولی واقعات کا وقوع پذیر ہونا اور بار بار ہونا نفسیاتی مسائل کو جنم دیتا ہے میرا دل ڈرا ہوا ہے اور زندگی اجیرن ہوگئی ہے۔

آج دوپہر بھی کچھ عجیب ہوا..... دن 3 بجے میری واپسی ہوئی اور میں سونے کے لئے بیڈ پر گئی تھی آدھے گھنٹے بعد تک مجھے وہی بچہ نظر آیا جس کے ہاتھ میں تیز دھار چاقو تھا وہ مجھے مارنے ہی والا تھا کہ میں نے تیزی سے کروٹ بدلی اور اٹھ کر بیٹھ گئی..... وہاں کوئی موجود نہ تھا البتہ بیڈ پر نشان ضرور نظر آیا جہاں سے چادر پھٹ گئی تھی اور چاقو شاید اندر گھس گیا تھا ..... اگر میں کروٹ نہ بدلتی تو وہ چاقو میرے جسم میں گھس چکا ہوتا...

میں نے اس بچے کو غور سے دیکھا تھا اور اسے پہچان گئی۔

وہ بچہ صرف ایک دن اسکول آیا تھا وہ خوبصورت بچہ داخلے کی غرض سے اسکول آیا تھا لیکن میں نے اس کا ایڈمشن نہیں ہونے دیا تھا کیونکہ وہ اس قابل ہی نہ تھا کہ اسے اسکول میں داخلہ دیا جاتا اس سے کہا تھا کہ ''وہ چار سال کسی دوسرے اسکول میں پڑھتا رہا تھا۔''

میں نے اس کا ایڈمشن ٹیسٹ لیا۔ لیکن اس نے ایک بھی سوال ٹھیک نہیں لکھا تھا۔ چونکہ میں ایڈمشن ہیڈ

تھی میں نے اسے ریجیکٹ کر دیا۔ میرا کام ان بچوں کو داخلہ دینا تھا جو اہل تھے اور ذہین... میرے حساب سے وہ اس قابل نہ تھا۔

ریجیکٹ ہونے والا وہ بچہ اسکول سے جاتے ہوئے کئی دفعہ میری جانب دیکھتا رہا تھا اس کی آنکھوں میں التجا تھی لیکن اسکول انتظامیہ کی طرف سے میں مجبور تھی اسکول کا ٹیسٹ ہر بچے کو 50 فیصد سے پاس کرنے لازمی ہوتا ہے جبکہ اس کے 20 فیصد مارکس تھے یہ اسکول کا نظام اور طریقہ کار تھا۔ اس صورت میں میری ایک بھی نہ چلنی تھی۔ گو کہ مجھے بھی اس بچے کا افسوس تھا۔

وہ پیارا اور سنہرے بالوں والا، نیلی آنکھوں والا بچہ تھا اس کا نام جیک تھا..... کاش وہ ٹیسٹ پاس کر لیتا تو اسے داخلہ مل جاتا... لیکن یہ میری مجبوری تھی۔

ڈائری کا یہ آخری صفحہ تھا۔ نیچے سائن اور تاریخ درج تھی۔ اس سے آگے ڈائری کے صفحے خاموش تھے۔ لکھنے والے کو موت نے آ گھیرا تھا اور اسے مزید کچھ لکھنے کی مہلت ہی نہ ملی۔

معاملہ سلجھا ضرور تھا مگر کچھ سوال ابھی باقی تھے۔

میں مائیکل... پرائیوٹ جاسوس... میرا بیٹا جیک کچھ عرصہ قبل جیک نے دس منزلہ عمارت سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔ جیک میرا بیٹا، اپنی ماں کے ساتھ اسکول گیا تھا اور اس دن اسکول جاتے ہوئے وہ بہت خوش تھا کیونکہ وہ شہر کے بہترین اسکول میں داخلے کے لئے جا رہا تھا... لیکن واپسی پر وہ مایوس لوٹا تھا۔

''ڈیڈ... میرا داخلہ نہیں ہو سکا۔'' وہ بولا۔

''کیوں......؟'' میں نے پوچھا۔

''وہاں جو میڈم ایڈمشن ٹیسٹ لے رہی تھی۔ اس نے مجھے فیل کر دیا..... وہ ظالم تھی ڈیڈ۔''

''اوہ..... بیٹا آپ نے غلط لکھا ہوگا۔ تبھی فیل ہوئے ہوں گے ناں......!'' میں نے کہا۔

''ڈیڈ میں نے سب ٹھیک لکھا تھا..... مگر وہ بہت بری تھی۔ اس نے سب کو پاس کر دیا اور مجھے فیل۔''

''آپ مایوس نہ ہوں۔ ہم کل دوبارہ چلیں گے۔ اور آپ کا ایڈمشن کرا آئیں گے۔''

جیک نے مجھے ایک نظر دیکھا اور چھت کی طرف بھاگ گیا تھا... وہاں چھت پر اس کا کمرہ تھا۔

میں اسے بلاتا رہا مگر اس نے میری ایک نہ سنی... میں آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھتا چھت پر پہنچا مگر... وہاں جیک نہ تو اپنے کمرے میں موجود تھا اور نہ ہی کسی اور جگہ۔

اچانک مجھے گلی میں لوگوں کی آواز سنائی دی، میں بھاگ کر پہنچا تھا۔ کیونکہ جیک نے چھت سے چھلانگ لگا دی تھی اور اس کا خون سڑک پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

جب تک میں اسے اسپتال لے گیا..... وہ راستے میں ہی دم توڑ گیا۔

جیک حساس طبیعت کا بچہ تھا۔ اس نے جذبات میں آ کر چھت سے چھلانگ لگا دیا تھا۔

روزی نہیں جانتی تھی کہ اسے کس نے مارا تھا... مرنے والا کب جان پاتا ہے۔

روزی کو کون تنگ کر رہا تھا۔

موت کا تعاقب مخصوص رفتار سے اسے اپنے شکنجے میں جکڑنے لگا تھا۔

جیک نے مرنے کے بعد روزی کو موت کے گھاٹ اتارا..... مگر کیوں.....؟

روزی تو انتظامیہ کی وجہ سے مجبور تھی اس میں روزی کا قصور کیا تھا۔

ڈائری میں لکھا احوال اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ روزی کو جیک نے ہی مارا تھا..... کیونکہ ڈائری پر لکھی گئی تاریخیں جیک کے مرنے کے بعد کی ہیں اس سے پہلے کے حالات تو محبت اور شکایتوں پر مبنی تھے۔

''جیک..... تم نے خود کو مار ڈالا..... روزی کو بھی... اور ہر روز تمہارے غم میں تمہارا باپ مرتا ہے۔ بیٹا کاش! تم جذبات میں ایسا نہ کرتے۔''

ظالم سلاطیہ

محمد قاسم رحمان۔ ہری پوری

جنگل کے وسط میں ایک خوبصورت دیدہ زیب تابوت پڑا تھا، تابوت کا ڈھکن کھلتے ہی اس جگہ موجود افراد ورطۂ حیرت میں پڑگئے کیونکہ تابوت میں ایک خوبرو حسینہ لیٹی تھی ایک ہزار سال سے اور پھر اچانک

برسوں دل ودماغ سے محو نہ ہونے والی ایک انمٹ حیرت انگیز تحیر انگیز اچھوتی کہانی

ریحانہ مجھ سے ناراض تھی اور میں بہت پریشان تھا۔ میں سب کچھ برداشت کرسکتا تھا مگر ریحانہ کی ناراضگی مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ ریحانہ سے میری ملاقات اس وقت ہوئی تھی جب میں میٹرک کے ایگزام دے کر گاؤں گیا تھا۔ راستے میں ریحانہ کنوئیں پر پانی بھر رہی تھی اور مجھے وہ پہلی ہی نظر میں بہت اچھی لگی تھی۔ اگلے دن ریحانہ کو اپنے گھر دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ بعد میں دادی سے معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ وہ میری دور کی کزن ہے۔ یعنی میری دادی کے بھانجے کی بیٹی ہے۔ یہ جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی کیونکہ ہمارے خاندان کی برسوں کی روایت ہے کہ شادی برادری سے باہر کسی صورت نہیں ہوسکتی۔ پھر میں نے امی سے اپنی خواہش کا اظہار کردیا۔ امی نے بھی ظالم سماج کا کردار ادا کرنے کے بجائے ایک اچھی ماں ہونے کا ثبوت دیا اور

میری اور ریحانہ کی منگنی بڑے آرام وسکون سے ہوگئی اور یہ طے پایا کہ جب مجھے جاب مل جائے گی تو شادی ہوجائے گی پھر چار سال گزر گئے۔

میں نے بی اے کا امتحان دیا اور گاؤں آ گیا۔ چار سالوں میں ریحانہ سے میرا رابطہ مستقل رہا اور مجھے یہ جان کر شدید حیرت ہوئی کہ ریحانہ مہینے میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں جنگل میں جاتی ہے۔ میں نے جب اس کی وجہ ریحانہ سے پوچھی تو وہ بولی۔ ''جمیل جنگل میں چاندنی رات میں بہت مزا آتا ہے۔ وہاں شبنم سے بھیگی ہوئی نرم نرم گھاس پر ننگے پیر چلتے ہوئے بہت زیادہ لطف محسوس ہوتا ہے۔''

ریحانہ کی باتیں سن کر میں ورطہ حیرت ہوگیا میں نے ریحانہ سے کہا۔ ''اگر کوئی جنگلی جانور یا درندہ تمہاری اس نرم نرم گھاس پر آ گیا تو میرا کیا ہوگا۔''

میری بات سن کر ریحانہ بولی۔ ''کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہمیشہ اچھا سوچنا چاہیے۔''

میں غصے میں بھول گیا کہ ریحانہ لفظ ''ڈھیٹ'' کو کس قدر ناپسند کرتی ہے۔ میں نے کہہ دیا ''ریحانہ تم بہت ڈھیٹ ہو۔'' اور ریحانہ ناراض ہوگئی۔

دو دن گزر گئے تھے اور ریحانہ راضی نہیں ہوئی تھی میں بہت ٹینشن میں تھا کہ ریحانہ کو کیسے راضی کروں۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرا دوست فواد آ گیا۔

''کیا ہوا جمیل! کیوں اتنے گم صم ہو؟'' فواد نے مجھ سے پوچھا۔

میں بولا۔ ''یار ریحانہ مجھ سے ناراض ہے۔ کیسے مناؤں اس کو۔''

''فواد کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا اور کچھ سوچتا رہا پھر ایک دم بولا۔ ''میرے پاس ایک آئیڈیا ہے۔''

''کیسا آئیڈیا؟'' میں نے جلدی سے پوچھا۔

''تم نے مجھے بتایا تھا کہ ریحانہ ہر چاند کی چودھویں رات جنگل میں گزارتی ہے۔ تم بھی کل جنگل میں جا کر اس کو سرپرائز دینا، وہ ایک دم مان جائے گی۔''

''ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو یہ ریحانہ کو منانے کا بہترین حل ہے۔'' میں خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''تو ٹھیک ہے۔ کل وہ جنگل میں جائے گی لیکن اس سے پہلے تم جنگل چلے جانا۔'' فواد نے کہا۔

میں بولا۔ ''یار میں اکیلا جنگل میں جاؤں گا، تم بھی میرے ساتھ چلو پلیز!''

فواد نے پہلے تو پس و پیش کی بعد میں اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

میں کیسے جنگل میں آیا تھا مجھے معلوم نہیں تھا۔ لیکن شاید میں راستہ بھول گیا تھا۔ اب اس گھنے جنگل میں شاید میں راستہ تلاش کر رہا تھا مجھے خود معلوم نہیں تھا۔ میں ایک عجیب گوشے میں آ گیا تھا۔ یہاں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ایک طرف ایک لمبا چوڑا گڑھا تھا۔ جبکہ اس گڑھے کے قریب ایک درخت تھا۔ وہ درخت پتوں سے بے نیاز تھا لیکن اس کی شاخوں کے سروں پر نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں اور ان نئی کونپلوں سے سرخ سرخ قطرے نیچے زمین پر گر رہے تھے۔

میں تجسس کے مارے اس درخت تک آیا اور یہ دیکھ کر میری خوف سے جان ہی نکل گئی کہ وہ قطرے خون کے قطرے ہیں۔

میں نے درخت کے نیچے دیکھا تو زمین پر مجھے صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں ایک تابوت رکھا ہوا تھا۔ فیروزی رنگ کا وہ تابوت مجھے تو بڑا ہی عجیب سا لگا۔ لیکن اچانک کوئی سایہ سا اڑتا ہوا آیا کہیں سے اور اس نے مجھے ایسے اٹھا لیا جیسے میں کوئی موم کی گڑیا ہوں وہ مجھے اٹھا کر لے جا رہا تھا کہ اچانک کہیں سے تیز طوفان آیا اور......

میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا نجانے کیسا پراسرار خواب تھا۔ میں خوف سے چور چور ہو چکا تھا۔ میں نے پاس پڑا ہوا پانی کا جگ دیکھا مگر اس میں پانی ختم ہوگیا تھا۔ میں کچن میں گیا وہاں جا کر پانی پیا اور واپس اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ کر سوگیا۔

صبح میری آنکھ ذرا دیر سے کھلی۔ ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوا تو امی کی کال آ گئی۔ امی شہر میں تھیں۔ میں اس مرتبہ گاؤں میں اکیلا آیا تھا۔ امی سے بات ہوئی تو انہوں

نے ابو سے بھی بات کروادی۔ ابو کے پاس خود تو کال کرنے کا ٹائم نہیں ہوتا کیونکہ وہ اپنے بزنس میں بہت بزی ہوتے ہیں۔ روایتی باتوں کے بعد سلسلہ منقطع ہوگیا۔

میں صحن میں چارپائی پر بیٹھا ہوا ریحانہ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ دادی نے مجھے آواز دی۔ ''جمیل جمیل ادھر آؤ۔''

میں دادی کے پاس گیا جو کچن میں کچھ بنا رہی تھیں۔ ''دادی آپ کیوں کام کررہی ہیں۔ چاچی سے کہتیں وہ بنادیتیں۔'' دادی کو کام کرتا دیکھ کر مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہا۔

دادی بولیں۔ ''بیٹا آسیہ تو مجھے منع کررہی تھی لیکن میرا دل لوکی کا حلوہ کھانے کو کررہا تھا اور آسیہ کے ہاتھوں کا بنا ہوا حلوہ مجھے پسند نہیں۔''

''دادی آپ نے مجھے کیوں بلایا؟'' میں نے پوچھا۔

دادی نے ٹفن میں حلوہ ڈالتے ہوئے کہا۔

یہ جاکر تم عابد کے گھر دے آؤ۔

میں نے بنا کچھ کہے دادی سے ٹفن لیا اور ماموں کے گھر کی طرف چل پڑا۔ عابد دادی کے بھانجے، میرے ماموں اور ریحانہ کے ابو تھے۔

گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں اندر چلا گیا تو سامنے بیٹھی ریحانہ نے منہ پھلالیا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ ابھی اس کی منتیں نہیں کروں گا۔

''یہ دادی نے بھجوایا ہے۔'' میں نے ٹفن میز پر رکھتے ہوئے کہا اور باہر نکل گیا۔ پیچھے سے میں نے ریحانہ کی بڑبڑاہٹ سنی۔ ''کھڑوس کہیں کا۔'' اس کی بات سن کر میں مسکرادیا اور واپس گھر کی طرف ہولیا۔

میں دو قدم ہی چلا تھا کہ سامنے سے میں نے فواد کو آتے ہوئے دیکھا۔ مجھے اس راستے پر دیکھ کر اس کے ماتھے پر بل پڑگئے۔

''میں نے تجھے منع کیا تھا ناں کہ تو ریحانہ سے کوئی بات نہیں کرے گا۔ ہم آج رات جنگل میں جاکر اس کو سرپرائز دے کر منالیں گے۔ مگر تجھے میری باتوں پر یقین کہاں ہے۔ تیرے نزدیک تو میں احمق ہوں ناں۔''

حسب روایت حسب معمول اس کا نان اسٹاپ ریڈیو کا بٹن آن ہوگیا تھا۔ ''میرے یار میری بات سن۔'' میں نے اس کو شانوں سے پکڑ کر کہا۔ ''کول ہوجاؤ، مجھے دادی نے حلوہ دینے کے لئے بھیجا تھا اور تم ہو کہ شروع ہوجاتے ہو۔''

''سوری۔'' فواد بولا اور میں نے سر اثبات میں ہلادیا۔

رات ہورہی تھی اور میں لیٹا ہوا تھا کہ فواد کا میسج آگیا۔ ''میں باہر آگیا ہوں۔ جلدی نکلو۔'' میں نے احتیاطاً ٹارچ بھی لے لی ہے۔''

میں نے فواد کو ٹافٹ میسج کیا۔ ''تم وہیں رکو میں پانچ منٹ میں آتا ہوں۔''

تقریباً آدھے گھنٹے میں ہم جنگل کے وسط میں کھڑے تھے۔ ''یار تیری محبوبہ تو کہیں نظر نہیں آرہی۔'' فواد نے مجھے چڑانے کے لئے کہا۔

میں بھی جھٹ سے بول پڑا۔ ''تمیز سے نام لے وہ تیری بھابھی ہے۔''

فواد نجانے کیوں چپ سا ہوگیا۔ ہم نے ریحانہ کو ڈھونڈنا شروع کردیا مگر وہ کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ اچانک فواد رک گیا۔ ''کیا ہوا؟'' فواد سے میں نے پوچھا۔

''یار جمیل آئی ایم سوسوری۔'' فواد نے کہا۔

میں بولا۔ ''کیوں کس لئے سوری کررہا ہے۔''

فواد ندامت سے چور لہجے میں بولا۔ ''یار آج چاند کی تیرہویں رات ہے اور میں جذبات میں یہ سمجھ بیٹھا کہ یہ چاند کی چودہویں ہے۔ ریحانہ آج نہیں آئے گی، ہمیں کل پھر آنا ہوگا۔''

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔'' میں غم و غصے کی حالت میں بولا۔ ''یہ جنگل ہے تمہارا کوئی ہوٹل نہیں۔ چلو واپس۔'' میں نے کہا اور ہم دونوں چاروں سمتوں کی طرف دیکھنے لگے۔ ریحانہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے نجانے ہم کس طرف آگئے تھے۔ ''کس سمت جانا ہے۔'' میں نے

فواد سے پوچھا۔
"مجھے خود نہیں معلوم۔" فواد بغلیں جھانکنے لگا۔
"دھت تیرے کی اب کیا ہوگا۔" میں واقعی پریشان ہوگیا تھا۔
"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ چلو شمال کی جانب چلتے ہیں۔ شاید راستہ مل جائے۔" فواد نے کہا۔
میں نے جواب دیا۔ "فواد یہ ساری غلطی تمہاری ہے۔ پہلے تم نے کہا کہ آج چاند کی چودھویں ہے۔ ہم بھول گئے اور اب اس طرح ری ایکٹ کررہے ہو جس طرح کچھ ہوا ہی نہیں۔"
فواد بولا۔ "جمیل یہ ٹائم لڑنے کا نہیں ہے۔ ہمیں واپسی کا راستہ ڈھونڈنا ہے۔" اور میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ہم دونوں ایک عجیب سی جگہ پر آگئے تھے۔ یہاں لمبی لمبی گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہم محتاط ہوکر آگے بڑھ رہے تھے۔ اس گھاس میں سانپ وغیرہ کا بھی ڈر تھا میں نے دور سے پانی کا ایک تالاب دیکھا تو میں حیران رہ گیا۔ یہ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور دیکھتا بھی کیسے میں پہلے کبھی اس جنگل میں نہ آیا تھا۔ بے اختیار مجھے میرا خواب یاد آگیا۔
"یار فواد مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔
فواد بولا۔ "ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جنگل سے نکل جائیں گے۔"
باتیں کرتے کرتے ہم آگے اس تالاب کے پاس آگئے تھے۔ اس تالاب سے ذرا ہٹ کر ایک درخت پتوں سے بے نیاز کسی بھوت کی مانند کھڑا تھا۔ درخت کے قریب دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی اور قریب کی ساری چیزیں بڑی واضح نظر آرہی تھیں۔ درخت کی نئی کونپلوں سے سرخ سرخ بوندیں نیچے زمین پر گررہی تھیں۔ "تو کیا میرا خواب حقیقت میں بدل رہا ہے۔" میں یہی سوچ رہا تھا۔

فواد درخت کے پاس گیا اور پھر خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "یار اس درخت سے تو خون کی بوندیں گررہی ہیں۔ مجھے کوئی آسیبی معاملہ لگتا ہے۔ یہاں سے فوراً نکلو۔"
میں نے سر اثبات میں ہلایا اور وہاں سے تقریباً ہم بھاگ گئے۔
آدھے گھنٹے کے تگ و دو کے بعد بالآخر ہم جنگل سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔
"یار میں اب ریحانہ کو کیسے مناؤں گا؟" میری بے بسی دیدنی تھی۔
فواد چڑ کر بولا۔ "یہاں ہم موت کے منہ سے باہر نکلے ہیں اور تجھے اپنی محبوبہ کی پڑی ہوئی ہے۔"
"تو کیا کل تم نہیں آؤ گے میرے ساتھ۔" میں بے بسی سے بولا۔
"نہیں۔" فواد نے کہا۔ "مجھے اپنی زندگی بہت عزیز ہے۔ میں اسے داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔" فواد نے کہا اور اپنے گھر کی طرف مڑ گیا۔ میں بھی گھر آیا اور شکر کیا کہ سب سو رہے تھے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو پونے تین کا ٹائم تھا۔ میں فٹافٹ بستر میں گھسا اور سوگیا۔
صبح میری آنکھ گیارہ بجے کھلی۔ سر بھاری ہورہا تھا۔ اور ٹمپریچر بھی ہورہا تھا۔ میں ہمت کرکے اٹھا اور جاکر نیم گرم پانی سے نہایا اور پھر چائے پینے کے بعد طبیعت ذرا بحال ہوئی۔ میں باہر نکل آیا اور ایک طرف چلنے لگا بے مقصد...... میں سوچ رہا تھا کہ "کیا کروں ریحانہ کو کیسے مناؤں اوپر سے فواد میرے ساتھ جنگل میں چلنے کے لئے تیار نہیں۔" کل رات جو ہوا اس نے میرے اعصاب کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ میں اس پراسرار درخت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ انسان کی فطرت میں تجسس کا مادہ کچھ زیادہ پایا جاتا ہے۔ مجھے بھی تجسس تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر ماجرہ کیا ہے۔ لیکن فواد ساتھ چلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ سوچتے سوچتے پتا بھی نہ چلا کہ میں کب ریحانہ کے گھر کے قریب آگیا۔ مجھے پتا نہ چلا۔ میں نے سوچا ایک کوشش اور کرلیتا ہوں اور میں ریحانہ کے گھر کے اندر چلا گیا۔ ریحانہ کی امی کا تو بہت پہلے انتقال ہوچکا تھا۔ کوئی بہن بھائی بھی نہ تھا اور ماموں کھیتوں میں کام کرتے تھے

اس لئے ریحانہ اکیلی ہی ہوتی تھی۔

میں گھر میں داخل ہوا تو ریحانہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کررہی تھی۔ میں ریحانہ کے قریب چلا گیا۔ ریحانہ نے مجھے دیکھا اور بولی۔ ''ابو گھر میں نہیں ہے۔ کیا کام ہے تمہیں؟''

''ریحانہ آئی ایم سوری۔'' میں نے کہا اور رات میں ہونے والا سارا واقعہ اس کو بتادیا۔

میری باتیں سن کر ریحانہ بولی۔ ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔''

''تمہاری قسم میں سچ کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے کل رات ہم دونوں ادھر چلیں گے اور دیکھتے ہیں کہ ماجرہ کیا ہے۔'' ریحانہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

''لیکن ریحانہ کچھ غلط نہ ہوجائے۔'' میں بولا۔

ریحانہ بولی۔ ''کچھ نہیں ہوتا۔'' میں بھی ریحانہ کی ناراضگی کے ڈر سے چپ ہوگیا۔

دوسرے روز کی شام بہت سہانی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور میں صحن میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے امی کا فون آیا تھا۔ وہ واپس آنے کا کہہ رہی تھیں اور میں نے بھی کہہ دیا کہ میں ایک ہفتے میں آجاؤں گا۔

تھوڑی دیر بعد فواد آ گیا۔

''جمیل کیسے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں تمہاری وہ دعائیں ہیں جو تم نے کبھی کی ہی نہیں۔''

''اچھا یار سوری۔ کل ہم جنگل میں جائیں گے اور پتہ لگائیں گے کہ اس درخت کے کیا اسرار ہیں۔''

میں نے فواد کو بتایا کہ ''ریحانہ مجھ سے راضی ہوگئی ہے اور وہ بھی اس درخت کے اسرار جاننا چاہتی ہے۔''

''تو ٹھیک ہے۔ کل رات ہم تینوں جنگل میں جائیں گے۔'' فواد نے کہا۔

میں بولا۔ ''یار پہلے میں ریحانہ سے پوچھ لوں ناں کہ وہ تمہیں ساتھ لے جانے پر آمادہ بھی ہے کہ نہیں۔''

''ٹھیک ہے اسے کال کرو بلکہ میسج کردو۔'' میں نے ریحانہ کو میسج کیا اور اسے بتایا کہ فواد ہمارے ساتھ جانا چاہتا ہے۔ کچھ دیر میں اس کا جواب آ گیا۔ ''ایک سے بھلے دو، دو سے بھلے تین۔''

ریحانہ نے رات کو ہمارے گھر رکنے کا پلان بنایا ہوا تھا۔ تاکہ رات کو ہم آسانی سے اپنا مشن سرانجام دے سکیں۔ ریحانہ چاچی کے کمرے میں سوئی تھی بلکہ سونے کی اداکاری کی تھی۔ رات نو بجے میں نے ریحانہ کو میسج کیا کہ ''چلو باہر آجاؤ۔'' تھوڑی دیر میں ریحانہ صحن میں آ گئی اور پھر ہم دونوں گھر سے باہر گلی میں نکل آئے۔ گلی سنسان وویران تھی۔ ''فواد کدھر مر گیا؟'' ریحانہ نے پوچھا۔

''اسے فون کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور اپنا موبائل نکالا تو لو بیٹری کی وجہ سے شٹ ڈاؤن ہوچکا تھا۔ اچانک سامنے سے فواد آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ جب وہ قریب آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک کدال تھی۔

ریحانہ بولی۔ ''یہ کیوں لے کر آئے ہو؟''

فواد بولا۔ ''جنگل میں کسی بھی جنگلی جانور سے ٹکراؤ ہوسکتا ہے اس لئے لے کر آیا ہوں۔''

خیر ہم تینوں جنگل کی طرف چل پڑے۔ ہم جنگل میں جب پہنچے تو ریحانہ بولی۔ ''کدھر ہے آپ کا وہ پراسرار درخت؟''

میں نے کہا۔ ''ریحانہ جنگل بہت وسیع ہے۔ ہمیں درخت ڈھونڈنا پڑے گا۔''

''تو چلو ڈھونڈتے ہیں۔'' ریحانہ بولی۔

''ریحانہ تمہیں ڈر نہیں لگ رہا۔'' فواد بولا۔

ریحانہ نے جواب دیا۔ ''ڈر کس بات کا۔''

ریحانہ تم واقعی بہت الگ ہو۔ ورنہ تمہاری جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ کپکپاتی۔'' میرے لہجے میں ریحانہ کے لئے ستائش تھی۔

ریحانہ فٹ سے بولی۔ ''زیادہ مسکا لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کام کے لئے آئے ہو وہ کرو۔''

آدھے گھنٹے سے کچھ زیادہ ٹائم لگا تھا ہمیں وہ جگہ ڈھونڈنے میں، بالکل ویسی ہی جگہ تھی جیسی ہم چھوڑ کر گئے تھے۔

ریحانہ نے اس پراسرار درخت کا غور سے مشاہدہ کیا۔

''اب ہم کیسے جانیں گے کہ یہ سب کیا ہے؟'' فواد بولا۔

''ایک طریقہ ہے۔ ہم درخت کے نیچے کھدائی کرتے ہیں اور ویسے بھی میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ درخت کے نیچے ایک فیروزی رنگ کا تابوت ہے۔'' میں نے کہا۔

''تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی۔'' فواد بولا۔ میں نے چڑ کر کہا۔''اب ہر بات تمہیں بتانا ضروری ہے کیا۔''

''بالکل۔'' فواد نے کہا۔

''اس وقت لڑو مت۔'' ریحانہ بولی۔''بعد میں لڑنا پہلے کھدائی کرتے ہیں۔''

مجھے ریحانہ پر بہت حیرت ہو رہی تھی یہ تو میں جانتا تھا کہ وہ ایک بہادر لڑکی ہے۔ لیکن اتنی بہادر ہے اس بات کا مجھے نہیں پتہ تھا۔

فواد اور میں نے کھدائی شروع کر دی۔ آدھے گھنٹے کی کھدائی کے بعد مٹی کا رنگ ہرا ہونے لگا۔

''یہ مٹی تو عجیب رنگ کی ہے۔ یقیناً کچھ نہ کچھ تو ہے۔'' ریحانہ نے کہا۔

اچانک کھدائی کے دوران مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ نیچے کوئی کھردری چیز ہے۔ میں نے فواد سے کہا کہ ''نیچے کوئی کھردری چیز ہے۔ ہاتھ سے مٹی ہٹاؤ۔''

فواد نے سر اثبات میں ہلایا اور ہم ہاتھ سے مٹی ہٹانے لگے۔

آج بھی اس جگہ صاف و شفاف دودھیا روشنی موجود تھی اور ہر چیز واضح نظر آ رہی تھی۔

جلد ہی ہم نے فیروزی رنگ کا ایک تختہ دیکھا اور مزید کھدائی کے بعد پتہ چلا کہ وہ تابوت ہے۔ میں نے اور فواد نے تابوت باہر نکالا۔ ریحانہ دلچسپی سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ وہ بولی۔''جلدی سے تابوت کو کھولو۔'' تابوت کو تالا نہیں لگا ہوا تھا ہم نے آسانی سے تابوت کھول دیا۔ تابوت کو کھولنا تھا کہ ہم تینوں کو حیرت کے جھٹکے لگنے لگے۔

تابوت میں ایک خوبرو حسینہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں بال سنہری تھے اور اس نے لمبی سی پوشاک پہنی ہوئی تھی۔ قریب ہی ایک چھوٹا سا شیشے کا بکس موجود تھا۔ چھوٹا سا تھا اور اس میں خونی رنگ کی ایک جلد والی موٹی سی کتاب تھی۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' ریحانہ حیرت سے بولی تو ہم دونوں کیا جواب دیتے ہم دونوں بھی ورطہ حیرت تھے۔

میں بولا۔''ہمیں کتاب کو دیکھنا ہوگا۔ کیا پتہ اسرار سے پردہ اٹھانے کے لئے کوئی کلیو مل جائے۔''

ریحانہ بولی۔''جمیل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ کتاب اٹھاؤ۔'' میں نے وہ بکس اٹھایا اور زمین پر دے مارا۔ میں نے کتاب اٹھائی۔ سامنے ٹائٹل پر اس لڑکی کی ہی تصویر تھی۔ کتاب کا نام ''ظالم سلاطیہ'' تھا۔ کتاب اردو میں اور ہاتھ سے لکھی گئی تھی۔

ہم تینوں وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے کتاب کھولی۔ دودھیا روشنی اس قدر تھی کہ کتاب کی تحریر صاف طور سے نظر آ رہی تھی۔

کتاب کی تحریر تھی سب جانتے تھے کہ بادشاہ بہت رحم دل ہے مگر اپنا رعب دوسرے لوگوں پر رکھنا چاہتا تھا۔ اس وقت بھی بادشاہ اپنے اسی رعب و دبدبے اور کروفر سے اپنے تخت پر براجمان کسی کتاب کے مطالعے میں مشغول تھا کہ اس کا مقرب خاص اس کے کمرے میں داخل ہوا اور جھک کر آداب بجا لایا۔

''بادشاہ سلامت میری بیٹی پیدا ہوئی ہے میں کچھ دن اپنے اہل خانہ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں۔''

بادشاہ نے اپنے مقرب خاص کی طرف دیکھا اور پھر یکدم مسکراتے ہوئے بولا۔''بہت مبارک ہو تمہیں، بیٹی کا نام کیا رکھا ہے؟''

مقرب بولا۔''بادشاہ سلامت اس کا نام اس کی ماں نے سلاطیہ رکھا ہے۔''

''بہت خوبصورت نام ہے۔ ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں ایک ہفتے کی چھٹی دیتے ہیں۔''

مقرب نے ایک بار جھک کر بادشاہ کی تعظیم کی اور

چلا گیا۔

مقرب کے جانے کے بعد وہاں ایک گول مٹول سا بچہ حاضر ہوا۔

"آؤ میرے بیٹے۔" بادشاہ بولا۔ وہ بچہ بادشاہ کا بیٹا تھا اس کا نام زنتاش تھا۔

"بابا جان ابھی تھوڑی دیر پہلے کون آیا تھا؟" زنتاش نے پوچھا۔

بادشاہ نے اپنے بیٹے کو اپنے قریب بیٹھایا اور بولا۔ "میرا مقرب خاص آیا تھا۔ کچھ دن کی چھٹی لینے کے لئے۔"

"چھٹی کیوں؟" زنتاش نے ایک بار پھر سوال کیا۔

"اس کے گھر پیاری سی بیٹی پیدا ہوئی ہے اس لئے۔"

"بابا ہم بھی جائیں گے، اس کی بیٹی دیکھنے کے لئے۔" زنتاش نے ضد کی۔

"بیٹا ہم کیسے جاسکتے ہیں۔ یہ کیسی ضد ہے۔" بادشاہ نے کہا تو زنتاش نے رونا شروع کر دیا۔

"اچھا روؤ مت تم چلے جانا، میں تمہیں وہاں بھجوا دوں گا۔" بادشاہ نے کہا اور زنتاش خوش ہو گیا۔

شام کے وقت جب شہزادہ، مقرب خاص کے گھر میں داخل ہوا تو گھر والوں کا مارے خوشی کے برا حال تھا۔ زنتاش نے ننھی سی سلاطیہ کو دیکھا اور اس کو گود میں اٹھا کر خوش ہونے لگا۔

☆......☆......☆

وقت کے پرندے نے اپنی اڑان بھری اور سترہ سال گزر گئے۔ ان سترہ سالوں میں ہر کوئی یہ جان گیا تھا کہ زنتاش، سلاطیہ اور سلاطیہ سے زنتاش سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہے۔ بادشاہ نے بھی یہ بات تسلیم کر لی تھی لیکن ملکہ کو یہ بات ناپسند تھی کیونکہ اس کو سلاطیہ پسند نہیں تھی۔ سلاطیہ بھی یہ بات جان گئی تھی کہ شہزادے اور اس کی محبت کے درمیان سب سے بڑا کانٹا زنتاش کی ماں ہے اور پھر سلاطیہ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس کانٹے کو ہٹا کر رہے گی۔

سلاطیہ جانتی تھی کہ ملکہ کے پاس طاقتوں کا انبار ہے وہ ایک شکتی شالی جن زادی ہے۔ اور پھر سلاطیہ نے اپنے استاد سے مشورہ کیا تو استاد نے بتایا کہ "ایک عمل ہے جس کے ذریعہ ملکہ کو زیر کیا جاسکتا ہے مگر اس عمل میں 21 انسانوں کا خون درکار ہوگا۔ اور تم وہ عمل کر کے کامیاب ہوسکتی ہو، یعنی یہ کہ ملکہ موت سے ہمکنار ہو جائے گی۔"

انسانی بستی اس قبیلے سے زیادہ دور نہیں تھی اور یہ قبیلہ ایک گاؤں سے ذرا فاصلے پر کھنڈرات میں مقیم تھا۔

سلاطیہ نے لوگوں کا خون پینا شروع کر دیا۔ اس نے سولہ انسانوں کا خون پی لیا تھا۔ یہ بات نجانے کیسے بادشاہ کو معلوم ہوگئی۔ جب سلاطیہ کو بادشاہ نیست و نابود کرنے کے لئے آرہا ہے تو زنتاش نے بادشاہ کی منتیں اور واسطے دے کر ایسا کرنے سے روکا اور بادشاہ سے وعدہ کیا کہ وہ سلاطیہ کو ایسا کرنے سے روکے گا۔

زنتاش سلاطیہ کے پاس گیا اور سلاطیہ سے ایسا گھناؤنا کام کرنے کی وجہ پوچھی۔ جواباً سلاطیہ نے بتایا کہ "وہ اس کی ماں کو مارنے کے لئے ایسا کر رہی ہے۔"

زنتاش کو بہت غصہ آیا اور اس نے اپنی طاقتوں کی مدد سے سلاطیہ کو تابوت میں دفن کیا اور ساتھ میں یہ کتاب لکھ ڈالی۔

آخر میں لکھا ہوا تھا کہ "سلاطیہ سے میں بے انتہا محبت کرتا ہوں مگر ایک خونی اور ایک ایسے وجود کو کبھی معاف نہیں کر سکتا جو میری ماں کی جان لینا چاہتا ہو۔ میں اپنے علم سے دیکھ رہا ہوں کہ تین انسان اس تابوت کو صدیوں بعد دیکھیں گے اور ان تین انسانوں میں سے کسی ایک کے جسم میں سلاطیہ کی روح حلول کر جائے گی۔"

آگے صفحات خالی تھے۔ ہم تین لوگوں پر جیسے سکتہ سا چھا گیا تھا۔ گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ فواد ڈرتے ہوئے بولا۔ "اب کیا ہوگا۔ سلاطیہ زندہ ہو جائے گی؟"

ریحانہ بولی۔ "اللہ پر بھروسہ رکھو کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے اپنی ریسٹ واچ پر ٹائم دیکھا۔ دو بج رہے تھے۔ "ہمیں واپس جانا ہوگا، جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ریحانہ بولی۔ "اس تابوت اور کتاب کا کیا کریں؟"

"میرے خیال میں کتاب ساتھ لے چلتے ہیں۔" میں نے کہا اور ہم سب واپسی کے لئے چل پڑے۔

ایک گھنٹے بعد میں اپنے گھر میں تھا۔ وہ کتاب میرے ہاتھ میں تھی۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں بہت ٹینشن میں تھا، مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کچھ بہت ہی برا ہونے والا ہے۔ کمرے میں بہت گھٹن ہو رہی تھی اس لئے میں چھت پر آ گیا۔

ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ میں چھت پر راؤنڈ لگانے لگا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کوئی اور بھی یہاں موجود ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہاں وہی لڑکی کھڑی تھی۔ ہاں وہ سلاطیہ ہی تھی..... اس کے بال ہوا کے دوش پر لہرا رہے تھے۔

میں نے فوراً وہاں سے دوڑ لگائی پیچھے سے مجھے سلاطیہ کے ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں اپنے کمرے میں آیا۔ منہ پر چادر لی اور آنکھیں موند لیں۔ پھر نجانے کب مجھے نیند آ گئی۔ صبح دادی کے شور سے میری آنکھ کھلی تھی۔ دادی کہہ رہی تھیں۔ "ریحانہ بیمار ہو گئی ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "کیا ہوا ریحانہ کو؟" تو دادی کا جواب سن کر مجھے زمین اور آسمان گھومتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ "ریحانہ پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔"

"کیا!" مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ میں کس طرح ری ایکٹ کروں، مجھے کتاب والی بات یاد آ گئی تھی۔ "کہ کسی ایک میں سلاطیہ کی روح حلول کر جائے گی۔"

میں بستر سے اٹھا اور باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ دادی یہی سمجھی تھیں کہ میں ریحانہ کے گھر جا رہا ہوں۔ لیکن میں فواد کو سب کچھ بتانے کے لئے جا رہا تھا۔ رات کو بھی میں نے سلاطیہ کو دیکھا تھا، نجانے کیا ہونے والا تھا۔ دماغ میں طرح طرح کے اندیشے آ رہے تھے۔ میں فواد کے گھر گیا اور اسے ریحانہ کے بارے میں بتایا۔ فواد بولا۔ "یار جمیل میں نے بھی کل سلاطیہ کو دیکھا تھا وہ میری جانب دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ میری بات اور ہے تو ریحانہ کے گھر جا اس کی حالت دیکھ پھر سوچتے ہیں کہ کیا کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "فواد تو ٹھیک کہہ رہا ہے، اچھا میں ماموں کے گھر جا رہا ہوں۔"

میں ماموں کے گھر آیا۔ کمرے میں ماموں کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ساتھ میں میری خالہ اور چاچی بھی ادھر ہی تھیں، میں کمرے میں داخل ہوا تو کسی نے بھی کچھ خاص نوٹس نہ لیا۔ میں نے ماموں سے کہا۔ "کسی اللہ والے کو دکھایا ہے؟"

مسجد کے پیش امام صاحب کے پاس گیا تھا۔ لیکن انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔ جمیل بیٹا ریحانہ کی حالت کے پیش نظر میں بہت پریشان ہوں۔" ماموں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اچانک ریحانہ نے آنکھیں کھول دیں۔ ریحانہ کی آنکھیں اس طرح سرخ ہو رہی تھیں جیسے ان میں کسی نے خون انڈیل دیا ہو۔ ہم سب نے ریحانہ کی طرف دیکھا۔ ریحانہ نے چلانا شروع کر دیا۔ اس کی چیخوں سے در و دیوار کانپنے لگے۔ وہ پھر ایک دم چپ ہو گئی اور اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر ہنستی رہی پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔

مجھ سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرا رخ فواد کے گھر کی جانب تھا۔ فواد مجھے باہر ہی مل گیا۔ میں نے فواد کو ساری صورتحال بتائی۔ تو فواد نے کہا۔ "جمیل ہمیں شہر میں کسی عامل سے رجوع کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے فواد چلتے ہیں لیکن اس وقت شہر جانے والی کوئی گاڑی نہیں ملے گی۔" فواد نے کہا۔ "کوئی بات نہیں ہم بائیک پر چلتے ہیں۔"

ہم شہر پہنچ کر ایک بزرگ کے آستانے میں گئے۔ ہم انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے اپنے نمبر کا انتظار کر رہے تھے۔ عامل صاحب کا نام "گلاب شاہ" تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کے جان لیوا انتظار کے بعد ہمارا نمبر آیا۔ ہم کمرے میں گئے۔ کمرے میں لوبان اور اگربتیوں کی مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ فرش پر ایک کارپٹ پڑا ہوا تھا، عامل صاحب سفید لباس میں ملبوس تھے۔ آنکھوں سے چمک اور چہرے سے روحانیت ٹپکتی تھی۔ انہوں نے پوچھا۔ "بولو بیٹا کیا مسئلہ ہے؟"

میں نے ان کو بتانا شروع کیا اور پھر آخر تک سب کچھ

بتا دیا۔ وہ میری تمام باتیں نہایت توجہ سے سنتے رہے۔
میری بات ختم ہوئی تو وہ آنکھیں بند کرکے مراقبے کی حالت میں بیٹھ گئے۔
پانچ منٹ بعد انہوں نے آنکھیں کھولیں اور بولے۔ ''بیٹا آپ کا مسئلہ بہت سنگین ہے۔ آپ لوگ کل اسی وقت آ جانا۔ پھر ہم آپ کے ساتھ آپ کے گاؤں چلیں گے۔''
فواد ڈرتے ہوئے بولا۔ ''شاہ صاحب آپ کا ہدیہ کتنا ہے؟''
عامل صاحب نے پہلے تو فواد کو طیش کے ساتھ دیکھا پھر بولے۔ ''بس میرے لئے دعا کیا کرنا۔''
ہم واپس گاؤں آ گئے۔ گاؤں میں ہر کسی کو پتہ چل گیا کہ ریحانہ پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ ہر عورت ہر بچہ بس یہی کہہ رہا تھا کہ ''ریحانہ آسیبی ہو گئی ہے۔''
ٹینشن کی وجہ سے ماموں کا بی پی لو ہو گیا تھا اور وہ بستر سے لگ گئے تھے۔
جب میں رات میں سونے کے لئے بستر پر لیٹا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا تھا کیونکہ یہ سب میری وجہ سے ہو رہا تھا، نہ میں جنگل جاتا اور نہ یہ سب ہوتا، لیکن اس میں کہیں نہ کہیں غلطی ریحانہ کی بھی تھی، اس نے جنگل جانے کی بے حد ضد کی تھی۔ خیر جو ہوا سو ہوا اب آنے والے کل کے بارے میں سوچنا تھا۔
اگلے روز میں اور فواد عامل صاحب کے آستانے پر چلے گئے۔ اس مرتبہ ہماری باری کچھ ہی دیر میں آ گئی۔ ہم اندر گئے اور عامل صاحب کے پاس بیٹھ گئے۔
وہ بولے۔ ''کچھ وجوہات کی بنا پر میں آپ کے ساتھ نہیں جا سکتا لیکن اس مسئلے کا حل میں نے ڈھونڈ لیا ہے۔''
''جی فرمائیں کیا حل ہے؟'' میں بے صبری سے بولا۔ عامل صاحب بولے۔ ''تمہیں سلاطیہ کے جسم اور اس کتاب کو جلا کر خاکستر کرنا ہوگا۔''
''اس کے علاوہ کوئی اور حل نہیں ہے؟'' فواد نے پوچھا۔
''نہیں اس کے علاوہ کوئی حل نہیں ہے۔'' عامل صاحب بولے۔
چاندنی رات تھی۔ میں اور فواد جنگل میں جا رہے تھے۔ فواد کے ہاتھ میں ایک کین تھا۔ اس کین میں مٹی کا تیل تھا۔ ہم تقریباً ایک گھنٹے میں وہ جگہ تلاش کر چکے تھے۔
عامل صاحب نے ایک بوتل میں دم کیا ہوا پانی دیا تھا اور فرمایا تھا کہ تابوت کے پاس پہنچ کر اس پانی کو تابوت کے چاروں طرف حصار کی صورت میں چھڑک دینا اور تھوڑا پانی تم دونوں اپنے جسم پر بھی چھڑک لینا۔
درخت کے قریب پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ سلاطیہ اسی طرح تابوت میں پڑی ہوئی تھی جس طرح ہم چھوڑ کر گئے تھے۔
پھر ہم نے عامل صاحب کے بتائے ہوئے طریقے پر عمل کیا۔ پھر میں نے سلاطیہ کے لاش نما جسم پر مٹی کا تیل اور ساتھ میں کتاب رکھی اور آگ لگا دی۔ آگ نے جیسے ہی کتاب کو چھوا، اس منحوس درخت کو بھی آگ لگ گئی۔ فواد اور میں نے وہاں سے دوڑ لگا دی۔ جلد ہی ہم گاؤں آ گئے، میں اپنے گھر گیا اور بستر پر لیٹ کر تمام واقعات پر غور کرنے لگا کہ اب نہ جانے کیا ہوگا۔
صبح میں جلدی اٹھا اور ریحانہ کے گھر گیا۔ ریحانہ ٹھیک ہو چکی تھی اور ماموں جان بے انتہا خوش تھے۔ ریحانہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''جمیل مجھے کیا ہوا تھا؟'' کمرے میں میرے اور ریحانہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس لئے ریحانہ کو میں نے سب کچھ صاف صاف بتا دیا۔
''سوری جمیل! میری وجہ سے یہ سب ہوا۔'' ریحانہ نے کہا۔
''سوری کی کوئی بات نہیں جانو۔'' میں نے کہا اور ریحانہ کے چہرے پر جھکنے لگا تو وہ مسکراتی ہوئی بولی۔ ''ہٹو پرے۔'' اور کمرے سے بھاگ گئی تو میں بے اختیار مسکرا دیا۔
چند ماہ بعد ریحانہ کے ساتھ میری شادی ہو گئی اور ہم دونوں نے زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر دیا۔

موت کا فرشتہ

پیا سحر - گجرات

حصار میں بیٹھنے والے بپھری ہوئی بدروح کو دیکھ کر تھرا اٹھے، آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور رگوں میں دوڑتا ہوا لھو منجمد ہونے لگا کہ اچانک بدروح طیش میں آکر حصار کی طرف بڑھی اور حصار سے ٹکراتے ہی زبردست دھماکہ ہوا پھر

بھولی بھالی صورت والے ہوتے ہیں جلاد بھی، اسی کے مصداق پراثر کہانی

''**یا اللہ** مجھے کیا ہو گیا۔ مجھ سے کام کیوں نہیں ہو رہا؟''

کاغذ اور قلم میرے سامنے پڑے میرا منہ چڑا رہے تھے اور میں خالی الذہنی کے عالم میں انہیں گھورے جا رہا تھا، ادھر ادارے والوں کا اصرار روز بروز بڑھ رہا تھا، میں انہیں جھوٹی تسلیاں دے دے کر ٹال رہا تھا لیکن آخر کب تک ٹال سکتا تھا خاص نمبر کی اشاعت میں بہت کم عرصہ رہ گیا تھا، میں ابھی تک خاص نمبر کے لئے اپنی خاص الخاص تحریر کا پلاٹ بھی ترتیب نہ دے پایا تھا ذہن پر جیسے دھند چھائی تھی سوچوں پر جمود طاری تھا کچھ بھی لکھنا دشوار تھا۔

ایک وقت تھا کہ الفاظ میرے سامنے ہاتھ باندھے قطار میں کھڑے رہتے اور ایک یہ وقت کہ لاکھ چاہنے کے باوجود میں ایک جملہ بھی لکھ نہ پا رہا تھا۔

پچھلے ڈیڑھ ماہ سے میں یونہی ٹیبل پر بیٹھتا اور اپنی کہانی شروع کرنے کی کوشش کرتا مگر کیسی اور کہاں کی کہانی، جیسے ہی میں قلم ہاتھ میں پکڑتا میرے دماغ سے سب کچھ بھک سے اڑ جاتا اور میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا۔

کلینڈر پر تاریخ دیکھ کر مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی، بے بسی ہی بے بسی تھی میں ایک معروف رائٹر ابن آدم جس کی کہانیوں کی دھوم مچی ہوئی تھی جس کے ایک ایک لفظ پر قارئین بہت اشتیاق سے تبصرہ کرتے تھے، فینز کے خطوط کا ڈھیر تقریباً روزانہ ہی مجھے موصول ہوتا تھا، میرا نام ہی اسٹوری کے ہٹ ہونے کے لئے کافی تھا، ایڈیٹر پبلشرز فون پر فون کرتے تھے کہ اگلی کہانی یا ناول ان کے لئے لکھا جائے۔

فرسٹریشن بڑھتی جا رہی تھی میں نے سر کے بالوں کو دونوں ہاتھوں کی مٹھیوں میں لے کر بھینچ لیا۔ فوراً سے یہ خیال ذہن میں کوندے کی طرح لپکا کہ مجھے آرام کرنا چاہئے میں نے دراز کھول کر ذہن کو پرسکون کرنے والی گولیوں کی شیشی نکالی اور تین گولیاں ایک ساتھ نگل کر پانی کا گلاس منہ سے لگایا اور غٹا غٹ پی گیا۔ جلد ہی نیند کے جھونکے آنے لگے تو میں جلدی سے کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر آ لیٹا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

بہ مشکل پندرہ منٹ ہی سویا ہوں گا کہ دروازے پر زور زور سے دستک ہونے لگی، میں گہری نیند میں تھا دروازہ دھڑ دھڑانے سے میرے دماغ پر جیسے چوٹ پڑ رہی تھی دروازہ مسلسل بج رہا تھا ناچار اٹھ کر مندی

آنکھوں سے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ ایک شخص کھڑا ہے عجیب ہی ہیئت تھی اس کی، میں سمجھ نہیں پا رہا تھا وہ بوڑھا ہے یا جوان ہے، اس کا چہرہ برف کی مانند ٹھنڈا پڑا ہوا لگ رہا تھا آنکھیں بے نور سی تھیں اس نے عجیب سا سفید لباس پہن رکھا تھا۔

اس آدمی کا حلیہ دیکھ کر میری نیند سے بوجھل آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں۔

''جی فرمایئے۔'' میں نے اخلاقاً پوچھا ویسے میں اندر سے پورا لرز گیا تھا۔ میری بات سن کر وہ مسکرانے لگا۔

''موت کا فرشتہ۔'' وہ بولا تو ڈر کے ساتھ ساتھ مجھے غصہ بھی آنے لگا۔

''جاؤ بھائی اپنا کام کرو۔'' یہ کہہ کر میں نے دروازہ بند کرنا چاہا۔ لیکن یہ کیا وہ جھٹ سے دروازے کے بیچوں بیچ آڑ بن کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔

''اندر آنے دو مجھے۔'' اس کی آواز ہر قسم کے تاثر سے عاری اور سرد تھی۔ میں نے کچھ کہے بغیر دروازے کو زور لگانا شروع کر دیا اتنی ہمت نہ تھی کہ اس آدمی کو دھکا دے پاتا، دروازے پر میرے زور لگانے کا کچھ اثر نہ ہو رہا تھا میری دھڑکنیں خوف سے بند ہونے کے قریب ہو گئیں۔ ایڑی سے چوٹی تک کا زور لگا دیا۔ نہ تو دروازہ اپنی جگہ سے ہلا اور نہ ہی وہ آدمی، میں نے جلدی سے دل میں فیصلہ کیا اور دروازے کو چھوڑ کر دونوں ہاتھوں سے اس آدمی کو پورے زور سے دھکا دیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی میں تھر تھر کانپنے لگا۔

وہ آدمی اپنی جگہ سے غائب تھا، جسے ابھی ابھی میرے دونوں ہاتھوں نے چھوا تھا، وہ اٹل حقیقت کی طرح میری آنکھوں کے سامنے دروازے میں جم کر کھڑا تھا، اب ایک دم سے وہ کہاں غائب ہو گیا، مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا، میں نے ہاتھوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا اور ایک ہاتھ پر چٹکی کاٹی۔

''تو گویا یہ حقیقت ہے میں جاگ رہا ہوں۔'' ابھی میں وہیں کھڑا کشمکش کے عالم میں تھا کہ نجانے کس کونے سے ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا دروازہ ٹھک سے بند ہو گیا۔

خوف سے میری گھگھی بندھ گئی ایک قدم بھی اٹھانا محال ہو گیا بمشکل خود کو سمجھا بجھا کر بیڈ تک لایا اور سمٹ سکڑ کر لیٹ گیا۔ اس کے بعد میں دنیا و مافیہا سے بیگانہ ہو گیا۔

دوسرے دن کا سورج حسب معمول نکلا آنکھ کھلتے ہی رات کے واقعات میرے ذہن میں کلبلانے لگے میں نے اس کو خواب سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا اور فریش ہو کر فلیٹ سے نکل کھڑا ہوا، گھر سے باہر کی دنیا تو ویسی کی ویسی ہی رواں دواں تھی گاڑیوں کا دھواں ہارن کی آواز پیڑ پودے، گاڑیوں اور رکشوں کے پیچھے بھاگتے بھکاری سڑک کے کنارے، پھل والے ریڑھی بان آوازیں لگاتے ہوئے سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔ اور مسافر خانے کی دیوار کے ساتھ بیٹھا وہ میلا کچیلا آدمی بھی معمول کے مطابق وہیں سکڑا سمٹا بیٹھا تھا اس کے پاس ہی ایک میلا سا کمبل اور دو چار گندے برتن پڑے تھے جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں اس کی ظاہری حالت ایسی تھی کہ کسی بھی نفیس آدمی کا جی اس کو دیکھ کر متلانے لگے مگر پھر بھی لوگ بہت شوق سے اس کے پاس آتے اس کے پاؤں دباتے چائے لا کر پلاتے اور اپنے مسئلے مسائل بھی بیان کرتے، میں اسے غور سے دیکھتے ہوئے گزر گیا، ایک عام سے ہوٹل میں ناشتہ کرنے کے بعد میں گھر لوٹ آیا۔

اپنے فن کے جادو کو جگانے کی تمام کوششیں بے کار ہوتی جا رہی تھیں میں نے بہت کوشش کی کہ اپنے آپ کو ایک کردار کے روپ میں ڈھال کر اس کے احساسات اور جذبات کو محسوس کروں اور ان کو قلمبند کر لوں، کردار میں ڈھلنا تو دور کی بات میں تو اپنا ہی اصلی چہرہ بھول گیا تھا۔ میرے احساسات وجذبات کہاں گئے کچھ بھی محسوس کیوں نہیں ہوتا، محبت نہ ہی نفرت، کیا کروں میرے خدا اپنی ہی سوچوں کی یلغار سے گھبرا کر میں دوسرے دن فلیٹ سے نکلا اور وہیں دیوار کے ساتھ بیٹھے آدمی کے کچھ نزدیک ایک جگہ پر بیٹھ کر لوگوں کو دیکھنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں یہاں تک کیوں آ گیا۔

لاشعوری طور پر قدم خود بخود اس جانب اٹھ آئے

تھے اس فقیر کے بارے میں میری رائے پہلے کی نسبت بدل گئی تھی وہ شاید کوئی درویش آدمی تھا اس کے ارد گرد ٹریفک کا ایک دریا سا بہتا تھا لوگوں کا ایک ہجوم بے کراں گزرتا تھا مگر وہ اس طرح پرسکون آنکھیں بند کئے رہتا جیسے وہ اس منظر کا حصہ ہی نہ ہو اس کے پاس لوگ دعا کے لئے آتے وہ مسکرا کر ان کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیتا بات بہت کم کرتا۔ جب بھی بات کرتا تو یہ ضرور کہتا۔ "محبت کرنا سیکھو جا کر محبت کرو۔"

شاید کوئی ناکام عاشق تھا جو محبت کی شکست سے گھبرا کر فرار چاہتے ہوئے بھیس بدل کر اس کونے میں بیٹھ رہا تھا۔

جس ڈائجسٹ کے لئے مجھے کہانی لکھنا تھی ان کی طرف سے ہر دوسرے تیسرے دن کالز موصول ہوتیں اور میں ان کو یہ کہہ کر ٹال دیتا۔

"کہانی اپنے انجام کی طرف رواں دواں ہے۔ ڈونٹ وری ٹائم پر پہنچ جائے گی۔"

میں چاہنے کے باوجود ان کو یہ نہ بتا پاتا کہ ابن آدم کے الفاظ اس کا فن اس کے کردار اس سے روٹھ گئے ہیں یا پھر آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں اس لئے کہیں چھپ گئے ہیں۔

بتاتا بھی کیا کہ "میں، میں نہیں رہا میرا فن میرا نہیں رہا یا پھر میرے ذہن پر جمود طاری ہے بے حسی اور بے کیفی کی برف جم گئی ہے۔"

جب احساسات و جذبات نہ رہیں تو انسان انسان نہیں رہتا زندہ لاش بن جاتا ہے کامیابی کی منزلیں جس تیزی سے طے کی تھیں اسی تیزی سے تنزلی کی طرف جا رہا تھا تو کیا ابن آدم کا اینڈ ہونے جا رہا ہے۔

نہیں، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، میں ایسا ہونے نہیں دوں گا میں ضرور لکھوں گا، ضرور ایک سپر ہٹ اسٹوری لکھوں گا جسے لوگ میری باقی کہانیوں کی طرح فراموش نہیں کر پائیں گے میں خود کو گرنے نہیں دے سکتا۔

جب پریشانی حد سے بڑھ جاتی تو دل چاہتا کہ دیوار کے ساتھ سر ٹکرا دوں اور ایسے میں، میں گھر سے نکل کھڑا ہوتا اور اپنی مخصوص جگہ پر کچھ فاصلہ چھوڑ کر بیٹھ جاتا۔

وہ دن بھی عام دنوں کی طرح ہی تھا۔ مجھے خود پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ میں اپنی جگہ گم صم بیٹھا تھا۔ اس کا نام رحمان تھا لوگ اسے رحمان بابا کہتے تھے وہ کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا ہمیشہ اپنی نظریں جھکا کر رکھتا اس کے انداز سے عجز و انکسار جھلکتا لیکن کبھی کبھی وہ لوگوں کے ساتھ مس بی ہیو بھی کرتا تھا تب میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ کتنا مغرور ہے لوگ اس کی کتنی عزت و احترام کرتے ہیں اور یہ سب کو دھتکارتا ہے کتنا مغرور انسان ہے ایک طرف تو سب کو غلط سبق دیتا ہے کہ "جاؤ محبت کرو۔" دوسری طرف اس طرح کا سلوک یہ ضرور کوئی جرائم پیشہ فرد ہے یا پھر کسی دشمن ملک کا جاسوس بھی ہو سکتا ہے۔

میں اپنا دکھ بھول کر رحمان بابا کی ذات میں کھو جاتا اور کبھی بھی کسی صحیح نتیجے پر نہ پہنچ پاتا۔

میری سوچوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا نجانے ایسا کیا ہوا کہ میں چونک پڑا اوپر سے کا پورا منظر خون میں نہایا ہوا تھا گاڑیوں والے گاڑیاں دوسری گاڑیوں سے ٹکرا رہے تھے پیدل چلنے والے بھی ایک دوسرے پر جھپٹ رہے تھے ریڑھی بان اپنے پھل اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے کو مارتے، جیسے ہی وہ پھل کسی کو لگتا ایک دھماکہ سا ہوتا اور خون کے فوارے چھوٹ جاتے۔ عورتیں اور مرد ایسے ایک دوسرے سے گتھم گتھا جیسے ایک دوسرے کے جانی دشمن ہوں میری ٹانگیں شل ہو گئیں میں خوف سے اپنی جگہ سے ہل بھی نہ پایا۔ ایک چیز سب میں مشترک تھی کہ سب نے عجیب سے جھولتے اور لٹکتے ہوئے تار تار سفید لباس پہن رکھے تھے جیسے ہی میں نے ان کا لباس دیکھا مجھے اس دن والا شخص یاد آ گیا جو میرے فلیٹ پر آیا تھا اس کا خیال آتے ہی مجھے چکر سا آ گیا۔

"یا اللہ یہ میں کس مصیبت میں پھنس گیا؟" میں نے خوف سے آنکھیں میچ لیں۔

ایک بھکاری بچہ ایک بہت معصوم بچے کو نوچ رہا تھا، بھکاری بچے نے دوسرے بچے کے سر کو بالوں سے پکڑا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ اس کا منہ نوچ رہا تھا بچے کی چیخیں آسمان ہلا رہی تھیں مجھے ابکائی آئی اور ساتھ ہی میں نے الٹی کردی مگر اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

جب میری آنکھ کھلی تو میں اپنے فلیٹ پر تھا دو آدمی میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھے تھے۔ ان سے مجھے پتہ چلا کہ میں تیز دھوپ کے باعث میں چکرا کر گرا تھا۔ اور بے ہوش ہوگیا تھا۔

میں کہنیوں کے بل بیٹھنے کی کوشش کی تو ایک آدمی بولا۔

''لیٹے رہو بھائی، تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔

''وہ آدمی دیکھنے میں بھلا مانس اور دردمند دل رکھنے والا لگ رہا تھا پھر بھی میں سہم گیا اور ان کی شکلوں اور لباس کو غور سے دیکھنے لگا وہ سیدھے سادھے قمیض شلوار میں ملبوس تھے، میرے دل کو ذرا ڈھارس بندھی تو میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا بہت بہت شکر گزار ہوں بھائی جان کہ آپ مجھے یہاں تک لے کر آئے۔''

وہ آدمی مسکرا دیا۔ جبکہ دوسرا شخص آرام سے پاؤں پسارے بیڈ کی ٹیک سے سر ٹکا کر بیٹھا تھا۔ اس نے سر پر ایک میلے سے کپڑے کا ڈھاٹا باندھا ہوا تھا وہ دیکھنے میں نحیف و نزار لگ رہا تھا۔ اس سے نظر ہٹائی تو کھڑکی کے باہر پھیلتے اندھیرے پر نظر پڑ گئی میں نے فوراً وال کلاک پر ٹائم دیکھا تو رات کے دس بج رہے تھے۔ میں نے حیرانگی سے اس آدمی کو دیکھا جو مجھ سے ذرا قریب بیٹھا تھا اور ہوش آنے کے بعد سے اب تک وہی مجھ سے مخاطب تھا ڈھاٹے والا شاید اونگھ رہا تھا۔

''جی ہاں تم دوپہر سے ایسے ہی بے ہوش پڑے تھے، ہم نے سوچا جب تک تم ہوش میں نہیں آتے تمہارے پاس ہی رک جائیں۔'' یہ اس نے ڈھاٹے والے اونگھتے ہوئے شخص کی طرف انگلی سے اشارہ کیا۔

''یہ بیمار ہے۔''

میں نے اس کی بات سن کر سر ہلایا۔ اب میں سوچنے لگا کہ گھر میں صرف ایک آدمی کا کھانا ہے ان کو کیا کھلاؤں، کھانے کا خیال آتے ہی پیٹ میں چوہے دوڑنے لگے۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آدمی بول پڑا۔ ''ہم دن کو کھانا لائے تھے سوچا تھا تم ہوش میں آؤ تو مل کر کھائیں گے۔'' وہ مسلسل مسکرا رہا تھا اس نے شاید میری سوچ پڑھ لی تھی، وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں نے آپ کا کچن دیکھ لیا تھا میں کھانا گرم کرلوں۔''

میں کچھ سمجھ نہ پا رہا تھا، میں چاہتا تھا کہ یہ لوگ اب یہاں سے چلے جائیں۔

خدا جانے چور ڈاکو تھے یا کون تھے زبان سے یہ کہنا مشکل لگ رہا تھا کہ آپ چلے جائیں کچھ دیر ہی گزری تھی کہ وہ ہاتھ میں ٹرے لئے آگیا میں اخلاقاً سنبھل کر بیٹھ گیا اور اپنے چہرے پر پھیلی ناگواری کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا وہ ٹرے درمیان میں رکھ کر خود بھی میرے سامنے بیٹھ گیا اس کی پراسراری مسکراہٹ گہری ہوتی جا رہی تھی جو کہ مسلسل میری الجھن میں اضافہ کر رہی تھی۔

اس نے پہلا نوالہ منہ کے قریب کیا ہی تھا کہ وال کلاک نے گیارہ بجادیئے اس نے ٹائم دیکھا پھر میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا۔ ''بھائی کھانا شروع کرو۔''

میں خجل سا ہوگیا وہ اتنے خلوص اور چاہت سے مجھے بیمار سمجھ کر میری خدمت کر رہا تھا اور میں اس پر شک کیے جا رہا تھا، پھر میں نے خود کو ملامت کی۔ ''یہ بھی اگر کھانے میں شریک ہوتے تو اچھا ہوتا۔'' میں نے سوئے ہوئے آدمی کے متعلق کہا تو وہ بولا۔

''نہیں جناب ان کو ابھی آرام کرنے دیں یہ بہت تھک گئے ہیں کچھ دیر تک اٹھ کر یہ بھی اپنا کھانا ضرور کھالیں گے۔''

''ان کو ہوا کیا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔

"یہ بھی تمہاری طرح بیمار ہیں، میں نے ان کی بھی خدمت کی ہے تمہاری بھی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔" وہ ساتھ ساتھ کھانا بھی تیزی سے کھا رہا تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ برسوں کا بھوکا ہو کمرے میں زیرو کا بلب اور سائیڈ ٹیبل لیمپ جل رہے تھے میں اسے کھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا خود میں نے ابھی تک ایک نوالہ بھی نہ لیا تھا کھانا شاید بہت لذیذ تھا خوشبو بھی کافی اشتہا انگیز تھی۔

میں کھانے کی طرف ہاتھ بھی نہ بڑھا رہا تھا کیونکہ میں چاہتا تھا کہ میرا محسن خوب پیٹ بھر کر کھا لے تو پھر میں کھاؤں کہیں کھانا کم نہ پڑ جائے۔ میں نے اسے باتوں میں لگائے رکھا اور وہ کھاتا رہا۔

باتوں باتوں میں اس نے پھر وال کلاک کی طرف دیکھا تو پونے بارہ بج چکے تھے وہ مسلسل کھا رہا تھا مگر کھانا پھر بھی کم نہ ہو رہا تھا میری حیرانگی کی حد ہوگئی ٹرے قدرے اندھیرے میں تھی میں نے کھانے پر غور کیا تو وہ فقط ایک ٹرے میں سمایا ہوا تھا شاید چھوٹے نوالے لے کر زیادہ چبا چبا کر کھا رہا تھا۔

"میں تو کھا چکا اب آپ بھی کھالو۔" اس نے ٹرے میری طرف کھسکا دی۔ اور اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کیا، شوربہ گوشت بہت لذیذ تھے میں جب آدھے سے زیادہ کھا چکا، تو میرے دل نے بوٹی کھانے کی شدید خواہش کی تو میں نے پلیٹ سے ٹٹول کر اور بغیر دیکھے ایک بوٹی اٹھالی منہ کے قریب لے جانے سے پہلے میں نے اس کو حسب عادت ایک نظر دیکھا تو میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا، وہ تو انسانی بچے کی نفاست سے کٹی ہوئی اور آپس میں جڑی ہوئی دو انگلیاں تھیں، میں نے ٹرے وہیں بستر پر پھینکی اور اچھل کر بیڈ سے اٹھا، ٹرے پھینکنے پر وہ شخص چونکا اور بولا۔

"کیا ہوا بھائی؟"

"یہ ... یہ!" میں نے کپکپاتے ہوئے الٹے ہونے کھانے کی ٹرے کی طرف اشارہ کیا اتنے میں وہ شخص بھی کھڑا ہو گیا۔

"کیا کھانا اچھا نہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"یہ تو انسانی ....." میں نے بات ادھوری چھوڑ دی پے در پے پر اسرار واقعات میرے ذہن میں گردش کرنے لگے۔

"انسانی گوشت ہے۔" اس نے میری ادھوری بات پوری کر دی تو گویا مجھ پر بجلی گرا دی اس کا مطلب کہ وہ جانتا تھا کہ وہ مجھے کیا کھلا رہا ہے، میں نے غصے سے بپھرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا تو ایک بار پھر میرے ہوش اڑ گئے۔ میں بھاگنے کی سوچنے لگا وہ ابھی تک اپنی جگہ جما کھڑا تھا کہ وال کلاک نے بارہ بجا دیئے اس کے منہ سے ایک بھیانک قہقہہ برآمد ہوا تو ہر طرف ایک ناگواری بدبو پھیل گئی۔

بارہ بجتے ہی وہ دوسرا بھی جاگ اٹھا پہلے تو وہ مشینی انداز میں سیدھا بیٹھ گیا پھر بیڈ سے نیچے پاؤں لٹکائے پھر کھڑا ہو گیا۔

میری رہی سہی ہمت بھی جاتی رہی وہ گھوم کر ٹک ٹک چلتا ہوا آ رہا تھا سوچنے سمجھنے کی صلاحیت جیسے ضبط ہو چکی تھی میں نے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنا شروع کر دیا۔

"کک کون ہو تم لوگ؟" بالآخر میرے حلق سے گھٹی گھٹی سی آواز نکلی۔

"تمہاری موت۔" اب کہ دوسرا آدمی بولا۔

"م ... میں نے کیا کیا ہے، کیا بگاڑا ہے تمہارا؟"

میری بات کا جواب دیئے بغیر وہ کسی غول بیابانی کی طرح بڑھے آ رہے تھے ان کے غلیظ جسموں سے اٹھتی بدبو کی بدولت میرا برا حشر ہو گیا جان کے لالے پڑے ہوئے تھے اگر اگلے چند سیکنڈ میں کچھ نہ کرتا تو موت یقینی تھی۔

باہر بادل آسمان کو گھیر چکے تھے زور زور سے گرجتے بادل کانوں کے پردے پھاڑتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے میں اپنی جگہ سے ایک قدم بھی نہ ہل سکتا تھا ٹانگیں جیسے مفلوج ہو گئی تھیں بجلی ایک کڑاکے سے چمک

کر لیکی، اتنے میں وہ دونوں بھی مجھ سے لپٹ گئے میرے حلق سے ایک چیخ نکلی میں یہ سوچ کر آنکھیں بند کر چکا تھا کہ میرا آخری وقت آ گیا۔

مگر یہ کیا میری حیرت کی انتہا نہ رہی میرے بدن کو چھوتے ہی وہ منظر سے کسی چھلاوے کی طرح غائب ہو گئے میں ہکا بکا رہ گیا تھا کہ اچانک لائٹ بھی چلی گئی اندھیرے میں مجھے اپنے ہی فلیٹ سے خوف آ رہا تھا۔

یہ افتاد کیا کم تھی کہ ایک اور مصیبت آن وارد ہوئی فلیٹ کے دروازے پر زوردار دستک ہونے لگی میرا دل دھک سے رہ گیا کہیں وہ پھر تو نہیں آ گئے۔

"یا خدا مجھے ان بلاؤں سے نجات دے یہ اگر میرے گناہوں کی سزا ہے تو میرے گناہ معاف فرما دے تو، تو رحیم و کریم ہے۔" میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دستک مسلسل ہوتے جا رہی تھی خدا کو یاد کرنے سے دل کو ذرا ڈھارس ہوئی مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق دل بڑا کر کے چیزیں ٹٹولتا ہوا دروازے تک آیا، کی ہول سے آنکھ لگا کر باہر جھانکا تو حیرت کا جھٹکا لگا۔

☆......☆......☆

دروازہ کھولتے ہی جو شخصیت سامنے آئی وہ رحمان بابا کی تھی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ رحمان بابا اور میرے فلیٹ پر وہ بھی اس وقت میں نے ان کو اندر آنے کا راستہ دیا، وہ اندر آئے تو میں نے دروازہ بند کر دیا۔

رحمان بابا کے ہاتھ میں کالے موتیوں کی ایک تسبیح تھی اس وقت وہ مسافر خانے کی دیوار کے ساتھ بیٹھنے والے رحمان بابا نہ لگ رہے تھے ان کا حلیہ ہی چینج تھا۔ جیسے ہی رحمان بابا نے گھر کے اندر قدم رکھا لائٹ آ گئی رحمان بابا کو اس حلیہ میں دیکھ کر میں حیران ہوئے جا رہا تھا صاف ستھرا اجلا لباس خوشبوؤں میں بسا ہوا بال نفاست سے جمے ہوئے چہرہ اتنا نورانی اور چمکدار کہ نظر نہ ٹھہر رہی تھی۔

وہ فلیٹ میں چاروں طرف کچھ پڑھ کر پھونک رہے تھے، میں چپ چاپ دیکھے جا رہا تھا جب وہ اپنا کام ختم کر چکے تو بولے۔

"ہمیں حکم ملا ہے کہ تمہیں اس مصیبت سے نکالا جائے، تو ہم چلے آئے۔" وہ بیڈ پر بیٹھ گئے میری اتنی ہمت نہ ہو رہی تھی کہ ان کے برابر بیٹھ جاتا رعب و جلال کے باعث مجھ پر ہیبت طاری تھی زبان تو جیسے گنگ ہو چکی تھی ایک دل ہی تھا جو عقیدت سے لبریز ہوئے جا رہا تھا۔ ان سے نظر ملانے کی بھی ہمت نہ ہو رہی تھی، دل سوز و گداز سے اتنا بھر گیا کہ صبر کا پیمانہ چھلک اٹھا، میں ایک دم سے ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور وہ میرا سر تھپکنے لگے۔

☆......☆......☆

میرا قلمی نام ابن آدم اور میرا پیدائشی نام اکبر ولد آدم حسین ہے۔"

جب میں نے اپنے چھوٹے سے گھر میں ہوش سنبھالا تو صرف اپنے باپ کو پایا، ماں جیسی نعمت سے تو محروم تھا ہی، بہن بھائیوں سے بھی اوپر والے نے نہیں نوازا تھا اب اس میں اس کی کیا حکمت ہے یہ وہی بہتر جانتا ہے اکیلا پن تنہائی کوئی بری بات نہیں، انسان دنیا میں اکیلا ہی آتا ہے اکیلا ہی جاتا ہے سو کبھی اس بات کا غم نہ کرنا کہ تم اکیلے ہو، والد نے بچپن میں ہی یہ بات اچھی طرح میرے ذہن میں بیٹھا دی تھی تاکہ مجھے کبھی قلق نہ ہو کہ فیملی کے نام پر صرف باپ ہی ہے میرے پاس، خاندانی پس منظر بھی اتنا وسیع نہ تھا، والد صاحب بھی صرف ایک بھائی بہن ہی تھے اس لئے افراد کا قال تھا میرے خاندان میں۔

یوں تو میں ایک سعادت مند اور فرماں بردار بچہ تھا لیکن میرے اندر اس سے ہٹ کر میرے اندر ایک لاابالی اور چلبلا سا کھلنڈرا سا لڑکا بھی کہیں چھپا تھا اس الہڑ سے لڑکے کو میں خاص طور پر اپنے والد اور اپنے ٹیچر سے چھپاتا تھا میں اپنی فرمانبرداری کی بنی ہوئی ساکھ قائم رکھنا چاہتا تھا اس لئے میں نہیں چاہتا تھا کہ کسی بھی

بات سے میری ساکھ کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ میٹرک کا امتحان اچھے نمبروں سے پاس کرکے میں پھولا نہ سما رہا تھا امتحان کے بعد میں بالکل فارغ تھا کرنے کو کچھ بھی نہ تھا۔

والد صاحب ایک مقامی اخبار سے منسلک تھے میں نے وقت گزاری کے لئے ان کے آرٹیکلز باقاعدگی سے پڑھنا شروع کردیئے جلد ہی میں اکتا گیا۔ وقت گزاری کے لئے کچھ بھی نہ سوجھ رہا تھا چھوٹے سے قصبے میں سہولتوں کا بھی فقدان تھا شام کے ٹائم دوستوں کے ساتھ قصبے کے چھوٹے سے گراؤنڈ میں میچ اور موج مستی ہوجاتی مگر شام کے فوراً بعد ہی مجھے گھر لوٹنا پڑتا بوریت زیادہ تھی، والد صاحب تو ہر وقت اخباروں اور کاغذوں میں سر دیئے رہتے یا ہر وقت کچھ نہ کچھ لکھنے میں مصروف رہتے، رات آٹھ بجے والا پی ٹی وی سیریل دیکھ کر خود کو تھپکیاں دے کر سلانے کی کوشش کرتا اس زمانے میں کیبل ناپید تھی اور ڈش ہر گھر افورڈ نہیں کرسکتا تھا سو شاذ و نادر ہی کسی گھر کی چھت پر ڈش بھی نظر آتی۔

اس فارغ البالی میں زندگی نے ایسی کروٹ بدلی کہ انقلاب برپا کردیا میٹرک کے امتحان کے بعد والد صاحب نے مجھے موٹر سائیکل لے دی تاکہ کالج آنے جانے میں وقت نہ ہو بس پھر کیا تھا میں اور میرا جگری یار اسلم کالج کے بعد سارا دن آوارہ گردی کرتے چھٹی والے دن تو دن چڑھتے ہی جیسے ہی والد صاحب آفس کے لئے نکلتے میں موٹر سائیکل لے کر اسلم کی طرف چلا جاتا وہ پہلے ہی میرا منتظر ہوتا جیسے ہی دستک دی اسلم جھٹ سے باہر، ہم سارا دن منرگشت کرتے اکثر قصبے سے باہر شہر کی طرف نکل جاتے، نئی مصروفیت کافی دلچسپ تھی۔

ایک دن گھومتے گھامتے بازار کی طرف نکل آئے، یہ شہر کا بڑا بازار کہلاتا تھا بازار کیا تھا ایک میلے کا سماں تھا، میں نے بچپن میں والد صاحب کے ساتھ دو ایک مرتبہ بڑا بازار دیکھا تھا اس کے بعد بھی اتفاق نہ ہو پایا کیونکہ ضرورت کی ہر چیز والد صاحب گھر میں ہی وافر مقدار میں مہیا کردیتے تھے۔

ہر طرف رنگین آنچل لہرا رہے تھے مختلف اسٹالز پر مختلف دکانوں پر جہاں جہاں پھول جیسے چہرے تتلیوں کی مانند اڑتے پھرتے ہوں وہاں بھنورے تو ضرور ہوتے ہیں سو منچلوں کی بھی بہتات تھی پھرتے پھراتے ہم ایک اسٹال کے پاس سے گزرنے لگے تو میں چلایا۔"

رکو، رکو ذرا۔"

موٹر سائیکل چونکہ اسلم چلا رہا تھا سو ایک جھٹکے سے رکا اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا میں فوراً سے پیشتر اتر کر اسٹال کی طرف بڑھا وہ وہیں موٹر سائیکل کے پاس کھڑا رہا کیونکہ وہ کتابوں سے کوسوں دور بھاگتا تھا۔

اسٹال، اسٹال نہیں رسالوں، کتابوں اور میگزینز کی ایک منی لائبریری لگ رہا تھا۔ میں کتابوں اور رسالوں پر نظر دوڑانے لگا کتاب اٹھاتا کیٹلاگ، فہرست، چیک کرتا پھر رکھ دیتا۔ مجھے مطالعہ کا بہت شوق تھا۔ اسکول کی لائبریری کی تقریباً ہر کتاب میں پڑھ چکا تھا لیکن وہ موضوع کے لحاظ سے ذرا مختلف تھیں جو کتابیں اور رسالے میں یہاں دیکھ رہا تھا انہیں دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ایسے ایسے موضوعات پر مشتمل تھیں کہ ان میں ہر موضوع اپنی اہمیت کے لحاظ سے زندگی کے لئے لازم و ملزوم نظر آرہا تھا۔ انتخاب کرنا مشکل ہوگیا میں نے چند کتابیں منتخب کیں مگر ان کا بل بجٹ میں نہیں سما رہا تھا آخر مندے دل کے ساتھ میں نے تین ڈائجسٹ خرید لئے اور دل میں پکا ارادہ کرلیا کہ میں یہ کتابیں ضرور خریدوں گا ان رسالوں کو خرید کر میں بہت مسرور تھا کہ جیسے میرے ہاتھ کوئی خزانہ لگ گیا ہو، اب تو شام میں، میں اور میری کتابیں اور رسالے ہوتے میں اپنا جیب خرچ جمع کرتا رہتا اور اس سے ہر ماہ دو چار ڈائجسٹ اور ایک کتاب ضرور خریدتا۔

والد صاحب پہلی دفعہ میرے ہاتھ میں رسالے دیکھ کر ٹھٹھکے اور کہنے لگے۔"اکبر بیٹا کیا آپ کو یقین

ہے کہ آپ ان کو پڑھ کر کسی قسم کا غلط اثر نہ لیں گے۔"

میں نے کہا "ابا جان کہانیاں تو صرف وقت گزاری یا دلچسپی کی وجہ سے پڑھتا ہوں میں ان کو خود پر طاری یا حاوی تھوڑی کروں گا۔"

میں اس وقت یہ نہیں جانتا تھا کہ کہانیاں ہی میرا اوڑھنا بچھونا بن جائیں گی میرے جواب سے والد صاحب مطمئن ہوئے یا نہیں انہوں نے دوبارہ اس بارے میں کوئی بات نہ کی۔

زندگی ایک روٹین سے چل رہی تھی گھر کالج، کتابیں، موٹر سائیکل اسلم اور میں ہر ماہ میرے بک ریک پر ایک سے ایک نئی کتاب نظر آتی۔ نصابی کتابوں سے جو بھی فارغ ٹائم ملتا میں ادب کے مطالعے میں گزار دیتا زندگی کی گاڑی ایک ہی طرز پر سیدھی چلی جارہی تھی کم بخت ہچکولے تک نہ لے رہی تھی بھی بھی میں اداس ہو جاتا کہ کتنی بے رنگ اور پھیکی سی زندگی ہے بہن بھائی ہی مل جاتے کم از کم کسی سے روٹھنا مناتا کسی کو تنگ کرتا تو ہوتا ہو کہ زندگی میں رنگ بھر دیتا مگر بے سود قسمت کو منظور ہی نہ تھا کہ میری زندگی میں رنگ بھر جاتے۔

مگر اس دن میرا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا، میں جو چاہتا تھا کہ زندگی کی گاڑی ہچکولے ہی لے، ہل چل تو کیا اس دن تو بہت بڑا طوفان آ گیا۔

ہوا کچھ یوں کہ میں کالج کے کیفے ٹیریا میں سکون سے بیٹھا اپنا موسٹ فیوریٹ ہارر ڈائجسٹ ڈر پڑھ رہا تھا پڑھنے میں ایسا محو تھا کہ آس پاس کا بھی ہوش نہ رہا کافی تک ٹھنڈی ہوئی مگر مجھے ہوش کہاں تھا۔ تبھی وہ میرے پاس آئی۔

"ایکسکیوزمی کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟"

"جی " میں نے رسالہ ہٹائے بغیر دیکھے بغیر کہ محترمہ ہیں کون جی کہہ دیا۔ اب تو ایجوکیشن میں جہاں لڑکے لڑکیاں اکٹھے پڑھتے ہوں وہاں ایک ٹیبل پر بیٹھنے میں کیا قباحت ہے۔ وہ بیٹھ گئی میں بدستور اپنی کہانی میں مگن رہا۔ اس نے شاید میرا کافی کا مگ دیکھ لیا تھا کافی ٹھنڈی ہو گئی تھی اور دو چار رکھیاں تیر رہی تھیں اس لئے اس نے دو کافی کا آرڈر دے دیا اور بولی۔

"کیا میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا؟"

"نہیں تو" میں نے پہلی والی پوزیشن ہنوز برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کیا آپ کچھ دیر کے لئے میری طرف متوجہ ہوں گے۔" بہت ہی شائستہ لہجے میں درخواست کی گئی تھی۔ مجھے ڈائجسٹ بند کرنا ہی پڑا۔

"جی فرمائیے۔" میں نے رسالہ ٹیبل پر ایک طرف رکھ دیا کافی آ چکی تھی تو کافی کا مگ اٹھالیا۔ میرے سامنے بہت سادہ سی اور معصوم صورت سی لڑکی بیٹھی تھی فیشن سے بالکل نابلد جبکہ اس کے مقابلے میں کالج کی لڑکیاں فیشن کی دوڑ میں ایک دوسرے پر سبقت پانے کے لئے انتہائی مضحکہ خیز حد تک چلی جاتی تھیں۔ اس کی سادگی نے مجھے پہلی نظر میں ہی متاثر کیا اور اس کے لئے احترام کا ایک جذبہ دل میں بیدار ہو گیا۔

"آپ کا نام جان سکتی ہوں؟" اس نے رسالہ اٹھالیا۔

"اکبر۔" میں نے مختصراً کہا۔

"میں صبا ہوں۔" اس نے اپنا تعارف کروایا۔

"جی فرمائے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔"

وہ بولی۔ "آپ پلیز برا مت مانیے گا میں جو کہنے جا رہی ہوں ہو سکتا ہے آپ کو عجیب لگے۔" وہ ایک لمحے کو رکی پھر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کو جب بھی دیکھا ہمیشہ آپ کو پڑھتے ہوئے ہی پایا۔"

یہ انکشاف میرے لئے نیا تھا کہ وہ مجھے دیکھتی بھی ہے لیکن اس میں چونکنے والی کیا بات ہے کالج ہے ہر کوئی ہر کسی کو دیکھتا ہے میں نے اپنے دل میں اٹھتے سوالوں کو بمشکل دبایا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔

"پڑھنا تو بہت آسان ہے ہر کوئی پڑھ سکتا ہے

کیا آپ نے کبھی کچھ لکھا بھی ہے؟'' اس کی سوالیہ آنکھیں مجھ پر ٹکی تھیں رسالے کے کھلے صفحات اس کے ہاتھوں میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا مس صبا۔''

''مطلب یہ کہ آپ دوسروں کی کہانیاں اتنے ذوق سے پڑھتے ہیں کبھی کوئی کہانی خود بھی لکھی ہے۔''

میں نے سر انکار میں ہلایا۔

''کیا کبھی سوچا ہے کہ کہانی آپ کی ہو اور لوگ ایسے ہی انہماک واشتیاق سے پڑھیں۔'' اس کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ رینگ رہی تھی میں الجھ سا گیا اس کی باتوں میں۔

''دیکھئے مس صبا پہلی بات تو یہ کہ میں قاری ہوں لکھاری نہیں، دوسری بات یہ کہ میں آپ کو نہیں جانتا، آپ مجھے نہیں جانتیں پھر یہ باتیں۔''

''کیا مطلب ومقصد، کچھ سمجھنے میں دقت ہو رہی ہے براہ کرم وضاحت کیجیے۔'' وہ دھیرے سے مسکرائی اس کے لب کچھ کہنے کو یوں وا ہوئے جیسے گلاب کی کلی کھلنے کے لئے آہستگی سے اور نرمی سے کھلتی ہے۔

''میں روز آپ کو دیکھتی ہوں آپ کے ایک ہاتھ میں کالج کی بکس اور دوسرے ہاتھ میں کوئی ناول یا ڈائجسٹ ہوتا ہے آپ کی یہی روٹین ایک عادت سی ہوگئی ہے آپ کے ہاتھ میں کتابیں دیکھنے کی جس دن آپ کے ہاتھ میں کچھ نہ ہو، اس دن ادھورا پن سا محسوس ہوتا ہے لیکن ایک موہوم سی امید اس ادھورے پن کو ختم کر دیتی ہے کہ شاید آج پڑھنے کے بجائے کچھ لکھنا چاہتے ہیں۔

جب سے میں نے یہ کالج جوائن کیا ہے آپ کو پڑھتے ہوئے ہی پایا ہے لکھتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا آپ کو یہ سب کہتے ہوئے کچھ جھجک سی بھی محسوس ہو رہی ہے میں بہت دن سے آپ سے یہ بات کہنا چاہتی تھی پر یہ سوچ کر رہ جاتی کہ آپ کیا سوچیں گے آپ پلیز مائنڈ مت کیجیے گا، مجھے آپ میں ایک ادیب نظر آتا ہے۔ میں چاہتی ہوں آپ اس کو عیاں کریں۔''

اس نے جیسے تیسے کرکے مدعا بیان کیا اور خاموش ہو رہی، میں جو وضاحت چاہتا تھا اس کی وضاحت سن کر میرے طوطے اڑ گئے اس کو مجھ میں رائٹر نظر آتا تھا جبکہ میں ایک عام سا ریڈر تھا، میں اپنی جگہ پر چور سا بنا بیٹھا رہا، یہ میرے لئے ناگہانی تھا کہتا بھی تو کیا کہتا، اس کے لہجے کے یقین میں بہت گہرا مان جھلک رہا تھا۔

خدا خدا کرکے وہ اٹھی اس نے ریسٹ واچ پر ٹائم دیکھا بیگ سے کچھ پیسے نکال کر کافی کی پیالی کے نیچے رکھ دیئے اور اپنا بیگ سنبھال کر اٹھ کھڑی ہوئی یہ کہتے ہوئے چلی گئی۔ ''میری بات پر غور کیجیے گا۔''

وہ تو چلی گئی لیکن مجھے ایک نئے طوفان کی زد میں چھوڑ گئی۔

اس کی یہ بات میرے ذہن کے کسی کونے میں کسی کیڑے کی طرح چپک گئی اور کلبلاتی رہتی۔ پڑھنا تو بہت آسان ہے ہر کوئی پڑھتا ہے۔'' آپ نے کبھی کچھ لکھا بھی ہے... مجھے آپ میں ایک ادیب نظر آتا ہے۔'' سوتے جاگتے اٹھتے بیٹھتے کہیں بھی کبھی بھی یہ بات اور اس کی آواز ذہن میں گونجتی رہتی نا چاہتے ہوئے بھی میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا۔

کالج میں ہر وقت مجھے یہ دھڑکا لگا رہتا کہ وہ مجھے دیکھ رہی ہے اس کی سرمئی آنکھیں مجھ سے سوال کر رہی ہیں میں ادھر ادھر لاشعوری طور پر دیکھتا اسے نہ پا کر سر جھکا لیتا وہ تو ایسے غائب ہوگئی جیسے گدھے کے ...

ہر وقت بے کل رہنے لگا ہر وقت یہ سوچتا رہتا کیا لکھوں، کیا میں لکھ سکتا ہوں۔ مجھے لکھنا چاہئے کوشش کرنے میں کیا حرج ہے اپنی ہی سوچوں کی نفی اثبات کرتا رہتا۔

میرا اس پریشان خیالی سے میرے شب وروز متاثر ہو رہے تھے اسلم میری کیفیت کو بھانپ گیا ایک دن اس نے پوچھ ہی لیا۔

"یار کیا مسئلہ ہے تو بڑا کھویا کھویا رہتا ہے؟"

اس کا یہ پوچھنا تھا کہ میری سوچوں اور الجھنوں کے سیلاب کو بہنے کا بہانہ سا مل گیا میں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات اس کو بتا دی۔ وہ میری باتیں سن کر مسکراتا رہا جب میں اپنی تمام پریشانی بتا چکا تو وہ بولا۔ "بس اتنی سی بات پر تو اتنا پریشان ہے یہ کون سا مشکل کام ہے تمہارے پاس الفاظ کا ذخیرہ ہے ٹیلنٹ ہے ماشاء اللہ پڑھے لکھے ہو ذہین بھی ہو تو لکھ ڈالو کوئی کہانی۔" اس نے اپنی طرف سے تو چٹکیوں میں میرے مسئلے کا حل بتا دیا۔

"ہاں لکھ ڈالو کہانی۔" میں نے اس کی نقل اتاری میں اس کی بات سے چڑ گیا۔

"الفاظ ہیں، ٹیلنٹ ہے سب کچھ ہے پر کہانی کہاں ہے؟" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "یار تم ہر وقت کہانیوں میں رہتے ہو پھر بھی تمہارے پاس کہانی نہیں کہیں سے بھی کوئی کہانی پکڑو اور اپنے الفاظ اور اپنے انداز میں لکھ ڈالو۔"

"یہ تو میں نے بھی سوچا تھا مگر مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی کی اسٹوری چوری یا کاپی نہیں کرنا چاہتا میرا ضمیر نہیں مانتا میں اوریجنل لکھنا چاہتا ہوں کہانی کو کہانی سمجھ کر نہیں ایک جیتی جاگتی زندگی جیسی سانسیں لیتی ہوئی لکھنا چاہتا ہوں جس میں خالی الفاظ نہیں دل دھڑکتے ہوں ریشمیں آنچل لہراتے ہوں ساتھ ہی ساتھ گلابی گالوں کی لالیاں بھی مہکتی ہوں ......" میں کہتے کہتے رک گیا اسے ایک نظر دیکھ کر بولا۔

"رہن دے یار تم سے مشورہ کرنا بے کار ہے۔"

اس نے برا سا منہ بنایا اسے شاید اپنی ہتک محسوس ہوئی جسے وہ جلد ہی پی گیا۔ "کتنے سال ہوئے تجھے کالج جاتے ہوئے۔" اب وہ سنجیدہ تھا۔

"تین سال۔" میں نے کہا۔

"اور صبا بقول تمہارے دوسرے سال میں ہے اور تم تیسرے سال میں ہو تم بدھو ہو گدھے ہو تمہارے گرد زندہ جاوید کہانیاں موجود ہیں تم نے بس ان پر غور کرنا ہے اور ان کو قلمبند کرنا ہے ارے کالج لائف تو بذات خود ایک سپر ہٹ اسٹوری ہے اور اگر پھر بھی تسلی نہ ہو تو عشق فرما کر دیکھو جب اپنی ذات پر بیتے گی تو لکھنے میں آسانی ہو جائے گی۔" وہ بات ختم کر کے داد طلب نظروں سے مجھے تکنے لگا۔ اب اس کی بات مجھے کچھ معقول لگی تو میں مسکرا دیا۔

اسلم کی بات مجھ پر گہری چھاپ چھوڑ گئی اب میں نے سنجیدگی اور قنوطیت کا لبادہ اتار پھینکا اور دنیا کو ایک نئی نظر سے دیکھنے لگا صنف نازک میں میری دلچسپیاں بڑھ گئیں سینے میں رکھا دل نام کا ٹکڑا کسی اور ہی لے میں دھڑکنے لگا کسی اور ہی رنگ میں ڈھل گیا۔ اب میں نے کھل کر کھیلنا شروع کر دیا میں روز کسی نئے معاشقے میں ملوث ہوتا ہر روز کوئی نہ کوئی نئی لڑکی میرے پہلو سے چپکی نظر آتی اب کالج کی لڑکیوں میں میری امیج بہت بدل گئی لڑکیوں کو موہ لینا اب میرے لئے کچھ مشکل نہ تھا۔

میں بہت بدل گیا تھا بقول اسلم کے مجھے زمانے کی ہوا لگ گئی تھی۔ جب میں نے اپنی پہلی اسٹوری صبا کے ہاتھ پر رکھی تو اس کی آنکھوں میں تشکر اور ممنونیت کی ملی جلی لہریں نظر آئیں۔ میری گردن جیسے اکڑنے لگی دن بدن میری مانگ بڑھ رہی تھی میں کامیابی کی طرف رواں تھا میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اسٹوری رائٹنگ کو پروفیشن کے طور پر اپناؤں گا اور اس سلسلے میں صبا کے قیمتی مشورے میرے بہت کام آ رہے تھے اس کا مطالعہ وسیع اور نظریہ ٹھوس تھا یہ بات وہ بھی نہ سمجھ پائی کہ میں رومانی کہانیاں ہی کیوں لکھتا ہوں۔

میں تیزی سے کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا گیا۔ صبا کی دعائیں رنگ لائیں اور میں کیریئر کے عروج پر پہنچ گیا۔

یہ بھول کر کہ ہر عروج کو زوال لازم ہے۔

تب سے اب تک میں ایک سو ایک افیئر چلا چکا تھا کئی لڑکیوں سے تو میں شادی کا وعدہ بھی کر چکا تھا۔ صبا میری سب سے اچھی دوست تھی پھر بھی میں اس سے

اپنی شخصیت کا ہر پہلو چھپاتا تھا۔

میری کامیابی کے پیچھے بہت حد تک صبا کا ہاتھ تھا میں نہیں چاہتا تھا اس کو یہ پتہ چلے کہ میں ایک بدکردار انسان بن چکا ہوں ایک اس کی خواہش پوری کرنے کے لئے ایک معمولی سا قاری اکبر ایک معروف رائٹر ابن آدم کے نام سے اتنا معروف ہوگیا کہ مجھے خود بھی کامیابی اور تعریف وتوصیف کا نشہ سا ہوگیا۔

جہاں میں لڑکیوں سے جلد اکتا جاتا وہاں لڑکیاں بھی میری فطرت کے ہرجائی پن سے خوب واقف تھیں پھر بھی نجانے کیا کشش تھی کہ میرے نام کے ساتھ جڑنا لڑکیوں کو اچھا سا لگتا تھا۔ اپنی کہانیوں کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ان میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے میں ہر حد عبور کرگیا انسان سے جانور بن گیا بہت سی لڑکیوں سے میرے روابط جسمانی حد تک چلے گئے تھے۔

میں ساتویں آسمان پر تھا اور اس سے بھی آگے جانا چاہتا تھا مگر قسمت میری ڈور کھینچنے کا انتظام کرچکی تھی۔ تعلیم میں دلچسپی برائے نام رہ گئی تھی، والد صاحب شادی کرنا چاہتے تھے مگر مجھے جولت لگ چکی تھی وہ لہو کی چاٹ جیسی تھی اگر میں شادی کرلیتا تو میرا کیریئر تباہ ہوجاتا شادی کرکے مجھے گھر بیٹھنا پڑتا میری کامیابی کا ذریعہ لڑکیاں مجھ سے چھن جاتیں۔

مجھے خود کو چھپانا آتا تھا مگر میں کہاں کہاں خود کو چھپاتا والد سے، صبا سے، عزیزوں دوستوں سے خاص کر لڑکیوں سے جن کے ساتھ تعلق کی شروعات ہی میں اس بات سے کرتا کہ میں ان کا ایسا عاشق ہوں کہ اگر وہ نہ ملیں تو میری موت بھی واقع ہوسکتی ہے پھر ایسے میں شادی کرکے مجھے بیوی بچوں سے بھی خود کو چھپانا پڑتا میں یہ رسک کیسے لے لیتا۔ سو میں ٹال مٹول سے کام لیتا رہا میری ٹال مٹول زیادہ نہ چلی، والد نے چپکے چپکے اپنے دوست کی بیٹی کے ساتھ میری نسبت طے کردی۔

برے کی رسی کو خدا دراز ضرور کرتا ہے مگر اس کی بے آواز لاٹھی جب پڑتی ہے تو کوئی جائے اماں بھی نہیں ملتی میرا یہ کھیل زیادہ دیر چل نہ سکا شاید میرے پاپ کا گھڑا بھر چکا تھا۔

گرمیوں کے دن تھے ہر طرف گرم لو چل رہی تھی چرند پرند انسان سبھی گھبرائے نظر آتے میرا زیادہ وقت شہر میں ہی گزرتا، میں رات گئے گھر آتا والد صاحب جاگ رہے ہوتے تو ان کو سلا کر میں رائٹنگ ٹیبل سنبھال لیتا اور اپنے تجربات کو کہانی کا روپ دے کر الفاظ میں ڈھالنے لگتا۔

☆......☆......☆

حرا کے ساتھ میرا معاشقہ نیا نیا اسٹارٹ ہوا تھا جو کہ اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ وہ اکثر رات کو مجھے اپنے گھر بلالیتی اس کا کمرہ گھر کی نچلی منزل پر تھا جس میں ایک بہت چھوٹا سا کھڑکی نما دروازہ تھا جس سے اس کے کمرے میں آنا جانا بہت آسان تھا کیونکہ دروازہ گلی میں پیچھے کی طرف تھا۔

میں ہر قسم کی فکر سے آزاد خوشی خوشی اس کے بلاوے پر چلا جاتا جوانی کے دن تھے جوانی تو ویسے بھی دیوانی ہوتی ہے میری بے حسی وخودغرضی عروج پر تھی، برائی مجھے برائی نہ لگتی اور اچھائی کو دیکھ کر میں کبوتر کی طرح آنکھیں بند کرلیتا۔

ریشمیں زلفوں کے سائے مرمریں بانہیں سرمئی آنکھیں اور نشیلے ہونٹ ازبر تھے باقی سب میں بھول چکا تھا میں اپنی حدود بھول چکا تھا دن رات بس بے حیائی اور مستی کی نظر ہورہے تھے۔

حرا کے گھر والے دو دن کے لئے شادی پر جارہے تھے جہاں وہ رات کور کرتے مجھے یہ خبر حرا نے ایک ہفتہ پہلے ہی دے دی، سو میں بہت ایکسائیٹڈ تھا اور دن گن گن کر گزار رہا تھا خدا خدا کرکے وہ دن بھی آن پہنچا۔

میں نے والد صاحب کو بتایا کہ ”میں شہر میں ایک عزیز دوست کی شادی میں جارہا ہوں جانا ضروری

ہے شاید رات کو گھر نہ آ پاؤں۔''

والد صاحب خالی خالی نظروں سے مجھ دیکھ رہے تھے جیسے جانچنے کی کوشش کر رہے ہوں مجھے ان کی نظروں سے شرمندگی کے بجائے الجھن ہو رہی تھی میں ان کی تپتی نگاہوں میں مچلتے شکووں کی تردید کرنا چاہتا تھا لیکن ایسا کر کے میں اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتا۔ اس لئے چپ چاپ اپنی سنا کر دکھاوے کے طور پر چھوٹے سے بیگ میں دو سوٹ ٹھونس کر نکل کھڑا ہوا۔

جیسے جیسے میرے قدم برائی کی دلدل میں پھنستے جا رہے تھے واپسی کے دروازے مجھ پر بند ہو رہے تھے میرے دل کی سیاہی میں اتنا اضافہ ہو چکا تھا کہ اب میرا دل مکمل سیاہ ہو گیا ایک کوئلے کی مانند ہو گیا تھا۔

حرا بے صبری سے میری منتظر تھی میں نے جاتے ہی اسے بانہوں میں بھر لیا اور لاڈ بھرے انداز میں اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرنے لگا وہ بھی میرے بازوؤں میں مچلنے لگی اس کا مچلنا اچھلنا مجھے پاگل کئے دے رہا تھا، میرا خود پر سے کنٹرول ختم ہوتا جا رہا تھا، بس پھر تو جذبات کا ایسا طوفان آیا کہ سب کچھ بہا کر لے گیا۔

ہم دونوں اس طوفان کی لہروں کے ساتھ ساتھ بہتے بہتے بہت دور نکل گئے۔

میں اس کی زلفوں کی گھٹاؤں میں منہ دیئے پڑا تھا کہ اس کو کچھ یاد آیا وہ فوراً بیڈ سے اتر کر الماری کے پاس گئی ایک پٹ کھول کر اس میں سے کچھ نکال کر مڑی تو میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا۔

''حرا میری جان اس وقت کچھ بھی نہ کرو، کوئی کام نہ کرو، بس میرے پاس بیٹھی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں۔''

وہ بیڈ کی دوسری سائیڈ پر ٹک گئی اور ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ کا ٹکڑا میری طرف بڑھایا۔ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا اور کاغذ کا ٹکڑا تھام لیا بہت بے نیازی سے کھول کر پڑھنے لگا جب تک میں اس کے الفاظ و مفہوم کو سمجھ پایا زمین میرے پیروں کے نیچے سے کھسک گئی آسمان میرے سر پر ٹوٹ پڑا وہ حرا کی پریگنینسی رپورٹ تھی جو کہ پازیٹو تھی اب میں سمجھا کہ وہ پچھلے کافی دنوں سے مجھ پر شادی کے لئے کیوں دباؤ ڈال رہی تھی۔

میں آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گیا تھا کرتا بھی تو کیا کرتا کچھ سمجھ نہ آ رہا تھا میں خالی ذہن کے ساتھ حرا کی رپورٹ کو گھورے جا رہا تھا۔

''آدم اب بھی شادی امپورٹینٹ نہیں ہے؟''

اس نے حد درجہ سنجیدگی اور معصومیت سے پوچھا۔

ایک دم سے میرے ذہن میں بچپن سے لے کر اب تک کے حالات کسی فلم کی طرح چلنے لگے بچپن، باپ، منیجر، صبا، میری عزت میری ساکھ..... میری ساکھ اس ایک ساکھ نام کے لفظ سے میرے اندر جنون سا بھر گیا میں کسی بپھرے ہوئے شیر کی طرح بیڈ سے اٹھا، حرا کی رپورٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہوا میں اچھال دیا وہ ہکا بکا مجھے دیکھ رہی تھی۔

''میں اپنی عزت و شہرت کو اس طرح خاک میں نہیں ملا سکتا میں تم سے شادی نہیں کر سکتا سنا تم نے۔''

کسی جنونی کی طرح دھاڑا اپنے اندر کے بزدل اور ڈرپوک انسان کا غصہ میں ایک کمزور عورت پر چلا کر نکال رہا تھا جس کو میں نے ہی اپنے پیار کے جال میں پھانسا تھا اس کی دنیا اندھیر کر دی تھی اس سے شادی کا وعدہ کر کے۔

وہ سکتے کی کیفیت میں مجھے دیکھنے لگی جیسے اس نے کچھ غلط سنا ہو یا پھر سن کر سمجھ نہ پائی ہو۔

مجھے ساری غلطی حرا کی نظر آ رہی تھی اس پر انتہائی غصہ آ رہا تھا، میں گھوم کر بیڈ کی دوسری سائیڈ پر آیا اور اس کو بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔

''میں تم سے شادی نہیں کر سکتا میری منگنی ہو چکی ہے، آج سے میرے اور تمہارے بیچ کا ہر رشتہ ختم ہر تعلق ختم۔'' میں نے اس کے بازوؤں کو اتنی زور سے جھٹک کر دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا ٹکرائی۔

پھر بھی ایک لفظ اس کی زبان سے نہ نکلا، وہ کچھ

دیر یونہی مجھے دیکھتی رہی پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی، میں بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آیا وہ کچن میں گھس گئی اور کھڑ پڑ کی آوازیں آنے لگیں۔
مجھے لگا کہ وہ فریج سے پانی کی بوتل نکال رہی ہے سو میں لاؤنج میں صوفے پر ٹک گیا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔
اچانک ہی در و دیوار حرا کی دلدوز چیخ سے لرز اٹھے، میں بھاگ کر کچن میں گیا کچن کا منظر دیکھ کر میں بت بن گیا لہو میری رگوں میں منجمد ہوگیا اس نے خود کو بہت اذیت ناک موت دی تھی، چولہا جل رہا تھا، ساتھ ہی ساتھ حرا کا نازک بدن بھی جل رہا تھا۔
میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے جلتے ہوئے دیکھتا رہا میں نے سوچا تھا کہ حرا کو شادی سے انکار کرکے چلا جاؤں گا یہ تو میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ کہانی یہ رخ اختیار کرے گی وہ خود کو اتنی بڑی سزا دے گی۔
میرے دل پر جمی بے حسی کی برف پگھلنے لگی کب آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں کچھ پتہ نہ چلا ہوش تب آیا جب انسانی گوشت جلنے کی سرانڈ ہر طرف پھیل گئی مجھے ابکائی آئی میں منہ پر ہاتھ رکھ کر باہر کی طرف بھاگا اور گھر کے مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔
جانے کب تک ایسے ہی بھاگتا رہا۔ بھاگتے بھاگتے اپنے دوست کے فلیٹ پر گیا میری یہ حالت دیکھ کر خلیل پریشان ہوگیا میں نے بہانہ بنا دیا کہ ''چند غنڈے میرے پیچھے پڑے ہیں۔''
اگلے دن اخبار کے فرنٹ پیج پر خبر چھپی۔ ''اہل خانہ کی غیر موجودگی میں حرا نامی لڑکی اتفاقاً دوپٹے میں آگ لگنے سے جھلس کر جاں بحق ہوگئی۔''
میری کہانی جان کر رحمان بابا کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں جبکہ میں ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا، بابا نے مجھے بہت تسلی دی اور کہا۔ ''بیٹا اب بھی ٹائم نہیں گزرا اپنے گناہوں کی معافی مانگ لو، خدا کے دربار سے کوئی خالی نہیں جاتا۔''
یہ سن کر میں اٹھا وضو کیا اور دو رکعت نوافل ادا کرکے سجدے میں گر کر روتا رہا اور رب کے حضور معافی کے لئے گریہ کرتا رہا۔ جب پشیمانی کا غبار آنکھوں کے راستے نکل گیا تو میں جائے نماز سے اٹھا اور پھر سے بابا کے قدموں میں آ بیٹھا۔
''جو عورتیں ماں بننے والی ہوں۔'' اور حرام موت مر جائیں تو بدروح بن جاتی ہیں، حرا نے تو خودکشی کرکے تمہارے لئے اور اپنے لئے بہت بڑی مصیبت مول لے لی۔ سنگھا جادوگر ایک عرصے سے ایسی عورت کی تلاش میں تھا جو کہ ماں بننے والی ہو اور حرام موت مری ہو۔
حرا کی جیسے ہی جان نکلی سنگھا جادوگر نے اس کی روح کو اپنے قبضے میں کرلیا۔ وہ حرا کے ذریعے اپنے کچھ ناپاک عزائم پورے کرنا چاہتا جو کہ اگر پورے ہوگئے تو ایک کہرام برپا ہو جائے گا نیکی کی قوتیں اس کو روکنے کی کوشش میں ہیں۔
جبکہ حرا نے سنگھا جادوگر سے تمہاری مانگ کی ہے وہ بدروح بن کر سب سے پہلے تمہارا دل اور کلیجہ چبانا چاہتی ہے۔
سنگھا جادوگر کالے جادو سے حرا کو طاقتور بنانے کے لئے شیطان کے سامنے پوجا پاٹ جلے جاپ کررہا ہے حرا کو بھیجنے کے بجائے وہ کچھ مردہ مخلوق کو تمہاری طرف بھیج رہا تھا جو کہ اپنے منصوبے میں ناکام رہا تمہارے جسم کو چھوتے ہی ان کے مردہ وجود جلنے لگتے تھے اس لئے وہ تمہیں چھوڑ کر غائب ہوجاتے۔
اب حرا کے ایک طاقتور بدروح بننے میں بہت کم وقت بچا ہے اکبر۔'' رحمان بابا چپ ہوگئے۔
میں سن سا ہو رہا تھا میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔
''بابا کیا اس کو روکا نہیں جاسکتا؟'' میں نے پوچھا۔
''روکا جاسکتا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی حل ہے۔'' وہ پھر خاموش ہوگئے۔
''وہ کیا بابا؟'' میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بے تابی سے پوچھا۔

کلامِ الٰہی کی مخصوص آیتوں کی پڑھائی کا ایک عمل ہے جو کہ بہت سخت اور خطرناک بھی ہے، یہ صرف وہ انسان کرسکتا ہے جسے تم سے خود سے بھی زیادہ محبت ہو، تمہاری جان بچانے کو وہ اپنی جان داؤ پر لگا دے۔''

بابا کی بات سن کر مجھے سخت مایوسی ہوئی میرے پاس تو ایسا کوئی بھی نہ تھا۔ روپوشی کی زندگی اختیار کرنے کے کچھ عرصے بعد ہی والد صاحب کی ہارٹ اٹیک کی بدولت جان چلی گئی باقی تو میرے پاس کچھ بچا ہی نہ تھا میرے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

میں نے اپنی دونوں ہتھیلیاں آنکھوں کے سامنے پھیلا لیں قسمت کی لکیروں سے شکوہ کناں ہوا پھر دونوں ہاتھ آنکھوں سے لگالئے ایک چہرہ ایک پاکیزہ سا چہرہ نظروں میں لہرایا تو میں نے فوراً آنکھوں سے ہاتھ ہٹالئے۔

''بابا کیا یہ کام میں خود نہیں کرسکتا۔ میرے پاس ایسا کوئی نہیں ہے جو میرے لئے اپنی جان مشکل میں ڈالے۔''

بابا میری بات سن کر مسکرائے اور بولے۔

''ایک ہے، تمہاری منگیتر ہے، وہ تمہیں بہت چاہتی ہے وہی یہ کام کرے گی۔''

ایک بار پھر میری آنکھوں میں مایوسی در آئی۔

''بابا میں اس کو جانتا نہیں میں نے اس کو دیکھا نہیں بس اتنا پتہ ہے کہ وہ ابا جان کے دوست فاروقی صاحب کی بیٹی ہے اور شاید اب اس نے میری طرف سے مایوس ہو کر شادی بھی کرلی ہو۔''

''ابھی بھی وہ تمہارا انتظار کررہی ہے، ہمیں ابھی نکلنا چاہئے وقت بہت کم ہے ہمارے پاس۔'' ہم تیزی سے اٹھ کر باہر کی طرف لپکے۔

فاروقی صاحب کا پتہ مجھے اپنے آبائی گھر سے ملا اس کے بعد پوچھتے پاچھتے ہم فاروقی لاج پہنچ گئے، رحمان بابا نے فاروقی صاحب سے ساری بات کی، حرا کی پریگنینسی کی بات وہ گول کرگئے۔

فاروقی صاحب نے اپنی طرف سے اجازت دے دی۔

جب میں اپنی منگیتر سے ملا تو حیران رہ گیا۔

وہ صبا تھی، صبا فاروقی، جس کی وجہ سے آج میں ابن آدم تھا جس کے مان اور یقین نے مجھے اس مقام پر پہنچایا تھا کہ میں ہواؤں میں اڑنے لگا لیکن اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے میں اپنے مقام سے گر گیا۔ میں نے صبا کے آگے ہاتھ جوڑ دیئے اور اس کو پوری سرگزشت سنادی۔ اس نے بہت سکون سے میری بات سنی اور مجھے معاف کردیا۔ محبت کی عظمت اور مفہوم صحیح معنوں میں آج مجھ پر عیاں ہوا تھا۔

فاروقی صاحب نے صبا کو ہمارے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ ہم وہاں رکے نہیں ایک بھی لمحہ ضائع کئے بغیر ہم واپس فلیٹ پر آگئے۔

رحمان بابا نے صبا کو سارا عمل سمجھا دیا اور تسلی وتشفی دیتے ہوئے کہا کہ ''ہم تمہارے ساتھ ہیں قطعی فکر کی کوئی بات نہیں اور نہ ہی ڈرنے کی بات ہے۔''

پھر انہوں نے ایک جگہ منتخب کی ہم تینوں اس میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے تو انہوں نے گول دائرہ کی شکل میں حصار باندھ دیا۔

صبا نے آنکھیں بند کرکے عمل شروع کیا۔ میں ڈرے ہوئے کبوتر کی طرح کبھی آنکھیں بند کرتا کبھی کھولتا کبھی اونگھ جاتا۔ میں بیٹھے بیٹھے اونگھ رہا تھا کہ ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں ایک عجیب سا احساس مجھے گھیرے میں لے رہا تھا گھبراہٹ سی محسوس ہورہی تھی مجھے۔

ایسے میں فلیٹ کے داخلی دروازے سے میں نے اپنے ابا جان کو آتے دیکھا، ان کے پیچھے کوئی اور بھی خراماں خراماں چلا آرہا تھا، جب ابا جان دائرے سے کچھ ہی دوری پر رہ گئے تو وہیں رک کر بولے۔ ''دیکھو اکبر بیٹا میں اپنے ساتھ کسے لایا ہوں۔'' ان کے پیچھے جو ہستی کھڑی تھی وہ جب سامنے آئی تو میں بے تاب ہو کر اٹھ کھڑا ہوا، وہ میری امی جان تھیں۔

امی نے اپنی بانہیں پھیلالیں اور بولیں۔ ''آؤ بیٹا میرے گلے لگ جاؤ۔'' ممتا کی تڑپ ان کے لہجے

سے چھلک رہی تھی، میں نے امی جان کو صرف تصویروں میں دیکھ رکھا تھا، میں امی جان کو دیکھ کر خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ جی میں آیا کہ ان کی گود میں سر رکھ کر سارے دکھ ساری پریشانیاں ان کو سناؤں اور کسی چھوٹے بچے کی طرح مچلتے ہوئے سو جاؤں۔

میں نے اس ارادے سے آگے بڑھنا چاہا تو بابا نے میرا ہاتھ سختی سے پکڑ لیا میں نے ان سے ہاتھ چھڑانے کے لئے زور لگانا شروع کردیا۔

ادھر امی جان مسلسل مجھے پکار رہی تھیں اس سے پہلے کہ میں جذبات میں آ کر کوئی جارحانہ قدم اٹھاتا، بابا نے ابا جان اور امی کی طرف پھونک ماری تو وہ چیختے ہوئے ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ پھر ان کے جسموں نے آگ پکڑ لی، جیسے ہی ان کے جسموں نے آگ پکڑی میری چیخ نکل گئی۔

بابا نے مجھے دونوں کندھوں سے تھام لیا ان کے ہونٹ مسلسل ہل رہے تھے۔

صبا ان ساری باتوں سے بے نیاز کچھ پڑھے جارہی تھی اس کے ہاتھ کی انگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانے بدل رہی تھیں۔

میں بہت نڈھال تھا رات کا دوسرا پہر چل رہا تھا جیسے ہی وال کلاک نے 12 بجائے ایک زلزلہ سا برپا ہوگیا در و دیوار ہلنے لگے ہر چیز اپنی جگہ سے لڑھکنے لگی رحمان بابا اور صبا کی آنکھیں تو بند تھیں جبکہ میں کھلی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ اتفاقاً ہی میری نظر چھت پر پڑی تو چھت دھڑام سے میرے اوپر گرنے لگی میں ڈر کر رحمان بابا سے لپٹ گیا اور سختی سے آنکھیں میچ لیں جب کچھ دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو زلزلے کے کہیں کوئی آثار باقی نہ تھے جیسے کبھی کوئی زلزلہ آیا ہی نہ ہو۔

ابھی یہ مصیبت ٹلی نہ تھی کہ نئی افتاد آن پڑی۔ اطراف میں چیخ و پکار شروع ہوگئی اسی چیخ و پکار میں قہقہوں کی آواز بھی شامل تھی۔ میں نے فطری تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر غور کیا تو وہ نسوانی قہقہے تھے آواز

کچھ جانی پہچانی سی تھی اس شور و غل میں پتھر برسنے شروع ہوگئے خدا جانے وہ پتھر آ کہاں سے رہے تھے جو سب کے سب حصار کے باہر گر رہے تھے۔ گویا ہمیں ڈرانے کی کوشش کی جارہی تھی جس میں وہ کسی حد تک ناکام رہے تھے کیونکہ میرے سوا اس منظر کو کوئی دیکھ نہ رہا تھا۔

بابا اور صبا آنکھیں بند کئے اپنے کام میں مصروف تھے ایسی کوئی بھی چیز ان پر اثر انداز نہ ہورہی تھی۔

جب یہ طوفان شور و غل تھما تو ہر طرف سناٹا چھا گیا لاؤنج کا منظر بہت خوبصورت ہوگیا کھلی کھڑکی سے چاندنی چھن چھن کر آرہی تھی بہت سکون دہ ماحول ہوگیا تھا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور بابا کا ہاتھ چھوڑ کر سائیڈ پر ہوکر بیٹھ گیا۔

ابھی میں ٹینشن فری ہوا ہی تھا کہ گھنگھروؤں کی آواز سماعتوں سے ٹکرائی، میں نے چونک کر بابا اور صبا کی طرف دیکھا، وہ ہنوز آنکھیں بند کئے بیٹھے تھے جیسے ابدی نیند سو رہے ہوں، ان کے ہونٹ ہل رہے تھے جو ان کے زندہ ہونے کا پتہ دے رہے تھے۔

میں نے ان سے نگاہ ہٹائی تو میرے بالکل سامنے حصار کے باہر ایک ہیولا سا کھڑا تھا، جسمانی ساخت سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ کوئی لڑکی ہے، آہستہ آہستہ ہیولے نے ظاہر ہونا شروع ہوا۔

وہ حرا تھی جو بہت میٹھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی اور اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ تھی۔

''آدم میرے پاس آؤ'' اس کی آواز سن کر میں جیسے کسی ٹرانس میں آ گیا وہ بار بار ایک ہی بات دہرا رہی تھی۔ ''آدم میرے پاس آؤ'' اس کا سراپا ایک بار پھر مجھے دعوت گناہ دے رہا تھا، میں سب کچھ بھول کر لڑکھڑاتا ہوا اٹھا اور حصار سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ صبا میرے سامنے حائل ہوگئی۔

''رکو آمبر'' صبا کی آواز سن کر مجھے ایک جھٹکا سا لگا میں جیسے نیند سے جاگ گیا۔ ''آمبر یہ حرا نہیں ایک بدروح ہے جو تمہاری جان لینا چاہتی ہے۔''

میں رک گیا۔ صبا نے مجھے اپنے پیچھے ایسے چھپا

لیا جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں میں لے لیتی ہے۔

حرا کا خوبصورت سراپا بدلنا شروع ہوگیا، وہ بہت ہی بدصورت بن گئی جسے ایک نظر دیکھ کر دل کی دھڑکن رک جائے اس نے گول گول دائرے کی طرف پھرکی کی طرح گھومنا اور قہقہے لگانا شروع کردیا اس کے قہقہے اتنے خوف ناک اور اذیت ناک تھے کہ میں نے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں صبا اپنا عمل پورا کرچکی تھی۔

حرا کے غیر انسانی تکلیف وہ قہقہوں کا شور رکنے میں نہ آرہا تھا پھر اچانک وہ رکی، اس نے قہقہے لگانا بند کردیا ایک بار پھر اس کی ہیئت تبدیل ہوگئی اور وہ نازک ہی خوبصورت سی حرا کے روپ میں واپس آگئی۔

"آدم کو مجھے دے دو لڑکی، یہ میرا ہے اس سے میری شادی ہوگی۔" وہ صبا سے مخاطب تھی۔

صبا رعب سے بولی۔ "یہ ہرگز ممکن نہیں آدم کبھی تمہارا نہیں تھا، نہ مرنے سے پہلے نہ ہی مرنے کے بعد۔" صبا کی بات پر حرا غضب ناک ہوگئی اور دھمکیاں دینے لگی، جب اس کی دھمکیوں کا صبا پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے صبا کی منتیں شروع کردیں اس کی آہ وزاری دل پر چوٹ سی لگا رہی تھی میں حرا کی اس حالت کا ذمہ دار خود کو سمجھ رہا تھا۔ حرا کی آہ وزاری مسلسل جاری تھی کہ صبا بولی۔ "ایک شرط پر آدم تمہیں مل سکتا ہے۔"

میں نے حیرت سے صبا کو دیکھا۔ وہ مکمل حرا کی طرف متوجہ تھی۔ "یہاں آکر آدم کو لے جاؤ۔"

میں حیرت کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔ "تو کیا سچ میں صبا مجھے حرا کے حوالے کردے گی کیا وہ مجھے موت کے حوالے کردے گی؟" بابا کی طرف دیکھا تو وہ بدستور اپنے عمل میں مصروف تھے۔

مجھے موت کے خوف نے لرزا کر رکھ دیا۔ حرا نے صبا کی شرط مان لی تھی، وہ ابھی ہماری طرف بڑھی ہی تھی کہ اچانک ایک مکروہ صورت بوڑھا نمودار ہوا۔

"رک جاؤ حرا، مت جاؤ اس لڑکے کی طرف، میں تمہیں اس جیسے ہزاروں مہیا کردوں گا۔" اس بوڑھے کے نمودار ہوتے ہی بابا بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور اس بوڑھے سے مخاطب ہوئے۔

"سنگھا اب تیرا سارا خونی کھیل ختم ہوگیا۔"

اس نے بابا کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا اور حرا کو روکنے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر حرا ایک ہیجانی وجنونی سی کیفیت میں بھاگتی ہوئی میری طرف آئی۔ اور جیسے ہی وہ حصار کے ساتھ ٹکرائی تو اس کا وجود دھماکے سے پاش پاش ہوگیا، اس کا یہ انجام دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے حرا کا خاتمہ ہوگیا۔

سنگھا نے جب حرا کا انجام دیکھا تو بھاگ کھڑا ہوا۔ ہم ابھی تک حصار میں تھے، صبا نے مجھے سہارا دیا اور صوفے تک لے آئی، بابا نے حرا کے ٹکڑے جمع کرکے ان پر پھونک ماری تو وہ غائب ہوگئے، گھر کی ابتر حالت بھی خود بخود سدھر گئی۔

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے برائی کے ایک بہت بڑے طوفان کا رخ موڑنے میں ہماری مدد کی حرا کا وجود ختم ہوگیا۔

"میں اب چلتا ہوں بچو۔" رحمان بابا ہم دونوں کے سروں پر پیار سے ہاتھ پھیر کر چلے گئے۔

"ابن آدم کا اینڈ ہوگیا۔" میں ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میں ابن آدم کا اینڈ کبھی نہیں ہونے دوں گی جب تک میں زندہ ہوں۔" صبا کے لہجے کا یقین اور مان ابھی تک برقرار تھا۔

پھر میں نے صبا کو شاکی نظروں سے دیکھا تو وہ میری نظروں کا مفہوم سمجھ کر بولی۔ "صبح کا بھولا اگر شام کو گھر واپس آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے مسٹر آدم۔" گویا اس نے مجھے دل سے معاف کردیا تھا۔

اب ہمیں ایک نئی شروعات کرنی تھی، ایک مکمل اور خوشیوں بھری زندگی کی شروعات۔ میں نے صبا کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر مسکرانے لگا اور صبا کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیل گئی۔

بھیانک انجام

محمد ابوہریرہ بلوچ - بہاولنگر

نوجوان کو مارنے کے لئے چڑیل نے اپنے تمام حربے آزمالئے اور اس کا ایک بھی وار نوجوان پر کارگر ثابت نہ ہوا، کیونکہ نوجوان حصار میں بیٹھا عمل پڑھنے میں مشغول تھا کہ پھر چڑیل کی دلدوز چیخ سنائی دی اور ۔۔۔۔

رات کے گھٹا ٹوپ اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والے اندھیرے میں جنم لینے والی ڈراونی کہانی

یہ ستمبر کی سرد راتوں کی بات ہے۔ عبداللہ ایک سنسان سڑک پر محو سفر تھا۔ وہ اپنے آبائی گاؤں چندن پور اپنے دادا دادی سے ملنے جارہا تھا۔ آسمان پر چھائے بادل کسی بھی وقت بارش ہونے کا اعلان کرنے والے تھے۔

حالانکہ جس وقت عبداللہ اپنے گھر سے نکلا تھا اس وقت موسم بالکل صاف تھا۔ سردی کا اتنا احساس اس وقت نہ تھا جتنا کہ اب ہورہا تھا۔ اگر اسے معلوم ہوتا کہ وہاں اتنی زیادہ ٹھنڈ ہوگی تو وہ گھر سے نکلتے وقت کوئی گرم چادر وغیرہ ضرور لے آتا۔ اب اس کے پاس صرف ایک کوٹ تھا جسے اس نے سردی سے بچنے کے لئے پہن رکھا تھا۔ لیکن یہ اسے سردی سے بچانے کے لئے کافی نہیں تھا۔

اپنے گھر سے تو وہ جلدی نکلا تھا۔ پر راستہ خراب ہونے کی وجہ سے بس بھی خراب ہوگئی تھی۔ جس وقت بس نے اسے اڈے پر اتارا اس وقت رات کے تقریباً دس بج

چکے تھے۔ سردی سے اس کے جسم پر کپکپی طاری تھی۔ گہری دھند رات کی تاریکی میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ رات کے اس پہر چونکہ اڈے پر کوئی بس نہ تھی اور نہ ہی وہاں سے کسی اور بس کے ملنے کا امکان تھا اس لئے اس نے پیدل چلنے کا فیصلہ کیا۔ اپنے دادا دادی سے ملنے وہ گاؤں پہلی بار جا رہا تھا۔ گاؤں جانے کا پورا راستہ اس کے ابو نے اسے سمجھا دیا تھا۔ اس کے گھر والوں نے اسے اکیلا جانے سے روکا بھی تھا لیکن اس نے کہا کہ وہ "دادا، دادی کو سرپرائز دے گا۔"

وہ تیز تیز قدم اٹھا رہا تھا تاکہ جلد از جلد اپنی منزل پر پہنچ جائے۔ اچانک آسمان پر بجلی چمکی جس سے وہ گھبرا گیا۔ وہ مضبوط دل کا مالک تھا لیکن خوف ایک قدرتی امر ہے جو کہ بڑوں بڑوں کی ہوا نکال دیتا ہے، بجلی کی چمک کسی بھی وقت بارش کے ہونے کی پیشین گوئی تھی۔ اب بجلی وقفے وقفے سے کڑک رہی تھی۔ وہ کچھ ہی قدم چلا ہوگا کہ بارش شروع ہوگئی۔ بارش ہلکی ہلکی بوندا باندی کی صورت میں تھی۔ اس کے پاس اس سے بچنے کے لئے کوئی چھتری وغیرہ بھی نہیں تھی۔ اس لئے اس نے ایک نزدیکی درخت کے نیچے پناہ لینے میں عافیت جانی۔ اس نے ایک بڑے گھنے درخت کا انتخاب کیا۔ یہ درخت ارد گرد کھڑے تمام درختوں سے پرانا اور گھنا تھا اس کی شاخیں مضبوط اور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے تنے کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور بارش کے رکنے کا انتظار کرنے لگا۔

درختوں سے چھن کر گرتی بارش کی بوندیں جب زمین پر پڑتیں تو ایک عجیب سی آواز پیدا ہوتی۔ اندھیری رات میں یہ آواز بہت پراسرار لگ رہی تھی۔ وہ بارش کے رکنے کی دعائیں کرنے لگا۔ لیکن بارش تھی کہ تھمنے کے بجائے پہلے سے بھی تیز ہوتی جا رہی تھی۔

بارش کے ساتھ ساتھ بجلی کی ہر چمک اور کڑک کچھ لمحوں کے لئے ماحول کو روشن اور خوفناک بنا دیتی تھی۔ اس کے خوف میں متواتر اضافہ ہوتا جا رہا تھا وہ بہت خوفزدہ تھا۔ مسلسل ایک گھنٹہ برسنے کے بعد بارش کا زور آہستہ آہستہ کم ہوتا آخر بالکل ہی ختم ہو گیا۔

عبداللہ تقریباً مکمل بھیگ چکا تھا۔ کیونکہ بارش کے وہ قطرے جو کہ پتوں سے چھن کر آ رہے تھے وہ ان سے محفوظ نہ رہ سکا۔ سردی میں اب مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ لیکن اس نے ان سب کو نظر انداز کیا اور درخت کے نیچے سے نکل کر پھر سڑک پر چلنے لگا۔ بارش ہونے کی وجہ سے سڑک پر جگہ جگہ کیچڑ ہو گیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے گڑھے پانی سے بھر گئے تھے۔ بارش تو بند ہو گئی تھی لیکن بجلی کی چمک اب بھی وقفے وقفے سے جاری تھی۔ اس وقت وہ درختوں کے درمیان بنے ایک کچے راستے پر چل رہا تھا ابھی وہ دس منٹ ہی چلا ہوگا کہ بارش پھر شروع ہو گئی۔ بارش اس مرتبہ پہلے سے تیز تھی وہ دوڑ کر ایک درخت کے نیچے آ کھڑا ہوا۔ یہ پہلے درخت کی نسبت چھوٹا اور کم گھنا تھا۔

موسم کی اس اچانک تبدیلی سے وہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اس وقت رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ دفعتاً بجلی پھر چمکی جس میں اس نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو خود کو ایک اجڑے ہوئے کھیت کے پاس پایا جو کہ غالباً مکئی کا تھا، بارش آدھا گھنٹہ تک اسی طرح برسی اور دل کھول کر برسی۔ بجلی پھر چمکی اس دفعہ اس کی چمک اور کڑک اس قدر زوردار تھی کہ عبداللہ کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ بجلی کی روشنی میں اس نے ایک اور درخت دیکھا جو کہ اس سے تقریباً 100 میٹر کے فاصلے پر تھا۔ اسے اس درخت کے پاس ایک سایہ نظر آیا جو کہ درخت کے ساتھ پشت لگائے کھڑا تھا۔

رات کے اس پہر ایک انجان جگہ پر سایہ دیکھ کر ڈرنا ایک فطرتی امر ہے اس لئے وہ ڈر گیا اس نے اس سائے کی طرف دیکھا سایہ کسی لڑکی کا لگتا تھا، اس کے ذہن میں عجیب سے خیالات ابھرنے لگے بارش ایک دفعہ پھر بند ہو چکی تھی انسانی ہمدردی کے ناطے وہ اس کے پاس جانا چاہتا تھا تاکہ اس سے پوچھے کہ وہ کون ہے؟ اور یہاں کیا کر رہی ہے؟ لیکن وہ اپنے اندر اتنی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ خیر اس نے دل کو پختہ کیا اور اس کی طرف چل پڑا۔ آخر وہ اس کے نزدیک پہنچ گیا وہ ایک لڑکی ہی تھی اس کی پشت اس طرف تھی اور منہ دوسری طرف تھا۔

''کون ہو تم؟'' بالآخر عبداللہ نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔

عبداللہ کے اس سوال پر وہ مڑی تو اسے دیکھتے ہی وہ سکتے میں آ گیا۔ اتنے میں زوردار بجلی چمکی تو لڑکی کا سراپا نظر آیا۔ وہ بلا کی حسین تھی۔ اس کا بھیگا سنگ مرمر سا جسم عبداللہ کے حواس پر چھا گیا۔ وہ عبداللہ کی طرف غور سے دیکھنے لگی...... ''میرا نام صبا ہے۔'' لڑکی نے اپنا تعارف کروایا۔ ''پر اتنی رات گئے تم یہاں پر کیا کر رہی ہو؟'' یہ سوال عبداللہ نے اگرچہ نارمل انداز میں کیا تھا لیکن حقیقت میں وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔

''میں یہاں نزدیک ہی رہتی ہوں۔ میں شہر گئی تھی اپنے ابو کی دوائی لینے، وہ بہت بیمار ہیں۔ لیکن آتے ہوئے دیر ہوگئی اور پھر بارش کے سبب مجھے یہاں رکنا پڑا۔ پر تم کون ہو؟'' لڑکی نے عبداللہ سے سوال کیا۔

''میرا نام عبداللہ ہے۔ میں شہر سے آیا ہوں اپنے دادا دادی سے ملنے۔'' عبداللہ نے تعارف کروایا۔

''کہاں رہتے ہیں وہ؟'' لڑکی نے ایک اور سوال کیا......

''وہ چندن پور گاؤں میں رہتے ہیں، اور وہ میرا آبائی گاؤں ہے، بس راستے میں خراب ہوگئی تھی اس لئے دیر سے پہنچا اور پھر کوئی سواری نہ ملنے پر پیدل چل پڑا اور پھر بارش کے سبب مجھے بھی یہاں رکنا پڑا۔'' عبداللہ نے مختصراً بتلایا۔ ''کیا تم نے چندن پور گاؤں کا نام سنا ہوا ہے؟'' عبداللہ نے سوال کیا وہ اس سے جان بوجھ کر باتیں بڑھا رہا تھا تاکہ دلچسپی مزید اس کے ساتھ بتا سکے۔

''ہاں سنا بھی ہوا ہے اور دیکھا بھی ہے لیکن وہ یہاں سے بہت دور ہے اگر اسی طرح پیدل چلتے رہے تو ڈھائی تین گھنٹوں میں پہنچو گے۔ تم ایک کام کرو آج رات ہمارے گھر قیام کرلو صبح ہوتے ہی میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آؤں گی۔'' عبداللہ اس لڑکی کی ہمت پر حیران تھا۔ سخت سردی اور لڑکی کو سردی کا بالکل احساس نہ تھا اس کے برعکس اس نے خود ایک کوٹ اور موٹے کپڑے پہن رکھے تھے اور ان سب کے باوجود اسے زبردست ٹھنڈ لگ رہی تھی۔

''اس وقت رات بہت زیادہ ہو چکی ہے اگر وہاں جاؤ گے تو راستے میں تمہارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ راستے میں جنگلی جانور، بھیڑیے بہت ہیں اس لئے تم نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔'' لڑکی نے عبداللہ کو راستے میں پیش آنے والے خطرات سے آگاہ کیا۔ اس سے پہلے کہ عبداللہ کچھ سوچ کر فیصلہ کرتا لڑکی نے عبداللہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کا ہاتھ برف کی مانند یخ تھا اس کے چھوتے ہی عبداللہ کو اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔ اس نے اپنا ہاتھ اس لڑکی سے چھڑانا چاہا لیکن اس کی گرفت اس کے ہاتھ پر سخت تھی۔ وہ اس لڑکی کے روپ پر حیران و پریشان تھا۔ وہ عبداللہ کا ہاتھ پکڑے راستے سے ہٹ کر کھیتوں کے درمیان ہی ایک پگڈنڈی پر چلنے لگی، عبداللہ کا ہاتھ بدستور اس لڑکی کے ہاتھ میں تھا کبھی کبھار وہ مڑ کر اسے مسکرا کر دیکھتی تو وہ بھی آگے سے رسماً مسکرا دیتا لیکن حقیقت میں وہ اندر سے بہت ڈرا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس اس کو آنے والے خطرات کا الارم دے رہی تھی۔

''تمہارے ساتھ اور کون کون رہتا ہے؟'' عبداللہ نے بے تکلفانہ سوال کیا، وہ خود بھی حیران تھا کہ اس نے ایسا سوال کیوں اور کیسے کیا۔

لڑکی نے مسکراتے ہوئے عبداللہ کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں اور میرے بوڑھے والد، ماں بچپن میں ہی چھوڑ کر چل بسی اس وقت میں سات سال کی تھی ابو نے ہی میری پرورش کی ہے۔''

اب لڑکی نے عبداللہ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ وہ چاہتا تو وہاں سے بھاگ سکتا تھا لیکن پھر اس نے سوچا کہ لڑکا ہو کر لڑکی سے ڈر۔ شرم کی بات ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا یہ سوچ کر وہ مسلسل اس کے ساتھ چلتا رہا۔ لڑکی اسے ساتھ لئے آدھا گھنٹہ چلتی رہی۔ آخر وہ ایک بوسیدہ گھر کے پاس پہنچ گئے۔ گھر انتہائی خستہ حال اور بوسیدہ تھا۔ گھر درختوں کے درمیان گھرا ہوا تھا۔ عبداللہ کو اس جگہ سے ڈر لگنے لگا اور خاص طور پر اس لڑکی سے جو اس وقت اس کے ساتھ تھی۔ اس لڑکی نے کھنڈر نما گھر کا انتہائی بوسیدہ اور بڑا دروازہ دھکیلا تو وہ چرچراہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ گھر میں مکمل اندھیرا تھا

ایسا لگ رہا تھا جیسے برسوں سے کوئی روشنی نہ ہوئی ہو۔
"تم یہاں ٹھہرو میں روشنی کا انتظام کرتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ لڑکی اندھیرے میں یوں غائب ہوگئی جیسے اس اندھیرے کا ہی ایک حصہ ہو۔
عبداللہ وہاں اکیلا رہ گیا۔ اس کو گھمبیر سناٹے اور اندھیرے میں ڈر لگنے لگا وہ وہاں سے بھاگنے کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس نے اندھیرے میں دروازے کا تعین کیا اور دوڑا لیکن یہ کیا اس کا سر کسی سخت دیوار سے ٹکرایا تو وہ گر گیا۔ دیوار سے اس کی ٹکر اس قدر سخت اور زوردار تھی کہ اسے اپنا سر گھومتا محسوس ہونے لگا اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے اس نے ہمت کی اور ایک بار پھر کھڑا ہوگیا اس کو بہت حیرانی ہوئی کہ ابھی تو وہ دروازے سے اندر آیا تھا تو پھر وہ دروازہ آخر گیا کہاں؟ اس کا دل گھبرانے لگا۔
اس لڑکی کو گئے دس منٹ سے زیادہ ہو چکے تھے پر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔
اچانک عبداللہ کو لگا جیسے اس کے آس پاس کوئی ہے اسے کسی کی سانسوں کی گونج واضح سنائی دے رہی تھی۔ پھر اسے اپنی گردن پر دباؤ محسوس ہوا اسے لگا جیسے کوئی اس کا گلا دبا رہا ہو، اسے اپنی گردن پر سوئیاں سی چبھتی محسوس ہوئیں تو وہ سرتاپاؤں کانپ گیا، اس سے پہلے کہ وہ بے ہوش ہو کر گرتا اس نے ہمت کر کے اپنے دونوں ہاتھوں کو جوڑ کر ایک گھونسہ بنایا اور پھر ایک جانب کا تعین کر کے پوری قوت سے اسے گھمایا ایک ہلکی سی چیخ اسے سنائی دی اور ساتھ ہی اس کی گردن پر دباؤ بھی کم ہوگیا۔
چیخ کسی بوڑھے آدمی کی تھی۔ سخت سردی میں بھی اس کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپک پڑیں۔ پھر اسے اپنی طرف ایک روشنی آتی دکھائی دی یہ روشنی ایک لالٹین سے پھوٹ رہی تھی جس کو صبا نے اٹھایا ہوا تھا۔
"لگتا ہے بارش کی وجہ سے بجلی کا کنکشن کٹ گیا ہے اب پتہ نہیں کب تک ٹھیک ہوگا بس تم میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ۔" صبا نے اس سے کہا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے ساتھ چلنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ لڑکی اسے مختلف کمروں سے ہوتی ہوئی ایک ہال میں لے آئی یہ ہال باقی تمام کمروں سے جن سے وہ گزر کر آیا تھا وسیع تھا۔ اس بڑے ہال میں صرف ایک چارپائی تھی اس میں ایک چراغ جل رہا تھا حیرت کی بات یہ تھی کہ اس چراغ سے پھوٹنے والی روشنی سرخ رنگ کی تھی جو کہ اس ماحول کو پراسرار بنا رہی تھی۔ "تم یہاں بیٹھو میں تمہارے لئے کھانا لاتی ہوں۔" صبا نے کہا اور پھر عبداللہ کا جواب سنے بغیر ہی چلی گئی۔
عبداللہ ایک دفعہ پھر اس وسیع و عریض ہال میں تنہا رہ گیا تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی جس میں گرم بھاپ اٹھتا کھانا اور پانی کا ایک جگ تھا۔ جس میں سرخ رنگ کا گاڑھا مشروب تھا۔ عبداللہ کو بھوک تو تھی ہی گرم کھانا دیکھ کر اور بھی تیز ہوگئی، اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ تھوڑے سے وقت میں کھانا کیسے تیار ہوسکتا ہے۔
عبداللہ نے جیسے ہی پہلا نوالہ لیا اسے قے آگئی، کیونکہ اس کھانے کا ذائقہ بالکل عجیب تھا۔
"کیا ہوا؟" صبا نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔
"کچھ نہیں مجھے بھوک نہیں ہے۔" عبداللہ نے بہانہ کیا۔
"ٹھیک ہے پانی تو پی لو۔" صبا نے کہا تو عبداللہ نے جگ سے گلاس بھرا اور غٹاغٹ پی گیا۔ پانی پیتے ہی عبداللہ کو اپنے سر میں درد محسوس ہوا۔ اور اس کے بعد وہ ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔
رات کے نہ جانے کون سے پہر اس کی آنکھ کھلی کمرے میں لالٹین کی روشنی پھیلی ہوئی تھی، عبداللہ کو اپنے اوپر ایک سایہ جھکا محسوس ہوا۔ عبداللہ نے جیسے ہی اس کو بالوں سے پکڑ کر اوپر اٹھایا تو اسے اپنا سانس رکتا محسوس ہوا کیونکہ اس کے اوپر جھکنے والی ایک چڑیل تھی جو کہ اس کا خون پی رہی تھی۔ اس چڑیل کا چہرہ انتہائی سیاہ تھا اس کے چہرے پر بے شمار جھریاں تھیں اور آنکھیں انگاروں کی طرح سرخ، اس نے اپنے حواس پر قابو پاتے ہوئے اسے زوردار دھکا دیا اور دوڑ لگادی۔ وہ اس کمرے سے نکل کر دروازے کی طرف بھاگنے لگا۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ دروازہ اب کھلا ہوا تھا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے اپنی رفتار میں بالکل کمی نہ کی

اور اندھا دھند بھاگتا رہا۔ وہ بالکل نہیں جانتا تھا کہ وہ اب کہاں بھاگا جا رہا ہے اسے فکر تھی تو صرف اپنی جان بچانے کی اس دھوکہ دینے والی چڑیل سے۔

آسمان اب بالکل صاف ہو چکا تھا۔ ستارے چمک رہے تھے۔ بارش کی وجہ سے جگہ جگہ کیچڑ بن گیا تھا۔ مسلسل بھاگنے سے وہ بہت تھک گیا۔ اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اچانک اس کا پاؤں کسی بڑے پتھر سے ٹکرایا اور اس کے ساتھ ہی وہ ہوش کی دنیا سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

اس نے جب آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک اجنبی مقام پر پایا وہ گھبرا کر اٹھنے ہی والا تھا کہ اسے اپنے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔ "لیٹے رہو بیٹا۔" اس نے چونک کر آواز کی سمت دیکھا تو اس کی نظر ایک باریش بزرگ پر پڑی جن کی عمر کم از کم اسی سال کے لگ بھگ تھی۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیح تھی اور بدن پر سفید لباس تھے۔

"آپ کون ہیں؟ میں اس وقت کہاں ہوں؟ اور مجھے یہاں کون لایا؟" عبداللہ نے کئی سوال ایک دم بزرگ سے کر ڈالے۔ وہ بزرگ پہلے تو تھوڑا مسکرائے پھر بولے۔ "تم تھوڑا آرام کر لو پھر میں تمہارے سوالوں کا جواب دوں گا۔ تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔"

"نہیں بابا جی میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ پلیز بتائیں کہ میں کہاں ہوں؟" عبداللہ نے بزرگ سے التجا کی۔

جب بزرگ نے عبداللہ کو اس قدر پریشان اور حیرت زدہ دیکھا تو بولے۔ "تم مجھے اس راستے میں بے ہوش پڑے ملے تھے۔ تمہاری حالت اس وقت بہت زیادہ خراب تھی اور تم پسینے میں شرابور تھے۔ لگتا ہے تمہارے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے، مجھے بتاؤ، بیٹا تم بے ہوش کیوں ہوئے تھے؟ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔" عبداللہ نے بزرگ کو اپنا مخلص سمجھا اور اپنے ساتھ گزرا سارا واقعہ کہہ سنایا۔

بزرگ اس کی کہانی کو توجہ سے سنتے رہے پھر بولے۔ "اوہو..... تو یہ بات ہے۔"

"پر آپ کون ہیں بابا جی؟" عبداللہ نے دوبارہ وہی سوال دہرایا۔

"میرا نام عبدالرحمٰن ہے اسی جنگل میں میرا مسکن ہے۔" بزرگ نے تعارف کروایا۔

"بہت سی سرکش اور ضدی چڑیلوں اور بدروحوں کو میں نے قید کر رکھا ہے اس جنگل کی ہر چیز پر میری حکومت ہے۔ پر لگتا ہے تم نے جس چڑیل سے پیچھا چھڑایا ہے وہ بہت ہی خطرناک اور طاقتور تھی۔ ایک بات یاد رکھو چڑیل جس انسان کا خون ایک بار چکھ لیتی ہے اس کو اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب تک اس کے سارے جسم کا خون نہ نچوڑ لے۔ اور اس نے تمہارا خون چکھ لیا ہے اور اب وہ تمہیں ضرور ڈھونڈے گی۔" بزرگ نے عبداللہ کو یہ سب بتلایا تو وہ گھبرا گیا۔ اس کا واسطہ زندگی میں چڑیل سے نہیں ہوا تھا۔ اس نے ان کے بارے میں صرف کہانیاں سن رکھی تھیں۔ اسے کیا معلوم تھا جن کہانیوں کو سن کر وہ ہنستا تھا۔ ایک دن اس کی اصلی زندگی میں بھی رونما ہوں گی۔

بزرگ نے عبداللہ کا ڈرا چہرہ دیکھا تو اسے دلاسا دیا کہ "اب تم بے فکر ہو جاؤ یہ میرا علاقہ ہے اور یہاں پر میرا راج چلتا ہے میری مرضی کے بغیر کوئی بھی جن بھوت یہاں نہیں آ سکتے۔ یہاں پر بھی جن رہتے ہیں پر وہ سب میرے ماتحت ہیں۔

مجھے پتا کرنا ہوگا کہ وہ چڑیل جس سے تم ملے تھے وہ کون تھی؟ یہ سب معلوم کرنے کے لئے مجھے آج رات عمل کرنا ہوگا، اب تم فی الحال آرام کرو، میں نے تمہارے ناشتے کے لئے کہہ دیا ہے۔" یہ کہہ کر بزرگ جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔

عبداللہ ایک بار پھر تنہا رہ گیا اس نے جھونپڑی کا جائزہ لیا۔ اس میں گھاس پھونس کا فرش پانی کا ایک گھڑا اور مٹی کا گلاس موجود تھا۔ لیکن جہاں وہ بزرگ بیٹھے تھے وہاں پر کسی جانور کی کھال بچھی ہوئی تھی۔ پھر اسے اپنے پیچھے سے آواز سنائی دی۔ "کھانا کھا لو بابو جی۔"

عبداللہ نے پلٹ کر دیکھا تو خوف سے اس کی سانس رکنے کو تھی اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں کیونکہ آواز دینے والا کوئی انسان نہیں بلکہ ایک

عجیب الخلقت وجود تھا۔
''کون ہو تم؟'' اس نے ڈرتے ہوئے لہجے میں اس عجیب الخلقت سے پوچھا۔ ''میرا نام کالو سنگھ ہے۔ اس نے انسان کی طرح آگے بڑھ کر کہا اور کھانا چارپائی پر رکھ دیا۔ ''میں بابا جی کا بھگت ہوں۔'' عبداللہ نے کالو سنگھ سے کئی اور سوال کر ڈالے۔
''میں ایک جن ہوں بابو جی، پہلے بابا جی نے مجھے قید کیا تھا پھر مجھے آزاد کر دیا لیکن ان کی خوش اخلاقی سے متاثر ہو کر میں ان کے پاس ہی رہ گیا۔'' وہ غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ بھوک تو عبداللہ کو زوروں کی تھی گرم کھانا دیکھ کر اور بھی تیز ہوگئی۔ اس نے پہلے کھانے کی طرف اور پھر اس عجیب الخلقت وجود کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گیا کہ وہ اسے باہر بھیجنا چاہتا ہے اس لئے چپ چاپ باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی عبداللہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ کھانا اتنا لذیذ تھا کہ وہ اسے منٹوں میں چٹ کر گیا۔ اس کے بعد اس نے جگ سے پانی پیا جس سے اس کی کھوئی توانائی بحال ہوگئی جب وہ کھانا کھا چکا تو وہ اندر آیا اور برتن لے کر چلا گیا۔ کھانا کھا کر عبداللہ چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ دل ہی دل میں اس چڑیل اور بزرگ کے بارے میں سوچنے لگا کہ پتا نہیں بابا جی اس چڑیل کے بارے میں جان پائیں گے یا نہیں، اس نے آنکھیں موند لیں۔ اس کے بعد کب وہ نیند کی گہری وادیوں میں چلا گیا اسے پتا ہی نہ چلا۔
شام کے وقت تک وہ سوتا رہا۔ شام کو بزرگ کے اٹھانے پر اس کی آنکھ کھلی جو کہ اسے کھانا کھانے کا کہہ رہے تھے۔ اس نے اٹھتے ہی سب سے پہلے اس چڑیل کے بارے میں پوچھا کہ اس کا پتا چلا کہ نہیں۔ ''بیٹا ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ اس کے لئے عمل آج رات کروں گا۔ تم بے فکر رہو اگر خدا نے چاہا تو اس کی کمزوری معلوم کر کے اسے فنا کر دوں گا۔'' بزرگ اسے دلاسا دیتے ہوئے بولے۔
''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' اس نے دل ہی دل میں کہا پھر ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھانے لگا۔

شام کو جاتے ہوئے بزرگ نے عبداللہ کو سختی سے منع کیا کہ ''آج رات تم اس جھونپڑی سے باہر مت نکلنا ورنہ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔''
''ٹھیک ہے بابا جی جیسا آپ کا حکم۔'' عبداللہ نے مودب لہجے میں کہا۔
''شاباش بیٹا یہ ہوئی نا اچھی بات۔'' بزرگ نے اسے تھپکی دی۔ ''اب تم سو جاؤ مجھے عمل کے لئے جانا ہے دعا کرنا کہ میں کامیاب لوٹوں۔'' یہ کہہ کر بزرگ جھونپڑی سے باہر نکل گئے۔ عبداللہ پھر لیٹ گیا۔ اس بار اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کو بزرگ پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ ضرور اس چڑیل کو ختم کر دیں گے۔ وہ یونہی لیٹا رہا۔
رات کو اسے محسوس ہوا جیسے اسے کوئی باہر بلا رہا ہو۔ پہلے پہل تو اسے یہ وہم لگا پر جب آوازیں مسلسل سنائی دینے لگیں تو اسے یقین ہوگیا کہ باہر کوئی ہے۔ وہ اٹھ کر باہر جانے والا تھا کہ اس آواز کے بارے میں معلوم کر سکے پھر اسے بزرگ کی ہدایت یاد آ گئی کہ ''بیٹا آج کسی صورت بھی باہر مت نکلنا۔'' اس نے باہر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور آ کر دوبارہ لیٹ گیا۔ ساری رات اسے یہی آوازیں پریشان کرتی رہیں پھر اس نے ان سب کو ان سنا کر دیا اور یونہی کروٹ بدلتے رات گزر گئی۔
صبح اس کے لئے کالو سنگھ ناشتہ لے کر آ گیا۔ اس نے اس سے بزرگ کے بارے میں پوچھا کہ وہ آئے کہ نہیں..... ''نہیں ابھی تک نہیں آئے پر آئے تو میں آپ کو آگاہ کر دوں گا۔ آپ بے فکر ہو جایئے اور ناشتہ کر لیجئے۔'' عبداللہ نے اٹھ کر گھڑے سے پانی لیا اور ہاتھ منہ دھو کر ناشتہ کرنے لگا حسب عادت وہ برتن خالی ہوئے تو کالو سنگھ اسے اٹھا کر چلتا بنا۔ اب اسے بابا جی کا انتظار تھا۔ تاکہ ان سے عملی طور پر چڑیل کے بارے میں معلوم کرے۔ صبح کے 9 یا 10 بجے اس کا یہ طویل انتظار رنگ لایا اور بابا جی واپس آ گئے۔ آتے ہی عبداللہ نے ان سے چڑیل کے بارے میں پوچھا۔
''غور سے سنو بیٹا وہ بہت ہی ظالم اور طاقتور چڑیل ہے رات کے عمل میں مجھے پتا چلا ہے کہ وہ بہت ہی

خطرناک ہے۔ معصوم اور سیدھے سادھے مسافروں اور راہ گیروں کو بہلا پھسلا کر مندر میں لے جاتی ہے جہاں وہ تمہیں بھی لے گئی تھی۔ پھر وہ وہاں ان کا خون پیتی ہے۔ لوگوں کا خون پی کر ہی وہ نوجوان اور خوب صورت دکھتی ہے ورنہ اس کا اصلی چہرہ وہی ہے جو تم نے خون پیتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور جس بوڑھے کے بارے میں اس نے بتایا تھا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ درحقیقت وہ اس کا گرو ہے جو کہ بدروح ہے۔ خون پینا ان دونوں کا مشغلہ ہے۔

بیٹا ان کی طاقتیں انسانی خون پینے اور گوشت کھانے سے بہت بڑھ گئی ہیں۔ بیٹا ان کو مارنا اب بہت ہی زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔ اگر ان کا کوئی حل نہ کیا گیا تو وہ ایسے ہی معصوم اور بے قصور لوگوں کو مارتے اور ان کا خون پیتے رہیں گے اور اپنی طاقت میں اضافہ کرتے رہیں گے۔''

''بابا جی میں ان کو ضرور ختم کروں گا۔'' بزرگ کی باتیں سن کر عبداللہ جوش اور جذبے سے بولا۔

''شاباش بیٹا! ایک اچھے مسلمان سے یہی امید ہوسکتی ہے۔'' بزرگ عبداللہ کی ہمت کی داد دیتے ہوئے بولے۔

''بیٹا میرے ساتھ تمہیں بھی ایک خطرناک عمل کرنا ہوگا جس سے تم کو بے پناہ طاقتیں حاصل ہوجائیں گی اور انہی طاقتوں سے تم ان دونوں کا مقابلہ کرکے انہیں ختم کرسکتے ہو۔ ویسے تو یہ عمل میں خود بھی کرسکتا تھا۔ لیکن تمہارا ساتھ ہوگا تو تمہیں زیادہ فائدہ ہوگا۔ بیٹا اس عمل میں تمہیں ہر طرح سے ڈرایا دھمکایا جائے گا اور تمہارے عمل کو ناکام بنانے کے لئے کئی حربے آزمائے جائیں گے اور حصار سے باہر نکالنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے لیکن یاد رکھو اگر تم عمل چھوڑ کر حصار سے باہر آگئے تو اپنی جان سے جاؤ گے اور اس کے برعکس اگر تم ثابت قدم رہو گے تو جیت تمہاری ہوگی۔'' بزرگ نے عبداللہ کو عمل کے خطرات سے تفصیلاً آگاہ کیا۔

''میں ہر طرح کی مصیبت اور آفت کا سامنا کرنے کے لئے پوری طرح تیار ہوں بابا جی۔'' عبداللہ نے پختہ عزم سے کہا۔۔۔۔ پھر بزرگ نے اسے عمل کے کلمات یاد کرادیئے، جسے اس نے اچھی طرح یاد کرلیا۔

بزرگ دوبارہ بولے۔ ''بیٹا یہ عمل تین دن کا ہے کیونکہ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں اور ہاں یہ عمل تمہیں جنگل میں کرنا ہوگا۔'' پھر بزرگ نے اسے ایک خنجر اور تعویذ دیا اور بولے۔ ''ان کو سنبھال کر رکھنا اور تعویذ کو خود سے جدا نہ کرنا کیونکہ ان کے ہوتے ہوئے کسی بھی بھوت یا جن کا وار بے اثر ہے۔''

عبداللہ نے بزرگ کا شکریہ ادا کیا۔

رات کے 8 بج رہے تھے۔ جنگل بہت زیادہ گھنا تھا۔ عبداللہ نے آگے بڑھ کر ایک جگہ کو صاف کیا پھر اپنے ساتھ لائے خنجر سے حصار کھینچا اور اس میں بیٹھ کر عمل کے کلمات کا ورد کرنے لگا۔ کچھ پل تو سب کچھ ٹھیک رہا پھر تیز ہوا چلنی شروع ہوگئی لیکن عجیب بات تو یہ تھی کہ ہوا حصار کے باہر ہی تھی۔ ہوا نے خطرناک صورت اختیار کرلی ایسے لگنے لگا جیسے درخت جڑوں سے اکھڑنے والے ہوں۔

کچھ دیر بعد طوفان کا زور ٹوٹ گیا اب ہر طرف پتے ہی پتے بکھرے ہوئے تھے۔ پھر اسے شیروں کی آواز سنائی دی، اس کا دل دھک دھک کرنے لگا، اسے دو شیر اپنی طرف آتے دکھائی دیئے یہ شیر بہت ہی خونخوار لگ رہے تھے وہ آہستہ آہستہ عبداللہ کی طرف بڑھنے لگے ایک بار تو اس کا دل کیا کہ اٹھ کر بھاگ جائے پھر بزرگ کی آواز پر اس کی ڈھارس بندھی کہ ''بیٹا یہ سب نظر کا دھوکہ ہے۔''

خوف سے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور زور زور سے عمل کے الفاظ دہرانے لگا شیروں کی آواز اسے قریب سے قریب تر آتی محسوس ہوئی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو شیر بالکل ہی قریب آگئے پھر ان دونوں نے اس پر چھلانگ لگائی لیکن وہ حصار سے ٹکراتے ہی غائب ہوگئے۔ اب وہ ایک نئی مصیبت کا سامنا کرنا کے لئے تیار تھا۔

رات کے 2 بجنے والے تھے کہ اسے ایک بچے کے رونے کی آواز سنائی دی اس نے دیکھا کہ ایک پانچ سالہ بچہ جو شکل وصورت کے لحاظ سے بہت ہی معصوم تھا بیٹھا رو

رہا تھا۔ اسے اس بچے پر بہت ترس آیا پھر اس نے ایک خوفناک بلا کو دیکھا جو اس بچے کی طرف بڑھ رہی تھی اس بلا کی طرف دیکھ کر وہ بچہ اور اونچی آواز سے رونے لگا۔ وہ بلا اس قدر خوفناک تھی کہ خدا کی پناہ۔ بلا نے قہر آلود نظروں سے عبداللہ کو دیکھا پھر بولی۔

''اے لڑکے اپنا عمل چھوڑ دے ورنہ اس بچے کو کھا جاؤں گی۔'' اس کی آواز ایسی تھی جیسے بجلی کڑک رہی ہو اس نے اس بلا کی بات پر دھیان نہ دیا اور عمل پڑھنے میں مصروف رہا۔

عبداللہ کو بزرگ نے بتایا تھا کہ عمل میں نظر آنے والے واقعات محض فریب اور نظر کا دھوکہ ہوں گے اور عمل کو ختم کرنے کے لئے ہوں گے۔ اس لئے وہ ثابت قدم رہا۔

اس بلا نے اس روتے بچے کو اٹھایا اور اس کی نظروں کے سامنے چیر پھاڑ کر کھا گئی۔

عبداللہ کے لئے وہ منظر دل دہلا دینے کے لئے کافی تھا۔

اس بچے کو کھانے کے بعد وہ عبداللہ کی طرف بڑھی اور بولی۔ ''اے لڑکے اب بھی وقت ہے میری بات مان لے اور عمل چھوڑ دے اور یہاں سے چلا جا ورنہ تیرا حشر بھی اس سے بھی برا کروں گی۔'' عبداللہ نے اس کو محض دھمکی سمجھا اور عمل پڑھنے میں مشغول رہا۔ پھر وہ بلا غصے سے اس کی طرف بڑھی اس کے تیور کچھ ٹھیک نہیں تھے۔ پر جیسے ہی وہ حصار سے ٹکرائی اسے آگ نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور وہ اس کے سامنے جلنے لگی۔ اس کی چیخیں پورے جنگل میں گونج رہی تھیں۔ عبداللہ کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ اس نے اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس لیں۔ پھر پوری رات پرامن رہی۔

عبداللہ کا ایک رات کا عمل مکمل ہو گیا کیونکہ صبح ہو گئی تھی پھر اسے بزرگ کی آواز سنائی دی۔ ''اپنی آنکھیں بند کرلو بیٹا اس نے ایسا ہی کیا اور جب آنکھیں کھولیں تو خود کو بابا جی کی جھونپڑی میں پایا۔ بزرگ اٹھ کر عبداللہ سے ملے اور ایک رات کا عمل پورا ہونے پر اور ثابت قدم رہنے پر مبارکباد دی۔ پھر عبداللہ کے لئے کھانا لایا گیا۔ کھانا کھانے کے بعد بزرگ نے اسے سو جانے کے لئے کہا کیونکہ آج آنے والی رات پھر اسے جاگنا ہے۔ رات جاگنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ اس لئے وہ بستر پر لیٹ گیا اور میٹھی نیند لینے لگا۔

شام تک وہ سوتا رہا۔ پھر حسب معمول اٹھ کر کھانا کھایا پھر بزرگ نے اسے رات کے عمل کے خطرات سے آگاہ کیا اور ثابت قدم رکھنے کی تلقین بھی کی۔ اس نے عمل کے کلمات بزرگ کو سنائے تاکہ اگر اس میں غلطی ہو تو اصلاح ہو جائے لیکن وہ اسے اچھی طرح یاد ہو گئے تھے۔

پھر اس نے خنجر اور تعویذ جو کہ بزرگ نے اسے دیئے تھے اٹھا لئے، بابا جی نے اسے ڈھیروں دعائیں دیں اور آنکھیں بند کرنے کے لئے کہا کیونکہ اس کے عمل کا وقت ہو گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور جب کھولیں تو اپنے آپ کو عمل والی جگہ پر کھڑا پایا۔

بزرگ کے پاس واقعی بہت طاقتیں تھیں جس کی وجہ سے وہ اسے منٹوں میں اس کی مطلوبہ جگہ پر پہنچا دیتے۔ ورنہ اگر اسے پیدل چلنا پڑتا تو نہ جانے وہ اس جگہ پر کتنی دیر میں پہنچتا۔ اس نے اپنی جگہ کو صاف کیا حصار کھینچا اور بیٹھ کر ورد کرنے لگا۔ وہ اب آنے والے خطرات سے پہلے ہی آگاہ تھا کہ آج کی رات پہلے والی رات سے زیادہ سخت ہوگی۔

اسے بیٹھے کچھ دیر ہی گزری تھی کہ آسمان سے بارش ہونے لگی وہ ڈر گیا کیونکہ یہ عام بارش نہیں بلکہ خون کی بارش تھی حیرت کی بات یہ تھی کہ کل کی طرح یہ سب حصار کے باہر ہو رہا تھا۔ پھر اسے دور سے اپنی طرف ایک لڑکی آتی دکھائی دی وہ جب اس کے نزدیک آئی تو عبداللہ اس کے حسن میں کھو کر سب کچھ بھول گیا۔ وہ لڑکی حصار سے تھوڑا ہٹ کر اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ بت بنا اس حسن کی دیوی کو تکے جا رہا تھا۔ وہ لڑکی افسردہ تھی پھر اس نے رونا شروع کر دیا۔ وہ لڑکی عبداللہ کے دل کو بھا گئی۔ وہ بھی ٹکٹکی باندھے عبداللہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ اس سے مخاطب ہوئی۔ ''کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟ اگر کرنا چاہتے ہو تو حصار سے باہر نکل آؤ ہم شادی کر کے

ایک نئی دنیا بسائیں گے۔"

عبداللہ اس کے حسن کے سحر میں جکڑ چکا تھا۔ وہ حصار سے باہر نکلنے ہی والا تھا کہ بزرگ کی آواز سنائی دی۔ "بیٹا یہ سب ایک فریب ہے اس لڑکی کی باتوں میں مت آؤ یہ خوب صورت نہیں بلکہ بدصورت چڑیل ہے، حصار سے باہر نکلتے ہی یہ تمہیں مار ڈالے گی اور خون پئے گی۔"

باباجی کی آواز سن کر وہ اس لڑکی کے سحر سے آزاد ہوا۔ اس نے خود کو بہت ملامت کیا اور عمل دوبارہ پڑھنے میں لگ گیا۔ اس لڑکی نے اسے بہت بہلایا پھسلایا پر اب وہ سنبھل چکا تھا۔ لڑکی نے اسے دولت اور شہرت کا لالچ دیا پر اب وہ اس کے مکر میں کہاں آنے والا تھا۔ جب اس کی تمام ترکیبیں ناکام ہوگئیں تو لڑکی نے اپنا روپ بدلنا شروع کردیا۔ اس کے منہ سے دو لمبے لمبے دانت ظاہر ہوگئے۔ اس کے ناخن کئی انچ کے ہوگئے اس کی ناک بالکل غائب ہوگئی اور بال زمین کو چھونے لگے۔ وہی لڑکی جس کو پہلے وہ حسن کی دیوی سمجھ رہا تھا فدا ہوا جارہا تھا اب اس کو دیکھ کر کراہیت ہورہی تھی لڑکی آہستہ آہستہ اس کے قریب آنے لگی اس کے جسم سے اٹھنے والی بدبو سے عبداللہ کا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ دل یوں زور زور سے دھڑ کنے لگا جیسے پسلیوں کے پنجر کو توڑ کر باہر نکل آئے گا۔

قریب آتی آتی جب وہ حصار سے ٹکرائی تو اسے آگ لگ گئی وہ یوں جلنے لگی جیسے اس پر پیٹرول چھڑک کر جلادیا گیا ہو۔ اس طرح جلتی وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی اور اس کے ساتھ ہی عبداللہ کے دوسرے دن کا عمل بھی پورا ہوگیا۔

عبداللہ نے حصار سے باہر قدم رکھا اس کے سامنے وہی مندر والا بوڑھا ظاہر ہوگیا وہ غصے سے لال پیلا ہوا جارہا تھا۔ بوڑھے نے قہر آلود نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ پڑھ کر اس کی طرف پھوک ماری تو تیروں کی ایک بوچھاڑ عبداللہ کی طرف بڑھنے لگی۔ لیکن وہ قریب آتے آتے غائب ہوگئے۔

بوڑھے نے اپنا وار ناکام دیکھا تو اور بھی زیادہ غصہ ہوا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے تو ایک چمکتی تلوار اس کے ہاتھ میں آگئی۔ عبداللہ پہلے تو اس سے ڈر رہا تھا مگر اب وہ تیار تھا۔ اور پھر جیسے ہی بوڑھے نے وار کیا تو اس کا وار ناکام گیا۔

پھر اچانک بوڑھے کی گردن کٹ کر دور جا پڑی گردن کے کٹتے ہی خون فوارے کی مانند بہنے لگا۔ وہ کچھ دیر تڑپتا رہا پھر ساکت ہوگیا۔ اس کے مرتے ہی وہ ہوا میں تحلیل ہوگیا۔

پھر عبداللہ کو باباجی کی آواز سنائی دی۔ "بیٹا جلدی سے آنکھیں بند کرو ورنہ چڑیل آکر تمہیں مار ڈالے گی۔"

عبداللہ نے ہدایت پر عمل کیا اور فوراً سے پہلے جھونپڑی میں تھا۔ بابا نے اسے خوشی سے گلے لگایا۔ "واہ بیٹا واہ..... تم نے تو آج کمال کردیا۔ اب تم آسانی سے چڑیل کو مار سکو گے۔"

"باباجی میری جیت میں سب سے بڑا کمال تو آپ کا ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے اب باتیں چھوڑو اور کھانا کھا کر آرام کرو، آج آخری رات کا عمل باقی ہے، یہ رات باقی دو راتوں سے زیادہ سخت ہوگی، اس میں تمہارے پاس اتنی خوفناک شکل والی چڑیلیں آئیں گی جن کا تصور بھی تمہارے رونگٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی ہوگا۔ لیکن بیٹا اپنے دل کو مضبوط رکھنا اب منزل بالکل قریب ہے اور مجھے یقین ہے تم اسے ضرور حاصل کرلو گے۔" بزرگ نے عبداللہ کو ہمت دلائی اور وہ انہیں خاموشی سے سنتا رہا۔

پھر عبداللہ کے لئے گرما گرم کھانا لایا گیا جسے اس نے جی بھر کر کھایا۔ کھانا کھا کر بزرگ اسے کچھ دیر عمل کے متعلق بتلاتے رہے اور پھر بزرگ ہی کے کہنے پر وہ لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی وہ میٹھی نیند کے مزے لینے لگا۔ آج اس کی آنکھ خلاف توقع عصر کے وقت کھل گئی اس نے جھونپڑی میں دیکھا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا باباجی بھی کہیں باہر چلے گئے تھے۔

اس نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے اور پھر جھونپڑی سے باہر نکل آیا وہ باہر کے منظر سے لطف اندوز ہورہا تھا کہ اسے ایک طرف سے بزرگ آتے دکھائی دیئے وہ

بہت پریشان لگ رہے تھے وہ اس کے پاس سے گزر کر بغیر کوئی بات کئے جھونپڑی میں داخل ہوگئے بزرگ کے اس رویے پر اسے حد سے زیادہ حیرانی ہوئی وہ بھی ان کے پیچھے چلا آیا۔

بزرگ اندر سر جھکائے گہری سوچ میں غرق تھے۔

"کیا ہوا بابا جی؟" عبداللہ نے پریشانی سے سوال کیا۔

"کچھ نہیں بیٹا کچھ نہیں۔" بزرگ نے صاف جھوٹ بول دیا۔....

"کچھ بتائیں کیا ہوا ہے۔ میں نے اس سے پہلے آپ کو اتنا پریشان نہیں دیکھا۔" عبداللہ بولا۔

"بیٹا اس چڑیل کو پتا چل گیا ہے کہ تم نے ہی اس کے گرو کو مارا ہے، اب وہ تم پر کسی بھی وقت حملہ کرسکتی ہے۔ اس نے ایک رات کا ایسا چلہ کرلیا ہے، جس کی وجہ سے اس کے شیطان آقا نے اسے بے انتہا طاقتیں دے دی ہیں اور اس بوڑھے نے بھی مرنے سے پہلے اپنی ساری شکتیاں اسے دان کردی تھیں جس سے وہ مزید طاقتور ہوگئی ہے اور تمہیں جو طاقتیں اس عمل سے ملیں گی وہ اس کے مقابلے کے لئے کم ہیں تمہیں اس سے لڑنے کے لئے اس سے بھی زیادہ طاقت کی ضرورت ہوگی۔ میں اسی وجہ سے پریشان ہوں کہ تم اس کا مقابلہ کیسے کرپاؤ گے۔"

بزرگ کی باتیں سن کر اس کا منہ توری کی طرح لٹک گیا۔ "اب ایک ہی صورت ہے بیٹا۔" بابا جی نے افسردگی سے کہا۔

"وہ کون سی۔" اس نے بزرگ سے سوال کیا۔

"مجھے بھی اپنی کچھ طاقتیں تمہیں دینی ہوں گی، صرف اسی صورت میں تم اس کے مدمقابل ٹھہر پاؤ گے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔ بیٹا اب میں بوڑھا ہوگیا ہوں، پتا نہیں کب موت کا پیغام آجائے تو میری کچھ طاقتیں جو میں نے اکٹھی کی تھیں ضائع ہوجائیں گی اس لئے میں چاہتا ہوں کہ یہ سب میں تمہیں سونپ دوں۔"

بزرگ کی باتیں سن کر عبداللہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں اس نے روتے ہوئے کہا۔ "بابا جی میں آپ کا کچھ بھی نہیں لگتا تھا، پھر بھی آپ نے مجھے اپنے بیٹے کی طرح رکھا، میری پریشانی کو اپنی پریشانی سمجھا مجھ پر اتنی عنایتیں اور مہربانیاں کیں کہ جن کا بدلہ میں آپ کی غلامی کرکے بھی ادا نہیں کرسکتا، اب آپ اپنی زندگی کا حاصل بھی مجھے دے کر ایک اور احسان کرنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں بیٹا ایسی باتیں مت کرو تم میرے بیٹے جیسے ہو تم نے مجھے اپنا دکھ بتایا تو میں نے تمہاری مدد کردی، میں نے تم پر کوئی احسان تو نہیں کیا بلکہ یہ سب تو انسانیت کے ناطے میرا فرض تھا اور ویسے بھی اگر اپنی طاقتیں تمہیں نہ دوں تو کس کو دوں گا، میں انہیں ضائع بھی تو نہیں کرسکتا۔" بزرگ نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے بابا جی میں نے آپ کو استاد سمجھا ہے اس لئے آپ کی جو مرضی کریں میں آپ کے ہر حکم کی تعمیل کروں گا۔"

"شاباش بیٹا۔" پھر بزرگ اسے لے کر اس کھال پر بیٹھ گئے جو کہ جھونپڑی میں ایک کونے میں بچھی ہوئی تھی۔

بزرگ نے اسے اپنے سامنے بٹھایا اور دوزانوں بیٹھنے کے لئے کہا۔ عبداللہ نے ایسے ہی کیا پھر ان کے حکم پر اس نے اپنی آنکھوں کو بند کرلیا۔ پھر بزرگ عبداللہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھنے لگے، پھر پھونکیں مارنی شروع کردیں۔ ان کی ہر پھونک پر عبداللہ کی حالت بدل جاتی اسے یوں لگتا جیسے اس کے جسم میں کوئی گرم شے داخل ہوئی جارہی ہو۔ وہ اسی حالت میں ایک گھنٹہ بیٹھے رہے پھر بابا جی کے حکم سے عبداللہ نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اسے اپنے آپ میں واضح تبدیلیاں نظر آئیں اس کی آنکھوں میں بھی وہی چمک تھی جو بابا جی کی آنکھوں میں تھی۔

"اب تم عام انسان نہیں رہے اس وقت تمہارے قبضے میں کئی روحیں، بدروحیں، جن چڑیلیں آچکی ہیں۔ بیٹا ان طاقتوں کو کبھی غلط استعمال نہیں کرنا، ہمیشہ انسانیت کی خدمت کرتے رہنا، کسی کو مایوس نہیں کرنا۔" اس کے علاوہ بھی کئی اور نصیحتیں بزرگ نے کیں جن پر قائم رہنے کا عبداللہ نے وعدہ کیا۔

آج اس کے عمل کی آخری رات تھی۔ بزرگ نے اس کے لئے بہت ساری دعائیں کیں پھر بولے۔ ''آج رات تمہارے پاس وہی چڑیل آئے گی تم نے اس سے بالکل نہیں ڈرنا۔ چاہے جو بھی ہو جائے، اپنے عمل کو مکمل کرنا اور کسی صورت حصار سے باہر نہیں نکلنا۔''

رات ہونے والی تھی۔ عبداللہ نے جی بھر کر بزرگ سے باتیں کیں، پھر باباجی نے عبداللہ کو گلے سے لگایا اور کہا۔ ''اب تمہارے عمل کا وقت ہو گیا ہے لیکن یاد رکھنا جو ہدایات میں نے تمہیں دی ہیں اس پر عمل پیرا رہنا ورنہ بہت بڑی مصیبت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔'' اس نے باباجی سے وعدہ کیا کہ وہ کسی صورت ان کی باتوں کو نہیں بھولے گا، پھر باباجی نے عبداللہ کو طاقتوں کے استعمال کا طریقہ بھی بتا دیا۔ عبداللہ نے آنکھیں بند کر کے عمل پڑھا اور مطلوبہ جگہ پہنچ گیا۔

آج رات بہت تاریک اور خوفناک تھی۔ جنگل میں ماسوائے گیدڑوں اور جھینگروں کے کچھ نہیں تھا پورے جنگل پر مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس نے حصار کھینچا اور بیٹھ کر عمل کا ورد کرنے لگا، اسے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ کئی خوفناک آوازیں آنا شروع ہو گئیں جب اس نے آوازوں کی سمت دیکھا تو اس کا سانس جیسے حلق میں اٹک گیا کیونکہ اس کی طرف سینکڑوں گوشت سے عاری ڈھانچے دوڑے چلے آرہے تھے ان کے ہاتھوں میں کلہاڑیاں اور تیز بھالے تھے۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اسے کچا چبانے والے ہیں، اس نے دل کو مضبوط رکھا اور عمل میں مشغول رہا کیونکہ اسے باباجی کی بات یاد تھی کہ سب نظر کا دھوکا ہے۔ ڈھانچے حصار سے ٹکراتے ہی غائب ہو جاتے۔ ایسا صبح تک ہوتا رہا۔

آخری وقت میں وہی لڑکی نمودار ہوئی جو اسے پہلی بار راستے میں ملی تھی۔ اس کے انگ انگ سے مستی ٹپک رہی تھی۔ وہ مستانی چال چلتی ہوئی قریب آئی، اس نے عبداللہ کو بہت لبھایا، کئی حربے آزما ڈالے مگر بے سود، پھر اس نے اپنی شکل بدلنا شروع کر دی اس کے سارے جسم پر لمبے لمبے بال اگ آئے جن میں زہریلے کیڑے کلبلا رہے تھے اس کی آنکھیں تارکول جیسی ہو گئیں اس کے دو دانت جو کہ سامنے تھے باہر کو نکل آئے یہ وہی چہرہ تھا جسے عبداللہ پہلے بھی دیکھ چکا تھا جب اس نے خون پیا تھا۔

اس نے عبداللہ سے وعدہ کیا کہ وہ وہاں سے چلی جائے گی اور کبھی کسی کو تنگ نہیں کرے گی لیکن اس کی معافیاں بھی دھوکہ ہی تھیں۔

صبح ہونے والی تھی عبداللہ کا عمل پورا ہو گیا، اس لئے اس نے بسم اللہ پڑھ کر حصار سے باہر قدم نکال لئے، اس کا باہر نکلنا تھا کہ چڑیل اس پر برس پڑی، اس نے عبداللہ پر کبھی آگ کے گولے پھینکے تو کبھی تیر، کبھی خون کی بارش کی تو کبھی سانپ بچھو مگر سب کے سب عبداللہ کے قریب آتے آتے ختم ہو جاتے۔

جب اس چڑیل نے اپنے سارے وار ناکام دیکھے تو وہ گڑگڑانے لگی۔ عبداللہ نے عمل کے الفاظ پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو اس کے اعضا جسم سے الگ ہونا شروع ہو گئے، اس کی چیخیں دل دہلا دینے والی تھیں۔ عبداللہ نے مزید عمل پڑھ کر اس پر پھونک ماری تو وہ راکھ کا ڈھیر بن گئی۔

مصیبت کے ٹلنے پر عبداللہ نے خدا کا شکر ادا کیا، تیز آندھی شروع ہو گئی اور بے شمار بلیوں کے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے اپنی ساتھی کی موت پر آنسو بہا رہی ہوں۔

پھر عبداللہ نے دل میں بزرگ کا تصور کیا اور آنکھیں بند کر لیں پھر کھولیں تو وہ بزرگ کے سامنے تھا۔ اسے دیکھتے ہی فرط جذبات سے باباجی کی آنکھیں نم ہو گئیں، باباجی نے عبداللہ کو گلے سے لگایا اور بولے۔'' چڑیل کا خاتمہ ہو گیا ہے، اب وہ اپنے دادا دادی سے ملنے جا سکتا ہے۔''

لیکن عبداللہ اب اپنا ارادہ ترک کر چکا تھا۔ اس نے باباجی سے ڈھیروں دعائیں لیں اور واپس گھر آ گیا۔ اور باباجی کی ہدایت کے مطابق ضرورت مند اور دکھی لوگوں کی مدد میں وقت گزارنے لگا۔

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

کرے کون دور وحشتیں اس دل کی بخاری
یہ مریض نیم جاں اب ٹھہرا لا علاج ہے
آج بھی دشت محبت میں تنہا کھڑی ہوں بخاری
کسی نے کہا تھا صرف ''میری'' ہوکر رہنا
(مریم شاہ بخاری۔ سرگودھا)

رکا ہوا ہے میری آنکھ میں وہ ایک لمحہ
بچھڑتے وقت کسی کو میرا صدا دینا
جو کر رہے ہو محبت تو یہ دھیان رہے
بہت کٹھن ہے کسی یاد کو بھلا دینا
(آصفہ سراج۔ لاہور)

اندھیری رات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
ہم اپنی ذات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
دکھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں
تمہارے ہاتھ میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
(صبا محمد اسلم۔ گوجرانوالہ)

کیوں پاس آکے جانے کی بات کرتے ہو
کچھ دیر تو پاس بیٹھو نظریں سیراب کرنے دو
(وشیقہ زمرہ۔ سمندری)

یوں بھی ہنس کر شہر کو ویران چھوڑ آئے
لوگوں میں اس سے عشق کے امکان چھوڑ آئے
لہجے کے بعد اب وہ بدلتا نگاہ بھی
رستہ بدل کے ہم اسے حیران چھوڑ آئے
(محسن عزیز حلیم۔ کوٹھا کلاں)

بسا لیتے ہیں ذہنوں میں ہزاروں بت محبت کے
وہ جس کو پوجتے تھے آج وہ پتھر نہیں ملتے
وہ محسن دن میں شرماتا ہے باہر ہی نہیں آتا
اندھیروں میں نکلتا ہے تو میرا گھر نہیں ملتا
(عبدالکریم۔ کوٹھا کلاں)

اگر معلوم ہوتا کہ عشق اتنا تڑپاتا ہے
تو ہم دل جوڑنے سے پہلے ہاتھ جوڑ لیتے
(ندیم بلوچ نوید شوکت۔ کوٹھا کلاں)

اک شام کے سائے تلے بیٹھے رہے وہ دیر تک
آنکھوں سے کی باتیں بہت منہ سے کچھ کہا نہیں
احساس کی خوشبو کہاں، آواز کے جگنو کہاں
خاموش یادوں کے سوا میرے پاس رہا کچھ بھی نہیں
(محمد اسحاق انجم۔ کنگن پور)

تو بھی نہ ملا تو کدھر جاؤں گا
سوکھے پتوں کی طرح بکھر جاؤں گا
یوں بھی ہوگا تم دیکھنا اے صنم
تم سے بچھڑوں گا اور مرجاؤں گا۔
(عمر دراز۔ کھڈیاں خاص)

آپ ساحل پر ہیں دیکھ کے حیران کیوں ہیں
ہم وہی ہیں جنہیں چھوڑ آئے تھے طوفانوں میں
(ثوبیہ۔ کنگن پور)

اپنوں سے منہ موڑے نہیں جاتے
سلسلے یوں ہی توڑے نہیں جاتے
جن کو پایا ہو دعا کی مرادوں سے
اقبال وہ لوگ چھوڑے نہیں جاتے
(محمد اقبال۔ کنگن پور)

تو دور بھی ہے اور پاس بھی ہے
کہیں کہیں تیری کمی کا احساس بھی ہے
دوست تو اور بھی بہت ہیں مگر
تو پیارا بھی ہے اور خاص بھی ہے
(کاشف حمید کاوش۔ بنگرام)

کتنے دنوں کے پیاسے ہوں گے یارو سوچو تو
شبنم کا قطرہ بھی جن کو دریا لگتا ہے
(مہر پرویز دولو۔ میاں چنوں)

☆☆

پھر کسی قاسم و طارق کی ضرورت ہے
گلشن حق کے نگہبان غزل رہنے دے
(حکیم خان حکیم.....کامل پورموسیٰ اٹک)

زبان خوشبو میں تجھ سے کہا ہے
صبا کی بات کو میں نے سنا ہے
مرے جذبوں کی سچائی کو دیکھو
یہ وہ جادو ہے جو تم پہ چلا ہے
پیاسا جو رہا دریا کنارے
بہت اس میں کمال و حوصلہ ہے
جو پتہ شاخ سے ٹوٹا وہ مردہ
اشارہ یہ خزاؤں نے دیا ہے
ہوا خوشیوں کی آتی ہے جہاں سے
دریچہ وہ مجھے ہی کھولنا ہے
بیاں ہوں جس میں دکھ میرے وہ سارے
کسی کو اس طرح کا خط لکھا ہے؟
رہی خانم یہ اپنے رب کی رحمت
یہی احساس تو اس نے لیا ہے
(فریدہ خانم۔لاہور)

تھم گیا درد کا طوفان غزل رہنے دو
دل ہے اب بے سرو سامان غزل رہنے دے
یہ حقیقت ہے کوئی خواب نہیں ہے جاناں
میں ہوں تیرا مجھے پہچان غزل رہنے دے
لٹ گیا راہ محبت میں میرا شوق سفر
بہہ گئے اشکوں میں ارمان غزل رہنے دے
میں نے کب تم سے محبت کی تمنا کی ہے
اپنے دشمن کا کہا مان غزل رہنے دے
دونوں اطراف سے ٹھکرایا ہوا بیٹھا ہوں
جان سلامت ہے ایمان غزل رہنے دے
جان جائے گی تم سب ختم مصائب ہوں گے
عشق ہوتا نہیں آسان غزل رہنے دے

اجڑے ہوئے لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں
ہر شخص کے اپنے اپنے نصیب ہوتے ہیں
کوئی جا کے جہاں میں نہیں ہے آتا
خوف کے سائے کتنے مہیب ہوتے ہیں
خیالوں میں آکے جو مٹتے نہیں کبھی
وہ کتنے پیارے میرے حبیب ہوتے ہیں
تھک ہار کے سوجاتا ہوں میں آخر کار
جذبہ زندگی کے کتنے قریب ہوتے ہیں
مجھے بھی آئے گا گزرے دنوں کا خیال جاوید!
حسن کے بھی پھیر کتنے عجیب ہوتے ہیں
(محمد اسلم جاوید۔فیصل آباد)

حسرت رہے کہ اب مر ہی جائیں ہم
کہ اپنا نام و نشان بھی نہ پائیں ہم
اس محبت میں رستہ ہے، نہ منزل ہے
ڈر لگتا ہے کہیں کھو نہ جائیں ہم
لاکھوں مجبوریاں راہ روکے کھڑی ہیں
تم ہی کہو ذرا کس طرف جائیں ہم
اپنے آنسو چھپا کر اپنی آہیں دبا کر
بول بھلا کس طرح اب مسکرائیں ہم
اے دنیا والو تم ہی انصاف کرو ناں......
آخر کب تک اپنی حسرتوں کو دفنائیں ہم
ریزہ ریزہ ہوکر بکھر چکا ہے وجود اپنا
چلو اپنی لاش کو خود ہی اٹھائیں ہم
سانسیں دم آخر الجھ رہی ہیں سینے میں
اب دیکھئے بخاری کب سکون پائیں ہم......
(مریم شاہ بخاری۔سرگودھا)

مجھے زندگی کبھی
یوں بھی ملی

میرے گلے میں بانہیں ڈال کر
میرے دردسارے ملال کر
میرے غموں کو جڑ سے اکھاڑ دے
میری ہر خوشی پر دھمال کر
میری تاریک رات کو
اجالا دے
مجھے لے جا غموں سے
نکال کر
مجھے زندگی کبھی یوں
بھی مل
میرے گلے میں بانہیں
ڈال کر
میرے گلے میں بانہیں
ڈال کر......!

(سیدہ عطیہ زاہرہ۔لاہور)

دوستوں کی محفل میں آنا جانا تو سیکھیے
جان جہاں دور جدید کے تقاضے نبھانا تو سیکھیے
ہر لمحہ ہر وقت ایک ہی موڈ میں نہ رہا کیجیے
ہنسنے والوں کے ساتھ کھل کر مسکرانا سیکھیے
اب آہی گئے ہیں تو کچھ دیر ٹھہر جایئے
محفل یاراں ہے کچھ پینا پلانا تو سیکھیے
مسرور رہیں گے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے
دوستوں کی خوشی میں خوش ہوجانا تو سیکھیے

(طارق محمود۔کامرہ اٹک)

زندگی پہلے جو ہوتی تھی بہاروں کی طرح
ہوگئی وہ زندگی اب خار زاروں کی طرح
ہوگیا وہ شخص میرا دشمن جاں ہوگیا
جو رہا ہے ساتھ میرے رازداروں کی طرح
نہ کہیں جلتا دیا ہے نہ کہیں دست دعا
حال اپنا ہے انہیں ٹوٹے مزاروں کی طرح
وہ بدلتے موسموں کے ساتھ ہی چلنے لگا
زندگی اس نے گزاری بے قراروں کی طرح
اب تو احساس مروت مٹ گیا ہے اس طرح
شہر میں ہم پھر رہے ہیں بے سہاروں کی طرح
کیا ہوا رنگ خزاں چہرے پہ ان کے آگیا
جو شگفتہ تھے کبھی رنگیں بہاروں کی طرح
ہے قمر ان سے تو سائے کی توقع ہی عبث
ہوگئے جو لوگ سوکھے شاخساروں کی طرح

(ریاض حسین قمر۔منگلا ڈیم)

اے کاش دل نادان ایسا نہ کیا ہوتا
پیار کیا ہوتا سودا نہ کیا ہوتا
اے کاش دل ناداں.....
وعدہ وفا کا ہم نے کس موڑ پہ ہے توڑا
بنتے کسی چمن کو ویران کرکے چھوڑا
معصوم کسی دل کو دھوکا نہ دیا ہوتا
پیار کیا ہوتا سودا نہ کیا ہوتا
اے کاش دل ناداں....
چاہت کی نئی دنیا کیوں بسائی ہم نے
دولت سے محبت کی قیمت لگائی ہے ہم نے
نیلام میں ہوئی تھی دل تو نہ بکا ہوتا
اے کاش دل ناداں ایسا نہ کیا ہوتا
پیار کیا ہوتا سودا نہ کیا ہوتا

(آصفہ سراج۔لاہور)

گھر واپس جب آؤ گے تم
کون تمہیں پہچانے گا
کون کہے گا تم بن ساجن یہ نگری سنسان
بن دستک دروازہ گم سم بن آہٹ دہلیز
سونے چاند کو تکتے تکتے راہیں پڑ گئیں مانند
پل جیسے پتھر بن جائیں گھڑیاں جیسے ناگ
دن نکلے تو شام نہ آئے
آئے تو بحران
کون کہے گا تم بن ساجن یہ نگری سنسان
گھر واپس جب آؤ گے تم کیا دیکھو گیا پاؤ گے
یار نگار وہ سنگی ساتھی
مدھ بھریاں تھیں انکھیاں جن کی باتیں پھلجھڑیاں
بجھ گئے تارے لوگ وہ پیارے رہ گئیں بکھ لڑیاں

ڈھول بول ہوئے دیکھو ایک گریزاں سوچ کی خاطر
صحرا صحرا پھرتے ہیں
تم بھی پھر درویش صفت اب
رقصاں رقصاں حیراں حیراں
لوٹ کے پھر کیا آؤ گے اور کیا پاؤ گے کیا پاؤ گے
کون کہے گا تم بن ساجن یہ نگری سنسان
یہ نگری سنسان
(محمد علی چغتائی ..... خیر پور ٹامیوالی)

یونہی بے سبب نہ پھرا کرو کوئی شام گھر پر رہا کرو
یہ غزل کی بچی کتاب ہے اسے چپکے چپکے پڑھا کرو
کوئی ہاتھ بھی نہ ملائے گا جو گلے ملو گے تپاک سے
یہ نئے مزاج کا شہر ہے ذرا فاصلے سے ملا کرو
نہیں بے حجاب وہ چاند سا کہ نظر کا اس پر اثر نہ ہو
اسے اتنی گرمی شوق سے بڑی دیر تک نہ تکا کرو
کبھی حسن پردہ نشین ہو ذرا عاشقانہ مزاج میں
جو میں بن سنور کے چلا کروں میرے ساتھ تم بھی چلا کرو
(شرف الدین جیلانی ..... ٹنڈوالہ یار)

کچھ گناہ بخشے نہیں جاتے گناہ ذرا سوچ کے کیا کرو
کچھ خطا بخشی نہیں جاتی خطا ذرا سوچ کے کیا کرو
دل جوڑ کے پھر توڑا نہیں جاتا، یہ کام ذرا سوچ کے کیا کرو
کچھ یادیں بھلائیں نہیں جاتیں ادائیں ذرا سوچ کے کیا کرو
کچھ الفاظ بھلائے نہیں جاتے کلام ذرا سوچ کے کیا کرو
کچھ درد بھلائے نہیں جاتے درد ذرا سوچ کے دیا کرو
ہر زخم مٹائے نہیں جاتے زخم ذرا سوچ کے دیا کرو
(ضیغم الحسن ..... پڑولی)

خاموش کیوں کھڑا ہے سخن جان بات کر
مر جائے گا وگرنہ میری بات مان کر
کس نے کہا کہ بات کا مطلب بھی ہو کوئی
اس طور کی ہے یہی پہچان بات کر
چپ چاپ ہار ماننا مناسب نہیں تیرا
اس شان کے نہیں ہے یہ شایان بات کر
کیوں آنکھ تیری نم ہے تیری اپنی ہنسی پہ
دل کس نے کردیا تیرا ویران بات کر
(سنبل ماہین ..... سرگودھا)

زندگی باگیشری، سارنگ، دیپک سوہنی
بت تراشی، رقص موسیقی، خطابت شاعری
پنکھڑی، تتلی، صنوبر، دوب، نسریں، چاندنی
لاجوردی، شربتی، دھانی، گلابی، چمپئی
زعفرانی، آسمانی، ارغوانی، زندگی
لاجونتی، مدھ بھری، کومل، سہانی زندگی
ہر نفس پروتی، پھول برساتی زندگی
خیمہ زربفت میں پازیب جھنکاتی ہوئی
مرکیاں لیتی، ٹھٹکتی، ناچتی، گاتی ہوئی
دوڑتی، بڑھتی، ہمکتی، جھومتی، گاتی ہوئی
اک سنہری تان کی زنجیر بل کھاتی ہوئی
اک انگڑائی کے پل پہ لہراتی ہوئی
زندگی مڑتے ہوئے چتوں پر بوند دل کی دھنک
صبح سرما کی کرن، شام بہاراں کی دھنک
شہر تن میں پھول والوں کی گلی ہے زندگی
گردن آفاق میں چمپا کلی ہے زندگی
(محمد عدن راشش ..... راولپنڈی)

بچھڑ کر وہ مجھ سے پھر واپس لوٹ آنا بھول جاتا ہے
رلا کر مجھ کو پھر رات بھر صبح کو ہنسانا بھول جاتا ہے
اس کی ایسی ادائیں اکثر مجھ کو کردیتی ہیں خفا
ہو جاتا ہوں جب خفا وہ بھی منانا بھول جاتا ہے
لاپرواہی دیکھی ہے اس کے ہر کام میں
دے کر زخم جدائی کا مرہم لگانا بھول جاتا ہے
کہا تھا ایک دن نہ لکھا کرو میرا نام دیواروں پہ
بھول کر لکھ دیتا ہے پھر لکھ کر مٹانا بھول جاتا ہے
اس کی یادیں کتنی خوب صورت ہیں حبیب
جب بھی آتی ہیں ہمیں زمانہ بھول جاتا ہے
(رانا حبیب الرحمٰن ..... لاہور)

☆☆

محبت کی تلاش میں
بھٹکنے والی لڑکی
بھول گئی تھی کہ
محبت ہر ایک کو نہیں ملتی
کچھ لوگ سدا بھٹکتے رہتے ہیں
کہ جن کی آنکھیں تو جاگتی رہتی ہیں
پر مقدر سوئے رہتے ہیں
(بلقیس خان۔ پشاور)

شورش قلب نے عذاب کیا
پیرہن سانس کا خراب کیا
کس نے خیرات دی ہے جلوؤں کی
کس نے تابندہ آفتاب کیا
جونہی شعروں کا انتخاب کیا
درد دل کا کشید کر بیٹھے
ہم نے اشکوں کو ہی شراب کیا
سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی
جس کلی کو ابھی گلاب کیا
ایک نیکی بھی نہیں قمر میری
جو کبھی اعمال کا حساب کیا
(چوہدری قمر جہاں علی پوری۔ ملتان)

وعدے پر اعتبار کرکے
بگاڑلی زندگی میں نے
تمہارے آنے کے انتظار میں
یونہی گزارلی زندگی میں نے
عشق کے حسین خیالوں میں
سنوارلی زندگی میں نے
تمہارے آنے کی خوشی میں
بچھادی پھلواڑی میں نے
بہت دیر کردی آنے میں
اب تو شادی کرلی میں نے
(سلیم بیگ ہمدانی۔ کراچی)

موسموں کی عجیب سازش میں
گھر بھی جلتا ہے تیز بارش میں
جانے کیا کیا سوال پوچھیں گے؟
آج وہ زخم دل کی پرسش میں
فکر پرواز کرتی رہتی ہے
چشم و لب کی ہزار بندش میں
ہم نے کیا کیا عذاب جھیلے ہیں
اف ایک زندگی کی خواہش میں
رنگ تعبیر ڈھل گیا سارا واجد
ہم نے جو خواب دیکھے تھے پچھلی بارش میں
کتنی صدیوں کا درد ہے پنہاں
ایک لمحہ خوشی کی کاوش میں
ہم نے خود کو بھلادیا واجد
ایک اسے بھولنے کی خواہش میں
(پروفیسر ڈاکٹر واجدی نگینوی۔ کراچی)

ہم ہار گئے تم جیت گئے
ہم اپنی ہار مناتے گئے
تم اپنی جیت منالینا
تم ہم سے کچھ کچھ بہتر ہو
ہم کم تر ہیں تم بہتر ہو
تم اپنے پیار کو پالینا
تم جیت کی مستی میں آکر
دل سے ہمیں بھلا دینا
ہم اپنی ہار منائیں گے
ہم سب کو یہ بتائیں گے
(عثمان غنی۔ پشاور)

ظلمت آگے انسان بھی چپ ہے
اور وقت کا سلطان بھی چپ ہے
جبر کے عکاس ہیں چہرے
ظلم کا ترجمان بھی چپ ہے
آہوں کا زندان بھی چپ ہے
انسان ہے حیوان یا درندہ!
اس کی کوئی تفسیر تو سوچو!
امن کی کوئی تدبیر تو سوچو!
کب تک مائیں بین کریں گی!
کوئی زندہ ضمیر تو سوچو!
عدل کی کوئی زنجیر تو سوچو!
شدت پسندی کی بے مقصد جنگ میں
سہاگ جس کا اجڑ گیا ہے
بیٹھی بال نوچ رہی ہے
اور یہ بھی سوچ رہی ہے
حق کا پندار بھی چپ ہے
گلی اور بازار بھی چپ ہے
چہروں پر ہے وحشت طاری
رعایا کا مختار بھی چپ ہے
دھڑکن کی رفتار بھی چپ ہے
غاصب کے ہر ظلم کے آگے
بستی کا سردار بھی چپ ہے
انصاف ڈر کی صلیب پہ لٹکا
قاضی کا دربار بھی چپ ہے
زندگی خونی نہر میں ڈوبی
کشتی جیسے لہر میں ڈوبی
آزادی قفس کے پہر میں ڈوبی
فضا گولے بارود سے لرزی
وحشت مرے شہر میں ڈوبی
غیرت کا رواج بھی چپ ہے
بے رحم سماج بھی چپ ہے
فطرت اور مزاج بھی چپ ہے
باہر خوف ناچ رہا ہے
کل بھی چپ ہے
آج بھی چپ ہے
(عامر زمان عامر۔ بورے والا)

☆☆

آسیبی جنگل

رضوان علی سومرو۔ کراچی

کلام الٰہی کا سننا تھا کہ سامنے کھڑی حسین و دیدہ زیب لڑکی کی شکل اچانک بدھیت ہوگئی اور اس پر لرزہ طاری ہوگیا وہ کپکپانے لگی اور اس کے حلق سے بھیڑیے سے مشابہ چیخ برآمد ہونے لگی کہ اتنے میں……

خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی اور جسم و جاں پر لرزہ طاری کرتی خوفناک ڈراؤنی کہانی

سورج غروب ہوچکا تھا۔ شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ ساتھ ہی سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہوچکا تھا۔ انسپکٹر ساجد اپنی گاڑی میں ڈیوٹی ختم کرکے گھر واپس جارہا تھا۔ پولیس فورس کا وہ سب سے جانباز اور نڈر افسر مانا جاتا تھا۔ آج اس کی طبیعت تھوڑی ناساز تھی۔ اس لئے وہ اپنا کام جلد ختم کرکے گھر کے لئے نکل پڑا تھا۔ فلیٹ میں پہنچ کر وہ فریش ہونے کے ارادے سے غسل خانے میں گھس گیا۔ فریش ہونے کے بعد اب اس کا ارادہ صرف اور صرف خواب خرگوش کے مزے لینا تھا۔

ایک تیز قسم کی چیخ سے مشابہ آواز سن کر انسپکٹر بیدار ہوگیا۔ فوری طور پر سمجھ نہ سکا کہ وہ کس قسم کی آواز ہے۔ مکمل طور پر ہوش و حواس میں آنے میں اسے چند منٹ ضرور لگے تھے۔ یہ دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا۔ جس جگہ وہ موجود ہے، وہاں اس کا بستر نہیں ہے بلکہ ایک سجا سجایا

دربار ہے۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ طبیعت ناسازی کے سبب جلد سوگیا تھا۔ مگر یہ شاہی دربار اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ بہر حال وہ یہ سب دیکھنے پر مجبور تھا۔

دربار کے دائیں بائیں شاہی کرسیاں بچھی تھیں جس پر مختلف لوگ اپنے عہدوں کے حساب سے براجمان تھے۔ بادشاہ اور ملکہ کی کرسیاں ابھی تک خالی تھیں۔ شاید ان کے دربار میں آنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ دربار کے وسط میں ایک نہایت ہی خوب صورت اور حسین لڑکی سر جھکائے مجرمانہ انداز میں کھڑی تھی، اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو رواں تھے، دفعتاً سنکھ پھونکے جانے کی آواز سن کر انسپکٹر چونک پڑا۔ سنکھ کی آواز اس بات کی علامت تھی کہ راج دربار میں مہاراجہ آرہے ہیں۔

''باادب، باملاحظہ ہوشیار
مہاراج رنجیت سنگھ کے اوتار
سورج دیوتا کے پرستار
نئے ہونے والے مہاراجہ بھیم سنگھ
بدھار رہے ہیں''

انسپکٹر ساجد نے دیکھا ایک شخص جو نہایت خوب صورت اور زرق برق لباس میں ملبوس تھا دربار میں داخل ہورہا ہے۔ وہ شخص انتہائی تکبرانہ چال چلتا ہوا تخت پر بیٹھ گیا۔

''راج دربار شروع کیا جائے......'' مہاراجہ ہاتھ اٹھا کر بولا۔

مہاراجہ کی بات سن کر ایک دوسرا شخص جو کہ تخت کے بعد سب سے اونچی گدی پر بیٹھا تھا۔ اٹھ کھڑا ہوا۔

''مہاراجہ کی جے ہو...... دیوتاؤں کا شبھ سایہ آپ پر سدا قائم رہے۔ بھگوان کرے آپ ہمیشہ یونہی شکتی شالی رہیں اور ہماری رکھشا کرتے رہیں۔''

انسپکٹر ساجد نے دیکھا وہ شخص اپنی تعریف سن کر انتہائی خوش ہونے لگا تھا۔ سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ انسپکٹر ساجد پر ابھی تک کسی کی نظر نہیں پڑی تھی۔ انسپکٹر نے مہاراج کا چہرہ دیکھا تو اسے اپنے پیشہ ورانہ تجربے کی بنا پر اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہ ہوئی کہ یہ شخص انتہائی خطرناک اور عیار ہے۔ سب سے بڑی بات اس کی آنکھوں اور چہرے کی بناوٹ سے صاف ظاہر ہورہا تھا یہ شخص اپنا مقصد، حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ ''مہامنتری اس لڑکی نے کیا پاپ کیا ہے؟'' مہاراجہ نے اس شخص کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ جو اس کی تعریف کررہا تھا۔

''سرکار...... یہ کنیا بڑی چلتر ہے، اس نے آپ کے بڑے بھائی مہاراج اجیت سنگھ کا خون کیا ہے......'' مہامنتری نے عیاری سے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر سر جھکائے کھڑی لڑکی نے چونک کر ان دونوں کی جانب دیکھا دوسرے ہی پل اس کی غزالی آنکھوں میں نفرت وحقارت ناچنے لگی تھی۔

''پاپی میں نہیں، تم دونوں ہو...... کام تمہارا، نام میرا...... پرنتو میں تمہارا انت ہوں...... بھگوان کی دیا سے مجھے وہ شکتی حاصل ہے جس سے تم دونوں پاپی میرے ہی ہاتھوں سروناش ہوجاؤ گے......'' وہ لڑکی کسی ناگن کی طرح پھنکارتی ہوئی بولی تھی۔

اس کی بات سن کر مہامنتری اور راجا کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ مہامنتری چور نظروں سے دوسرے درباریوں کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ سپاہیوں کے ہاتھ میانوں تک پہنچ چکے تھے۔ حکم ملنے کی دیر تھی کہ اس گستاخ لڑکی کا سرتن سے جدا ہوجائے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے انسپکٹر نے جو منظر دیکھا وہ انتہائی حیرت انگیز اور خوفناک تھا۔

قیدی لڑکی آن ہی آن میں ایک سانپ کا روپ لے چکی تھی۔ وہ سانپ عام سانپوں سے جسامت میں بڑا اور موٹا تازہ تھا۔ سانپ کا رنگ انتہائی گہرا سبز تھا۔ دوسرے لمحے سانپ نے بجلی کی تیزی سے مہامنتری کے اوپر جست لگائی تھی۔ یہ منظر دیکھ کر انسپکٹر اپنے حلق سے خارج ہونے والی دلخراش چیخ پر بڑی مشکل سے ضبط کرسکا۔

چیخ کی آواز کے ساتھ ہی انسپکٹر ساجد کی آنکھ کھل گئی تو گویا یہ خواب تھا۔

انسپکٹر کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ انسپکٹر کو ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے کہ یہ سب ایک خواب نہیں ایک حقیقت ہو، لڑکی کی صورت اس کے دل و دماغ میں نقش ہوگئی تھی۔ خواب میں دیکھی جانے والی صورت اس کو بھلانا مشکل ہورہا تھا۔ انسپکٹر نے اٹھ کر گھڑی دیکھی تو گھڑی رات کے 2 بجے کا وقت دکھا رہی تھی۔

انسپکٹر نے دوبارہ سے پہلو بدل کر سونے کی کوشش کی لیکن شاید نینداس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، بس اس کا ذہن اس لڑکی اور اس خوفناک خواب کے بیچ میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

رات آہستہ آہستہ اپنے سفر پر گامزن تھی، نیند انسپکٹر ساجد کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ آرام کرسی پر بیٹھا سوچوں میں مگن تھا۔ اس کے ذہن میں صرف اور صرف دھماکے میں ہلاک ہونے والوں کی تصویریں اور دہشت گردوں کا بھیانک انجام تھا۔ دھماکے میں مسجد کے پیش امام سمیت، بہت سارے لوگ لقمہ اجل بن گئے تھے۔

دفعتاً اسے ایک عجیب سی آواز سنائی دی۔ جو بہت حد تک سیٹی سے مشابہت رکھتی تھی۔ انسپکٹر بیٹھے بیٹھے چونک پڑا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ آواز اسے کمرے سے ہی آتی ہوئی محسوس ہورہی تھی۔ وہ بڑی تیزی سے الماری کی جانب بڑھا، جہاں اس کے ذاتی استعمال کا پستول رہتا تھا۔

سیٹی جیسی آواز پھر اس کے کانوں سے ٹکرائی، اس بار وہ آواز الماری کی جانب سے آئی تھی۔

شاید کوئی چوہا وغیرہ ہوگا...... انسپکٹر نے دل میں سوچا۔ اور آگے بڑھ کر الماری کھول دی...... دوسرے ہی لمحے وہ ڈر کر پیچھے ہٹ گیا...... اس کی آنکھوں سے خوف و دہشت ناچنے لگی تھی۔

کپڑوں کے اوپر سبز رنگ کا ایک سانپ پھن کاڑھے بیٹھا جھوم رہا تھا...... سانپ کے انداز سے کہیں سے بھی ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ ڈسنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ بس وہ یک ٹک انسپکٹر کو ہی گھورے جارہا تھا۔

دفعتاً انسپکٹر کی آنکھوں سے خوف و دہشت کا احساس زائل ہونے لگا، عجیب بے خودی اور مستی سی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے لگی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ سانپ کی جانب بڑھنے لگا۔ جیسے کہ اس سانپ نے اسے کسی تنویمی عمل کے زیر اثر کرلیا ہو...... جیسے ہی وہ سانپ کے قریب پہنچا۔

سانپ نے اچک کر اس کے ہاتھ پر ڈس لیا۔ یہ سب اچانک ہی ہوا تھا۔ اس پر تیزی سے غشی طاری ہونے لگی پھر وہ دھڑام سے فرش پر گرگیا۔

☆......☆......☆

تیز تیز گھنٹیوں کے شور کی آواز سے انسپکٹر کی آنکھ کھل گئی، گھنٹیوں کے ساتھ ساتھ اس کے کانوں میں سریلی جھنکار کی آواز سنائی دے رہی تھی اور ساتھ ہی کچھ سازوں کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند رکھنا ضروری سمجھا۔

''وید جی...... راج کمار کو ہوش آنا چاہئے...... ورنہ ہم کچھ کھالیں گے......'' آواز انتہائی سریلی اور کافی مترنم و دلکش تھی۔

''ہاں...... ہاں بھگوان کا مندر تو سب کے لئے ہوتا ہے، اسے ضرور ہوش آجائے گا......'' ایک مردانہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

انسپکٹر کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا گورکھ دھندا ہے۔ اسے تو سانپ نے ڈسا تھا پھر''میں یہاں کیسے؟''

انسپکٹر نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلتے ہی اس کی پہلی نظر ایک سادھو کے لباس میں ملبوس ایک بوڑھے شخص پر پڑی جس کی وضع قطع مندر کے پجاریوں جیسی تھی۔ وہ ایک چبوترے پر چت پڑا تھا اس کے بالکل پیچھے ایک قد آدم مورتی نصب تھی شاید وہ ان کا پتھر کا دیوتا تھا۔ انسپکٹر کی اپنی وضع قطع بھی تبدیل ہوچکی تھی۔ اس نے بھی ہندو شہزادوں جیسا لباس زیب تن کر رکھا تھا۔

مندر انتہائی پرشکوہ تھا جس کی ہر چیز سونے کی معلوم ہوتی تھی۔ ساجد ابھی اسی صورتحال پر غور کررہا تھا کہ اس کی نظر ایک لڑکی پر پڑی جو کہ مورتی کے سامنے

سر جھکائے بیٹھی تھی۔
"شکر ہے بھگوان کا تمہیں ہوش آ گیا...... ورنہ زہر بہت خطرناک تھا۔"
بوڑھا پجاری مسکرا کر بولا۔
"زہر......" انسپکٹر حیرت بھرے لہجے میں بولا اسے وہ سانپ یاد آ گیا جس نے اسے ڈسا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دیکھا مگر ہاتھ پر کوئی سانپ کا نشان نہ تھا۔ انسپکٹر پریشان ہو گیا۔ "یہ کیا معاملہ ہے؟" دفعتاً اس کے کانوں میں پجاری کی آواز گونجی۔
"ہاں زہر...... مگر راج کمار تم نے زہر کھایا کیوں؟" پجاری بولا۔
"میں نے زہر......" اس کے منہ سے حیرت بھرا جملہ نکلا......
لڑکی نے اس کا جملہ سن لیا تھا وہ اٹھ کھڑی ہوئی جیسے ہی انسپکٹر کی طرف پلٹی تو وہ حیران ہو گیا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی جو اس دن خواب میں نظر آئی تھی۔ جو سانپ بن کر اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔
دفعتاً انسپکٹر نے اس کی طرف دیکھا اور سخت لہجے میں پوچھا۔
"روپ متی پوجا کہاں ہے؟" یہ بات بول کر انسپکٹر حیران ہو گیا۔ اس طرح کا جملہ بولنے میں اس کے اپنے ارادے کا کوئی دخل نہ تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے اندر کوئی اور ہی ہے۔
"مار دیا...... میں نے اس حرامزادی کو...... اس نے تمہیں مجھ سے چھیننا چاہا تھا، راج کمار......"
"ہم تم سے نفرت کرتے ہیں اور صرف پوجا سے پیار...." ساجد نے دانت پیس کر کہا۔ ساجد کو ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے اندر کوئی اور ہی شخصیت تحلیل ہو گئی ہے۔ جو اس سے یہ سب کروا رہی ہے۔
"راج کمار تم صرف اور صرف میرے ہو...... میں اپنے پریم میں کسی اور کی شرکت برداشت نہیں کر سکتی تھی، اس لئے اس کو مار دیا۔"
لڑکی کا لہجہ سرد اور سپاٹ تھا۔

"ہم تم سے نفرت کرتے ہیں...... تم نے اسے راستے سے ہٹانے کی کوشش کی اسے ڈس لیا۔ اسے تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھ کر ہم نے بھی زہر پی لیا...... لیکن بدقسمتی سے بچ گئے لیکن اب نہیں......"
یہ کہہ کر ساجد چبوترے کی طرف بڑھا جہاں مورتی نصب تھی مورتی کے ہاتھ میں ایک ترشول تھا۔
"رک جاؤ......" راج کمار تم یوں نہیں جا سکتے...... تم میرے ہو......" لڑکی رو دینے والے لہجے میں بولی۔
"نہیں...... ہم مرنا چاہتے ہیں......" ساجد کے اندر کی دوسری شخصیت سے آواز آئی......
"نہیں...... نہیں...... راج کمار رک جاؤ......" لڑکی چیخی۔
لیکن راج کمار کے اندر جیسے بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ راج کمار نہایت تیزی سے مورتی کے ہاتھ میں نصب ترشول کی جانب بڑھا۔ اس سے قبل وہ ترشول نکال پاتا ایک تیز زن کی آواز کے ساتھ راج کمار کی پیٹھ میں پیوست ہو گیا۔ لڑکی چیخ کر اس کی جانب بڑھی اس سے قبل وہ اس تک پہنچتی سپاہیوں کی وردیوں میں ملبوس لوگوں نے اسے گھیر لیا۔
اس کے ساتھ ہی ساجد کی آنکھ کھل گئی۔ ساجد اسی جگہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ گویا وہ سب کچھ بحالت بے ہوشی میں ہوا تھا۔ اب وہ خواب تھا یا حقیقت اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

☆......☆......☆

پان شاپ والے نے ان دو مشکوک بندوں کو قریب سے دیکھا تھا۔ اس وقت وہ تھانے میں موجود تھا اور نہایت سہما ہوا تھا۔
"ص...... صاحب...... م...... م...... میں بال بچے دار آدمی ہوں...... اگر میں نے ان کی شناخت دے دی تو وہ مجھے مار دیں گے۔"
"تم بے فکر ہو جاؤ زندگی موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تمہاری شناخت خفیہ رہے گی......" انسپکٹر ریاض نے نرم لہجے میں کہا۔

''جی .....'' پان والا۔ بدستور سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

پان والا جیسے جیسے بتاتا جاتا محکمہ پولیس کا گرافک ڈیزائنر تصویر بناتا جاتا، انسپکٹر ریاض اور انسپکٹر ساجد بھی اس کے سامنے کھڑے تھے، جیسے ہی دونوں تصویر مکمل ہوئیں جو چہرے سامنے آئے انہیں دیکھ کر انسپکٹر ساجد کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

یہ دونوں وہی چہرے تھے جو اس نے خواب میں دیکھے تھے۔ مہاراجہ اور مہامنتری کے تھے جن پر وہ لڑکی سانپ بن کر حملہ آور ہوئی تھی۔

انسپکٹر ساجد حیرت سے ان دونوں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ جو وہ خواب میں دیکھ چکا تھا۔

''کیا تم یقین سے کہہ سکتے ہو کہ یہ دونوں وہی ہیں۔'' انسپکٹر ریاض نے پان والے سے پوچھا۔

''جی بالکل..... میں یقین سے کہہ سکتا ہوں ..... کہ یہ دونوں وہی ہیں۔''

''ٹھیک ہے تم جا سکتے ہو.....'' انسپکٹر نے کانسٹیبل کو اشارہ کیا۔

جس نے پان والے کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔

پان والے کے جاتے ہی انسپکٹر ریاض نے انسپکٹر ساجد کی طرف دیکھا جو کہ ابھی تک محو حیرت تھا۔

''ان دونوں کے نام ارجن اور شنکر ہیں.....''

''ایں.....'' انسپکٹر ساجد چونک پڑا۔

''کیا کہا تم نے۔'' انسپکٹر ساجد نے اس سے کہا۔

''ان دونوں کے نام ارجن اور شنکر ہیں..... یہ دونوں پیشہ ور قاتل اور غنڈے ہیں.....'' انسپکٹر ریاض نے کہا۔

''مگر یہ دونوں وہی ہیں جو میرے خواب میں آئے تھے.....'' ساجد نے زیر لب کہا۔

''کیا..... کہا.....'' انسپکٹر ریاض نے پوچھا۔

''کچھ نہیں..... میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان دونوں کا گرفتار ہونا بہت ضروری ہے ورنہ بہت سے سوال تشنہ رہ جائیں گے .....''

''ہاں یہ تو ہے، ہو سکتا ہے کہ ان دونوں کو دشمن ممالک کے ایجنٹوں نے خرید لیا ہو۔''

''کچھ بھی ہو..... ان کی گرفتاری بے حد ضروری ہے.....'' انسپکٹر ساجد بولا۔

دو چار دن کی دوڑ دھوپ اور تفتیش کے بعد پتہ چل گیا تھا کہ یہ دونوں مجرم سرحدی گاؤں کی طرف بھاگے ہیں جہاں سے وہ شاید سرحد پار کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

''ریاض..... ان دونوں کے پیچھے میں جاؤں گا.....'' انسپکٹر ساجد نے کہا۔

''تم اکیلے..... وہ بہت خطرناک ہیں..... میں بھی ساتھ چلوں گا۔''

''نہیں دوست تمہارا شکریہ..... موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ جب آنی ہوگی ضرور آئے گی.....'' انسپکٹر ساجد نے مسکرا کر کہا۔

''جیسی تمہاری مرضی..... میرے دوست.....'' ریاض نے جواباً مسکرا کر کہا۔

☆.....☆.....☆

انسپکٹر ساجد نے سرحدی گاؤں کے بوڑھے چوہدری کی طرف دیکھا جس کی عمر 65 سال سے زیادہ ہو چکی تھی۔ انسپکٹر ساجد 4 روز قبل اس گاؤں میں پہنچا تھا اور گاؤں کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا۔ سرحدی گاؤں بہت زیادہ خوب صورت اور حسین تھا اگر کوئی اس گاؤں کو پھولوں کی وادی کہتا تو غلط نہ تھا۔

یہ گاؤں حسین و جمیل پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ اس گاؤں میں زیادہ تر آبادی ہندوؤں کی تھی، ویسے مسلمان بھی اس گاؤں میں تھے جو کہ تعداد میں کم تھے۔

اس گاؤں میں سب سے پراسرار اور عجیب و غریب واقعات سے مزین ایک پہاڑی تھی جس کا نام کالی پہاڑی تھا، کالی پہاڑی تک پہنچنے کے لئے پرانے جنگلات کو عبور کرنا پڑتا تھا جس کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ جو ان جنگلات میں داخل ہوا زندہ واپس نہیں آیا۔

''ہاں تو چوہدری صاحب..... ان دونوں آدمیوں کو دیکھا ہے اس گاؤں میں.....'' انسپکٹر ساجد نے دو

تصویریں دکھاتے ہوئے کہا جو کہ ارجن اور شنکر کی تھیں۔

''اس گاؤں میں اس طرح کے دونوں بندے گزشتہ ایک ماہ سے نہیں دیکھے چھوٹا سا تو گاؤں ہے انسپکٹر صاحب......'' چوہدری نے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''ذرا یاد کریں غور سے دیکھیں...... یہ دونوں خطرناک قاتل ہیں امام صاحب کی شہادت میں ملوث ہیں......''

''گاؤں میں تو داخل نہیں ہوئے...... ہوسکتا ہے کہ گاؤں کے باہر سے کالی پہاڑی پر چلے گئے ہوں'' چوہدری صاحب سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔

''کالی پہاڑی......'' ساجد نے حیرت واستعجاب سے کہا۔

''جی...... باہر سے ایک مختصر راستہ ہے، جس پر چلنے سے جنگلات کو کراس نہیں کرنا پڑتا ہے...... اور جانے والا آسانی سے کالی پہاڑی پر پہنچ جاتا ہے۔''

''کالی پہاڑی یہ کیا ہے؟''

''کالی پہاڑی پر ایک انتہائی پرانا مندر ہے جو کہ نہ جانے کتنی صدیوں پہلے بنا تھا، اس کے بارے میں عجیب وغریب پراسرار روایات سنتے چلے آرہے ہیں کہ یہ مندر آسیبی ہے۔ جو اس مندر کے اندر جانے کی کوشش کرتا ہے اسے موت آجاتی ہے۔'' چوہدری نے کہا۔

''تو آپ کا خیال ہے کہ یہ دونوں آدمی پیچھے راستے سے مندر میں داخل ہوئے ہیں۔''

''جی...... نہیں...... میں یہ کہہ رہا ہوں ہوسکتا ہے کہ وہ دونوں آدمی مندر میں داخل ہوئے ہوں۔''

''ٹھیک ہے چوہدری صاحب...... میں جاؤں گا اس مندر میں۔'' انسپکٹر ساجد نے پرعزم لہجے میں کہا۔

اب ساجد کے پاس کالی پہاڑی تک جانے کے دو راستے تھے۔ ایک راستہ گاؤں کے باہر سے جاتا تھا اور ایک راستہ جنگلات سے ہوکر گزرتا تھا۔

کافی سوچنے کے بعد ساجد نے جنگل کے راستے جانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ گاؤں کے باہر کا راستہ مختصر ضرور تھا مگر خطرناک اور دشوار گزار تھا۔ اس لئے اس نے جنگل کے ذریعے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

ایک مضبوط جیپ ایک رسی اور دوسرا سامان لے کر ساجد اپنی منزل کی جانب چل پڑا تھا، اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کہ کالی پہاڑی پر ہی اسے تمام سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔

ساجد جنگل کے قریب پہنچ کر رک گیا نہ جانے کیوں اسے عجیب وغریب سے خوف کا احساس ہورہا تھا، لیکن اسے کوئی طاقت کشاں کشاں جنگل کے اندر جانے پر مجبور کررہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے کوئی کہہ رہا ہو کہ جیپ جنگل کے باہر ہی چھوڑ دو۔

چنانچہ اس نے جیپ جنگل کے باہر جھاڑیوں کے پاس کھڑی کی اور اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہوگیا۔

جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا ویسے ویسے اندھیرا بڑھتا جاتا ایک بات اس نے محسوس کی تھی، اس نے اب تک کسی بھی درندے یا پرندے کی آواز نہیں سنی تھی اور ہوا بھی جیسے بند تھی، عجیب قسم کا سناٹا اس نے جنگل میں محسوس کیا، جیسے کہ جنگل میں ان درختوں کے علاوہ اور کوئی بھی نہ ہو۔

دفعتاً اس نے عجیب سی آواز سنی آواز تیز قسم کی سیٹی سے مشابہت رکھتی تھی، سیٹی کی آواز سنتے ہی ساجد بری طرح سے چونک پڑا۔ بڑی سرعت سے اپنا پستول نکال کر ہاتھ میں پکڑلیا۔

جھاڑیوں کو ہٹاتا ہوا وہ سیٹی کی آواز کی جانب بڑھنے لگا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک طویل میدان تھا۔

ساجد میدان میں داخل ہوگیا۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ چونکنے انداز میں آگے بڑھتا رہا تھا۔ لمبا اور طویل میدان عام میدانوں سے ہٹ کر تھا۔ اس کی مٹی بھوری کی جگہ سبز تھی جبکہ میدان میں تھوڑے فاصلے پر ٹنڈ منڈ سے چھوٹے چھوٹے درخت تھے جو کہ بالکل بھی قدرتی معلوم نہیں ہورہے تھے۔ درختوں کا رنگ بھی سنہری مائل تھا۔

ساجد شدید ترین حیرتوں کے ساتھ آگے بڑھتا رہا، دفعتاً اسے اسی طرح کی تیز قسم کی سیٹی کی آواز پھر

سنائی دی تھی۔

سیٹی کی آواز سن کر وہ بری طرح سے اچھل پڑا تھا۔

اچانک اسے اپنے اندر ایک خوف سا محسوس ہوا، اسے ایسا لگا کہ جیسے اس کے آس پاس کوئی ہے، اس احساس کے ہوتے ہی وہ مزید ڈر گیا۔ اچانک اس کے کانوں میں رونے کی آواز گونجنے لگی وہ آواز کسی شیر خوار بچے کی تھی۔

اس آواز کو سنتے ہی جیسے اس کے قدموں کو پر لگ گئے، وہ اندھا دھند بھاگ کھڑا ہوا، بھاگتے بھاگتے اسے کسی چیز سے ٹھوکر لگی تو وہ گر پڑا، گرتے ہی اس کے ہر احساس کے گرد اندھیرا چھا گیا۔

☆......☆......☆

سنکھ کے پھونکے جانے کی آواز سن کر ساجد کو ہوش آ گیا۔ اسے اپنا سر بالکل بھاری سا محسوس ہو رہا تھا بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے سر پر مسلسل ہتھوڑے پڑ رہے ہوں، ساجد نے ہلنے کی کوشش کی تو منہ سے بے ساختہ سسکاری نکل گئی، جسم کا جوڑ جوڑ جیسے پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا اس نے آنکھیں بند کرلیں اور ہولے ہولے کراہنے لگا، تھوڑی دیر میں اسے سکون محسوس ہونے لگا، اسے ایسا لگا کہ جسم کی توانائی بحال ہو رہی ہو۔ عجیب و غریب قسم کی بے معنی سی آوازیں سن کر آنکھیں کھول دیں۔

اپنے چاروں طرف عجیب و غریب قسم کے لوگوں کو دیکھ کر وہ سہم گیا، وہ لوگ انتہائی کالے رنگ کے بدنما اور عجیب سے معلوم ہو رہے تھے۔ ان کی وضع قطع دیکھ کر اسے ہولی وڈ کی فلمیں یاد آ گئیں جن میں جنگلی قبیلوں سے تعلق رکھنے والے لوگ ہوتے ہیں۔

ساجد بڑی سرعت سے اٹھ بیٹھا..... اسے اٹھنے میں انتہائی شدید کمزوری محسوس ہو رہی تھی، جس جگہ ساجد موجود تھا، اس جگہ روشنی ناکافی تھا، اس لئے اس جگہ کا تعین کرنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ اسے اپنے سامنے موجود لوگوں کو دیکھ کر بہت زیادہ خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ لوگ ساجد کو بہت زیادہ پرشوق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

''کون ہو تم..... '' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

اس کی بات سن کر سارے لوگ چونک پڑے اور بڑی تیزی سے دو لوگوں نے اس کے ہاتھوں کو پیچھے سے پکڑ لیا۔

''جواب کیوں نہیں دیتے! مجھے اس طرح کیوں پکڑا ہوا ہے؟''

''میں جواب دیتی ہوں تمہیں کہ ہم کون ہیں......'' ایک انتہائی سریلی آواز سن کر بری طرح سے وہ چونک پڑا...... آواز دینے والی اسے دکھائی نہیں دے رہی تھی بلکہ جس جانب سے آواز آئی تھی اس طرف کافی اندھیرا تھا۔ اس کی آواز سن کر سارے جنگلی نما لوگ اس وقت رکوع کی حالت میں جھکے ہوئے نظر آئے۔

دفعتاً اس پوری جگہ انتہائی تیز روشنی پھیل گئی تھی۔

روشنی کہاں سے آ رہی تھی یہ تو اسے پتہ نہ چلا لیکن وہ جگہ جہاں وہ تھا اس کا وہ اچھی طرح سے جائزہ لے سکتا تھا۔

یہ ایک پتھریلی کوٹھری تھی بالکل ویسے ہی جیسے کہ سینٹرل جیل میں قیدیوں کے لئے ہوتی ہے۔ ساجد نے سامنے دیکھا تو اسے ایک انتہائی خوب صورت اور حسین لڑکی کھڑی نظر آئی، ساجد نے زندگی میں کبھی اتنا حسن نہیں دیکھا تھا لڑکی سر سے پیر تک دعوت گناہ تھی۔ اس نے انگریز عورتوں کی طرح سوئمنگ کاسٹیوم نما کوئی چیز پہن رکھی تھی، جسم کے بقیہ حصوں پر رنگ و روغن سے لیپ کیا ہوا تھا۔

ساجد نے سر گھما کر دیکھا تو وہ جنگلی اب بھی رکوع کی حالت میں کھڑے تھے۔

''یہ سب میرے غلام ہیں اور ہم سب چاند کے پجاری ہیں...'' لڑکی نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھ کر کہا۔

وہ لڑکی درحقیقت میں حسن و جوانی کا شاہکار تھی۔ اس کی آواز خود اس کی طرح انتہائی خوب صورت تھی۔

''مگر تم لوگ ہو کون؟'' ساجد نے پوچھا۔

''کہا نا کہ ہم چاند کے پجاری ہیں اور ہر سال چاند کا دیوی کے آگے بلی دیتے ہیں۔'' لڑکی نے رکوع میں جھکے ہوئے لوگوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ لوگ اٹھے اور الٹے قدموں وہاں سے باہر نکل گئے۔

''بلی دیتے ہو مگر کس کی؟'' ساجد نے حیرت سے

پوچھا۔

انسانوں کی اور آج تمہاری باری ہے، اور وہی رات ہے..... جب تمہیں قربان کیا جائے گا۔"

اتنا سننا تھا کہ ساجد کے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا، ساجد نے دونوں ہاتھوں سے پسینہ پونچھا اور تھوک نگلتے ہوئے لڑکی کی طرف دیکھ کر گویا ہوا۔ "تو گویا یہ جنگل تم لوگوں کی وجہ سے آسیبی ہے....."

"نہیں یہ جنگل واقعی آسیبی ہے لیکن چونکہ ہم چاندکا کے پجاری ہیں، جس کی وجہ سے ہم محفوظ ہیں۔"

ساجد نے دل ہی دل میں سوچا۔ "اب تو کہانی ختم....."

میرے پاس کتنا وقت ہے....." ساجد نے اس سے پوچھا۔

"صرف دو گھنٹے....." لڑکی مسکراتے ہوئے بولی۔

"ساجد میاں..... یہی وقت ہے کچھ کرنے کا....." ساجد نے دل ہی دل میں سوچا۔

"مگر تم لوگ یہ سب کچھ کیوں کررہے ہو؟" ساجد نے یونہی پوچھ لیا۔

میں اس سوال کا جواب دینے کی پابند نہیں۔" لڑکی نے منہ بنا کر کہا۔

اس وقت ساجد کا ذہن بڑی تیزی سے کچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

دفعتاً ساجد نے بیٹھے بیٹھے زقند لگائی اور بجلی کی تیزی سے لڑکی پر جا گرا لڑکی اس ناگہانی افتاد سے بری طرح بوکھلا گئی، اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتی ساجد نے اس کو یکے بعد دیگرے اس کے منہ پر دو مکے جڑ دیئے.....

لیکن دوسرے پل ہی اس نے ساجد کو ہوا میں اچھال دیا۔

ساجد ہوا میں اچھل کر واپس فرش پر پڑا لڑکی بھنا کر جیسے بھوکی شیرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔

ساجد فرش پر کراہ رہا تھا لڑکی نے ساجد کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا، خون پونچھتے ہوئے ساجد کی ناک پر زوردار ٹکر ماری اور ساجد چیختا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔

دوسرے لمحے ساجد نے خود کو سنبھالا اور پولیس ٹریننگ کا پورا پورا فائدہ اٹھاتے لڑکی کو گھوم کر کک ماری اور پے در پے کئی ککیں لگادیں، ساجد کا خیال تھا کہ وہ اتنی مار کھانے کے بعد ٹھنڈی ہو جائے گی لیکن ساجد کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

لڑکی الٹی قلابازی کھاتی ہوئی آئی اس کی دونوں لاتیں ساجد کی طرف تھیں، دونوں لاتیں ساجد کے سینے پر بھرپور انداز سے پڑی تھیں، ساجد سینے پر لات کھا کر گر پڑا۔ گرتے ہی ساجد چیخ مار کر فرش پر کراہنے لگا۔

لڑکی فاتحانہ انداز سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔

دفعتاً ساجد کو کچھ خیال آیا اس نے موزے میں اڑسا ہوا پستول نکالا اور پے در پے دو تین فائر ایک ساتھ کردیئے۔

لیکن دوسرے پل اس نے جو کچھ دیکھا وہ ناقابل یقین تھا۔ مگر سچ تھا۔

تینوں گولیاں لڑکی کے سینے پر لگی تھیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اس کے سینے پر تین سوراخ ہوجاتے، لیکن گولیاں لڑکی کے سینے سے ٹکرا کر دور جا گریں، جیسے وہ سینہ پتھر کا ہو۔

"اب تم کو کون بچائے گا..... تم نے غلط اندازہ لگایا تھا۔ میرے بارے میں۔" لڑکی قہقہہ لگا کر بولی۔

ساجد کو ایسا لگا کہ جیسے لہو اس کی شریانوں میں جم کر رہ گیا۔ لڑکی آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھنے لگی۔

اس کے چہرے کے تاثرات انتہائی خطرناک تھے، صاف ظاہر ہورہا تھا کہ اب وہ کوئی انتہائی خطرناک قدم اٹھائے گی، ساجد نے پے در پے سارا پستول اس پر خالی کردیا، گولیوں کی آواز سن کر سارے جنگلی اندر داخل ہوگئے، اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے ساجد کو پکڑ لیا، لڑکی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی، دفعتاً دروازہ کھلا نیلے رنگ کا دھواں کوٹھری کے اندر داخل ہوگیا، دھواں کافی تعداد میں اندر داخل ہورہا تھا۔

دھواں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر لڑکی چونک پڑی، دفعتاً ساجد کا ہاتھ کسی نے پکڑ لیا۔

ساجد کا ہاتھ انتہائی سرد ہاتھوں نے تھام رکھا تھا۔

ساجد کو ایسا لگا کہ وہ ہاتھ نہیں برف کی سرد سل ہو، جس

میں زندگی کا احساس بالکل نہ تھا۔

"جلد نکل چلو تمہاری منزل یہ نہیں۔" آواز انتہائی سریلی اور خوب صورت تھی۔

"تم کون ہو؟" ساجد نے پوچھا۔

"یہ وقت زیادہ باتیں کرنے کا نہیں ہے۔ دھوئیں کا پردہ زیادہ دیر تک نہیں رہے گا۔" سرد ہاتھ نے تقریباً ساجد کو گھسیٹتے ہوئے کہا۔

ہاتھ ساجد کو گھسیٹتے ہوئے اس جگہ سے باہر لے گیا۔ ساجد کو ایسا لگا کہ وہ ہواؤں میں اڑ رہا ہو۔ ہاتھ اس کو گھسیٹتے ہوئے آگے آگے لے جا رہا تھا۔ بس اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دھوئیں کے بیچوں بیچ چلا جا رہا ہو۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے دھواں چھٹا تو اس نے دیکھا کہ وہ اسی جنگل میں کھڑا ہے۔

"یہاں سے بالکل سیدھے چلے جاؤ۔" تمہاری منزل زیادہ دور نہیں... مگر خبردار...... راستے میں جو کچھ دیکھو اس پر کسی بھی قسم کا کوئی ردعمل ظاہر نہ کرنا ورنہ نتائج کے ذمہ دار خود ہوگے۔"

ساجد کو ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے آواز پہلے بھی سنی ہے لیکن کہاں اسے یاد نہیں آ رہا تھا۔ ساجد کی منزل کالی پہاڑی تھی۔ جہاں وہ دو مجرم چھپے ہوئے تھے؟ جن کے چہرے بالکل ویسے ہی تھے جیسے کہ اس نے خواب میں دیکھا تھا؟ اس لئے وہ وہاں جا رہا تھا، ساجد آرام، آرام سے چلتا ہوا جنگل کے گھنے حصے میں داخل ہوگیا، وہ آہستہ آہستہ اس کچی پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ اس پگڈنڈی کے دونوں اطراف بڑے بڑے وسیع و عریض درخت، جھاڑیاں خودرو پودے موجود تھے۔ ساجد بڑے آرام سے پھونک پھونک کر قدم اٹھا رہا تھا۔ اس نے جھاڑیاں کاٹ کر راستہ بنانے کے لئے خنجر نکال کر ہاتھ میں پکڑ لیا۔

جنگل بڑھتا ہی جا رہا، نہ جانے ساجد کتنی دیر تک چلا ہوگا۔ اب ساجد کافی تھکن محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

بھوک و پیاس کا احساس اب شدت سے سر اٹھانے لگا تھا۔

مچھر

مالک (نوکر سے) تم نے مچھر نہیں مارے۔ میرے کان میں گنگنا رہے ہیں۔

نوکر بولا۔ "صاحب......! مچھر تو مار دیئے ہیں۔ یہ تو ان کی بیوائیں ہیں جو غم سے رو رہی ہیں۔"

(محمد وارث آصف-واں بھچراں)

ساجد نے سوچا کوئی پھل دار درخت ڈھونڈا جائے تا کہ اس کا پھل کھا کر بھوک مٹائی جائے۔

ساجد تھوڑی دیر بعد اٹھا اور پھل دار درخت کی تلاش میں آگے بڑھنے لگا جیسے وہ آگے بڑھا اس کو گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں ساجد فوراً ایک درخت کے پیچھے ہوگیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ساجد نے دیکھا۔

"تین گھڑ سوار سر سے پاؤں تک کالے لباس میں ملبوس اسی طرف چلے آ رہے ہیں۔ ایک گھڑ سوار کے گھوڑے پر ایک بچی لدی ہوئی تھی جو کہ بے ہوش تھی۔ انہوں نے اس بچی کو زمین پر پٹخ دیا۔

"سردار...... کیا ارادہ ہے؟" ایک گھڑ سوار نے دوسرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ آواز انتہائی خرخراتی ہوئی تھی۔

"ذبح کر دو سائیں کو بہت تنگ کیا ہوا ہے اس نے۔" پہلے نے تیسرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"تیسرے گھڑ سوار نے نیفے میں اڑسا ہوا خنجر نکال کر لڑکی کی گردن پر رکھ دیا۔

ساجد یہ منظر دیکھ کر بے چین ہوگیا۔ اس کے اندر سویا ہوا پولیس آفیسر انگڑائی لے کر بیدار ہوگیا۔

"اے...... رک جاؤ...... یہ جرم میں تم لوگوں کو نہیں کرنے دوں گا۔" ساجد ان کی طرف دیکھ کر چلایا۔

ساجد کی آواز سن کر وہ تینوں چونک پڑے لڑکی کو

چھوڑ کر ساجد کی طرف دیکھنے لگے، اسی لمحے لڑکی بھی بیدار ہو کر اٹھ کھڑی ہوئی وہ بھی ساجد کو نہایت عجیب نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

''چھوڑ دو اس لڑکی کو.....'' ساجد انتہائی سرد لہجے میں چلایا۔

جواب دینے کے بجائے لڑکی سمیت وہ چاروں ہنسنے لگے۔

لڑکی کو ہنستا دیکھ کر ساجد کو نہایت حیرت ہوئی اور ساتھ ہی ساتھ کسی گڑبڑ کا احساس بھی۔

ان تینوں نے اپنے چہرے پر پڑے ہوئے کالے نقاب اتار دیئے۔

ان کے چہرے دیکھ کر ساجد کے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

وہ منظر انتہائی خوفناک اور دل دہلا دینے والا تھا۔

لڑکی کے ناخن مڑنے لگے تھے، آنکھیں بے حد نیلی ہونے لگی تھیں چہرے کی کھال جگہ جگہ سے ادھڑنے لگی تھی..... جبکہ وہ تینوں گھڑ سواروں کے چہرے..... چہرے نہیں استخوانی کھوپڑیاں تھیں..... جن کے سوراخوں سے کالے سانپ جھانک رہے تھے۔

انتہائی خوفناک منظر دیکھ کر ساجد سمجھ گیا کہ اس کا کھیل ختم ہو چکا ہے۔

''میں نے تمہیں منع کیا تھا نا.....'' ایک ہلکی سی سرگوشی ساجد کے کانوں میں گونجی۔

''مگر.....''

''اگر مگر..... کچھ نہیں۔'' اب میں کچھ نہیں کر سکوں گی.....'' آواز ہلکی ہوتے ہوئے غائب ہو گئی۔

ساجد کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے، موت اس سے چند لمحوں کے فاصلے پر تھی۔ اس پراسرار آسیبی جنگل میں اس کی قبر بن جائے گی.....

وہ چاروں طرف عفریت عجیب و غریب آوازیں نکالتے ساجد کو دبوچنے آگے بڑھ رہے تھے۔

ساجد کے دل میں نہ جانے کیا آیا کہ وہ بلند آواز سے آیت الکرسی پڑھنے لگا۔

اور پھر کلام الٰہی کو سن کر وہ عفریت رک گئے۔ یہ کلام کی تاثیر تھی وہ عفریت پیچھے ہٹنے لگے تھے۔ ان کے حلق سے اب چیخیں نکلنے لگی تھیں۔ اللہ کے کلام کا ہی اثر تھا کہ ساجد کے دل کو طمانیت محسوس ہونے لگی تھی اسی پل عفریتوں کے جسموں کو آگ لگ گئی۔ ان کی بھیانک چیخیں جنگل کی فضا میں ارتعاش پیدا کرنے لگی تھیں۔

چند منٹوں کے بعد وہاں راکھ کے ڈھیر کے سوا کچھ نہ تھا۔

ساجد دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا جیسے ہی درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلا اسے اپنے سامنے پہاڑیوں کا طویل سلسلہ نظر آیا جو کہ انتہائی وسیع و عریض پہاڑیاں، ساجد نے کمر پر بندھی رسی کھولی اور کوئی ایسی چیز ڈھونڈنے لگا کہ جس کا کنڈا بنایا جا سکے۔

جلد ہی ساجد کو ایسی چیز مل گئی تھی جس کا وہ کنڈا بنا سکے یہ لوہے کا ایک کڑا تھا جو کہ زنگ آلود ہو چکا تھا۔

ساجد بڑی تیزی سے پہاڑیوں کے نزدیک پہنچ گیا۔

پولیس ٹریننگ میں وہ رسی کی مدد سے اترنے اور چڑھنے کی تربیت لے چکا تھا۔ اس لئے وہ جانتا تھا کہ اس کی مدد سے پہاڑی پر چڑھ جائے گا۔

آدھے گھنٹے کی انتھک محنت اور جدوجہد کے بعد وہ پہاڑی پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔

پہاڑی پر چڑھتے ہی ساجد کو اپنے سامنے قدیم اور بوسیدہ سی عمارت نظر آئی جو کہ طرز تعمیر سے مندر لگتا تھا۔ یہ عام مندر سے مختلف گنبد نما بنایا گیا تھا۔ مندر کے دروازے پر انتہائی قد آدم مجسمہ نصب تھا اس مجسمہ کو دیکھ کر ساجد کو میوزیم میں نصب وہ مجسمہ یاد آ گیا جو کہ مایا تہذیب کی کھدائی کے دوران نکلا تھا۔

ساجد نے جیسے ہی دروازے کو دھکا دیا وہ از خود اندر کی جانب کھلتا چلا گیا۔ ساجد جیسے ہی اندر داخل ہوا دروازہ بند ہو گیا، سامنے ایک طویل برآمدے نما راہداری تھی، راہداری میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مختلف مجسمے نصب تھے جو کہ پتھر کے تھے، ہر مجسمہ امتداد

زمانہ کے باعث سیاہ کالا ہو چکا تھا۔
ساجد مختلف مجسموں کو دیکھتا ہوا راہداری میں آگے بڑھنے لگا۔ راہداری عبور کرنے کے بعد ساجد ایک وسیع و عریض ہال میں داخل ہو چکا تھا۔ ہال کی چھت گنبد نما تھی، ہر طرف بڑی بڑی مشعلیں روشن تھیں، سامنے ایک سنگی چبوترے پر ایک بڑا پتھر کا بت نصب تھا۔ جو کہ کافی طویل اور دیو قامت تھا۔

☆......☆......☆

ساجد جیسے ہی ہال میں آگے بڑھا اسی لمحے ایک منٹ سے بھی کم وقفے کے اندر پورا ہال روشنی میں نہا گیا ساجد کے اوپر نہ جانے کہاں سے پھولوں کی برسات ہونے لگی...... پھولوں کی برسات اس قدر تھی کہ دو سیکنڈ کے اندر پورا ہال خوشبو اور پھولوں سے لد گیا......
ساجد کی نظر مورتی پر پڑی وہ حیرت سے چونک گیا، کیونکہ مورتی کے سر پر ایک سانپ پھن اٹھائے بے حس و حرکت بیٹھا تھا، سانپ انتہائی خوب صورت اور گہرے سبز رنگ کا تھا، اس کے جسم پر جگہ جگہ سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، آنکھوں میں اتنی مسحور کن چمک تھی، ساجد کئی لمحے تک ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔
دفعتاً ساجد کی نظر مورتی کے دائیں اور بائیں طرف پڑی، دو شخص زنجیروں میں بندھے کھڑے تھے ان کے چہروں پر نقاہت طاری تھی، صاف ظاہر ہو رہا تھا ان دونوں نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ ساجد نے ان دونوں کو صاف پہچان لیا، یہ دونوں وہی تھے جن کی تلاش میں وہ یہاں تک آیا تھا۔ ارجن اور شنکر جو کہ پیش امام صاحب کی اور دیگر نمازیوں کی شہادت کے ذمہ دار تھے، ان کی حالت کافی پتلی تھی، صاف لگ رہا تھا زندگی کسی بھی لمحے ان کا ساتھ چھوڑنے والی ہے۔
''ان کا یہ حال کس نے بنایا؟'' ساجد زیر لب بڑبڑایا۔
اچانک فضا میں گھنٹی کی آواز گونجی...... ساتھ ہی ساتھ سنکھ کی آوازیں ساجد کے کانوں میں گونجنے لگیں...... جیسے ہی سنکھ کی آواز تھمی مورتی پر بیٹھا ہوا سانپ زندہ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور تیز ہو گئی۔
سنکھ کی آواز سن کر ارجن اور شنکر بھی ہوش میں آ گئے تھے۔ سانپ نے قہر آلود نظروں سے ان دونوں قیدیوں کی طرف دیکھا اور دوسرے لمحے سانپ نے اڑتے ہوئے ان دونوں کے سروں پر ڈس لیا۔
ان دونوں کے حلق سے نکلنے والی چیخ انتہائی کریہہ تھی...... تھوڑی ہی دیر میں وہ پانی بن کر بہنے لگے اور پھر چند لمحے بعد وہاں کچھ نہ تھا۔
سانپ فرش پر گر کر تڑپنے لگا، چند لمحوں بعد سانپ کی جگہ ایک خوب صورت اور حسین لڑکی موجود تھی جس کی آنکھیں بند تھیں، چہرے پر سکون اور طمانیت کا احساس تھا۔
چند لمحوں بعد لڑکی نے آنکھیں کھول دیں اور ساجد کی طرف بڑی ہی محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''میری تپسیا پوری ہوگئی راج کمار تم آ گئے......'' وہ مسکرا کر بولی۔
ساجد نے اس لڑکی کی طرف غور سے دیکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اس نے خواب میں دیکھا تھا۔
لڑکی آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور پوجا کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر مورتی کو پرنام کیا اور والہانہ انداز میں رقص کرنے لگی...... رقص کے انداز میں جوش و خود سپردگی تھی، ساجد کے کانوں میں گونجنے والی سریلی آوازیں اس کے پاؤں کی ہر جنبش میں مدغم ہو چکی تھیں ساجد نے اس قدر والہانہ رقص کبھی نہیں دیکھا تھا، ساجد اپنے وجود کا ہر احساس کھو چکا تھا۔ اس وقت سارے ماحول پر پراسراری بے خودی چھائی تھی......
دفعتاً وہ لڑکی رقص کرتے کرتے ساجد کے پاس آئی اور اس کے پیروں میں بیٹھ گئی۔
''کون ہو تم؟'' ساجد نے کانپتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔
''مجھے پہچانو...... راج کمار...... پہچانو راج

کمار......"

ساجد کانپ کر رہ گیا یہ وہی آواز تھی جس نے اس کو جنگلیوں سے نجات دلائی تھی۔

"راج کمار...... مجھے پہچانو...... وقت کی گرد اپنے ذہن سے ہٹا کر دیکھو تمہیں اپنی روپ متی یاد آئے گی...... جس نے تمہارے پریم میں پوجا کو مار دیا... تم نے ہیرے کی انگوٹھی چاٹ لی لیکن تم بچ گئے...... تم نے میرے کارن دوسرا جنم لیا ہے۔"

"کیا بک رہی ہو؟" ساجد نے جھلا کر کہا۔

اچھا سنو شاید تم کو یاد آئے۔" آج سے ہزار سال پہلے اس جگہ ایک بہت شاندار ریاست تھی۔ ریاست کا مہاراجہ ششی پال بہت بڑا دھرماتما اور پرجا کا خیال رکھنے والا تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے ایک کا نام اجیت سنگھ، دوسرے کا نام جگجیت سنگھ تھا۔ ریاست کے دستور کے مطابق مہاراجہ کی موت کے بعد اجیت سنگھ کو راج گدی پر بیٹھنا تھا اجیت بہت سندر اور نیک دل گیانی تھا، بھگوان کا سچا بھگت یہ مندر اس نے بنوایا تھا اس کا وقت زیادہ یہیں گزرتا تھا پرجا بھی اس سے خوش تھی۔

اس کے برخلاف جگجیت سنگھ بہت گھمنڈی اور ظالم تھا، دن رات شراب پی کر باندیوں اور کنیزوں کی آبرو سے کھیلتا تھا، لوگ اس کے ظلم سے پریشان تھے مگر خوف کے مارے مہاراجہ سے شکایت کرنے کی ہمت نہ تھی یہ جسے تم ارجن کے نام سے جانتے ہو، یہی جگجیت تھا، اور تم اجیت......" اتنا کہہ کر لڑکی سانس لینے کے لئے رکی۔

مگر ساجد چیخ پڑا "نہیں...... تم جھوٹ بکتی ہو......"

"داستان ابھی ختم نہیں ہوئی......" لڑکی نے پھر دوبارہ بولنا شروع کر دیا۔

"مہامنتری چکروتی جس کی بیٹی جگجیت سنگھ سے منسوب تھی۔ مہامنتری جگجیت کو مہاراجہ بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اجیت کو ختم کرنے کی ٹھانی کام بہت مشکل تھا۔ اس زمانے کے راجاؤں کا دستور تھا کہ وہ اپنے محل میں وش کنیائیں (زہریلی لڑکیاں) ضرور رکھتے تھے راجہ انہیں اپنی جان کی حفاظت کرنے کے لئے پالتے تھے ساتھ ہی ساتھ وہ دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ رہتے تھے۔ انہی دنوں محل میں میرا اور ایک راج رنگی جو کہ وش کنیا بھی تھی بڑی دھوم تھی اس کا نام پوجا تھا، چکروتی نے پوجا کو لالچ دے کر اجیت سنگھ کو مارنے بھیجا تاکہ اجیت سنگھ جیسے ہی اس کے ہونٹوں پر پیار کرے مر جائے۔

لیکن پوجا تو خود ہی اجیت سنگھ کے پریم کا شکار ہو گئی۔ اس کے دل میں وہ جوت (شمع) جلی جسے پریم کہا جاتا ہے۔ پیار تو تیاگ مانگتا ہے اس لئے اس نے تیاگ دیتے ہوئے راج کمار اجیت سنگھ یعنی تم کو سب بتا دیا۔

راج کمار جو کہ خود بھی پوجا سے سچا پریم کرتا تھا نے پوجا کو معاف کر دیا۔ اور اپنے راجا بننے کے انتظار کرنے کو کہا کیونکہ وہ راجا بن جاتا تو پوجا کے ذریعے پوجا کو وش سے آزاد کروا دیتا۔

چکروتی اور جگجیت سنگھ نے مجھے بلایا اور زہر سے آزادی کا لالچ دے کر راج کمار کو ٹھکانے لگانے کو کہا میں نے زہر سے آزادی کے لالچ میں اجیت کو ختم کرنے کا سوچا۔ لیکن میں بھی پریم بندھن میں جکڑ گئی۔ اجیت سنگھ کو نظر بھر دیکھنا ہی قاتل ثابت ہوا۔ مگر اجیت تو پوجا کا تھا اور وہیں میرے دل میں پوجا کے لئے نفرت پیدا ہوئی...... محبت کی نفرت...... اپنے محبوب کو حاصل کرنے کا جنون یہ جنون مجھ سے کچھ بھی کرا سکتا تھا......

میں جب بھی اجیت اور پوجا کو پیار بھری باتیں کرتے دیکھتی تو میرا روم روم جھلس جاتا پھر ایک دن میں نے ایک منصوبہ بنایا ایک انتہائی خوفناک منصوبہ۔

میں نے اپنے آپ کو ناگ دیوتا کے سامنے ارپن فیصلہ کیا تاکہ ناگ دیوتا کا ایک روپ مجھے مل جائے یہ بات میں نے چکروتی اور جگجیت سنگھ کو بتائی کیونکہ دیوتا کے سامنے زتھ کی پوجا کے لئے ان دونوں کی انومتی (اجازت) ضروری تھی۔ چنانچہ ان دونوں کی اجازت کے لئے میں چکروتی سے ملی۔

"میں تمہاری کس طرح مدد کر سکتا ہوں۔"

چکروتی نے کہا۔

"مجھے ناگ دیوتا کی پوجا کرنی ہے...... اس کے لئے تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔

ناگ دیوتا کا ایک روپ مجھے ملے گا اور میں پوجا کو ڈس لوں گی پوجا خود وش کنیا ہے۔ اس لئے ناگ دیوتا کا زہر اسے مار سکتا ہے۔"

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ پوجا کے ہٹ جانے کے بعد تم راج کمار کو مار دوگی۔" چکروتی نے کہا۔

"میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گی...... ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بہت دور...... میرا پریم پوجا کی یاد بھلا دے گا......"

اتنا کہنے کے بعد لڑکی سانس لینے کے لئے رکی......

جبکہ ساجد کے چہرے پر جیسے کہ داستان کے سحر میں گم تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا وہ اس داستان کا کوئی ایک کردار ہو۔

"پھر کیا ہوا...... کیا پوجا مر گئی؟"

"ہاں......" لڑکی نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

"پوجا تو مر گئی مگر تم میرے نہ ہوئے...... تم نے پہلے جنم میں مجھے ٹھکرا دیا۔ میں نے ناگ دیوتا کی پوجا کی اس نے خوش ہو کر مجھے ناگن کا ایک روپ دے دیا۔ میں نے پوجا کو ڈس لیا وہ مر گئی۔ راج کمار نے زہر کھا لیا مگر میں نے اسے مندر میں لے جا کر رکھ دیا۔ میری پوجا سے خوش ہو کر ناگ دیوتا نے راج کمار کو زندہ کر دیا۔

راج کمار نے خودکشی کرنے کی کوشش کی اس منظر کو تم خواب میں دیکھ چکے ہو، اسے چکروتی نے مار دیا۔

راج دربار میں مجھ پر الزام لگایا گیا...... میں نے سانپ بن کر ان دونوں کو ڈس لیا...... وہ دونوں مر گئے یہ بھی تم خواب میں دیکھ چکے ہو۔ میں نے خود کو فوج کے حوالے کر دیا۔

قید خانے میں پوجا کرکے شیوجی سے مدد کی درخواست کی انہوں نے خوش ہو کر کہا کہ "راج کمار دوسرا جنم لے گا مگر وہ تمہیں جب ملے گا...... جب تم ان دونوں پاپیو کو راج کمار کے سامنے ماروگی اس کے لئے تمہیں ہزار سال انتظار کرنا ہوگا۔ اس کے لئے تمہیں اپنا شریر چھوڑنا ہوگا۔"

"تو میں نے آتما تیاگ کرلی۔ میری آتما ہزار سال سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ آج تم آگئے راج کمار اب تم میرے ہو...... میرے ہو......"

یہ کہہ کر روپ متی رو پڑی......

اسے روتے دیکھ کر ساجد کا دل نرم پڑ گیا......

"کیا چاہتی ہو تم؟"

"تمہیں! راج کمار صرف تمہیں...... سب یاد آ گیا......"

ساجد کو یاد تو کچھ نہیں آیا تھا۔ مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔

"آؤ...... میرے ساتھ۔" یہ کہہ کر اس نے ساجد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ساجد کو ایسا لگا کہ جیسے کہ کسی برف کی سل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ہو۔

وہ آہستہ آہستہ اسے چلاتی ہوئی ایک دوسرے ہال میں لے گئی۔ دوسرے ہال میں ایک سانپ کی ایک بہت بڑی مورتی رکھی تھی۔ جس کے سامنے ایک چبوترا تھا۔ جس پر خون کے دھبے سوکھے پڑ چکے تھے۔

"راج کمار تمہیں یہاں مرنا ہوگا...... تاکہ تم میرے ہو سکو۔" روپ متی نے سرد لہجے میں کہا۔

ساجد موت کا سن کر کانپ گیا......

"مرنے سے پہلے تمہیں ناگ دیوتا کے سامنے سجدہ کرنا پڑے گا...... تاکہ تم...... جسم کے پنجرے سے آزاد ہو سکو۔"

ساجد یہ سن کر کانپ گیا...... اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اس کے سر سے پاؤں تک ہلا دیا ہو......

"ساجد تم ایک کلمہ گو مسلمان ہو...... اس پتھر کو سجدہ مت کرو...... باطل مٹنے کے لئے آیا ہے......"

ساجد کے اندر سے ایک آواز آئی۔

ساجد چونک گیا...... اس کے اندر سے جیسے سویا ہوا مسلمان جاگ اٹھا...... اس نے انتہائی ٹھوس اور فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"میں ایک مسلمان ہوں، مسلمان مرنا تو پسند کرتا ہے لیکن باطل کے آگے جھکنا نہیں۔"

اس کی باتیں سن کر روپ متی لال بھبوکا ہوگئی اس کی خوب صورت آنکھوں سے شرارے پھوٹنے لگے۔

"..... تم ..... میرے راج کمار نہیں ہوسکتے ..... تم کوئی اور ہو ..... "

اتنا کہہ کر وہ مورتی کی جانب سر جھکا کر بیٹھ گئی اس کی پشت ساجد کی جانب تھی۔

وہ چند لمحے تک ساجد کی طرف پیٹھ کیے بیٹھی رہی، جیسے ہی وہ ساجد کی جانب مڑی ساجد اسے دیکھ کر ڈر گیا..... اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرے کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا۔ آنکھوں سے غصہ اور حقارت ظاہر ہورہی تھی۔ "تم نے ناگ دیوتا کی توہین کی ہے..... اب تمہیں موت سے کوئی نہیں روک سکتا، چاہے پھر مجھے ہزار سال تک ہی کیوں نہ انتظار کرنا پڑے۔"

ساجد ڈر کے چند قدم پیچھے ہٹ گیا لیکن روپ متی نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھایا تو سرخ روشنی کا ایک شرارہ نکل کر ساجد کے جسم سے جاٹکرایا۔

روشنی کا شرارہ ٹکراتے ہی ساجد کو اپنے جسم میں آگ لگتی ہوئی محسوس ہوئی، ساجد فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

روپ متی حقارت بھری نظروں سے ساجد کو تڑپتا ہوا دیکھنے لگی.....

"تم نے میرے دیوتاؤں کو پتھر کہہ کر اپنی موت کو دردناک بنالیا ہے اب میں تمہیں بتاؤں گی۔"

دوسری بار ہاتھ کا اشارہ کیا اس بار ساجد ہوا میں اچھلا اور چھت سے جاٹکرایا ..... اور مزید تڑپنے لگا .....

"م ..... م ..... میں ایک مسلمان ہوں ..... مسلمان صرف اللہ کے سامنے جھکتا ہے ..... "

روپ متی نے جواب دینے کے بجائے تڑپتے ہوئے ساجد کی جانب پھر اشارہ کیا۔ ساجد اڑتا ہوا دیوار سے جاٹکرایا ..... ساجد زمین پر جاگرا۔ دفعتاً اسی لمحے ساجد کے کانوں سے آواز ٹکرائی ..... جو کہ انتہائی دھیمی تھی۔ "پریشان کیوں ہو ..... میرے عزیز ..... ذکرِ الٰہی کرو ..... پھر دیکھو قدرت کا نظارا۔"

ساجد کراہتا ہوا اٹھا اور سورۃ اخلاص کا بلند آواز سے ورد کرنے لگا۔ کلام الٰہی کا سننا تھا کہ روپ متی پر لرزہ طاری ہوگیا۔

پھر لرزہ کپکپی میں تبدیل ہوگیا ..... روپ متی کے حلق سے چیخیں نکلنے لگیں۔

ساجد نے سورۃ اخلاص با آواز بلند ورد شروع کردیا تھا۔ مندر کے در و دیوار پر لرزہ طاری ہوگیا .....

ساجد پیچھے ہٹنے لگا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے کمرے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے ہوئے اس نے دیکھا کہ روپ متی کے جسم نے آگ پکڑلی ہے۔

مندر کے در و دیوار زلزلے کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ ساجد نے دیکھا کہ پتھر کی مورتی سرنگوں ہوچکی ہے۔ روپ متی کی چیخیں ساجد کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے ساجد کا پیر پھسلا اور گر گیا تو ساجد کا سر ستون سے ٹکرایا۔ اسی لمحے ساجد کے حلق سے چیخ نکلی اس کا ذہن اندھیرے میں گم ہونے لگا، نیم وا آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ مندر کے در و دیوار گر رہے ہیں۔ روپ متی آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی اس کی جانب بھاگی ہوئی آرہی ہے۔ پھر اس کے ذہن کے سارے دروازے بند ہوگئے اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔

پھر جب ساجد کو ہوش آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ اپنی جیپ کے قریب پڑا ہوا ہے۔ سورج اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا، اسے گزشتہ واقعات یاد آنے لگے۔ اس نے جان بچ جانے پر اللہ کا شکر ادا کیا اور جیپ اسٹارٹ کرکے آگے بڑھادی، اب سے ایک اور سفر کرنا تھا، جس میں جسم کی نہیں روح کی ضرورت ہوتی ہے، جس سفر میں صرف اللہ کو راضی کرنا ہوگا، دور کہیں سے ساجد کے کانوں میں اذان کی آواز گونجی اور ساجد نے جیپ کا رخ مسجد کی جانب کردیا۔

اجر صبر

ساحل دعا بخاری۔ بصیر پور

نوجوان کو لهولهان کرنے کے بعد درخت سے باندھ دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اسے پانی کی ایک بوند بھی نہ دی جائے اور پھر ایک وقت آیا کہ نوجوان کی روح اس کا جسم چھوڑ کر پرواز کر گئی اور پھر روح نے ایک فیصلہ کیا تو……

محبت، خلوص اور چاہت کی دل گرفتہ کہانی جس میں پڑھنے والوں کیلئے سبق ہی سبق ہے

محسن میرے وجود کو سنگسار کرتے وقت
شامل تھا سارا شہر اک تہوار کی طرح

اس کا نیم جان وجود بے چارگی کی رسیوں میں جکڑا تھا، وہ مجسم ''بے بس'' تھا بے بس جس کی رگوں میں بے قراری کا لاوا بار بار ''جاں کنی'' کے عالم میں سر پٹختا تھا۔ اس کے گرد آلود پیر مضبوطی سے رسیوں میں جکڑے تھے۔ ہاتھ پشت پر لے جا کر باندھے گئے تھے۔ اور اس کی گردن کو ایک مخصوص ڈھیل دے کر سنبل کے کھردرے تنے سے جکڑا گیا تھا۔ یوں کہ اگر وہ گردن کو حرکت دیتا تو بندش رگوں کو کاٹتی محسوس ہوتی تھی۔ ارد گرد لاتعداد لوگ تھے جو اس کو دیکھ رہے تھے۔

ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ہم لوگ اس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ مدد کرنا تو دور کی بات، الٹا کسی بے کس کی بے بسی کا تماشہ دیکھتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔ درخت کے

قریب چند لوگ آتشیں اسلحہ لئے کھڑے تھے۔ ان کا انداز کسی محافظ کا سا تھا اور وہ اس بندش زدہ وجود کی "حفاظت" پر مامور تھے۔ سنبل کا درخت ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

اچانک خاموش فضا میں قدموں کی چاپ ابھری۔ مکھیوں کی بھنبھناہٹ کے مشابہ سرگوشیاں یکلخت تھم گئیں۔ ہر آواز سو گئی...... آنے والا ایک باوقار شخص تھا۔ قیمتی لباس، اس کے باوجود شخصیت اور شانوں پر دھری بلیک شال...... اس کی سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ رسیوں میں جکڑے وجود کے عین سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کی سیاہ آنکھیں اسی بے بسی پر مرتکز تھیں۔"

اب کیا کہتے ہو حیدر؟" اس کی آواز بھی بارعب تھی۔

حیدر کی آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ابھرا اور لبوں پہ استہزائیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب وہ بولا تو لہجہ اس کی جسمانی حالت کے برعکس تخفیف نہیں تھا۔ "وہی جو پہلے کہتا تھا۔"

"اب بھی وقت ہے حیدر، معافی مانگ لو جان بچالو۔"

"محبت کرنا ہی انسان کا "حق" ہے مہر داد آفریدی! اور حق کے لئے معافی نہیں مانگی جاتی، اس کی جتاتی نظریں مہر داد کے چہرے پر گڑی تھیں۔

"ہمت ڈھیٹ ہو۔" مہر داد کی سیاہ آنکھوں میں ناگواری در آئی۔

"اسے مستقل مزاجی کہتے ہیں مہر داد آفریدی۔"

اس نے گویا تصیح کی تھی اور مہر داد آفریدی کا تن بدن سلگ اٹھا تھا۔ "اسے یہیں پڑا رہنے دو۔ اگلے ایک ماہ تک اس جگہ کے قریب نہیں پھٹکے گا، اسی طرح مرنا ہی اب اس کا مقصد ہے۔" مہر داد کی آواز میں رعد کی کڑک تھی۔

"مقصد لکھنے والا اللہ ہے کفر مت بکو۔" اس کی بات پر سناٹا چھا گیا۔

سب کو گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ کسی کی ہمت نہ تھی کہ مہر داد کے سامنے آنکھ بھی اٹھاتا، کجا کہ ایک عام سے "کمی" نے ...... "اللہ ہی نے تمہارے مقدر میں یہ لکھا ہے۔" مہر داد چھنکارا۔

"تو پھر اللہ نے تمہارے مقدر میں بھی یہی لکھا ہوگا، کیونکہ وہ واحد منصف ہے جو واقعی "انصاف" کرتا ہے۔ اس کا اطمینان قابل دید تھا۔ جو مہر داد کو مزید بھڑکا گیا۔

"سب دفع ہو جاؤ یہاں سے، اگر کوئی اس کے قریب بھی پھٹکا، اس کا حشر اس جیسا ہی ہوگا۔ اس کا سرد لہجہ بھی کو ہراساں کر گیا تھا۔ اور محض ایک منٹ بعد وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ مہر داد نے ایک قہر آفریں، زہر خند نگاہ حیدر پر ڈالی اور اپنے کارندوں کو ہاتھ سے اشارہ کر کے پلٹ گیا، کارندے بھی مودب ہو کر اس کی تقلید میں چل پڑے، اب وہاں صرف اور صرف حیدر تھا۔

لیکن نہیں...... وہاں کوئی اور بھی تھا...... جو حیدر کی بے بسی سے، اس کی مشکل سے واقف تھا اور اس کی مشکل دور کرنے پر قادر بھی تھا۔ "اللہ! میں تجھ سے انصاف طلب کرتا ہوں، ویسے تو میں جانتا ہوں کہ میرے حال کی خبر تجھے مجھ سے بھی زیادہ ہے اور تو میرے بنا مانگے بھی انصاف کرے گا لیکن میں تجھ سے مانگ اس لئے رہا ہوں کہ یہ تیرا حکم ہے کہ مجھ سے مانگو، میں دوں گا، اگر تو میری مدد نہیں کرے گا تو اور کون کرے گا، بے شک تو ہی ہے جو ہر چیز پر قادر ہے اور جلد کی مدد کرنے والا ہے۔" اس کی آواز سرگوشی سے مشابہ تھی۔

جب ہم سب مشکل میں از حد اذیت میں، بے حد کرب میں ہوتے ہیں تو لاکھ تڑپنے کے باوجود، یہ احساس کہیں دل کی گہرائیوں کو تقویت دیتا ہے کہ ہم اکیلے نہیں...... کوئی ہے جو ہمیں دیکھ رہا ہے، کوئی ہے جو ہماری اس حال، اس تڑپ، اس اذیت سے واقف ہے۔ جس اذیت کے دوزخ کی صورت الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اس سے بھی بخوبی واقف ہے اور وہی ہے، واحد وہی ہے جو اس تکلیف کو ختم کر سکتا ہے، یہ احساس اور "آس" بن کر ہمیں دلاسہ دیتا ہے۔ ہمارے ضبط کا حوصلہ بڑھاتا ہے، اگر یہ آس بھی نہ رہے تو...... پھر کچھ بھی نہیں رہتا۔ لیکن اللہ کی ذات سے مایوس کفر ہے۔ اللہ اپنے پکارنے والے کی مدد ضرور کرتا ہے جلد یا بدیر...... لیکن وہ انسان کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا ہے۔ وہ

ہے وہی ہے جو اچھے، برے ہر ایک کو دیتا ہے، بالا آفریدی نواز تا ہے، یہی حقیقت حیدر کے ایمان میں تھی۔

☆......☆......☆

مہرداد آفریدی سے چھوٹا مہروز تھا اور اس سے چھوٹی مہرگل... اس کے والد مہران آفریدی اپنے علاقے کی ایک بارسوخ شخصیت تھے۔ اتنے بارسوخ کہ اردگرد کی ساری معزز شخصیات ان سے دبتی تھیں، مہرینہ ان کی چچازاد بھی تھیں، اور ان کو بھی وراثت میں کافی زمین ملی تھی، یوں مہران آفریدی سب سے بڑے زمین دار تھے، مہرداد پہلا بیٹا ہونے کی وجہ سے ان کا لاڈلا تھا اور مہروز اور مہرگل سے زیادہ توجہ اور محبت ملی تھی وہ بچپن ہی سے باپ کے ساتھ زیادہ رہا تھا۔ اسکول سے آ کر اس کا زیادہ وقت مہران کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ گاؤں میں پرائمری تک تعلیم حاصل کی جاسکتی تھی جو لوگ آگے جانا چاہتے تھے۔ ان کو اس کی اجازت نہیں ملتی تھی، ویسے بھی ان ''کمی کمینوں'' نے زیادہ پڑھ لکھ کر کرنا بھی کیا تھا؟

تعلیم تو صرف جاگیرداروں کا حق تھی، وقت گزرتا رہا، مہرداد اور مہروز دونوں ہی شہر میں رہنے لگے، دوسرے، تیسرے دن مہرداد گاؤں کا چکر لگالیتا تھا، آخر کو وہ سب اس کو سنبھالنا تھا، مہرگل نے محض بی اے کرنے کو کافی سمجھا تھا۔ وہ ویسی ہی تھی، جیسا کہ مہران خان آفریدی کی بیٹی اور مہرداد کی بہن کو ہونا چاہئے تھا۔ یعنی ایک خودسر، مغرور اور اوروں کو خود سے کمتر سمجھنا۔

گاؤں کی ہر لڑکی اس سے تنگ تھی کہ وہ بلاوجہ سب کو جی بھر کے ڈانٹتی تھی۔ پھر وقت نے ذرا سا کسمسا کر کروٹ لی اور مہران خان وقت کی گرد میں گم ہوگیا، باپ کی گدی بڑے بیٹے نے سنبھال لی۔ جس طرح مجنوں کو اگر صحراؤں سے لاکر شہر میں چھوڑ دیا جاتا، وہ تب بھی ''مجنوں'' ہی رہتا، اسی طرح مہران کے مرنے اور مہرداد کے آنے سے کوئی فرق نہ پڑا۔ مہرگل نے باپ کی وفات کا بہت اثر لیا تھا۔ کیونکہ وہ باپ کی لاڈلی تھی۔ اگرچہ اسے وہ توجہ نہیں ملی تھی مگر مہروز سے پھر بھی اسے زیادہ اہمیت ملی تھی۔

☆......☆......☆

اس دن وہ یونہی ٹہلنے کی غرض سے اپنے دل کو بہلانے کے خیال سے باغ میں چلی گئی۔ شفاف دھوپ مالٹے کے درختوں پر، بکھری ہوئی تھی۔ ہوا ساکت تھی۔ سناٹا ہر طرف اپنے پر پھیلائے ہوئے تھا۔ باغ میں ہو کا عالم طاری تھا۔ مالٹوں کی ترش مہک سارے میں پھیلی تھی، وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی، حیدر ایک درخت سے نیچے اتر رہا تھا، وہ درختوں پر چڑھ کر خراب پھل اتار رہا تھا اور اب نیچے اترتے ہوئے اس کی نگاہ اس حسن کے مجسمے پر پڑی اور ساکت ہوگئی... پھر نگاہ پلٹ کر نہیں آئی۔ ان پر قربان ہوگئی ہوگی۔''

اور نگاہ جب قربان ہوتی ہے تو سمجھو کہ ''سب کچھ'' قربان ہوجاتا ہے۔ اس نے خود کو اس غیر اختیاری حرکت سے باز رکھنا چاہا، مگر اس کی نگاہیں تو پلکیں تک جھپکنے کو تیار نہ تھیں وہ لاکھ کوشش کے باوجود نگاہیں پھیر نہ پارہا تھا اور جب ''نگاہ'' ہاتھ سے گئی تو ''دل'' میں ہاتھ سے گیا......اور جب ''دل'' ہاتھ سے گیا، تو پھر...... ''سب'' ہاتھ سے گیا...... پھر کچھ بھی ہمارے اپنے اختیار میں نہیں رہتا۔ کیونکہ......اگر ہم دل سے جیت جائیں، تو ہم پوری دنیا سے جیت جاتے ہیں، لیکن......اگر ہم اپنے ہی دل سے ہار جائیں، تو پھر ہم سب ہار جاتے ہیں۔

حیدر بھی صرف نگاہ سے نہیں ہارا تھا۔ وہ پوری کائنات ہار گیا تھا۔ مہرگل کو خدا نے حسن کی دولت سے بھی خوب نوازا تھا۔ یہی تو زندگی کی حقیقت ہے۔ کسی کو اللہ ''دے'' کر آزماتا ہے اور کسی کو نہ دے کر...... یہی تو اصل آزمائش ہے۔ کچھ لوگ پاکر بھی اللہ کے ناشکرے ہی رہتے ہیں اور کچھ سب کچھ کھو کر بھی اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

''کیا بات ہے؟'' مہرگل کی آواز میں ناگواری تھی۔

''کک..... کچھ نہیں۔'' وہ گڑبڑا کر رہ گیا۔ یہ تھی اس کہانی کی شروعات۔

☆......☆......☆

''میں رنگ شربتوں کا، تو میٹھے گھاٹ کا پانی.....
مجھے خود میں گھول لے تو..... میرے یار بات بن جانی.....'' مہر گل زیر لب گنگنا رہی تھی۔ چارہ لے جاتے حیدر کے قدم ٹھٹک کر رک گئے تھے۔ اس کی نگاہ اٹھی تھی اور پھر حسب معمول پلٹنا بھول گئی تھی۔ ''اے..... ادھر آؤ۔'' مہر گل نے ناگواری سے اس کو پکارا تھا۔

حیدر کا دل بے ترتیبی سے دھڑکا۔ چارے کا گٹھا وہیں رکھ کر اس نے حکم کی تعمیل کی تھی۔ ''تم مجھے گھورتے کیوں ہو؟'' اس نے تیکھی نظروں سے اسے گھورا۔

''میں گھورتا نہیں، دیکھتا ہوں جی!'' اس کی نظریں مہر گل کے چہرے پر گڑی تھیں، جیسے اس سے اہم کوئی کام ہی نہ ہو۔ ان نظروں میں محبت تھی، عقیدت تھی اور..... پرستش تھی۔

''کس نے حق دیا تمہیں، مجھے یعنی مہر گل کو دیکھنے کا؟'' لہجے میں غصے کی آنچ تھی۔

''میرے دل نے..... میری محبت نے۔'' کیسی ہمت، جرأت اور مزے سے وہ ''اعتراف جرم'' کر رہا تھا۔ یوں کہ چہرے پر ندامت کا شائبہ تک نہ تھا۔

''کیا..... آ.....؟'' وہ تحیر سے چلائی۔

''جی۔'' وہ ابھی بھی اسے دیکھ رہا تھا۔

''تم جانتے ہو، تم یہ بکواس کس سے کر رہے ہو؟ دفع ہو جاؤ ادھر سے اور آئندہ اپنی نظروں کو سنبھال کر رکھنا، ورنہ ''کچھ بھی'' دیکھنے کے قابل نہیں رہو گے۔'' مہر گل کی سیاہ آنکھوں میں طیش تھا۔

حیدر جانتا تھا، وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے، اسے دیکھنا واقعی اتنا بڑا جرم تھا کہ اس کی آنکھیں نکالی جا سکتی تھیں، لیکن کیا کیا جائے، یہی تو المیہ ہے چاہت کا کہ یہ ہمیشہ ''وہیں'' ہوتی ہے، جہاں اسے ''ہرگز بھی نہیں'' ہونا چاہئے۔

''میں آپ کے علاوہ کچھ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔''

وہ مسکرایا تھا اور اس کی یہ مسکراہٹ مہر گل کے اندر آگ بھڑکا گئی تھی اس کا دایاں ہاتھ بے ساختہ حیدر کا رخسار دہکا گیا تھا۔

اور عین اسی لمحے..... ایک آواز ابھری تھی۔ ''کیا ہو رہا ہے؟'' مہرداد نجانے کب وہاں آیا تھا۔

''لالہ!..... یہ بدتمیزی کرتا ہے۔'' اس نے حیدر کی جانب انگلی سے اشارہ کیا۔

''تیری اتنی ہمت.....؟'' مہرداد کی بھرپور ٹھوکر اس کے پہلو پر پڑی تھی، وہ لڑکھڑا کر زمین بوس ہو گیا۔

''چلو معافی مانگو۔'' مہرداد کے خاص آدمی راشد نے لاٹھی کا وار اس کی کمر پر کیا تھا۔

''کس بات کی معافی؟ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے اور اگر یہ جرم ہے بھی تو مجھے اس پر فخر ہے۔'' وہ مسکرایا تھا اور راشد مہرداد کے اشارے پر اس پر پل پڑا۔

☆......☆......☆

حیدر کا اس دنیا میں کوئی نہیں تھا، سوائے اللہ کے، ماں اسے پیدا کرتے ہی چل بسی، دو سال کا ہوا تو باپ کو سانپ نے ڈس لیا، موت کے مختلف روپ ہوتے ہیں اور اس کا ہر روپ اذیت ناک ہوتا ہے۔ جیسے..... جیسے زندگی کے کئی روپ ہوتے ہیں اور اس کا ہر روپ ہی اذیت ناک اور دلفگار ہوتا ہے..... زندگی نے حیدر کو بھی بڑی بے دردی سے برتا تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد اسے بستی کی ایک بیوہ عورت نے گود لے لیا۔ وہ بے اولاد تھی۔ وہ خان حویلی میں ملازم تھی..... اس نے حیدر کو پالا تو سہی، مگر اسے پڑھا نہ سکی، بمشکل کھانا ہی پورا ہوتا تھا۔ یوں حیدر دیگر لوگوں کی طرح واجبی سی تعلیم بھی حاصل نہ کر سکا۔ اسے بچپن ہی سے کام پر لگا دیا گیا اور وہ پندرہ برس کا تھا تو اس کی واحد ہمدرد کا بھی انتقال ہو گیا ہے۔ بے سہارا ہونے کے ناطے زندگی اس کے لئے مزید مشکل ہو گئی۔ اب اس کا اللہ کے سوا کوئی نہ تھا اور اسے اپنے اللہ پر کامل یقین تھا اور یہ ''کامل یقین'' ہی دراصل ہمارے ایمان کا جزو ہے۔ اللہ کے ساتھ ہونے کے احساس..... کتنی تقویت دیتا ہے نا! خیر..... اب پانچ

برس مزید گزر چکے تھے۔ اس دوران حیدر زندگی کی تلخیوں کا عادی ہو چلا تھا۔

لیکن..... گزشتہ دنوں اسے محبت نامی عفریت نے جکڑا تھا اور آج ..... آج وہ سنبل کے کھردرے تنے سے بندھا مر رہا تھا۔ پل پل مر رہا تھا..... اوہ.....! یہ زندگی کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے نا! اور محبت زندگی سے بھی بدتر..... بلکہ بدترین..... لوگ موت کو سفاک کہتے ہیں جبکہ محبت..... موت سے بھی کہیں سفاک ہے۔

موت ایک بار مارتی ہے۔ محبت بار بار..... ہر سانس میں، سانس سانس میں پل پل مارتی ہے۔ موت سانسیں نچوڑ لیتی ہے، محبت سانسوں میں صحرائی کانٹے، خشک ریت بھر دیتی ہے..... زندگی اور موت کے بیچ لٹکائے رکھتی ہے۔ نہ جینے دیتی ہے، نہ مرنے دیتی ہے، ہر پل..... پل پل ''جانکنی'' میں مبتلا کئے رکھتی ہے۔ سانس ہمیشہ حلق میں اٹکی رہتی ہے، کسی سخت، نوکیلے پتھر کی طرح حلق میں پھنسی، چبھتی رہتی ہے، جسے نہ تو اگلا ہی جا سکے، نہ نگلا..... موت تو جانکنی کی اس کیفیت سے، اس اذیت سے نجات دیتی ہے، اس نے حلق میں پھنسی سانس کی خشک ریت سے گھبرا کر آنکھیں موند لیں۔ لیکن..... جو اذیت ''اندر'' ہو، اس سے تو کسی طور نظریں نہیں چرائی جا سکتیں..... جانکنی کی کیفیت سے گھبرا کر اس نے پھر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی پیاسی ترسی ہوئی نگاہ آسمان پر گڑی تھی، جس کی رنگت کملا کر گول ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اس کے ہجر میں چپکے سے مر گئے ہم
تھی کمال وابستگی دل کو ہی آدمی کے ساتھ
گر جیتے کچھ دن اور تو دکھاتے نبھا کر بھی
وہ زندگی کی بات تھی، گئی زندگی کے ساتھ

''حیدر مر گیا بی بی جی۔'' ساجھی کی بات پر مہر گل کا پاپ کارن کھاتا ہاتھ لمحہ بھر کو تھما۔ ''میں آپ کے سوا کچھ دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔'' اس سرگوشی سے سجائی مترنج تھی۔ ''اونہہ.....'' اس نے سر جھٹک کر کرسٹل باؤل میں دھرے پاپ کارن سے مٹھی بھر لی۔

''اس کی لاش بہت بری حالت میں تھی جی! کھال ہڈیوں سے یوں چمٹی ہوئی تھی جیسے اسے مرے لمبا عرصہ ہو گیا ہو۔ اور.....''

''بکواس بند کرو۔'' وہ اس کی بات قطع کرتی چلا اٹھی۔ ''وہ اس قابل تھا۔ اپنی اوقات بھول گیا تھا وہ اور اوقات بھول جانے والے اسی انجام کے مستحق ہوتے ہیں۔'' وہ ساجھی کو گھور کر وہاں سے تنہا ہوتی چلی گئی۔

اسی وقت تقدیر مسکرائی تھی..... اور تقدیر کی یہ مسکراہٹ استہزائیہ تھی۔

☆.....☆.....☆

سورج ڈوب رہا تھا۔ مغربی سمت افق پر گویا کسی نے لہو چھڑک ڈالا تھا۔ پرندے اپنے گھونسلوں کو لوٹ رہے تھے۔ لیکن اس شور پہ بھی ایک ویرانی، ایک خالی پن، ایک اداسی حاوی تھی۔ تاہم اس اداسی، اس خالی پن اور اس ویرانی کو صرف وہی لوگ محسوس کرتے ہیں، جن کے اپنے دل میں اداسی نے پنجے گاڑ رکھے ہوں، خالی پن نے جن کی اپنی تمام تر خواہشیں، تمام چاہتیں نچوڑ لی ہوں، ویرانی جن کی روحوں میں بسی ہو..... رنگ و بو کی روشن دنیا کے مکینوں کو بھلا یہ سب کہاں محسوس ہوتا ہے؟

وہ دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں پھنسائے، سر جھکائے، چل رہا تھا۔ اس کی چال میں صدیوں کی تھکن تھی اور چہرہ..... اندرونی پریشانی کا غماز.....

ایک نسوانی چیخ اس کی سوچوں کے ارتکاز کو ایک دم بھٹکا گئی۔ اس نے چونک کر اردگرد کو نگاہوں سے کھنگال ڈالا، تبھی اس کی نگاہ نے ایک ریشمی وجود کو چھوا..... وہ ایک سفیدے کے تنے سے لگی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اسے لڑکی کے پاس پہنچنے میں چند سیکنڈ لگے تھے۔ لڑکی سے ذرا فاصلے پر ایک دھاری دار ناگ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا، ہاتھ بڑھایا اور ناگ کو ایک جھٹکے سے جکڑ لیا، اس نے ناگ کو کوڑے کی طرح

لہرایا اور ہاتھ گھما کر دور پھینک دیا۔ ''چلئے! میں آپ کو گھر تک چھوڑ دوں۔''

لڑکی کی ڈری ڈری سی کیفیت دیکھ کر اس نے کہا۔

''ج..... جی!'' وہ ایک طرف چل پڑی۔ اس کا خوف قدرے زائل ہوا تھا۔ ''آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟'' لڑکی نے یقیناً اس کو مخاطب کیا تھا۔

''جی میں یونہی گھومتے گھومتے ادھر آ نکلا، ویسے مجھے احمر کہتے ہیں۔''

''میں مہر گل ہوں۔''

''میں اکلوتا ہوں، پاپا! بزنس مین ہیں، لیکن میں ابھی فارغ ہوں۔'' وہ اسے اپنے بارے میں مزید بتانے لگا۔ مہر گل کی حویلی تک پہنچتے تک دونوں پرانے دوستوں کی طرح باتیں کررہے تھے۔ کل پھر ملنے کا وعدہ کرکے وہ رخصت ہوگیا۔

مہر گل گھر میں داخل ہوتے وقت احمر ہی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ بلا کی سحر انگیز شخصیت رکھتا تھا وہ چھا جانے والی شخصیت..... پرکشش لب ولہجہ مخاطب کو اپنے حصار میں جکڑ لیتا تھا۔

اگلے چند دن میں وہ تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ گویا دنوں کا نہیں، برسوں کا ساتھ ہو، ہوتے ہیں نا کچھ لوگ ایسے کہ جن سے مل کے لگتا ہے کہ یہ تو ہمارے اپنے ہیں، اور دل کا کوئی گوشہ جو ہمیشہ سے خالی تھا، ان کے آنے سے وہ خلا بھر گیا ہے، کچھ ایسا ہی مہر گل کے ساتھ ہوا تھا۔ لیکن وہ مطمئن نہیں تھی کہ احمر کو پالے گی۔ وگرنہ اس سے جدائی کا احساس ہی اس کی سانسیں اٹکائے دیتا تھا۔ ان دنوں گھر میں اس کی شادی کی باتیں چل رہی تھیں۔ تین چار رشتے بھی زیرغور تھے۔ مگر..... ظاہر ہے فیصلہ اس کی اپنی مرضی سے ہونا تھا اور اسے یقین تھا کہ مہر داد اللہ کو احمر پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ احمر کے والد کا بزنس بیرون ممالک میں بھی پھیلا تھا۔ فیملی بھی اچھی، غرض ہر لحاظ سے وہ ان کے ہم پلہ تھا۔

☆ ☆ ☆

جب بھی زخم اتنے گہرے ہوں کہ جن کی گہرائی کا ہمیں خود بھی اندازہ نہ ہو، ان کے لئے سچائی کسی کام کی نہیں..... ان زخموں کو بھرنا ہی نہیں ہوتا، پھر ہم لاکھ کوشش کرتے پھریں، وہ زخم ناسور بن جاتے ہیں۔ صدیوں بعد بھی ''تازہ'' رہتے ہیں۔

''احمر!'' اسے مہر گل کی آواز سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی۔ اس نے بغور مہر گل کے پرکشش چہرے کو دیکھا تھا۔ یہ چہرہ، یہ چہرہ اسے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔ یہ سیاہ..... تاریک..... بے حد تاریک سمندر کی سی آنکھیں اس کے لئے بے حد ''اہم'' تھیں۔ پہلی بار جب اس نے مہر گل کی سیاہ آنکھوں کو سیاہ سمندر سے تشبیہ دی تھی تو وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

''احمر، مہر داد لالہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' مہر گل کی نظریں زمین پر گڑی تھیں، ورنہ احمر کے چہرے کا اتار چڑھاؤ یقیناً دیکھ لیتی۔

''تم کیا چاہتی ہو؟'' اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ یعنی اب وقت آگیا تھا۔ یعنی اب ''اصل'' وقت آگیا تھا..... ''مم..... میں..... تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''لیکن میں ایسا نہیں چاہتا۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا بولا تھا۔

مہر گل نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا..... یہ کیا کہہ رہا تھا وہ؟ ''کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟'' اس کے لہجے میں حیرانی کے سوا کچھ نہ تھا۔

''کرتا ہوں، میں نے اگر دنیا میں، اپنی زندگی میں کسی سے محبت کی ہے، تو وہ صرف مہر گل ہے۔'' اس کے انداز میں، اس کی آواز میں، اس کے لہجے میں، اس کی آنکھوں میں اور..... اس کے چہرے پر ''سچ'' رقم تھا.....

''تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مگر شادی نہیں کرنا چاہتے لیکن کیوں..... ؟'' مہر گل کی سوالیہ نظروں کا مرکز احمر کا چہرہ تھا۔

''جس سے محبت ہو، ضروری تو نہیں کہ اس سے

شادی بھی ہو جائے۔" اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔
"لیکن یہ ممکن ہے احمر!" وہ پر یقین تھی۔
"یہ ممکن نہیں۔" وہ جواباً چلایا تھا۔
"تو پھر میں مہر داد لالہ کی مرضی سے شادی کرلوں؟"
"ہرگز نہیں" وہ بے ساختہ بولا تھا۔
"تم کسی اور کو کیسے قبول کرسکو گی؟" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا وہ واقعی اور کسی کو سوچ بھی نہ سکتی تھی۔
"تم مجھ سے محبت کرتے ہو، مگر شادی نہیں کرنا چاہتے، میں کسی اور سے شادی کروں، یہ بھی نہیں چاہتے، تو پھر آخر تم چاہتے کیا ہو؟" وہ جھلا اٹھی، اس کی سیاہ آنکھیں اب پانیوں سے بھرتی جا رہی تھیں۔
"میں کیا چاہتا ہوں؟ میں چاہتا ہوں مہر گل آفریدی! کہ......
اللہ کرے! جہاں کو میری "یاد" بھول جائے
اللہ کرے! کہ "تم" کبھی "ایسا" نہ کرسکو
"میرے سوا" کسی کی نہ ہو تم کو "آرزو"
"میرے سوا" کسی کی "تمنا" نہ کرسکو......"
"کیا مطلب؟" وہ نہیں سمجھی تھی۔ وہ واقعی کچھ نہیں سمجھی تھی۔ "مطلب صاف ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ تم ہر وقت، ہر لمحہ، ہر دھڑکن، ہر سانس صرف اور صرف مجھے سوچو، صرف اور صرف مجھے چاہو۔" خواہش شدید ترین تھیں اور آنکھیں مصر تھیں کہ ایسا ہی ہو......
"تو احمر ایسا تو ہو چکا ہے، ہر وقت ہر لمحہ میری سوچ تمہارے ہی خیال کا طواف کرتی ہے، میری ہر دھڑکن، ہر سانس تمہارے ہی نام کا ورد کرتی ہے احمر!" وہ سر جھکا کر اعتراف کرگئی۔ لہجے میں بھرپور بے بسی تھی۔ "احمر نہیں مہر گل! حیدر۔" اس نے مہر گل کی سماعتوں میں "صور" پھونکا تھا اور صور پھونکے جانے کے بعد تو قیامت ہی آتی ہے۔ سو...... "کک کیا؟" اس کا انداز ذرا ڈرا سا تھا۔ اس نے دیکھا اور...... اور دیکھتی ہی رہ گئی۔
احمر کا چہرہ حیدر کے چہرے میں ڈھل چکا تھا۔ اس کی سرمئی آنکھیں حیدر کی بھوری آنکھوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ اس کی گلابی مائل سفید رنگت حیدر کی گندمی رنگت میں مدغم ہو چکی تھی اور اس کی فرنچ کٹ، حیدر کی چند دن کی بڑھی ہوئی شیو میں...... اس کے سامنے احمر نہیں، حیدر تھا......
وہ حیدر جو کہ مہینوں قبل مر چکا تھا۔
"ت...... تم؟" بے یقینی اس کے لہجے میں بکھری تھی۔
"ہاں مہر گل...... میں حیدر...... وہ حیدر...... جو آج سے چھ ماہ، ستائیس دن پہلے مر چکا ہے اور جس کے مرنے سے تمہیں ذرا بھی...... ذرہ بھر بھی فرق نہیں پڑا تھا۔" اس کے انداز و آواز میں، لہجے میں عجیب سا درد اتر آیا تھا۔ "ہم جس کے لئے جان سے گزر جائیں اور وہ لمحہ بھر بھی ہمارے بارے میں نہ سوچے، درد تو ہوتا ہے نا!" وہ اس کے شفاف چہرے پر نگاہ جمائے بول رہا تھا۔ اس چہرے پر جہاں حیرت میں اب شکست و ریخت مدغم ہو رہی تھی۔ "میں نے ہمیشہ صبر کیا...... اور میں نے سنا تھا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر کا اجر وہ خود کہتا ہے، کب حساب دوں گا اور میں نے مہر گل!...... میں نے اس سے صبر کا اجر مانگا...... اپنی مرضی سے مانگا...... اور اس نے مجھے اجر دیا...... جب ہم مزدوری کرتے ہیں تو اجرت ہمارا حق ہے۔ اسی طرح جب ہم صبر کرتے ہیں تو اجر ہمارا حق ہے، یہ اور بات کہ یہ اجر ہمیں جلدی اس دنیا میں ملے، یا پھر آخرت میں، روز محشر...... بات پھر وہی کہ جتنا زیادہ صبر، اتنا زیادہ اجر۔" اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ اس کی آنکھیں پہاڑوں سے اوپر...... کہیں دور مرکوز تھیں۔
اس کے لہجے کے گرد اذیت دھیرے دھیرے حصار باندھ رہی تھی...... بھوری آنکھوں کے "خالی پن" کی تہوں میں ہولے ہولے کرب کروٹیں لینے لگا تھا۔ مہر گل دم بخود تھی......

☆......☆......☆

میں نے جب سے ہوش سنبھالا، محبتوں کے لئے

خود کو ترستے ہی پایا۔ وہ عورت جس نے میری پرورش کی، سب سمجھتے ہیں کہ اس کا رویہ میرے ساتھ محبت و شفقت آمیز تھا۔ مگر ...... یہ غلط ہے۔ حقیقت صرف خدا جانتا ہے کہ اس نے مجھے صرف اس لئے اپنے پاس رکھا کہ اسے کسی کام کرنے والے کی ضرورت تھی۔ اور میں نے باہر کے علاوہ گھر کا بھی ہر کام کیا ...... اس کے باوجود ڈانٹ پھٹکار اور مار ہی میرے حصے میں آئی۔ بات بات پر مفت روٹیاں توڑنے کا طعنہ ...... میں نے کئی بار گھر سے بھاگ جانے کا سوچا، مگر پھر یہ سوچ کر صبر کیا کہ میں اگر اس حالات کی ماری عورت کا غصہ سہہ لوں گا تو مجھے اللہ کا غصہ نہیں سہنا پڑے گا۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ جو حالات کے تھپیڑے، وقت کے طمانچے کھاتا ہے، اسے اللہ رب العزت کا غصہ نہیں دیکھنا پڑتا۔ اسے اللہ کا غضب نہیں جھیلنا پڑتا۔ ...... اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے، وہ جو سب سے بلند، سب سے بڑا، سب سے قوی ہو، کیا ہم سے کوئی بھی اس کے غضب، اس کے غصے کا ایک ذرہ سہنے کی بھی طاقت ہے؟...... نہیں ...... ہرگز ہرگز نہیں۔ ہم سب مل کر بھی اس کے غضب کا ایک ذرہ سہنے کی طاقت نہیں رکھتے اور اگر ہم وقت کی ''بے رحمی'' حالات کی ستم ظریفی جھیل چکے ہوں، تو پھر اللہ کی رحمت ہمارا حق ہے۔ وہ جو بے حد رحیم ہے۔ رحمان ہے۔ کریم ہے۔ ...... اس کی رحمت بے پناہ ہے۔ ہماری سوچ کی حدود سے بھی کہیں بالاتر ......

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ جو حالات کی بے رحمی، زمانے کی بے رحمی سہہ چکا ہو، اللہ اس پر ''رحم'' کرتا ہے۔ لیکن ...... شرط صرف یہ ہے کہ وہ وقت و حالات و زمانے کی بے رحمی کا ''واویلا'' نہ کرے۔ بلکہ اس پر ''صبر'' کرے ...... رونا چلانا، حالات کے شکر کرنا، زمانے کی بے نیازی کے گلے، اور جب ایسا کر کے بندہ تھک جائے تب چپ ہو جانے کو صبر نہیں کہتے ...... رو کر چلا کر تو ہر کوئی چپ ہو ہی جایا کرتا ہے۔ کیونکہ چپ ہونا ہی پڑتا ہے۔ صبر وہ ہے جو ''خاموش'' رہ کر کیا جائے۔ ہر دکھ، ہر زیادتی، ہر ستم کو چپ چاپ ''پی'' جانے کی کیفیت کو صبر کہتے ہیں۔ ہر دکھ، ہر تکلیف کے وقت یہ خیال ذہن و دل میں ہو کہ ''اللہ دیکھ رہا ہے اور وہی ہے جو ''قادر'' ہے۔ اگر اس نے اس دکھ کو ہمارے مقدر میں لکھا، تو یقیناً اس میں ہماری ہی بھلائی ہوگی۔ یہ دکھ اللہ کی رضا سے ہمیں ملا ہے اور ...... اللہ اگر ہم سے یہ چاہتا ہے تو بلاشک وہ ہمارے ہی بھلے کے لئے ہے۔ ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں، اللہ سے نہیں بھاگ سکتے اور کیا کوئی ایسا ہے جو اللہ کے مقابلے میں ہماری مدد کر سکے؟ ہرگز نہیں ...... تو پھر لوگوں کے آگے حالات کا رونا رونے کا فائدہ ......؟

لوگوں کے آگے رونے والے ''رسوائی'' پاتے ہیں اور ''اللہ'' کے آگے رونے والے ''بھلائی'' پاتے ہیں۔ ہر دکھ اللہ سے کہو، رونے کے لئے ''سجدے'' سے بہتر کوئی جگہ نہیں ...... دکھ زیادہ ہوں، تو آنسو نہ چاہتے ہوئے بھی چھلک پڑتے ہیں، مگر آنسوؤں کے درمیان اللہ سے شکوے نہیں کرنے چاہئیں ...... صرف اس سے مدد اور صبر مانگنا چاہئے۔ وہ واحد ہے جو اپنے در سے کسی کو خالی ہاتھ نہیں لوٹاتا ...... اس کا وعدہ ہے کہ وہ ہماری دعاؤں کو قبولیت بخشے گا۔

ارشاد ربانی ہے۔ ''تم دعا مانگو، میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔'' تو کیا اللہ بھلا اپنے وعدے سے پھر سکتا ہے؟ ناممکن ...... ہاں! قبولیت کی صورتیں مختلف ہیں۔ یا تو دعا اسی وقت قبول کر لی جائے گی یا اس کے بدلے میں کوئی سانحہ، کوئی حادثہ ہم سے ٹال دیا جائے گا، یا پھر وہ دعا آخرت کے لئے ذخیرہ کر لی جائے گی۔ جس کے بدلے میں اس دن ...... یعنی یوم حساب، ہمارے گناہ مٹا دیئے جائیں گے۔

غرض دعا کی قبولیت میں جس قدر تاخیر ...... اسی قدر فائدہ ...... دعا قبول نہ ہو تو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ اس بات کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اللہ برتر نے اسے قبول کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اور اللہ بے شک اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ''

میں نے بھی ہمیشہ اسی بات کو ذہن میں رکھا۔ پھر

میری منہ بولی ماں مرگئی...... میں انسانوں کے بیچ اکیلا رہ گیا۔ وہ بے شک مجھ سے لڑتی تھی مگر پھر بھی وہ میرے لئے سایہ تھی۔ میں نے خان حویلی کے مکینوں کے طنز، طعنے، نشتر، گالیاں اور پٹائی سہی...... جو ذرا ذرا سی بات پر...... پھر میری زندگی میں تم آ گئیں...... میں نے تمہیں پہلی بار نہیں دیکھا تھا۔ مگر اس کے باوجود اس دن پہلی بار ہی دیکھا تھا۔ محبت گھات زدہ شکاری کی طرح جست لگا کر مجھ پر حملہ آور ہوئی تھی اور چھپ کر، گھات زدہ اور ہمیشہ ناقابل تلافی ہوا کرتا ہے...... اس وار سے ہم "بچ" بھی نہیں سکتے...... کیونکہ یہ وار ہمارے "وہم و گمان" کی سرحدوں سے بھی کہیں پرے ہوتا ہے...... میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں نے کبھی تمہیں پانے کی تمنا نہیں کی۔ بس صرف اتنا چاہا کہ کبھی کبھار تمہیں دیکھ لیا کروں اور تمہارے دل میں تھوڑی سی جگہ......

پھر کیا ہوا؟ مجھے عالم بے بسی میں سنبل سے متصل کر دیا گیا۔ پیاس، بھوک، نقاہت، اور مزید احساس کہ جس ہستی کے لئے میں یہ سب سہنے پر مجبور ہوں، اسے میرا ذرہ بھر بھی احساس نہیں، یہ احساس موت سے پہلے ہی ہمیں مارتا ہے اور پل پل مارتا ہی رہتا ہے، یہ احساس کہ ہماری ہر سانس، ہر دھڑکن کا جس کے نام کا ورد کرتی ہے، اسے ایک پل کی فرصت نہیں ہمارے لئے...... ہم جس کے لئے "زندگی" گنوا کر موت قبول کر رہے ہیں اس کی زندگی کا ایک پل بھی ہمارا نہیں، بہت تکلیف دیتا ہے یہ احساس...... لیکن بعض اوقات ہم کسی عام سے انسان کو کسی "دیوتا" کا درجہ دے کر مسلسل اس کی پرستش کئے جاتے ہیں۔ لیکن ہم بھول جاتے ہیں کہ ہم نے اس کو "دیوتا" بنایا ہے تو ہم کو اس دیوتا کا "قہر" بھی سہنا پڑے گا۔ بھلا پتھر کے مجسمے کب کسی درد کو محسوس کر پاتے ہیں؟ میں نے بھی تمہیں دیوی بنایا اور نتیجتاً وہی ہوا جو ہونا تھا......

جب میں مر رہا تھا...... اس لمحے اس آخری لمحے میں نے اللہ سے اپنے صبر کا اجر مانگا...... میں نے اپنے صبر کا اجر اس صورت میں مانگا کہ اس دیوی کو پتھر سے پگھلا کر...... انسان بنا دے...... درد کو محسوس کرنے والا انسان...... اور جب میں مر رہا تھا تو یہ احساس موت کو مزید جان لیوا بنا رہا تھا کہ میری موت کا تمہیں ذرا بھی افسوس نہیں...... تمہیں ذرا بھی فرق نہیں پڑتا...... اور تمہارے اس فرق "نہ پڑنے" سے مجھے "بہت فرق" پڑ رہا تھا......

غرض میں نے بہت تکلیف سہی...... اور یہ بھی صحیح ہے کہ جتنا زیادہ دکھ، اتنی زیادہ خوشی...... میں نے کہیں پڑھا تھا یہ جملہ اور میں نے سوچا تھا کہ ایسا کیسے ممکن ہے؟ مگر یہ میں جان گیا ہوں کہ ایسا ممکن ہے، مرتے وقت میں میرے ذہن میں یہ جملہ در آیا اور میں نے سوچا کہ بھلا مرنے کے بعد مجھے کیسے خوشی ملے گی...... کہ محبت کی خوشی اس بات میں ہوتی ہے ناکہ محبوب اس کی محبت میں مبتلا ہو جائے جس طرح انسان محبت کو اپنے دل سے نہیں نکال سکتا، اسی طرح...... ٹھیک اسی طرح اس خواہش کو بھی نہیں نکال سکتا، یہ دونوں چیزیں فطری ہیں۔

اور تبھی میرے ذہن میں آیا کہ صبر کا اجر تو ملے گا ہی، مگر اجر کی صورت تمہاری محبت مانگ لی جائے...... اور میں نے یہی کیا...... میں نے اللہ سے یہی دعا مانگی کہ میرے سوا کسی کی نہ ہو تم کو آرزو، میرے سوا کسی کی تمنا نہ کر سکو...... میں نے ٹوٹ کر خواہش کی کہ تمہاری سانس سانس میں میری محبت شامل ہو جائے...... میں نے اللہ سے مہلت لی...... اور احمر کے روپ میں یہاں آ گیا۔"

ہوا ہولے ہولے سرسرا رہی تھی، وقت لمحوں کی صورت بہہ رہا تھا، حیدر قدرے توقف سے پھر گویا ہوا۔

"میں جب دوبارہ یہاں آیا تو یہ عزم لے کر آیا تھا کہ......

رسم فریاد، پھر کریں زندہ
"آؤ! پھر پتھروں کے دل چیریں۔"

اور میں نے پتھر کی ایک مورت کا دل چیرنا چاہا تھا اور پتہ ہے کیا؟ میں نے اس مورت کا پتھر دل چیر لیا...... اب میں کہہ سکتا ہوں کہ "گو کہ ہم فرہاد نہ تھے، لیکن اس کو راہ پر لائے ہیں۔

ہم نے اس کے پتھر دل سے پیار کی نہر نکالی ہے۔"

اور کسی پتھر دل سے پیار کی نہر نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔" وہ مسکرایا۔ وہ درد میں ڈوبی مسکراہٹ تھی، وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کسی پتھر دل سے پیار کی نہر نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ اس میں مسلسل کوشش کی ضرورت ہے۔ پیہم کوشش..... اور اس کوشش میں مسلسل خود اپنا لہو پینا پڑتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے آبلہ کا کانٹوں پر چلنا اور چلتے ہی چلے جانا، یا پھر بنا کسی سہارے، بنا کسی ناؤ کے، خالی ہاتھ سمندر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جانا یا پھر تاحد نگاہ بکھرے کانچ کے نوکیلے ٹکڑوں کو اپنی لہولہو پوروں پر چننا..... ان سب کی منزل آسان نہیں..... کوئی معجزہ ہی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہم صورت فرہاد، مسلسل کوشش سے منزل تک پہنچ تو جاتے ہیں مگر..... منزل کسی اور کا مقدر دیکھ کر اسی شیشے سے اپنی زندگی ختم کر بیٹھتے ہیں۔ حیدر پھر بھی خوش نصیب تھا کہ مرنے کے بعد ہی سہی، اس نے اپنی منزل پالی تھی، اس نے چاہا تھا کہ پتھر کی مورت "دل" بن جائے..... دل جو سب سے زیادہ درد محسوس کرتا ہے۔ اور پتھر کی وہ مورت قلب میں ڈھل گئی تھی..... درد محسوس کرنے والا قلب..... اور درد جب محسوس ہوتا ہے تو تکلیف تو ہوتی ہے..... اور جب تکلیف ہوتی ہے تو پل پل جان نکلنا ہوتی ہے..... میں جا رہا ہوں۔" حیدر نے کہا۔

اور پھر مہر گل کا دل کسی نے تلوار کی نوک سے گھسیٹا۔ "مجھے..... چھوڑ کر مت جاؤ۔" وہ سراپا التجا بن گئی۔ جانے والے کو مگر جانا تھا.....

"تم جانتی ہو، اب یہ ممکن نہیں۔" اس نے پلکیں کرب سے میچی تھیں۔

"لیکن میں کیسے رہوں گی؟" وہ ہراساں تھی۔

جن سے محبت ہو، جو ہر سانس میں شامل ہوں، جو خون بن کر شریانوں میں دوڑتے ہوں، جو روح کی گہرائیوں میں بستے ہوں، جن سے جدائی کا تصور ہی سانسوں میں "دوزخ" دہکا دے، ان کے بغیر رہنا پڑے تو یہی حالت ہوا کرتی ہے..... سانس پھر ہمیشہ حلق میں صحرا کی خشک ریت بن کر اٹکی رہتی ہے..... جیسے کوئی حلق میں نوکیلا پتھر پھنسا دے۔ لیکن..... درحقیقت سانس ہی نوکیلا پتھر بن جاتی ہے۔ اور "جانکنی" کا یہ عالم..... آخری سانس تک طاری رہتا ہے، اور سانسوں پہ بھاری رہتا ہے.....

لوگ موت کو سنگدل اور سفاک کہتے ہیں، لیکن مہر گل! موت تو بہت مہربان شے ہے۔ یہ تو زندگی کی تلخیوں سے نجات دلاتی ہے اور لوگ محبت کو ایک خوب صورت اور دلفریب شے سمجھتے ہیں، مگر..... درحقیقت محبت تو موت سے بھی سفاک ترین ہے۔

موت ایک بار مارتی ہے اور محبت آخری سانس تک، ہر سانس میں بار بار مارتی ہے، ہمیشہ جانکنی میں مبتلا کئے رکھتی ہے..... ایسے میں انسان بے اختیار موت کی تمنا کرتا ہے۔ لیکن دراصل وہ نجات چاہتا ہے۔ بھلا جانکنی سے کون نجات نہ چاہے گا؟ محبت صبر کرنا سکھاتی ہے اور صبر بہت اچھی شے ہے۔ صبر اللہ کے پیاروں کا شیوہ ہے۔

جو صبر کرتا ہے، وہ جان لیتا ہے کہ صبر کا اجر اس قدر زیادہ کیوں ہے؟ اور میں خوش ہوں کہ مجھے میرے صبر کا اجر مل گیا ہے....." وہ بولتے بولتے ایک دم چپ ہوا تھا۔

مہر گل نم آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑے ہوئے تھی۔

"تم اب ساری زندگی اور کسی کو دل میں جگہ نہیں دے سکو گی اور جب دل میں کسی کو جگہ نہیں دے سکو گی تو زندگی میں بھی کسی کو جگہ نہیں دے سکو گی، کیونکہ..... تمہیں تمہارا دل اس کی اجازت نہیں دے گا، تمہیں میری محبت اس کی اجازت نہیں دے گی۔ تم ساری زندگی تنہا گزارو گی، میرے بغیر....." اس کا لہجہ سچائی کا غماز تھا۔

"میں خود کو ختم کرلوں گی۔ میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر....." بے قراری اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

"ہرگز نہیں..... اس طرح تم ہمیشہ کے لئے اللہ کے ہاں نامراد ٹھہرو گی، بامراد وہی رہتے ہیں جو صبر

کرتے ہیں، یاد رکھنا، خودکشی کی معافی بالکل بھی نہیں ..... ہر گناہ کی معافی ہے۔ لیکن ..... اس کی نہیں... کیونکہ گناہ خواہ کیسے ہی ہوں، شرک ہو، کفر ہو، معافی کی گنجائش ہے کہ بندہ توبہ کرلے تو وہ "توبہ" قبول کرلیتا ہے۔ لیکن خودکشی کی معافی نہیں.... کیونکہ "موت کے بعد" توبہ قبول نہیں ہوتی۔ سو مہر گل! تمہیں زندہ رہنا ہے، اگر آخرت کی زندگی میں سکون چاہتی ہو، تو اس فانی زندگی میں "بے سکونی" کو قبول کرلو۔ اس میں عافیت ہے... خیر... تمہاری مرضی میرے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔ اتنی ہی مہلت ملی تھی۔

"مم..... میں کیسے رہوں گی؟" وہ گھبرا گئی۔

"اللہ حافظ.....!"

"پلیز... مت جاؤ....." سیاہ آنکھیں سمندر بنی التجا کررہی تھیں۔

"اب یہ ممکن نہیں....."

اب ہم کو ڈھونڈنے کا تکلیف نہ کیجئے
ہم کھو گئے! کہ آپ کا ملنا محال ہے.....!

وہ مسکرایا تھا۔ وہ لہولہو مسکراہٹ تھی۔ دل کو چیر دینے والی.... آنکھوں میں خون بھر دینے والی... درد نے اپنے استخوانی، نوکیلے ہاتھ میں مہر گل کا دل جکڑ کر پوری قوت سے مسل ڈالا تھا۔ اس کا دل تڑپا تھا اور پوری شدت سے تڑپا تھا۔ پھر جب گوشت و پوست کے قالب میں ڈھلا تھا تو یہ درد تو لازم تھا۔ "اللہ حافظ.....! میں تمہارا انتظار کروں گا، مگر..... تمہیں "اچھی حالت" میں اپنے پاس آنے کا۔" حیدر کا وجود دھندلانے لگا اور دھندلاتے دھندلاتے بالآخر تحلیل ہوگیا۔ حیدر چلا گیا۔

اور درد تکلیف کرب، اذیت اور تڑپ باقی رہ گئی۔

"محبت" باقی رہ گئی..... "جانکنی" باقی رہ گئی..... وہ جانتی تھی کہ اب اسے آخری سانس تک یہ جانکنی جھیلنی ہے اور ہمیں یہ جانکنی ہر حال میں جھیلنی ہی پڑتی ہے۔ یہ بے بسی کا عالم ہی تو ہمیں احساس دلاتا ہے کہ محبت اور زندگی آسان نہیں..... اور مصائب کو جھیلنے والا ہی فلاح پاتا ہے.....

حیدر چلا گیا تھا۔ مگر... اسے صبر سکھا گیا تھا۔

اسے اگر صبر کا اجر مل گیا تھا تو مہر گل کو بھی صبر کا اجر ملنا ہی تھا۔ وہ صبر جو وہ پل پل اذیت جھیل کر، تادم آخر، زندگی اور موت کے بیچ معلق رہ کر کرتی۔

اگرچہ یہ پہاڑ سی زندگی گزارنے کا تصور ہی اس کا کلیجہ بھر چھ دیتا تھا، مگر... اسے یہ مصائب و آرام، آزمائش اور تڑپ کا یہ پہاڑ عبور کرنا ہی تھا۔ کہ اسے صبر کے جال میں حیدر قید کر گیا تھا۔ اور یہ جال اس قدر سخت تھا کہ روح تک جسم کے زندان میں بے قرار ہو کر پھڑ پھڑا اٹھی تھی۔ اس جال کی گرفت، شکنجہ، جس قدر سخت ہوگا، اسی قدر درد ہوگا اور جس قدر درد ہوگا اسی قدر صبر کرنا پڑے گا... اور جتنا صبر، اتنا اجر... مہر گل اب اس جال سے رہائی چاہتی بھی نہ تھی کہ اسے اس جال میں حیدر نے جکڑا تھا۔

بلا کی بدگمانی تھی، میرے صیاد کو مجھ سے
"ذبح" کے بعد بھی اس نے میرے کس کس کے
"پر" باندھے......!

اور اسے آئندہ زندگی اسی طرح بندھے ہوئے پروں کے ساتھ گزارنا تھی..... کیونکہ "وہ ہتھیلیوں کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اٹھی اور گھر کی سمت چل پڑی۔ اس کے قدموں سے صدیوں کی شکست، صدیوں کی تھکن لپٹی تھی۔ اسے اب ہمیشہ جانکنی کے عالم میں رہنا تھا۔ مگر.... ایک پرامید مسکراہٹ اس کے بھیگے ہونٹوں کو چھوگئی۔ "کیونکہ..... کیونکہ جتنی زیادہ تکلیف، اتنا زیادہ صبر..... اور جتنا زیادہ صبر اتنا ہی زیادہ اجر....."

اور اسے بھی "صبر کا اجر" اللہ سے حیدر کی صورت مانگنا تھا۔ اور بے شک اللہ بہترین اجر دینے والا ہے......

اللہ ہماری چھوٹی چھوٹی نیکی بھی ضائع نہیں کرتا۔ معمولی سا عمل بھی سنبھال کر رکھتا ہے۔ اور بہترین اجر سے نوازتا ہے اور صبر تو بذات خود بہترین عمل ہے۔

اور اللہ اچھے اعمال کا بہترین صلہ دیتا ہے۔ تو پھر..... جتنا زیادہ صبر... اتنا زیادہ اجر... !!

انگارے

شہزادہ چاند زیب عباسی

قسط نمبر: 03

دل گرفتہ دل شکستہ ناقابل فراموش ناقابل یقین سے دو چار عجیب و غریب حیرت سے روشناس کراتی تحیر انگیزی میں سب سے آگے خوفناک وادی کے نشیب و فراز میں دندناتی اور ذہن سے محو نہ ہونے والی شاھکار کہانی۔

حیرت و خوف کے گرداب میں غوطہ زن اپنی مثال آپ تحیر انگیز ایڈونچر کہانی

سلمان کی گندمی رنگت سیاہی مائل ہو چکی تھی اب وہ کوئی سیاہ فام حبشی دکھائی دیتا تھا۔

''اب تمہارا نام جوزف ہے اور کوشش کرنا کہ انگلش کے علاوہ کسی دوسری زبان میں کسی سے گفتگو مت کرنا۔'' حیدر علی نے اسے تنبیہ کیا۔ ناک کے نتھنوں میں اسپرنگ اور زیرو نمبر کے چشمے نے اس کی شخصیت کو یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ پھر حیدر علی نے اپنا اور اپنے ساتھیوں کا ریڈی میڈ میک اپ کیا پھر اپنا ضروری ساز و سامان لے کر وہاں سے نکل گئے۔

سلمان اس وقت مسافر بس میں موجود تھا۔ حیدر علی پچھلی نشست پر تھا۔ جبکہ ناصر اور غلام مصطفیٰ ان سے الگ دوسری گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ ان کے درمیان یہی طے ہوا تھا کہ وہ دو افراد کی الگ الگ ٹولیوں میں مختلف گاڑیوں میں راجستھان پہنچیں گے اور دوران سفر ایک دوسرے سے الگ رہیں گے۔ تاکہ اگر ان میں سے کوئی پکڑا جائے تو دوسرے محفوظ رہیں۔

سلمان بھائی کے گھر سے نکلتے ہی وہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں شفٹ ہو گئے تھے وہاں سے وہ دوسرے روز ہی راجستھان کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔

سلمان کھڑکی سے باہر گزرنے والے نظارے دیکھنے کے ساتھ ساتھ گاہے بہ گاہے بس کے دیگر مسافروں کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اس کے برابر ایک گٹھے ہوئے جسم کا نوجوان بیٹھا ہوا تھا۔ جو کسی انگلش میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا۔ بس اس وقت ایک پہاڑی علاقے سے گزر رہی تھی۔

اچانک سلمان چونک پڑا دور سے ایک ناکہ نظر آ رہا تھا۔ سڑک کے دونوں اطراف پولیس اہلکار چوکنے کھڑے تھے۔ سلمان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ میک اپ میں ہونے کے باوجود اسے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں وہ پہچان نہ لیا جائے۔ اس نے سر گھما کر پچھلی نشست پر موجود حیدر علی کو دیکھا جو بظاہر مطمئن بیٹھا تھا۔ اسے اطمینان سے بیٹھے دیکھ کر سلمان کو تسلی ہوئی اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

ناکہ پر ملنے والے اشارے پر بس ڈرائیور کو بس روکنا پڑی۔ بس رکتے ہی سلمان کو اپنے اعصاب میں تناؤ سا محسوس ہوا۔ بس کے رکتے ہی ایک پولیس انسپکٹر دو سپاہیوں کے ساتھ بس میں چڑھا اور مسافروں کے سامان کی تلاشی لی جانے لگی۔ سلمان کا دل انجانے خدشات کے تحت تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ اسے یہی خدشات لاحق ہو گئے تھے کہ کہیں اسے پہچان نہ

لیا جائے۔

پولیس اہلکار دیگر مسافروں کی تلاشی لینے کے بعد اب اس کی طرف آ رہے تھے۔ مگر خیریت گزری انہوں نے سـن کو سرسری نگاہوں سے دیکھا اور اس کے بیگ کی تلاشی لینے کے بعد آگے بڑھ گئے پھر کچھ دیر بعد انہوں نے بس کے تمام مسافروں کی تلاشی لینے کے بعد بس کو آگے جانے کی اجازت دے دی۔

سـن نے محسوس کیا کہ اس کے برابر بیٹھا شخص اسے غور سے دیکھ رہا ہے اسے اس کی ٹٹولتی نگاہوں سے الجھن سی ہونے لگی تھی۔ لیکن وہ بظاہر لاپروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس شخص نے کچھ دیر بعد اسے کھنکار کر متوجہ کیا اور کہا۔ ”میرا نام اشوک کمار ہے اور میں پریس رپورٹر ہوں۔“

سـن کو بھی مجبوراً اپنا تعارف کرانا پڑا۔ ”میں جوزف ہوں۔“

”آپ کرتے کیا ہیں؟“ اشوک کمار نے پوچھا۔ ”میرا تعلق کینیا سے ہے اور وہاں ہمارے چائے کے باغات ہیں اور میں سیاحت کی غرض سے انڈیا آیا ہوں۔“ سـن نے انگلش میں جواب دیا۔

”اگر آپ سیاحت کی غرض سے آئے ہیں تو راجستھان کی طرف کیوں جا رہے ہیں۔ وہاں تو کوئی تفریحی مقام نہیں۔“ اشوک کمار نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے اگلا سوال داغ دیا۔

”مجھے ریگستان دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ اسی لئے وہاں جا رہا ہوں۔“ سـن نے اس بار ناگوار لہجے میں جواب دیا۔ اسے اس صحافی کے سوالات سے الجھن ہو رہی تھی۔ منزل مقصود تک پہنچتے پہنچتے وہ شخص سـن کو اپنی فضول باتوں سے بیزار کر چکا تھا۔

بس سے اترتے ہوئے سـن نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی اس باتونی شخص سے جان چھوٹی۔ وہ حیدر علی کی ہدایت کے مطابق بس اسٹاپ سے کچھ فاصلے پر واقع ٹیکسی اسٹینڈ میں پہنچا تو حیدر علی ٹیکسی بک کر چکا تھا۔ یہاں سے آگے کا سفر ان دونوں نے اکٹھے ٹیکسی میں ہی طے کرنا تھا۔ ابھی ٹیکسی نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ حیدر علی چونک پڑا۔ ”کیا ہوا خیریت تو ہے؟“ سـن نے پوچھا۔

”ہمارا تعاقب کیا جا رہا ہے۔“

حیدر علی نے جواب دیا۔ سـن نے مڑ کر دیکھا وہ واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ایک بڑے ٹائروں والی جیپ ان کے پیچھے تھی سـن سوچنے لگا کہیں انہیں ٹریس تو نہیں کر لیا گیا۔

جیپ میں ڈرائیور سمیت چار افراد موجود تھے وہ زیادہ فاصلہ ہونے کے باعث وہ ان کی شکل و صورت نہیں دیکھ سکے تھے۔ البتہ اتنا اندازہ لگا چکے تھے کہ وہ سادہ لباس میں تھے۔ سـن کے اندازے کے مطابق وہ بی ایس ایف یا کسی دوسری ایجنسی کے اہلکار بھی ہو سکتے تھے پھر جیپ کی رفتار تیز ہونے لگی۔ اور لحہ بہ لحہ ان کے قریب آتی ہوئی اوورٹیک کرنے لگی۔ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے شخص نے سـن کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ تو سـن کی جان میں جان آئی وہ اس کا بس کا ہم سفر اشوک کمار تھا۔ ”حیدر علی تم نے مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ یہ اشوک کمار ہے پریس رپورٹر۔“ سـن نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا وہ انگلش میں ہی بات چیت کر رہے تھے تاکہ ٹیکسی ڈرائیور ان کی بات نہ سمجھ سکے۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر وہ ٹیکسی سے اترے اور ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ ادا کر کے رخصت کیا۔ کچھ دیر بعد غلام مصطفیٰ اور ناصر بھی ایک دوسری ٹیکسی میں وہاں آ پہنچے۔ ”اب آگے کا سفر ہمیں پیدل طے کرنا ہے دشمن کا یہ ٹریننگ سینٹر پہاڑی سلسلے کے درمیان ایک میدان میں ہے۔ جہاں دور دور تک سیکورٹی کا سخت انتظام ہے۔“ حیدر علی نے ایک طرف چلتے ہوئے کہا۔

انہیں اس سنسان علاقے میں چلتے ہوئے کافی دیر ہو چکی تھی۔ سورج چھپ چکا تھا اور چندا ماموں پہاڑیوں کی چوٹیوں سے طلوع ہو رہے تھے۔ چلتے چلتے حیدر علی رکا تو انہیں بھی قدم روکنے پڑے حیدر علی نے اپنی جیب سے نقشہ نکالا۔ اور اس کا معائنہ کرنے کے بعد

بولا۔ ''اب ہم ریڈ زون میں داخل ہونے والے ہیں بہتر یہی ہے کہ ہم نصف شب کے بعد اپنی کارروائی شروع کریں جب تک کوئی مناسب جگہ دیکھ کر قیام کر لیتے ہیں۔ کچھ دیر آرام سے ہم تازہ دم بھی ہو جائیں گے۔''

مناسب جگہ انہیں کچھ ہی دیر بعد مل گئی۔ یہ کوئی خستہ حال زمانہ قدیم کی ٹوٹی پھوٹی عمارت تھی۔ جو ویران پڑی تھی عمارت کے کمرے گرد و غبار اور جالوں سے اٹے ہوئے تھے۔ اس عمارت کا ایک دروازہ عقبی سمت بھی تھا لیکن یہ آمد و رفت کے قابل نہ تھا کیوں کہ یہاں ڈھلان تھی اور بکثرت خودرو پودے اور جھاڑیاں تھیں انہوں نے روشنی کے لئے ٹارچ روشن کر لی تھی اور ایک کمرے کو جھاڑ پونچھ کر بیٹھنے کے لائق بنایا۔ اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔

ناصر نے اپنا بیگ کھولا اور اسلحہ نکالنے لگا یہ دو آٹومیٹک رائفلیں اور دو پسٹل تھے۔ ''کیا تمہاری تلاشی نہیں لی گئی؟'' ...ن نے پوچھا۔

''لی گئی کیوں نہیں لی گئی۔'' اس نے جوب دیا۔

''تو پھر وہ یہ اسلحہ کیوں نہیں ڈھونڈ سکے؟''

...ن نے پوچھا۔

''یہ کرتب نے کا نہیں ایک نہ ایک داؤ تو استاد بھی شاگرد سے چھپا کر رکھتا ہے۔ جیسے بلی نے شیر کو سب کچھ بتایا مگر درخت پر چڑھنا نہیں سکھایا۔'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔

''ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے ہر جگہ میر جعفر اور میر صادق جیسے غدار ہوتے ہیں جو جرائم پیشہ افراد کے کام آتے ہیں۔''

باتوں کے دوران حیدر علی اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بیرونی سمت کھلنے والی کھڑکی کو کھول کر باہر جھانکا۔ ''کیا ہوا؟'' غلام مصطفیٰ نے پوچھا۔

''اس عمارت کو گھیرا جا رہا ہے۔'' حیدر علی نے سرسراتی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ اور وہ بے اختیار کھڑکی کی طرف لپکے۔ انہوں نے دیکھا واقعی حیدر علی ٹھیک کہہ رہا تھا درجنوں کی تعداد میں دور سے بہت دور سے ہیولوں کی مانند دکھنے والے افراد آہستہ آہستہ اس عمارت کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے۔ حیدر علی کی حسیات بلا کی تیز تھیں۔

''لیکن انہیں ہمارے یہاں آنے کی کیسے خبر مل گئی۔'' ...ن نے کہا اور وہ سوچ میں پڑ گئے۔ یہ شک و شبے والی بات تھی۔

حیدر علی کا ذہن یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ ان میں سے کوئی غدار بھی ہو سکتا ہے ناصر اور غلام مصطفیٰ اس کے ساتھی تھے۔ جو وطن کے لئے جان تو دے سکتے تھے لیکن غداری نہیں کر سکتے تھے۔ جب کہ ...ن کرنل توحید جیسے جانباز فوجی کا بیٹا تھا جس نے جان تو دے دی مگر دشمن کو اپنا راز نہیں بتایا تو پھر دشمن ان کی راہ پر کیسے لگ گیا۔

اچانک اس کی نظر ...ن کے شانے پر پڑی اس کی شرٹ پر ٹائیگر کا ایک چھوٹا سا اسٹیکر چپکا ہوا تھا۔ جو شرٹ کا ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ مگر قدرے ابھرا ہوا تھا۔ حیدر علی نے لبوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور آگے بڑھ کر ...ن کی شرٹ سے اسٹیکر اکھاڑ کر باریکی سے اس کا معائنہ کرنے کے بعد نیچے پھینکا اور جوتے سے مسل دیا۔ ''یہ حساس ترین ڈیوائس تھی ہماری لوکیشن کے بارے میں دشمن لحہ بہ لحہ اسی ڈیوائس کے ذریعے جانتا رہا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمہاری شرٹ پر یہ اسٹیکر چپکایا کس نے؟'' حیدر علی نے کہا اور ...ن سوچنے لگا بس میں اشوک کمار اس سے چپک کر بیٹھا تھا وہ با آسانی یہ کام کر سکتا تھا اور پھر راستے میں وہ جیپ میں ان کے قریب سے بھی گزرا تھا۔ اس نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

حیدر علی نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اشوک کمار کوئی اخباری رپورٹر نہیں کسی ادارے کا اہلکار ہے ہو سکتا ہے اس کا تعلق کسی ایجنسی سے ہو۔ کیوں کہ کوئی پولیس والا اس قسم کی حساس ڈیوائس سے آگاہ نہیں ہوتا۔''

انہوں نے اسلحہ اٹھایا اور چھت پر پہنچ گئے۔ دشمن آہستہ آہستہ گھیرا ڈال رہے تھے پھر حیدر علی نے باؤنڈری وال کی دیوار سے سر ابھار کر برسٹ مارا انہوں نے دو افراد کو گرتے دیکھا۔ پھر ان پر بھی جوابی برسٹ

فائر کئے گئے۔ وہ نیچے دبک کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد فائرنگ روک دی گئی اور خاموشی چھائی۔ اور پھر لاؤڈ اسپیکر پر آواز ابھری۔ ''تم لوگ اس وقت ہمارے گھیرے میں ہو۔ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ خود کو ہمارے حوالے کر دو میں وچن دیتا ہوں کہ تمہارے ساتھ قانون کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔''

...ن سناٹے میں آ گیا وہ اس آواز کو بخوبی پہچانتا تھا۔ یہ میجر رام پرشاد کی آواز تھی وہی میجر رام پرشاد جو کہ ابرش اور بریرہ کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ گویا وہ آرمی کے گھیرے میں تھے۔ ان کے دلوں پر دشمن کی ہیبت طاری ہو چکی تھی اور اپنی موت کا یقین ہو چلا تھا۔ دشمن آرمی کے اس دستے سے مقابلہ ناممکن تھا کیوں کہ ان کے پاس اسلحہ کے نام پر صرف دو پسٹل اور دو رائفلیں تھیں۔ ہتھیار ڈالنے کی صورت میں انہیں اذیت ناک موت ملتی۔ دشمن سے کسی بھی رعایت کی توقع فضول تھی وہ آنے والے لمحوں کے بارے میں سوچ رہے تھے اور وقت ان کی مٹھی سے ریت کی مانند سرک رہا تھا اور رفتہ رفتہ گھیرا تنگ ہوتا جا رہا تھا۔

☆......☆......☆

...ن، بریرہ اور ابرش سے شاہ زین رخصت ہو کر منچو کے بتائے ہوئے راستے پر پیدل چلتا رہا۔ چلتے چلتے جب وہ تھک جاتا تو رک کر کسی سایہ دار درخت کے نیچے آرام کر لیتا۔ راجستھان کوئی نزدیک نہیں تھا۔ چلتے چلتے اس کے پاؤں کے تلوؤں میں چھالے پڑ گئے۔ مگر اس نے ہمت نہیں ہاری۔ جہاں کہیں نماز کا وقت ہوتا وہ رک کر نماز پڑھ لیتا۔ رات کو وہ جنگل میں ہی سکون سے بے فکر ہو کر سو جاتا۔ مجال ہے جو کوئی درندہ یا کوئی موذی جانور اس کے سامنے آئے۔ اس کی نیت صاف تھی۔ وہ اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے تکلیفیں اٹھا رہا تھا۔ اس لئے کٹھن منزلیں بھی اس کے سامنے سہل ہوتی جا رہی تھیں۔ راستے میں نہ ہی اسے کسی چیک پوسٹ پر روکا گیا۔ اور نہ ہی اس کا سامنا دشمن دستے سے ہوا یونہی چلتے چلتے وہ کئی دن کی مسافت کے بعد راجستھان کی حدود میں داخل ہوا تو شام ہو چکی تھی۔

دور ایک آبادی کے آثار دیکھ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بستی سے پہلے اس کے راستے میں ایک مندر آ گیا۔ جس کے احاطے میں برگد کا اونچا درخت دور سے نظر آ رہا تھا۔ پتھر سے بنے ہوئے اس مندر کا عکس بھی دکھائی دے رہا تھا۔

وہ مندر کے قریب سے گزرنے لگا تو کسی کی سسکیوں اور آہ و بکا کی آواز سن کر ٹھٹک کر رک گیا۔ یہ آواز مندر سے آ رہی تھی وہ فطری تجسس کے تحت مندر میں داخل ہو گیا۔ سیڑھیاں عبور کر کے اندرونی حصے میں پہنچا تو وہاں کشادہ احاطہ تھا۔ احاطے کے درمیان سبزہ تھا جس پر ایک پجاری لیٹا ہوا تھا۔ اندر سے سسکیوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی وہ آواز کی سمت چل پڑا اور محرابی دروازے سے گزر کر ہال نما کمرے میں پہنچا جہاں کالی کا قد آور بت ایستادہ تھا۔ بت کے قدموں کے پاس ایک ادھیڑ عمر شخص سجدہ ریز تھا اور آہ و بکا کر رہا تھا اس سے کچھ فاصلے پر ایک دس بارہ سالہ نحیف و نزار لڑکا چت پڑا تھا۔ وہ لڑکا کیا تھا ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا۔ جس میں شاید ہلنے جلنے کی سکت بھی نہ تھی۔

وہ ادھیڑ عمر شخص کے قریب پہنچا اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ چونک اٹھا اور حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ اس شخص کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''تم رو کیوں رہے ہو اور اس بت کے سامنے آہ و زاری کیوں کر رہے ہو؟''

اس شخص کی حیرت دو چند ہو گئی۔ ''مورکھ تم کالی مائی کو نہیں جانتے۔ یہ میرا بیٹا راہول ہے پچھلے ورش سے اسے نہ جانے کیا ہو گیا ہے سوکھتا جا رہا ہے ویدوں، ڈاکٹروں ہر ایک کو دکھایا مگر اس کی حالت بگڑتی جا رہی ہے اب تو سب نے جواب دے دیا ہے اس کی بیماری اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اب نہ تو یہ چل سکتا ہے اور نہ ہی بول سکتا ہے۔ بس ہر وقت بے حس و حرکت پڑا چھت کو تکتا رہتا ہے میں پچھلے کئی دنوں سے کالی مائی کے چرنوں میں آتا ہوں اور پرارتھنا کرتا ہوں کہ شاید کالی ماں مجھ پر دیا

کرے۔'' وہ روتے ہوئے بولا۔

''پاگل انسان یہ پتھر کا بے جان بت جسے ہمارے جیسے کسی انسان نے بنایا ہے نہ ہل سکتا ہے اور نہ ہی کسی کو کچھ دے سکتا ہے۔ یہ بت تمہارے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں اگر اس بت کو کوئی نقصان پہنچاؤں تو یہ اپنا بچاؤ بھی نہیں کر سکتا تو پھر بھلا یہ تمہیں کیا فائدہ دے گا۔'' شاہ زین جذباتی ہو گیا تھا۔

''مانگنا ہے تو اس واحد لاشریک سے مانگو جو سب کی سنتا ہے جو خالق ہے مالک ہے اور اس کے علاوہ کوئی عبادت کے لائق نہیں۔''

''بالک ایسے شبدھ مت کہو بھگوان ناراض ہو جائیں گے۔'' بوڑھا لرز اٹھا۔

''بابا یہ پتھر کے بے جان بت ہیں۔ جنہیں خود انسان نے بنایا ہے۔ ان میں احساسات نہیں نہ ہی یہ سن سکتے ہیں اور نہ ہی بول سکتے ہیں جہاں تک اس بچے کا تعلق ہے تو اس پر تمہارے دشمن نے کالا جادو کیا ہے یہ لحہ بہ لحہ موت کی طرف بڑھ رہا ہے اسے اٹھاؤ اور میرے ساتھ اپنے گھر لے چلو اگر اس لڑکے کی زندگی باقی ہے تو انشاء اللہ یہ ضرور صحت یاب ہو جائے گا۔'' اس نے پریقین لہجے میں کہا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد بوڑھے نے لڑکے کو اٹھایا اور باہر نکلنے لگا واپسی میں راستے میں انہیں ایک پجاری بھی ملا جس نے شاہ زین کو حیرت سے دیکھا ضرور مگر بولا کچھ نہیں۔ بستی میں پرکاش نامی اس بوڑھے کا کچا مکان تھا۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا اور راہول نامی یہ لڑکا اس کا اکلوتا بیٹا تھا گھر آ کر پرکاش نے اس کی ہدایت کے مطابق راہول کو چٹائی پر لٹایا۔

شاہ زین نے اسے پانی لانے کا کہا اور لڑکے کے قریب بیٹھ کر قرآنی آیات پڑھنے لگا۔ وہ پرکاش کے لائے ہوئے پانی پر پڑھتے ہوئے دم بھی کرتا جا رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد اس نے پانی کے چھینٹے راہول کے چہرے پر چھڑکے تو اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا بوڑھا ششدر رہ گیا کچھ دیر بعد اس نے راہول کے پورے جسم پر پانی چھڑکنے کے ساتھ ساتھ دم بھی کیا۔ تو وہ اٹھ بیٹھا۔

بوڑھے نے شاہ زین کے پاؤں پکڑ لئے۔ ''تم ہمارے لئے اوتار ہو۔ تم نے میرے بیٹے کو نیا جیون دیا ہے۔'' اس نے پرکاش کو شانوں سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا۔

''بابا توبہ میں ایک معمولی سا انسان ہوں یہ سب اللہ کے کام ہیں اللہ کے کلام کی برکت سے کالے جادو کا توڑ ہو چکا ہے۔ اب یہ لڑکا چند دنوں میں اچھا بھلا ہو جائے گا۔'' پرکاش بار بار اس کا شکر ادا کرتا تھا۔

مسلسل سفر نے شاہ زین کو تھکا دیا تھا۔ وہ کھانا کھا کر رات کو جلدی ہی سو گیا اور صبح ناشتہ کر کے پرکاش کے گھر سے نکلا اور ٹہلتا ہوا بستی سے کافی دور ایک پہاڑی مقام پر آ گیا۔ وہ مزید آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ منچو نے اسے روک دیا۔ ''شاہ زین آگے تمہارے لئے خطرہ ہے بہتر ہے واپس لوٹ جاؤ۔''

''کیسا خطرہ؟'' اس نے چلتے ہوئے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ منچو کوئی جواب دیتا خطرہ خود اس کے سامنے آ گیا۔

وہ پانچ افراد پر مشتمل پنڈت پجاریوں کا ایک جتھا تھا جو اسے خونخوار نظروں سے گھور رہا تھا۔ ایک ادھیڑ عمر دراز قد اور صحت مند پنڈت آگے بڑھا اور شاہ زین کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔ ''آپ لوگوں نے میرا راستہ کیوں روک رکھا ہے۔'' شاہ زین نے شائستہ لہجے میں پوچھا۔

''شاہ زین بھگت رام نامی یہ پنڈت انتہائی خطرناک ہے اور پرتاب بھوش کا چیلا ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارے لئے دل میں کینہ رکھتا ہے اس سے پہلے کہ یہ تم پر وار میں پہل کرے میں اس کا بندوبست کرتا ہوں۔ منچو تند لہجے میں بولا۔

''میں کسی سے بھی محاذ آرائی نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں باباجی کے حکم پر یہاں آیا ہوں۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں تم آرام سے بیٹھو۔'' شاہ زین نے دل ہی دل میں اسے مخاطب کیا اور منچو تلملانے لگا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا اگر شاہ زین اسے ٹوک نہ

دیتا تو وہ پنڈت پجاریوں کی اس ٹولی سے الجھ بیٹھتا۔

بھگت رام نے شاہ زین کو کینہ توز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”مورکھ میں تمہیں یہی نصیحت دیتا ہوں کہ ترنت اپنے دیش لوٹ جاؤ ابھی بھی سمے ہے۔ میرے ساتھیوں کی تو یہ اچھا ہے کہ تمہیں نشٹ کردیا جائے۔“

”میں باباجی کے حکم پر یہاں آیا ہوں اور کسی سے محاذ آرائی کا ارادہ نہیں رکھتا میرا آپ لوگوں کو بھی یہی مشورہ ہے کہ آپ اپنا کام کریں اور مجھے اپنا کام کرنے دیں۔“ شاہ زین نے شائستگی سے جواب دیا۔

مگر بھگت رام کا لہجہ بتدریج درشت ہوتا جارہا تھا۔ وہ اسے مسلسل دھتکار رہا تھا۔ بالآخر شاہ زین کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا۔ اس نے بھی اس متعصب ہندو پنڈت کو تلخ جوابات دیئے کچھ دیر تک ان کے درمیان تلخ و ترش جملوں کا تبادلہ ہوتا رہا اس کے باوجود شاہ زین تحمل و برداشت سے کام لیتا رہا اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھنا چاہا کہ میں تم سے الجھنا نہیں چاہتا۔

بھگت رام نے تلملاتے ہوئے شاہ زین کی طرف شہادت کی انگلی کو جنبش دی تو اس کے پاؤں کے گرد نادیدہ رسی لپٹ گئی اور وہ منہ کے بل گرا مگر گرتے ہی وہ اس کا توڑ کرچکا تھا۔ رسیوں کی بندش ٹوٹتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور پجاریوں کے ٹولے کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھ کر بولا۔ ”اب بھی وقت ہے رک جاؤ۔“

لیکن وہ اس کی بات پر توجہ دیئے بغیر منتر پڑھ رہا تھا۔

شاہ زین نے خود کو حصار میں محفوظ کرلیا۔

درجنوں کی تعداد میں کتے سے مشابہ خونخوار جانور کریہہ انداز میں چیختے ہوئے شاہ زین کی طرف لپکے۔ یہ بھگت رام کے بیر تھے لیکن جو بیر بھی حصار سے ٹکراتا جل کر راکھ ہوجاتا کچھ ہی دیر میں وہ درجنوں بیروں سے محروم ہوگیا۔

پھر اس نے غصے سے کھولتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ شاہ زین کی طرف جھٹکے۔ تو فضا سے شاہ زین پر پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ لیکن یہ پتھر بھی حصار سے باہر ادھر ادھر ہی گر رہے تھے اس نے جادو کے کئی مہلک ترین وار کیے۔ لیکن شاہ زین اپنے حصار میں محفوظ رہا۔ پے درپے ناکامیوں نے اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کردیا تھا۔ پھر اس نے طیش میں آکر زمین سے مٹی اٹھائی اور منتر پڑھ کر شاہ زین کی طرف پھینکی۔ گرد و غبار کا ایک بگولا سا اٹھا۔ اور تیزی سے حصار سے ٹکرایا بگولے کے حصار سے ٹکراتے ہی حصار ٹوٹ گیا اور شاہ زین کرب اور اذیت سے چیخ پڑا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے اس کے پورے بدن میں آگ لگ گئی ہو۔ درد کی ایک کٹیلی لہر اس کے وجود میں سرایت کرگئی تھی۔ تکلیف کی شدت سے وہ نیچے گر کر پانی سے نکلی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ لیکن اس کی یہ کیفیت عارضی رہی۔

منچو کا ہاتھ دراز ہوا اور اس نے شاہ زین کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا اسے ایسے لگا جیسے کسی نے اس کے جلتے ہوئے بدن پر ٹھنڈا پانی ڈال دیا ہو۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

بھگت رام اب کسی مداری کی طرح اچھل اچھل کر گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب وہ رکا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی ایک کوری ہانڈی نظر آرہی تھی یہ کالے جادو کا مہلک ترین وار تھا۔

منچو بھی چوکنا ہوگیا اور اپنی نگاہیں بھگت رام پر جمادیں۔ بھگت رام نے کالی کا فلک شگاف نعرہ بلند کیا اور ہانڈی شاہ زین کی طرف اچھال دی۔ ہانڈی گھوں گھوں کی گونج دار آواز بلند کرتی ہوئی گول گول گھومتی شاہ زین کی طرف بڑھی اور اس کے سر پر معلق ہوکر گھومنے لگی۔ منچو کے چہرے کا رنگ بھی فق ہوچکا تھا وہ خوف زدہ نظروں سے شاہ زین کے سر پر گھومتی ہانڈی کو دیکھ رہا تھا۔

اگلا ہی لمحہ حیرت انگیز تھا شاہ زین نے آیت الکرسی پڑھتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ بلند کیا اور ہانڈی کو تھام کر نعرہ تکبیر بلند کیا سرعت سے ہانڈی بھگت رام کی طرف اچھال دی۔ ہانڈی تیزی سے بھگت رام کی طرف پلٹی اور فضاء میں کان کے پردے پھاڑ دینے والی

سب تھم ہی چیخ و پکار دوبارہ گونج اٹھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے ہزاروں بدروحیں مل کر چیخ رہی ہوں۔ باندی اب بھگت رام کے سر پر گھوم رہی تھی بھگت رام ڈنڈوت کرتے ہوئے کالی کو پکارنے لگا۔ مگر اس کی فریادیں اور چیخ و پکار بھی اس کی جان نہ بچا سکی اور باندی بھگت رام کے سر پر گر کر پھٹ گئی۔ بھگت رام کا عبرت ناک انجام دیکھ کر اس کے ساتھیوں نے بھاگ کر جان بچانا چاہی مگر وہ منجو کے قہر و غضب کا نشانہ بن گئے۔ منجو کی انگلی کی جنبش سے وہ جل کر خاک ہو گئے۔

''تم نے پھر مداخلت کی۔'' شاہ زین نے اسے مصنوعی خفگی سے گھورا۔

''تو اور کیا انہیں پھولوں کے ہار پہناتا۔'' منجو جل کر بولا تو شاہ زین ہنس پڑا۔ اور اپنے قدم آگے بڑھا دیئے۔

چھ سات کلو میٹر آگے جانے کے بعد وہ ایک پہاڑی کے قریب جا پہنچا۔ جو سرسبز درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی ایک طرف اوپر سے نشیب میں بہتی ہوئی آبشار پہاڑی کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ وہ سحر زدہ سا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ ابھی اس نے چند ہی قدم آگے بڑھائے تھے کہ اسے محسوس ہوا اس کے شانے سے منجو غائب ہو چکا ہے یہ غیر معمولی بات تھی وہ ٹھٹک کر رکا مگر پھر ہمت کر کے اوپر چڑھنے لگا۔ پہاڑی کے عین وسط میں پہنچ کر اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہاں جنگل میں منگل کا سا سماں تھا۔

ایک طرف حجرہ سا بنا ہوا تھا جس کے دروازے پر بھاری پردہ جھول رہا تھا حجرے کے سامنے درجنوں لوگ مودب بیٹھے تھے۔ حجرے کے دروازے پر ایک باریش شخص مودب کھڑا تھا۔ شاہ زین بھی ان درجنوں افراد میں جا کر بیٹھ گیا۔ باریش شخص کے پکارنے پر ہر شخص باری باری حجرے کے اندر جاتا اور کچھ دیر بعد واپس لوٹ آتا۔ ''حجرے میں کون ہیں؟'' شاہ زین نے قریب بیٹھے ایک شخص سے پوچھا۔

''اندر بابا جی ہیں۔ جو برسوں سے یہاں مقیم ہیں بابا جی بنا کسی تفریق کے ہر ایک کے کام آتے ہیں یہاں انسان خالی ہاتھ آتا ہے اور جھولی بھر کر جاتا ہے۔'' اس شخص نے گہری عقیدت سے جواب دیا۔ شاہ زین نے اندازہ لگایا اس ہجوم میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی کثرت سے موجود تھے۔

کچھ دیر بعد جب ایک سائل حجرے سے باہر نکلا تو باریش شخص نے آواز لگائی۔ ''تم لوگوں میں شاہ زین کون ہے؟ اسے بابا جی بلا رہے ہیں۔'' شاہ زین کی حیرت دوچند ہو گئی گویا حجرے میں موجود شخصیت علم روحانیت میں کمال رکھتی تھی وہ سر جھکائے حجرے میں داخل ہوا تو ششدر رہ گیا۔ اندر چٹائی پر بابا محمد الیاس بیٹھے تھے۔ وہ دو زانو ہو کر ان کے سامنے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ اب اسے سمجھ آیا کہ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے منجو اس کے کندھے سے کیوں غائب ہوا تھا۔

بابا نے اسے مسکرا کر دیکھا اور بولے۔ ''شاہ زین اب کچھ عرصہ تم یہیں رہو گے اور یہاں آنے والے حاجت مندوں کے کام آتے رہو گے۔ کچھ دن میں بھی یہاں تمہارے ساتھ رہوں گا۔'' بابا سے کچھ پوچھنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ حالانکہ اس کے ذہن میں کئی سوالات مچل رہے تھے وہاں کے لوگوں کے بقول بابا جی کئی برسوں سے یہاں مقیم ہیں۔ جبکہ کئی بار بابا جی اسے پاکستان میں مل چکے تھے۔

شاہ زین کے شب و روز وہیں بیتنے لگے۔ بابا جی فارغ اوقات میں اسے علم روحانیت کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ دن کا ایک حصہ عام لوگوں کے لئے مختص تھا۔ جن میں ہندو بھی ہوتے تھے اور مسلمان بھی وہ بنا کسی تفریق کے ہر ایک سے محبت اور شفقت سے پیش آتے یہاں شاہ زین اور ان کا ساتھ صرف مہینہ بھر دیا۔ پھر وہ اسے اپنا قائم مقام بنا کر کچھ دنوں کے لئے وہاں سے رخصت ہو گئے۔

ایک روز سہ پہر کے وقت ایک ادھیڑ عمر شخص حجرے میں داخل ہوا۔ اس نے قیمتی لباس زیب تن کر رکھا تھا وہ شاہ زین کے سامنے مودب ہو کر بیٹھ گیا۔ ''جی فرمائیے؟'' اس نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا

تو وہ اس کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ ''شاہ صاحب مجھ پر دیا کیجیے۔ میری پتری کا جیون خطرے میں ہے۔''

شاہ زین نے اسے شانوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ ''گھبرائیں نہیں اللہ بہتر کرے گا۔ آپ صرف یہ بتائیں کہ آپ کس مسئلے سے دوچار ہیں۔''

''میں قریبی گاؤں کا مکھیا رام اوتار ہوں۔ گاؤں میں میری شاندار حویلی ہے روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں باوجود دولت کی ریل پیل کے میں گاؤں کے ہر فرد کے کام آتا ہوں پرنتو نہ جانے پھر بھی کیوں اس پریشانی میں آ پھنسا۔ آپ نے کوئی اپائے نہ کیا تو میرے پاس صرف یہ راستہ بچے گا کہ میں آتما ہتھیا کرلوں۔ کانتا میری اکلوتی بیٹی ہے عمر سولہ سترہ سال کے لگ بھگ ہے۔ پچھلے چند دنوں سے وہ رات آٹھ بجے ہی اپنے کمرے میں دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتی ہے اور ہمارے پکارنے کے باوجود نہ ہی دروازہ کھولتی ہے اور نہ ہی کوئی جواب دیتی ہے۔ دن بھر کھوئی کھوئی سی رہتی ہے۔

ایک دن رات کو گیارہ بجے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں محو خواب تھا وہ اپنے کمرے سے نکلی اور گیٹ پر جا پہنچی چوکیدار کا کہنا ہے کہ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو۔ چوکیدار نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے اسے زور سے دھکا دیا۔ وہ کئی فٹ دور جا گرا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نازک اندام لڑکی کے اندر نہ جانے کون سی حیوانی طاقت آ گئی تھی کہ اس نے قوی ہیکل چوکیدار کو کسی کھلونے کی طرح زمین پر گرا دیا تھا پر وہ کھر کھرائی ہوئی غیرانسانی آواز میں بولی۔ ''اب میرے راستے میں آیا تو نشٹ ہوجائے گا۔''

چوکیدار خوف زدہ ہو کر میرے کمرے کی طرف دوڑا میرے جاگنے تک کانتا غائب ہوچکی تھی۔ وہ صبح پانچ بجے کے قریب گھر آئی۔

جب ہم نے اس سے پوچھا کہ ''وہ کہاں گئی تھی؟'' تو اس نے ہمیں غصے سے گھورا اس کی انگاروں کی طرح دہکتی نگاہیں قہر برسا رہی تھیں۔

پھر وہ کھر کھراتی ہوئی غیرانسانی آواز میں مخاطب ہوئی۔ ''رام اوتار کانتا میری ہے۔ آئندہ ہمارے بیچ آنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ تیرے پورے پریوار کو جلا کر بھسم کردوں گا۔'' پھر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

دوسرے روز میں چوکیدار کے ساتھ گیٹ پر موجود تھا۔ کانتا رات کو حسب معمول جب گھر سے باہر جانے لگی تو میں نے اور چوکیدار نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے کسی کھلونے کی طرح ہم دونوں کو اٹھا کر زمین پر دے مارا۔ جب تک ہم اٹھتے وہ باہر جا کر اندھیرے میں گم ہوچکی تھی۔ میں گاؤں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔

آج سے دو روز پہلے میں ایک پنڈت دھن راج مہاراج کو گھر لایا۔ انہوں نے ابھی کانتا کے سامنے بیٹھ کر اشلوک پڑھنا شروع کیا تھا کہ کانتا نے ایک ہاتھ سے ان کا گلا دبوچ کر دوسرا ہاتھ کسی ہتھوڑے کی طرح ان کے سر پر مارا تو وہ وہیں گر کر بے ہوش ہوگئے۔ اور ہوش میں آنے کے بعد کچھ کہے سنے بغیر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ گئے۔

پھر میں نے پاربتی دیوی کے سیوک امرلال سے سہائتا طلب کی۔ وہ بہت بڑے شکتی شالی پنڈت ہیں۔ انہوں نے لوبان اور عود کی دھونی دینے کے بعد جب منتر پڑھنا شروع کیا تو کانتا کی حالت غیر ہونے لگی۔ اور وہ نیچے گر کر تڑپنے لگے۔

اچانک کمرے میں ایک ہیولہ سا نمودار ہوا۔ جس نے ایک تیس پینتیس سالہ شخص کا روپ دھار لیا۔ اس شخص کا چہرہ جلا ہوا تھا اور آنکھوں کی جگہ گڑھے تھے وہ اس قدر خوف ناک صورت تھا کہ میری تو گھگھی بندھ گئی پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے امرلال کی طرف دائیں ہتھیلی کا رخ کیا اس کے ہاتھ کی ہتھیلی سے ایک چنگاری سی نکلی اور امرلال مہاراج کے جسم میں آگ لگ گئی وہ نیچے گر کر تڑپنے لگے اور چند لمحوں بعد ان کا جسم ساکت ہوگیا۔ ان کی لاش آگ سے اس طرح جھلس

چکی تھی کہ ان کی طرف دیکھتے ہوئے خوف آتا تھا۔
پھر وہ دشت آتما میری طرف دیکھ کر غراہٹ آمیز لہجے میں بولی۔ "رام اوتار میں تجھے ایک اور موقع دیتا ہوں کہ اب میرے راستے میں مت آنا۔" اس نے اپنی روداد مکمل کی اور دوبارہ رونے لگا۔
"آپ گھبرائیں نہیں یہاں آستانے میں رہیں۔ شام ہوتے ہی میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔" اس نے رام اوتار کو تسلی دی۔ شام تک حاجت مندوں کا رش ختم ہو چکا تھا وہ حجرے سے باہر نکلا تو رام اوتار دو ملازموں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ وہ پہاڑی سے اترے ہی تھے کہ منچو شاہ زین کے کندھے پر آ گیا۔
"کیسے ہو چھوٹے؟" شاہ زین نے دل ہی دل میں شوخ لہجے میں کہا مگر منچو نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ پھلائے بیٹھا رہا۔
پہاڑی سے نیچے رام اوتار کی بگھی موجود تھی انہیں گاؤں پہنچتے پہنچتے رات ہو گئی شاہ زین کو حویلی کے ایک کمرے میں ٹھہرایا گیا۔ اس نے رام اوتار کو تاکید کی کہ کانتا جیسے ہی کمرے سے باہر نکلے اسے اطلاع دے دی جائے۔
"ہاں تو دوست اب بتاؤ ناراض کیوں ہو؟" رام اوتار کے کمرے سے جاتے ہی منچو سے شاہ زین مخاطب ہوا۔
"تم اتنے دنوں بعد جو پہاڑی سے اترے ہو میں وہیں تمہارا نیچے اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔" منچو نے اتراتے ہوئے کہا۔
"تم تو جانتے ہو کہ میں نے اپنی زندگی انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر دی ہے اور پھر باباجی نے بنا کسی خاص ضرورت کے پہاڑی سے اترنے سے منع کیا تھا۔" شاہ زین نے کہا۔ وہ کافی دیر تک گپ شپ میں مصروف رہے۔
نصف شب کے قریب کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اور رام اوتار گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "جلدی چلئے مہاراج! کانتا اپنے کمرے سے نکل پڑی ہے۔" وہ رام اوتار کے ساتھ برآمدے میں پہنچا تو اس نے ایک نوجوان لڑکی کو گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ چوکیدار کو وہ پہلے ہی سمجھا چکا تھا کہ کانتا کا راستہ نہ روکے شاہ زین دبے قدموں اس لڑکی کے پیچھے چل پڑا تو رام اوتار اور چوکیدار بھی اس کے ساتھ ہو لئے چوکیدار کے ہاتھ میں ٹارچ موجود تھی لیکن شاہ زین کے منع کرنے پر اس نے ٹارچ روشن نہیں کی۔
ادھر کانتا رات کے مہیب سناٹے میں بناء ادھر ادھر دیکھے چلی جا رہی تھی۔ "یہ تو مرگھٹ کی راہ پر جا رہی ہے۔" رام اوتار دبی دبی آواز میں بولا۔ پھر وہ واقعی مرگھٹ میں داخل ہو گئی۔
چودہویں کا چاند آسمان پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا اس کے باوجود مرگھٹ کا خوفناک اور ہولناک ماحول اور ویرانی انہیں خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھی۔ اس ویران ماحول میں ایک عجیب سا سکوت طاری تھا۔ ایسے میں اگر کوئی پتہ بھی گرتا تو بدروح کا گمان ہوتا رام اوتار اور چوکیدار تو بہت ڈرے ہوئے تھے۔ اور مرے مرے قدموں سے شاہ زین کا پیچھا کر رہے تھے جو نپے تلے قدموں سے کانتا کے پیچھے چل رہا تھا۔ ایک جگہ جا کر کانتا رک گئی وہ سحر زدہ سی ایک طرف دیکھ رہی تھی۔
شاہ زین نے اردگرد کا جائزہ لیا مگر وہاں ان کے علاوہ کوئی دوسرا ذی نفس موجود نہ تھا۔ منچو بھی شاہ زین کے کندھے پر چوکنا کھڑا تھا۔ شاہ زین نے اسے اس وقت مخاطب کرنا مناسب نہ سمجھا اور ایک جلالی وظیفے کا ورد کرنے لگا۔
اچانک کانتا کے قریب ایک ہیولہ سا نمودار ہوا۔ جس نے ایک لمبے تڑنگے 35 سالہ شخص کا روپ دھار لیا۔
اس بھیانک صورت شخص کے چہرے کا رخ ان تینوں کی طرف تھا گویا وہ انہیں دیکھنے کی قدرت رکھتا تھا اس دوران منچو اسے اس بدروح کے بارے میں تفصیلات بتا چکا تھا۔

شاہ زین چند قدم آگے بڑھا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''تم اس لڑکی سے کیا چاہتے ہو؟''

''میں گوپال ہوں اور وورشوں سے اس مرگھٹ میں موجود ہوں۔ ایک روز جب کہ یہ لڑکی اپنی سکھیوں کے ساتھ یہاں سے گزری تو میری اس پر نظر پڑتے ہی میں فریفتہ ہوگیا یہ میری پریمیکا سنگیت سے ملتی جلتی ہے اگر تم لوگ مداخلت نہ کرتے تو ابھی کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ مگر اب میں اس کی آتما کو اپنے وش میں کر کے لے جاؤں گا، تم لوگوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ ترنت اپنا جیون بچا کر یہاں سے بھاگ جاؤ، میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں کوئی عام آتما نہیں، کالی کے مہان سیوک گوپال کی آتما ہوں۔''

شاہ زین بولا۔ ''میں جانتا ہوں اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ جب تک تم زندہ تھے تمہارے شر سے کوئی بھی محفوظ نہ تھا۔ تم نے کالے جادو سے کئی لوگوں کے گھر اجاڑے۔ اور گاؤں کی بہت سی عورتوں کو عزت سے محروم کیا۔ اور تو اور تم نے اپنے مندر کی واسیوں تک کو نہیں بخشا۔ سنگیت نامی نوعمر داسی کو تم نے زبردستی مندر میں بے آبرو کرنے کے بعد قتل کر دیا۔ مگر تمہاری بدقسمتی تھی کہ ایک دوسرے پجاری نے تمہیں یہ گھناؤنی حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور اسی مرگھٹ میں لاکر گاؤں والوں نے گڑھا کھود کر تمہیں اس گڑھے میں دھکیلنے کے بعد آگ لگا کر زندہ جلا دیا اور پھر اسی گڑھے کو بھر کر وہ مرگھٹ سے چلے گئے۔ تب سے تمہاری آتما اس مرگھٹ میں بھٹک رہی ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دو سو سال پہلے کی بات ہے اب تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ اس معصوم لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو ورنہ اسی مرگھٹ میں تمہاری آتما کا خاتمہ ہو جائے گا۔'' ان دونوں کے درمیان تلخ و ترش جملوں کا تبادلہ جاری تھا جب کہ رام اوتار اور چوکیدار خوف سے لرز رہے تھے ایک تو رات کا مہیب سناٹا اور پھر مرگھٹ کی ویرانی اور سب سے بڑی خوف ناک بات ان کے سامنے خوف ناک آتما موجود تھی۔ جس کی شکل وہ خود اس سے پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ جب کہ کانتا اس سب سے بے نیاز تھی کیوں کہ وہ اس وقت اپنے ہوش وحواس میں نہیں تھی۔

''خود کو حصار میں محفوظ کرلو۔'' منجو نے سرگوشی کی تو شاہ زین نے گم صم کھڑی کانتا کو بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کر لیا جب کہ رام اوتار اور چوکیدار پہلے ہی اس کے قریب کھڑے تھے۔ اس نے اپنے اطراف حصار کھینچ لیا۔

''تم کیا سمجھتے ہو یہ کنڈل تمہیں بچالے گا۔'' گوپال نے کہا اور اس کے لب ہلنے لگے۔

شاہ زین سمجھ گیا کہ وہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کے گڑھوں سے نیلے رنگ کی شعاعیں نکلیں اور ان کی طرف بڑھیں اور جیسے ہی حصار سے ٹکرائیں فضا میں چنگاریاں سی اڑیں اور اس طرح کی آواز ابھری جیسے پھلجھڑیاں پھوٹ رہی ہوں۔ وہ حصار میں محفوظ تھے لیکن چوکیدار خوف زدہ ہو کر چیختا ہوا جیسے ہی حصار سے باہر نکلا اس شعاع کی زد میں آ گیا اور مرگھٹ اس کی دلدوز چیخوں سے گونج اٹھا۔ اس کے ناک اور منہ سے خون بہنے لگا تھا۔ پھر وہ تیورا کر نیچے گرا اور چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

اس میں کوئی شک وشبہ نہ تھا کہ اسے خونی آتما نے مار دیا تھا۔ رام اوتار کا تو جیسے ڈر کے مارے سانس رک گیا تھا وہ کچھ دیر کھڑا لرزتا کانپتا رہا۔ پھر لہرا کر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ آتما نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا تو طوفانی ہوائیں چلنے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے مرگھٹ میں طوفان آ چکا ہو۔ خونی آتما اب دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب کہ شاہ زین باآواز بلند قرآنی آیات پڑھ رہا تھا۔

جیسے ہی آتما حصار کے قریب آئی۔ شاہ زین نے دایاں ہاتھ بلند کر کے انگلی کو جنبش دی اور اس کی طرف پھونک ماری۔ آتما کا وجود آگ کے شعلوں میں گھر گیا اور مرگھٹ خوف ناک چیخوں سے گونج اٹھا۔ پھر

ہی دیر میں وہاں راکھ کا ڈھیر پڑا تھا۔ ہوا اڑا کر لے گئی، خونی آتما کا خاتمہ ہوتے ہی کانتا بھی بے ہوش ہوگئی۔

شاہ زین نے جھنجھوڑ کر رام اوتار کو ہوش میں لایا۔ وہ اب تک خوف زدہ تھا اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے چوکیدار کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ "گھبراؤ مت اس آتما کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب تم لوگ محفوظ ہو" شاہ زین نے اسے تسلی دی اور کانتا کے سر پر ہاتھ رکھ کر دم کیا تو وہ بھی ہوش میں آ گئی۔

"پتا جی میں یہاں کیسے آ گئی؟" وہ باپ سے لپٹ کر خوف زدہ لہجے میں بولی۔

شاہ زین نے وہ رات حویلی میں بسر کی اور صبح سویرے رام اوتار سے جانے کی اجازت طلب کی، وہ شاہ زین کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے لاکھوں روپے کا نذرانہ دینے پر اصرار کرنے لگا۔ مگر شاہ زین نے انکار کر دیا شاہ زین کو بگھی میں بیٹھا کر پہاڑی پر پہنچا دیا گیا۔ وہ اپنے حجرے کی طرف جیسے ہی بڑھا منچو غائب ہو گیا۔

اسی روز شام کے قریب جب حاجت مندوں کا رش کم ہوا تو وہ حجرے میں کچھ دیر کے لئے لیٹا ہی تھا کہ باہر سے شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں وہ صورت حال جاننے کے لئے حجرے سے باہر نکلا۔ "شاہ صاحب اس پہاڑی کو پولیس گھیرے میں لے رہی ہے۔" ایک مرید نے گھبرائے ہوئے لہجے میں اسے اطلاع دی۔

شاہ زین نے آگے بڑھ کر نظر دوڑائی۔ پہاڑی کے چاروں طرف درجنوں پولیس اہلکار موجود تھے ان میں سے بہت سے چاروں طرف سے پھیل کر پہاڑی پر چڑھ رہے تھے ان کے ساتھ ایک پنڈت بھی تھا۔ جسے اس نے بخوبی پہچان لیا وہ اس کا ازلی دشمن پرتاب بھوش تھا۔

☆……☆……☆

بڑے جان گسل لمحات تھے دشمن آرمی کا دستہ اس عمارت کے گرد محاصرہ تنگ کرتا جا رہا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ زندہ گرفتاری کی صورت میں انہیں اذیت ناک موت سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کا مشن بھی ناکام ہو جائے گا اور محدود ایمونیشن کے ساتھ آرمی کے اس دستے سے مقابلہ بھی ناممکن تھا۔ اسلحے کے نام پر ان کے پاس صرف 2 پسٹل اور دو رائفلیں تھیں ایک رائفل غلام مصطفیٰ کے پاس جب کہ دوسری رائفل حیدر علی کے ہاتھ میں تھی جبکہ حسن اور ناصر کے پاس پسٹل تھے۔ مقابلہ یا ہتھیار ڈالنے یعنی دونوں ہی صورتوں میں موت یقینی تھی۔ وہ چاروں خاموش کھڑے تھے اور ماحول پر سکوت چھایا ہوا تھا۔

اس سکوت کو غلام مصطفیٰ نے توڑا۔ جو کہہ رہا تھا "دوستو! ہمارے پاس اتنا ایمونیشن نہیں کہ ہم ان کا مقابلہ کر سکیں اور سوچنے کا وقت بھی نہیں میرا مشورہ بلکہ آرڈر ہے کہ تم تینوں عقبی سمت سے نکلنے کی کوشش کرو جبکہ میں انہیں سامنے سے روکتا ہوں۔"

حیدر علی کی بات کاٹتے ہوئے وہ بولا۔ "کرنل توحید کے بعد میں اس گروپ کا لیڈر ہوں اور ڈسپلن کے مطابق تمہیں میرا ہر حکم ماننا پڑے گا۔ اور ہماری زندگیوں سے زیادہ اہم ہمارا یہ مشن ہے اگر تم تینوں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تو دہشت گردی کے اس مرکز کو تباہ کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کر لو گے۔"

اس کے حکم ماننے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ وہ تینوں جانتے تھے کہ غلام مصطفیٰ سچ کہہ رہا ہے ان چاروں کا یہاں محصور ہو کر ڈٹ جانا بہادری نہیں بے وقوفی کہلاتا۔ غلام مصطفیٰ نے رائفل کی نال دیوار میں بنے سوراخ سے باہر نکال کر آگے بڑھنے والے فوجی دستے پر برسٹ فائر کر دیا دو فوجی اس کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔

میجر رام پرشاد نے غصے سے کھولتے ہوئے فائر کھولنے کا حکم دیا۔ پھر تینوں اطراف سے ان پر گولیاں برسائی جانے لگیں۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے فضا گونج رہی تھی۔ وہ بھی وقفے وقفے سے گولیاں چلا کر اپنی موجودگی کا احساس دلا رہا تھا اور تاک تاک کر سامنے آنے والے فوجیوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ جب کہ حسن ناصر اور حیدر علی عقبی سمت پہنچ کر نشیب میں پھسلتے ہوئے

چھوٹے چھوٹے درختوں اور جھاڑیوں میں سے ہوتے ہوئے ایک طرف نکل گئے ادھر غلام مصطفیٰ دشمن کے پانچ چھ اہلکاروں کو واصل جہنم کر چکا تھا پھر اسے میجر رام پرشاد کی آواز سنائی دی۔ ''میں میجر رام پرشاد تم لوگوں کو آخری موقع دے رہا ہوں خود کو ہمارے حوالے کر دو ورنہ ہم اس عمارت کو اڑا دیں گے۔ میرا وچن ہے کہ تمہیں جان سے نہیں مارا جائے گا۔'' وہ شاید میگا فون میں بول رہا تھا۔ کیوں کہ اس کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔

غلام مصطفیٰ نے دونوں ہاتھ منہ کے آگے بھونپو بنایا اور چلا کر جواب دیا۔ ''میجر میں تمہیں وہی تاریخی جواب دوں گا جو ٹیپو سلطان نے انگریز فوج کو دیا تھا۔ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' اس کی آواز عمارت کے درودیوار سے ٹکراتی ہوئی ہوا کے دوش پر لہرا کر چاروں طرف اس طرح گونجی جیسے اس علاقے کی ایک ایک چٹان ایک ایک پتھر بول رہا ہو۔ اور پھر مصطفیٰ نے نعرہ تکبیر بلند کرتے ہوئے ان پر فائر کھول دیا۔ وہ گولیاں برسا رہا تھا آگے بڑھنے کی کوشش کرنے والے مزید جہنم رسید ہو گئے دشمن کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ اتنی سخت مزاحمت کی انہیں توقع نہ تھی دشمن آرمی کا یہ دستہ اس بات سے قطعی آگاہ نہ تھا کہ ان کے مقابلے میں تنہا صرف ایک شخص ہے اور دوسرے وہاں سے نکل چکے ہیں، وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ اتنی زبردست مزاحمت کئی تربیت یافتہ افراد کر رہے ہیں۔

میجر کے حکم پر اس عمارت پر دستی بم پھینکنے کے ساتھ ساتھ راکٹ لانچر بھی فائر کر دیے گئے فضا ہولناک دھماکوں سے گونج اٹھی اور زمین لرز گئی جب کہ عمارت جگہ جگہ سے منہدم ہو کر زمین بوس ہو گئی۔

ادھر وہ تینوں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے رات کے اندھیرے میں یہاں قدم قدم پر دشواریاں اور رکاوٹیں تھیں کہیں راستہ ناہموار تھا اور کہیں زمین اس قدر نرم کہ پاؤں مٹی میں دھنس جائیں، پتوں کی سرسراہٹ سے کسی خطرناک سانپ یا جنگلی جانور کے گزرنے کا گمان ہوتا تھا۔ اور پھر اندھیرا بھی تھا اس سب کے باوجود وہ ہمت اور حوصلے سے آگے بڑھ رہے تھے ان تینوں کے ذہن میں ان دیکھے اندیشے سانپ کی طرح کلبلا رہے تھے کہ نہ جانے غلام مصطفیٰ پر کیا گزری وہ تنہا آرمی کے اس دستے سے مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

اچانک پے درپے تین چار دھماکے ہوئے اور زمین لرز اٹھی عمارت سے کافی فاصلے پر ہونے کے باوجود انہیں ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے زمین ان کے پاؤں کے نیچے سے سرک رہی ہو۔ ''ظالموں نے عمارت کو اڑا دیا۔'' حیدر علی سرد آہ بھر کر بولا۔

وہ تینوں سمجھ چکے تھے کہ غلام مصطفیٰ شہید ہو چکا ہے اور شہید کے لئے نہ تو روتے ہیں اور نہ ہی افسوس کرتے ہیں وہ بھی رکے بغیر چلتے رہے اور اس عمارت سے کافی دور پہنچ گئے مسلسل بھاگنے سے ان کے سانس دھونکنی کی طرح چل رہے تھے اور جسم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا کافی دیر بعد جب وہ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ سے گزرنے لگے تو یکلخت فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری وہ تینوں زمین پر گر گئے اور گولیاں شوں شوں کی آواز سے ان کے قریب سے گزرنے لگیں۔ وہ پھرتی سے جھاڑیوں کے جھنڈ میں جا گھسے۔ فائرنگ رک چکی تھی اور فائرنگ تھمتے ہی سناٹا چھا چکا تھا۔ ویسے بھی چاروں طرف تاریکی کا راج تھا اس گھپ اندھیرے میں کچھ دکھائی بھی نہیں دے رہا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ یہاں وہ حملہ آوروں سے نہیں بچ سکتے۔

کچھ فاصلے پر چار پانچ ٹارچوں کی روشنی لہراتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ انہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہے تھے ان کے ذہن میں ایک ہی سوال مچل رہا تھا کہ نامعلوم حملہ آور کون تھے کیا وہی فوجی دستہ تھا جس نے انہیں اس عمارت میں گھیرا تھا؟

پھر کہیں دور سے انہیں میجر رام پرشاد کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''کہاں گئے وہ مسلے؟ ڈھونڈو

یہاں کہیں ہوں گے انہیں بچ کر نہیں نکلنا چاہئے۔'' وہ بجلی کی سی سرعت سے جھاڑیوں سے نکل کر ایک طرف رینگ گئے۔ اس طرف قدرے نشیبی ڈھلان تھی وہ اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کرالنگ کرتے ہوئے اس کھلے میدان سے نشیبی ڈھلان سے ہوتے ہوئے قد آور جھاڑیوں کی آڑ میں پہنچے اور اٹھ کر بھاگنے لگے۔ مسلسل بھاگنے سے ان کے سانس پھول چکے تھے وہ جھاڑیوں کے جھنڈ سے ہوتے ہوئے ریتیلے میدان میں پہنچ چکے تھے اس میدان میں فاصلے فاصلے سے مٹی کے بڑے بڑے ٹیلے تھے وہ ان ٹیلوں کی آڑ میں پہنچنا چاہتے تھے ان کی کوشش یہی تھی کہ رات کی تاریکی میں ہی آرمی کے دستے سے نجات حاصل کرلیں۔

اچانک عقب سے گولیوں کی سنسناتی ہوئی آواز ابھری۔ خوش قسمتی سے انہیں ایک بھی گولی چھو نہ سکی تھی اور وہ ایک بڑے سے مٹی کے ٹیلے کی آڑ میں دبک گئے گاڑی کی ہیڈ لائٹس دور سے دکھائی دے رہی تھیں وہ ایک بڑے ٹائروں والی جیپ تھی جس پر پانچ چھ فوجی سوار تھے جیپ ان سے فاصلے پر رکی اور اس سے فوجی نیچے اترے۔

''وہ تو صرف پانچ چھ ہیں دوسرے کہاں گئے؟'' سمن نے سرگوشی میں پوچھا۔

''وہ بھی ادھر ہی اردگرد ہمیں ڈھونڈ رہے ہوں گے اور ان پر گولی چلانے کی حماقت مت کرنا ورنہ ہم دھر لے جائیں گے۔'' حیدر علی نے کہا۔

دشمن انہیں اردگرد پھیل کر ڈھونڈ رہا تھا۔ اور وہ دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہے تھے کہ وہ اس ٹیلے کا رخ نہ کریں جس کی آڑ میں وہ مورچہ زن ہیں پھر ان کے دل دھک سے رہ گئے۔ فوجی اسی ٹیلے کی طرف بڑھنے لگے جس کی آڑ میں وہ تینوں موجود تھے۔ حیدر علی نے ان دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور نہایت ہوشیاری اور چابکدستی کے ساتھ دشمن کے پہنچنے سے پہلے اپنی جگہ تبدیل کر کے ایک دوسرے ٹیلے کی آڑ میں پہنچے اور پھر وہاں سے رینگتے ہوئے ٹیلے کا طواف کر کے ایک دوسرے ٹیلے کی آڑ میں جا پہنچے جہاں سے محض چند قدموں کے فاصلے پر فوجیوں کی جیپ موجود تھی۔

اسی وقت گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری انہوں نے مڑ کر دیکھا فوجی اندھا دھند اردگرد کی جھاڑیوں اور ٹیلوں پر برسٹ فائر کر رہے تھے انہوں نے موقع غنیمت جان کر جیپ کی طرف دوڑ لگادی جب تک دشمن ان کی طرف متوجہ ہوتا وہ جیپ میں سوار ہو چکے تھے انجن اسٹارٹ تھا حیدر علی نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہی گیئر لگایا اور ایکسیلیٹر پر پاؤں کا دباؤ بڑھادیا جیپ طوفانی رفتار سے آگے بڑھی فوجیوں نے جیپ کے پیچھے دوڑتے ہوئے ان پر گولیوں کے برسٹ فائر کئے انہوں نے بروقت جھک کر جان بچائی گولیاں سنسناتی ہوئی جیپ کی باڈی سے ٹکرائیں۔

لیکن حیدر علی گولیوں کی برسات میں انتہائی مہارت سے تیز رفتار سے جیپ دوڑاتا ہوا فائرنگ رینج سے باہر نکل گیا۔ ناہموار راستے میں تیز رفتاری کی وجہ سے گاڑی بری طرح ڈگمگا رہی تھی اور ہچکولے کھا رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی لمحے جیپ الٹ جائے گی مگر خیریت گزری اور ایسا کچھ نہیں ہوا اور وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تقریباً نصف گھنٹے بعد ہی جیپ جھٹکا کھا کر رکی تو حیدر علی نے اطلاع دی کہ ''فیول ختم ہو چکا ہے۔''

اب پیدل چلے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا۔ کافی دیر چلنے کے بعد وہ ستانے کے لئے رکے ایک جگہ بیٹھ کر حیدر علی نے اپنے کٹ بیگ میں سے ایک بوتل نکالی اور سمن سے کہا۔ ''اس محلول کو اپنے جسم پر اچھی طرح ملنے کے بعد کسی کپڑے سے پونچھ لو۔''

''یہ کیا ہے؟'' سمن نے سفید رنگ کے محلول کو دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

''اس سے تم اپنی اصل شکل وصورت میں آجاؤ گے یہ بہت ضروری ہے کیوں کہ اشوک کمار بس میں تمہیں نیگرو کے روپ میں دیکھ چکا ہے۔'' حیدر علی نے جواب دیا اور سمن اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگا

حیدر علی اور ناصر نے بھی اپنا میک اپ صاف کرلیا۔

کچھ دیر قیام کے بعد وہ اٹھ کر آگے بڑھے ہی تھے کہ انہیں کچھ فاصلے سے کوئی دوڑتا ہوا اپنی طرف آتا دکھائی دیا وہ ٹھٹک کر رک گئے حیدر علی نے رائفل اور ناصر اور سمن نے پسٹل آنے والے پر تان لئے پھر وہ قریب آیا تو سمن ششدر رہ گیا وہ رادھا تھی جو قریب آکر اسے پہچان کر اس سے لپٹ گئی اور رونے لگی ناصر اور حیدر علی حیرت سے یہ منظر دیکھ رہے تھے سمن نے اسے بمشکل خود سے الگ کیا۔ ''تم رات کے اس پہر اس ویرانے میں کیا کررہی ہو اور تمہاری یہ حالت کس نے بنائی؟'' وہ رادھا کا جائزہ لیتے ہوئے بولا جس کے بال منتشر تھے چہرے پر خراشوں کے نشانات تھے اور لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ سمن نے اپنی جیکٹ اتار کر اسے پہنادی۔

''تمہارے جانے کے دوسرے روز وہاں پولیس نے ریڈ کیا اور مجھے گرفتار کرنے کے بعد آرمی کے حوالے کردیا گیا پھر وہاں سے مجھے یہاں راجستھان میں لایا گیا جہاں درجنوں کی تعداد میں لڑکے اور لڑکیوں کو دہشت گردی کی تربیت دی جاتی ہے وہ رات دن مجھے نوچنے کھسوٹنے کے بعد تم لوگوں کے بارے میں پوچھتے تھے، آج میں میجر رام پرشاد کے کمرے میں تھی وہ جیسے ہی شراب کے نشے میں دھت ہوا میں وہاں سے بھاگ نکلی اور بھگوان کی کرپا سے وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔

وہ تینوں چونک پڑے تھے نادانستگی میں وہ دشمن آرمی سے بھاگتے ہوئے اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ''ان کا وہ ٹریننگ سینٹر کہاں ہے؟''

سمن نے بے تابی سے پوچھا۔

''میں ایک خفیہ راستہ جانتی ہوں یہ ایک سرنگ ہے جو ٹریننگ سینٹر تک جارہی ہے مجھے بھی فرار ہوتے ہوئے اتفاقاً ہی نظر آگئی تھی مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''رادھا یہ دہشت گردی کا مرکز ہے جہاں جدید ترین ہلاکت خیز اسلحہ بھاری مقدار میں موجود ہے۔ یہاں سے اسلحہ پاکستان اسمگل کر کے دہشت گردوں تک پہنچایا جاتا ہے اور اس اسلحہ سے وہاں دہشت گرد معصوم بچوں عورتوں اور بے گناہ لوگوں کا قتل عام کرتے ہیں۔ اس ٹریننگ سینٹر میں نوجوان لڑکوں کو برین واش کر کے دہشت گردی کی ٹریننگ دی جاتی ہے۔ یہ ظالم لوگ لڑکوں کا ذہن اس قدر تبدیل کرلیتے ہیں کہ وہ انسانی روبوٹ ان درندوں کے حکم پر خودکش جیکٹ جسم سے باندھ کر اپنی جان دینے کے ساتھ ساتھ سینکڑوں لوگوں کو ہلاکت میں ڈال دیتے ہیں ہمارا مشن دہشت گردی کے اس کیمپ کا خاتمہ ہے اور اس مشن کی خاطر ہم اپنے دو جانثاروں سے محروم ہوچکے ہیں ان میں سے ایک میرے والد تھے۔''

''ٹھیک ہے میں تمہیں وہاں لے چلتی ہوں مگر تم تین افراد ایک رائفل اور دو پسٹل کے بل پر ان سے کیسے مقابلہ کرو گے؟ وہ درجنوں کی تعداد میں تربیت یافتہ فورس کے اہلکار ہیں اور پھر ان کے پاس جدید اور مہلک ہتھیار ہیں۔''

سمن مسکرایا اور بولا۔ ''رادھا حق کی خاطر لڑنے کے لئے طاقت اور اسلحہ کی نہیں حوصلے ہمت اور عزم کی ضرورت ہوتی ہے، ہمارا مقصد نیک ہے، انشاءاللہ خدا ہماری مدد کرے گا۔''

وہ رادھا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے لگے۔

کچھ دیر بعد رادھا ایک چھوٹی سی پہاڑی کے قریب جھاڑیوں کے جھنڈ کے پاس جارکی۔ ''اس جھنڈ میں سرنگ ہے۔'' رادھا نے کہا اور وہ بلا جھجک جھاڑیوں کے جھنڈ میں جاگھسے۔

ایک طرف زمین پر بڑا سا سل نما پتھر تھا۔ رادھا کے کہنے پر سمن وہ بھاری پتھر ایک طرف سرکایا تو تین بائی چار کا خلا نظر آیا وہ باری باری اس خلاء میں اتر گئے یہ سرنگ نما راستہ تھا جو آگے جاکر کشادہ ہوگیا اب وہ اس سرنگ میں باآسانی چل سکتے تھے وہ اندھیرے کے باوجود بنا رکے چلتے رہے اس سرنگ کا خاتمہ ایک وسیع و عریض ہال نما کمرے میں ہوا یہاں بھی تاریکی تھی۔

"اب کہاں جانا ہے؟" سمن نے سرگوشی کی۔

اچانک کمرہ روشن ہوگیا اور وہ تینوں ششدر رہ گئے کمرے میں میجر رام پرشاد سمیت چھ سات افراد موجود تھے جن کے ہاتھوں میں جدید ساخت کی خودکار رائفلیں تھیں۔ انہوں نے ننجا اسٹائل کے بلیک کلر کے یونیفارم پہن رکھے تھے اور چہرے پر نقاب تھے۔

"اب تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں اپنے ہتھیار پھینک دو۔" میجر رام پرشاد غرایا تو انہوں نے اپنے ہتھیار پھینک دیئے۔

"کیا رادھا نے انہیں پھنسایا ہے؟" سمن نے سوچا اور بے بسی سے میجر رام پرشاد اور سیاہ پوشوں کو دیکھا جن کی مہیب گنوں کا رخ ان کی طرف تھا اور انگلیاں ٹریگر پر تھیں۔ ان کی انگلی کی معمولی سی جنبش انہیں موت سے ہمکنار کرسکتی تھی۔

"کس سوچ میں پڑ گئے۔ اتنا زیادہ مت سوچو ابھی تو میرے پاس تمہارے لئے بہت سے سرپرائز ہیں، پہلا سرپرائز تو یہ رادھا ہے جو تمہیں یہاں ٹھیر کرلائی ہے اور ذہن سے اس غلط فہمی کو نکال دو کہ یہ ہماری ساتھی ہے تم نے اس کے گھر میں کچھ گھنٹوں کے لئے پناہ لی تھی اور اس کے ساتھ بڑے رنگین اور سنگین لمحات گزارے تھے پھر تم وہاں سے چلے گئے اور پولیس کی نااہلی کی وجہ سے اس علاقے سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے تھے تمہیں اس کی ملازمہ مانی تو یاد ہوگی وہ دیش پریمی نکلی، پہلے دن تو خاموش رہی، دوسرے روز پولیس کو اطلاع دے دی اسے گرفتار کرلیا گیا وہاں سے خفیہ والے اسے لے گئے۔

مجھے پتہ چلا تو رادھا کو اپنی تحویل میں لے لیا پھر میرے ہی حکم پر اس کی پانچ سالہ بیٹی کو بھی یہاں پہنچادیا گیا ادھر تم راجستھان آتے ہوئے بس میں میرے ایک کارندے اشوک کمار کی نظر میں آگئے اور اس نے چالاکی سے تمہارے لباس میں حساس ڈیوائس جوکہ اسٹیکر کی شکل میں تھی چپکادی۔ پھر تم لوگ ہماری نظروں میں تھے۔ اس عمارت پر میرے دستے نے ریڈ کیا تو توقع کے برخلاف وہاں زبردست مزاحمت ہوئی اور میرے دستے کے کئی جوان مارے گئے تو میں نے سوچا اس عمارت میں آتنک وادی آٹھ نو تو ضرور ہوں گے اس عمارت کو دستی بموں اور راکٹ لانچروں سے اڑادیا گیا وہاں صرف تمہارے ایک ساتھی کی لاش ملی تب پتہ چلا کہ تم سب بھاگ گئے ہو اور ہم سے صرف ایک ہی شخص مقابلہ کررہا تھا۔"

وہ بولتے بولتے لمحہ بھر کے لئے رکا تو سمن بول اٹھا۔ "میجر رام پرشاد غلام مصطفیٰ سے مقابلہ کرتے وقت تم اور تمہارے ساتھی اتنا تو جان چکے ہوں گے کہ سو گیدڑ مل کر بھی ایک شیر کا شکار نہیں کرسکتے اور ہم وہاں سے تم سے ڈر کر نہیں بھاگے تھے جھپٹنے کے لئے پلٹے تھے پلٹنا، جھپٹنا، جھپٹ کر پلٹنا لہو گرم کرنے کا ہے اک بہانہ۔

ان سنگین لمحات میں بھی حیدر علی اور ناصر ہنس پڑے انہوں نے دیکھا توہین آمیز باتوں کے باوجود میجر رام پرشاد مسکرا رہا تھا۔ "بولو خوب بولو جتنا چہک سکتے ہو چہک لو کچھ دیر بعد تم نے رونا بھی ہے ہاں تو میں کہہ رہا تھا اسکے بعد تم ریتیلے میدان میں دیکھ لئے گئے یہاں سے میں نے اپنی پلاننگ میں تھوڑی سی تبدیلی کی اور تمہارے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیلا۔

تمہیں وہاں سے جان بوجھ کر فرار ہونے کا موقع دیا گیا شاید تم لوگوں نے غور نہیں کیا وہاں تم تینوں پر گولیوں کی بارش ہوئی مگر ایک بھی گولی تمہیں چھو نہ سکی۔ گولیاں چلانے والے نہ اناڑی تھے اور نہ ہی تم تینوں سپر ہیرو جو گولیوں کی برسات میں وہاں سے باآسانی فرار ہوگئے۔

کلدیپ ہمارے قبضے میں تھی رادھا کو اس کی جان بچانے کے لئے مجبوراً ہماری بات ماننا پڑی۔ اور وہ ٹھیر کر تمہیں یہاں لے آئی اب تمہارے لئے ایک سرپرائز اور بھی ہے لیکن اس کے لئے تمہیں باہر چلنا پڑے گا۔" رام پرشاد کے اشارے پر ایک سیاہ پوش نے کمرے کا دروازہ کھولا۔

وہ کمرے سے باہر نکلے تو ایک وسیع و عریض

میدان میں کھڑے تھے مسلسل بھاگ دوڑ سے رات اختتام پذیر ہو رہی تھی اور صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا تینوں اطراف سے پہاڑیوں میں گھرے اس وسیع وعریض میدان میں طلوع آفتاب کا منظر بڑا خوشنما تھا۔ چوتھی سمت خاردار تاریں تھیں وہاں آٹھ دس منجا اسٹائل سیاہ پوش گنیں لئے چوکنے کھڑے تھے۔ ایک جگہ درجنوں کی تعداد میں لڑکے کراٹے کے مخصوص لباس میں کھڑے تھے ان کا انسٹریکٹر انہیں ایکسائز کروا رہا تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر نشانہ بازی کی تربیت دی جا رہی تھی۔

وہ ان تینوں کو اس میدان کے عین وسط میں لے گئے جہاں پچاس ساٹھ لڑکے مختلف قطاروں میں سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر بنی لال اور اشوک کمار موجود تھے۔ چند رائفل بردار سیاہ پوش وہاں بھی تعینات تھے حالانکہ اس کی ضرورت نہ تھی کیونکہ سلمان حیدر علی اور ناصر نہتے تھے اور پھر اس احاطے میں درجنوں مسلح سیاہ پوش گشت کر رہے تھے۔

''ان لڑکوں کو غور سے دیکھو۔'' رام پرشاد نے عجیب سے لہجے میں کہا تو وہ تینوں اس گروپ کی طرف مڑے مختلف قطاروں میں کھڑے لڑکے لڑکیاں ٹراوزر پہنے ہوئے تھے اور شرٹ پر عجیب ساخت کی جیکٹ موجود تھی ان کے چہروں پر بھی نقاب تھے۔

''نمبر ٹوئنٹی فائیو اور نمبر ٹوئنٹی سکس قطار سے باہر نکل کر سامنے آؤ۔'' بنسی لال نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور دو نقاب پوش لڑکیاں ایک قطار سے نکلیں اور روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی ان سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہو گئیں نہ جانے کیوں ان لڑکیوں کو دیکھ کر سلمان کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔

''نقاب اتار دو۔'' بنسی لال نے دوسرا حکم دیا۔

دونوں لڑکیوں نے جیسے ہی چہرے سے نقاب اتارا سلمان حیرت زدہ رہ گیا وہ ابرش اور بریرہ تھیں جو کسی روبوٹ کی طرح ساکت جامد کھڑی اگلے حکم کی منتظر تھیں ان کے چہرے بے تاثر تھے اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔

سلمان بے اختیار ان کی طرف بڑھا ہی تھا کہ رام پرشاد نے سرد لہجے میں کہا۔ ''رک جاؤ ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ ان کی موت بھی حیرت ناک ہوگی۔''

وہ وہیں رک گیا مگر اس کی نظریں بدستور ابرش اور بریرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ جن کی نگاہوں میں اس کے لئے اجنبیت تھی۔

''یہ ہمارے تیار کردہ انسانی بم ہیں جو سوائے ہمارے کسی کو نہ جانتے ہیں اور نہ ہی پہچانتے ہیں نہ ہی ان کے کوئی احساسات ہیں یہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر محروم ہیں۔ ہم انہیں جو حکم دیں گے اس پر یہ بلا جھجک عمل کریں گے یہی ہتھیار ہم جہاں چاہتے ہیں بھیجتے ہیں پھر یہ ہمارے حکم پر ہدف پر پہنچ کر خود کو ختم کر ڈالتے ہیں اور ہمارے دشمن کو ناکافی نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان دونوں کو جب یہاں لایا گیا تو انہوں نے اپنی عزت بچانے کے لئے ہمارے خودکش اسکواڈ کا حصہ بننے کے لئے رضامندی ظاہر کر دی۔ اسی طرح کے ہمارے دوسرے اسکواڈ کے تربیت یافتہ دہشت گرد بھی تمہارے ہی ملک کے نوجوان ہیں جنہیں ہم برین واش کر کے ان کے ذہنوں میں اپنے دشمن کے لئے زہر بھر دیتے ہیں نسلی تعصب کا زہر فرقہ واریت کا زہر اور پھر انہیں ٹریننگ دے کر مطلوبہ جگہ بھیجتے ہیں جہاں یہ اپنے ہی ہم وطنوں پر ہمارے ہتھیار آزماتے ہیں۔ اس کیمپ میں اتنا اسلحہ موجود ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔

''اب تم عملی مظاہرہ دیکھو کہ یہ انسانی بم ہمارے ایک اشارے پر خود کو کیسے اڑائیں گے۔''

پھر میجر رام پرشاد نے بنسی لال کی طرف دیکھا تو بنسی لال نے پکارا۔ ''نمبر ٹوئنٹی فائیو اور نمبر ٹوئنٹی سکس۔''

ان تینوں کے دل تیزی سے دھڑکنے لگے خاص کر سلمان کی حالت غیر ہونے لگی گویا یہ شیطان ابرش اور بریرہ کو ان کے سامنے اڑانے والے تھے اور وہ ان دونوں کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے تھے کیوں کہ

ان کے چاروں طرف درجنوں بلیک کیٹ کے مسلح کارندے موجود تھے۔

☆......☆......☆

پولیس اہلکار پہاڑی کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے تھے اور پرتاب بھوش بھی چند پولیس اہلکاروں کے ساتھ پہاڑی پر چڑھ رہا تھا بڑے کٹھن لمحات تھے اس کا مقصد اچھا اور ارادے نیک تھے وہ دکھی انسانوں کے کام آنے کے لئے اس پہاڑی پر موجود تھا لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر پولیس نے اسے حراست میں لے لیا تو ساری زندگی دشمن کی کسی جیل میں سڑتا رہے گا وہ پریشان سا حجرے میں داخل ہوا تو ٹھٹھک کر رک گیا، باباجی حجرے میں کھڑے تھے۔ "پریشان مت ہو اور ایک طرف آرام سے بیٹھ جاؤ۔" باباجی نے حکم دیا۔

تو وہ ایک کونے میں دو زانو ہو کر بیٹھ گیا باہر سے لوگوں کے چیخنے پکارنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ یہ پہاڑی پر موجود باباجی کے عقیدت مند تھے جو پولیس اہلکاروں کی راہ میں مزاحم ہو رہے تھے گویا اس کی گرفتاری کے لئے قانون کی ساری مشینری حرکت میں آچکی تھی۔

پرتاب بھوش نے جب دیکھا کہ اتنے عرصے سے وہ شاہ زین پر قابو نہیں پاسکا تو اس نے قانون کی مدد لی تھی۔ شاہ زین اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ ہندو پولیس ایک مسلمان کے مقابلے میں ہندو پنڈت کا ساتھ دے گی۔ نتیجے مزید زیادہ دیر تک پولیس کو حجرے میں داخل ہونے سے نہیں روک سکے اور ڈی ایس پی رینک کا آفیسر نصف درجن مسلح اہلکاروں کے ساتھ حجرے میں داخل ہوا ان کی نگاہیں باباجی پر مرکوز تھیں پھر ڈی ایس پی آگے بڑھا اور درشت لہجے میں باباجی سے مخاطب ہوا۔ "تم کون ہو اور شاہ زین کہاں ہے؟"

گویا پولیس اہلکار شاہ زین کو دیکھنے سے قاصر تھے۔ شاہ زین سمجھ گیا کہ یہ سب باباجی کی روحانیت کا کمال تھا۔ "شاہ زین میرا شاگرد ہے۔ تم خود دیکھ لو اگر نظر آئے تو گرفتار کر لینا لیکن مجھے اس کا جرم تو بتا دو۔" باباجی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"وہ یہیں کہیں اسی پہاڑی پر موجود ہے ہمیں اس کا پتہ بتادو تو یہ تمہارے لئے بہتر ہوگا وہ مجرم ہے تم زیادہ دیر تک اسے نہیں چھپا سکو گے۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"ڈی ایس پی میں نے تم سے یہ پوچھا ہے کہ شاہ زین کا جرم کیا ہے؟ اور رہا یہ سوال کہ وہ یہاں کہیں ہے تو تم اس حجرے سمیت پہاڑی کے چپے چپے کی تلاشی لے سکتے ہو۔"

"اس دشٹ نے پنڈت بھگت رام سمیت پانچ پجاریوں کی ہتھیا کی ہے۔ پر تو تم کون ہو اور یہاں کر رہے ہو؟" ڈی ایس پی رعونت بھرے لہجے میں بولا۔

"میرا نام محمد الیاس ہے اور میں برسوں سے اپنے اس حجرے میں اللہ کی عبادت میں مصروف ہوں رہا سوال شاہ زین کا تو وہ تمہیں یہاں ملتا ہے تو پکڑ کر لے جاؤ۔" شاہ زین خاموش بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔

"وہ ہماری نظروں سے بچ کر کہاں جائے گا، درجنوں پولیس اہلکار اس پہاڑی کے چپے چپے کی تلاشی لے رہے ہیں اسے بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔" ڈی ایس پی نے کہا، اسی وقت پرتاب بھوش حجرے میں داخل ہوا مگر دوسرے ہی لمحے باباجی کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اپنی دانست میں وہ شاہ زین کو پھنسا چکا تھا۔ اس کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ باباجی بھی اس حجرے میں موجود ہو سکتے ہیں وہ کچھ دیر تک انہیں گھورتا رہا پھر ڈی ایس پی کی طرف متوجہ ہوا۔ "مہاشے تم نے اب تک اس ملیچھ کو کیوں نہیں گرفتار کیا۔"

"مہاراج اس حجرے میں داخل ہونے پر ہمیں یہ بوڑھا نظر آیا۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی نہیں تھا۔" ڈی ایس پی نے مودب لہجے میں جواب دیا۔

"یہاں موجود نہیں؟ کیا تم سب اندھے ہو گئے ہو، وہ دیکھو حجرے کے کونے میں ٹیک لگائے بیٹھا ہے اسے پکڑ لو۔" وہ شاہ زین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

شاہ زین کو اس سے خطرہ محسوس ہونے لگا۔ گویا

وہ اسے بخوبی دیکھ سکتا تھا پرتاب بھوش کوئی معمولی پنڈت پجاری نہیں تھا۔ وہ اس پہاڑی پر باباجی کے لئے بھی مشکلات کھڑی کر سکتا تھا۔ ادھر ڈی ایس پی حیرت سے کہہ رہا تھا۔ ''کون مہاراج یہاں تو ہمیں آپ اور اس بوڑھے کے علاوہ کوئی دوسرا نظر نہیں آرہا۔''

''کیا کہا تمہیں نظر نہیں آرہا وہ دیکھو وہ سامنے بیٹھا ہے۔ جس نے پانچ پجاریوں کی ہتھیا کی تھی۔'' پرتاب بھوش جھلا کر بولا۔

''مہاراج آپ کا دماغ تو نہیں خراب ہوگیا میں کہہ رہا ہوں کہ یہاں آپ دونوں اور ہمارے علاوہ کوئی دوسرا نہیں۔'' ڈی ایس پی زچ ہوگیا۔

''اوہ میں سمجھ گیا یہ سب اس پاپی کے کارن ہو رہا ہے۔ اس نے تمہاری نظروں کے سامنے پردہ ڈال دیا ہے میں ابھی اس کا توڑ کرتا ہوں۔'' اس نے منتر پڑھتے ہوئے شاہ زین کی طرف ہاتھ جھٹکے۔

''پرتاب بھوش اپنی اوقات میں رہو ورنہ نقصان اٹھاؤ گے تم بار بار شاہ زین کے راستے میں آتے ہو اور شکست کھاتے ہو اس کے باوجود باز نہیں آتے۔ لیکن میری ایک بات یاد رکھنا حق حق ہے باطل بظاہر جتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو فتح بالآخر حق کی ہی ہوتی ہے۔'' باباجی نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

''بڈھے میرے سامنے تیرا کوئی چمتکار نہیں چلے گا اس دُشٹ نے پنڈت پجاریوں کے خون سے ہاتھ رنگے ہیں۔ اب اس کی کوئی بھی سہایتا نہیں کر سکتا۔''

''پرتاب بھوش تم شاہ زین کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ تم اپنی تمام تر تپیا اور گیان دھیان کے باوجود مجھ سے ناواقف ہو۔'' باباجی نے اس پر نظریں جما کر بولے۔

''بڈھے زیادہ باتیں مت بنا اور سیدھی طرح بتا تو نے اسے کہاں چھپا رکھا ہے۔'' ڈی ایس پی غرایا۔

''اپنے اس شکستی مان پنڈت سے کیوں نہیں پوچھتے۔'' باباجی نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ پرتاب بھوش اور ڈی ایس پی سے قطعی مرعوب نہ تھے۔

''تم دیکھ لینا میں اسے کیسے یہاں سے گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔'' پرتاب بھوش غصے سے بولا۔

''شیطان کی عمر طویل سہی لیکن انجام بہت برا ہے۔'' باباجی جلال میں آچکے تھے۔

پرتاب بھوش نے باباجی کی بات کا جواب دیئے بغیر منتر پڑھا اور اپنے دائیں ہاتھ کو جنبش دی اور شاہ زین کی طرف اشارہ کیا باباجی نے نیچے بیٹھ کر حجرے کے وسط میں عمودی لکیر کھینچی اور پرتاب بھوش کی طرف دیکھا۔

''بڈھے اب تو اسے نہیں بچا سکتا میں خود اسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کردوں گا۔ ڈی ایس پی تم اس بڈھے کو گرفتار کرلو میں خود اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں۔'' وہ ایک قدم مزید آگے بڑھ کر بولا۔

''رک جاؤ آگے مت بڑھنا ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔'' باباجی نے اسے تنبیہ کیا۔

''دیکھ رہے ہو ڈی ایس پی میں سچ کہہ رہا ہوں وہ ملیچھ سامنے موجود ہے تم صرف اس بڈھے کو قابو کرو باقی سب مجھ پر چھوڑ دو۔''

ایک تنومند سپاہی ہتھکڑی لے کر باباجی کی طرف بڑھا اس نے باباجی کی کلائی کو ہاتھ لگایا ہی تھا کہ چیختا ہوا ایک طرف جا گرا۔ دوسرے کا بھی یہی حشر ہوا تو پولیس اہلکاروں نے باباجی کی طرف رائفلیں تان لیں پرتاب بھوش تیزی سے شاہ زین کی طرف بڑھا ہی تھا کہ کسی نادیدہ چیز سے ٹکرا کر گر پڑا۔ جب وہ اٹھا تو غصے سے کانپ رہا تھا۔

''کیا ہوا مہاراج؟'' ڈی ایس پی آگے بڑھا۔

''یہ بڈھا کالی کے مہان سیوک سے یدھ (جنگ) کرنا چاہتا ہے پرنتو یہ نہیں جانتا میں اسے نشٹ کر سکتا ہوں۔'' اس نے منتر پڑھتے ہوئے اپنا دایاں پاؤں اوپر اٹھا کر زمین پر مارنا شروع کردیا۔ حجرے کے در و دیوار لرزنے لگے۔ اور چیخوں کی خوفناک آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہزاروں بدروحیں مل کر چیخ رہی ہوں پولیس اہلکار بھی ڈی ایس پی سمیت سہم کر ایک طرف دبک گئے تھے۔ جب کہ باباجی

با آواز بلند قرآنی آیات کا ورد کر رہے تھے حقیقت یہ تھی کہ اس بار شاہ زین بھی خوف زدہ ہو چکا تھا۔ یہ ماورائی قوتوں کی لڑائی تھی جو اس وقت زوروں پر تھی پرتاب بھوش مسلسل منتر پڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں اور حجرہ بھیانک قسم کی چیخ و پکار سے گونج رہا تھا پولیس اہلکاروں کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے وہ سہمے ہوئے کھڑے تھے۔ یہ شور کافی دیر جاری رہا پھر خاموشی چھا گئی۔

بابا جی کی آواز گونجی۔ ''تمہارے سارے بیر تو گئے کام سے اب کیا کرو گے۔''

پرتاب بھوش نے ڈنڈوت کیا اور کالی کا فلک شگاف نعرہ بلند کر کے اپنے سر سے چند بال توڑ کر زمین پر پھینکے، پولیس اہلکار حیرت اور خوف سے ایک طرف سمٹ گئے زمین پر پانچ چھ خوف ناک قسم کے سانپ پھنکارتے ہوئے بابا جی کی طرف بڑھ رہے تھے، بابا جی نے اطمینان سے وظیفہ پڑھتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا پانچ چھ نیولے نمودار ہوئے اور سانپوں سے بھڑ گئے۔

ڈی ایس پی اور دیگر پولیس اہلکار پھٹی پھٹی نگاہوں سے سانپوں اور نیولوں کا مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ جو زیادہ دیر جاری نہ رہا اور نیولوں نے لمحوں میں سانپوں کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ پھر سانپ اور نیولے دونوں ہی غائب ہو گئے۔ پرتاب بھوش نے اس کے بعد بھی جادو کے مہلک ترین وار کیے مگر ناکام رہا۔

بابا جی نے حق اللہ کا نعرہ بلند کیا تو گھپ اندھیرا چھا گیا۔ پھر بابا جی نے آگے بڑھ کر شاہ زین کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اب تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں اپنی آنکھیں بند کر لو اور جب تک میں نہ کہوں اپنی آنکھیں مت کھولنا۔''

شاہ زین نے جیسے ہی آنکھیں بند کیں تو اس نے خود کو کسی پرندے کی طرح ہوا میں اڑتا ہوا محسوس کیا۔

''وہ بھاگ رہے ہیں گولیاں چلاؤ۔'' پرتاب بھوش کی چلاتی ہوئی آواز سنائی دی اور حجرہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھا۔ کچھ دیر بعد شاہ زین نے محسوس کیا کہ وہ حجرے سے باہر نکل چکے ہیں اور فضا میں اڑ رہے ہیں یہ شاہ زین کی زندگی کا حیرت انگیز تجربہ تھا اسے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ یا کوئی ماورائی طرز کی ہارر موی دیکھ رہا ہو، جس میں جن اور پریاں پرندوں کی طرح اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ دیر بعد اس کے پاؤں زمین سے ٹکرائے پھر بابا جی کی آواز ابھری۔

''اب آنکھیں کھول دو۔''

شاہ زین نے آنکھیں کھولیں تو وہ ایک سنسان علاقے میں کھڑا تھا اور بابا جی غائب تھے۔ ابھی اسے وہاں کھڑے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ قریب ہی کہیں سے دل دہلا دینے والا دھماکہ سنائی دیا اور زمین لرز اٹھی۔ یہ لرزش اس قدر زیادہ تھی کہ شاہ زین لڑکھڑا کر منہ کے بل گرا۔ اور پھر وقفے وقفے سے زوردار دھماکوں سے فضا گونج اٹھی اور زمین لرزنے لگی۔ شاہ زین اٹھنے کی کوشش میں دوبارہ گر پڑا اور سر اٹھا کر دیکھا تقریباً سو گز دور سے آگ کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دے رہے تھے کچھ فاصلے سے ایک بڑے ٹائروں والی جیپ تیز رفتاری سے دوڑتی ہوئی اسی طرف آرہی تھی جیپ میں سوار افراد کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا اسے زمین و آسمان اپنی نگاہوں کے سامنے گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔

☆...☆...☆

خوف اور گھبراہٹ سے [illegible] کے چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا اسے اپنی موت کا ڈر نہیں تھا۔ وہ اس شہید سپاہی کا بیٹا تھا جو انجام سے بے پرواہ دشمن بھیڑیوں کے غول میں جا گھسا تھا اور مرتے مرتے بھی دشمنوں کو ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔ اسے یہی خطرات لاحق تھے کہ کہیں بنسی لال ان دونوں لڑکیوں کو خود کش حملے کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے تو منتخب نہیں کر چکا۔ یہ سوچتے ہی اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنسی لال نے ایسا کوئی قدم اٹھایا تو وہ انجام سے بے پرواہ ان پر پل پڑے گا۔ چاہے اس کے نتیجے میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ لیکن خیریت گزری ایسا کچھ نہیں ہوا۔ بنسی

لال نے پکارا۔ "نمبر نوٹی سکس اور نمبر ٹوٹی فائیو تم دونوں اپنی قطار میں لوٹ جاؤ، وہ دونوں اپنی قطار میں جا کر کھڑی ہوگئیں پھر ان کی سماعت سے بنسی لال کی مخصوص بھاری آواز ٹکرائی۔" نمبر الیون قطار سے باہر آؤ۔"

ایک نقاب پوش قطار سے نکل کر باہر آ گیا۔ اس نے عجیب ساخت کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ "ریڈ پوائنٹ پر جا کر کھڑے ہو جاؤ۔" بنسی لال نے ایک طرف اشارہ کیا تو وہ ان سے کافی دور جا کر ایک سنسان جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ بنسی لال اس کی طرف اشارہ کر کے دھاڑا۔ "ہارا کاری۔"

لفظ ہارا کاری سنتے ہی نمبر الیون نے جیکٹ پر ہاتھ رکھا اس کے ساتھ ہی سماعت شکن دھماکہ ہوا اور نمبر الیون کے جسم کے پرخچے اڑ گئے۔ ساتھ ہی زمین لرز اٹھی۔ گرد و غبار کا بادل سا چھا گیا تھا جس جگہ نمبر الیون کھڑا تھا۔ وہاں گڑھا بن گیا تھا وہ نمبر الیون سے کافی فاصلے پر تھے اس لئے کسی بھی قسم کے جانی نقصان سے محفوظ رہے۔ اس وسیع و عریض احاطے میں موت کا سا سکوت چھا گیا تھا۔" یہ معمولی نوعیت کا دھماکہ خیز مواد تھا۔ اس لئے ہم سب محفوظ رہے تم نے یہ بھی دیکھ لیا ہوگا کہ نمبر الیون نے میرے حکم پر بلا جھجک خود کو اڑا دیا۔ کیوں کہ اس کا دماغ میرے تابع تھا اور اگر میں زبان سے نہ کہتا اور اسے سوچ کے ذریعے حکم دیتا تب بھی وہ وہی کرتا جو اسے حکم دیا گیا تھا۔"

"گویا تم ٹیلی پیتھی اور ہپناٹزم پر عبور رکھتے ہو۔" سمن نے پرخیال انداز میں گردن ہلائی۔

"انسانی جسم میں سب سے بڑی شکتی دماغ میں ہے۔ ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم، مسمریزم، اور اسی طرح کے دیگر علوم کا تعلق دماغ سے ہے بس صرف خیال کے بے لگام گھوڑے پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ تم دیکھو گے ایک روز دنیا پر ہماری حکومت ہوگی۔" وہ ہذیانی انداز میں ہنسا۔

"تمہارے جیسے کئی پاگل دنیا میں آئے اور چلے گئے فرعون، نمرود، قارون، چنگیز خان، انہوں نے بھی تمہاری طرح خدائی دعوے کئے تھے انجام کیا ہوا وہ رہتی دنیا تک کے لئے عبرت کا نشان بن کر رہ گئے۔ انسان وہی ہے جو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو انسانیت کی بھلائی کے کام میں لائے۔ ورنہ اس میں اور جانور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔" ان کی گفتگو میں حیدر علی نے دخل دیا۔

اور میجر رام پرشاد نے غصے سے اس کی طرف دیکھا اس کا چہرہ خون کی سرخی سے دمکتا نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں کا تیکھاپن ظاہر کرتا تھا کہ وہ سخت گیر طبیعت کا مالک ہے۔ وہ بلیک کیٹ کے ایک سیاہ پوش کی طرف دیکھ کر غرایا۔ "انہیں سیل نمبر تھری میں لے جا کر خاطر خواہ تواضع کرو تاکہ ان کے دماغ ٹھکانے آ جائیں۔"

سیل نمبر تھری ایک لاک اپ نما کمرہ تھا۔ جس کا دروازہ آہنی سلاخوں کا تھا۔ انہیں کمرے میں لے جا کر ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے اور منہ پر ٹیپ لپیٹنے کے بعد پاؤں میں رسی باندھ کر کر چھت لگے ہکوں سے الٹا لٹکا دیا گیا۔ اور کمرے میں تیز روشنی والا بلب جلا دیا گیا تھا۔ روشنی اس خوف ناک حد تک تند و تیز تھی کہ اس میں آنکھیں کھولنا مشکل ہو رہا تھا اوپر سے وہ ذبح کئے ہوئے بکرے کی مانند الٹے لٹک رہے تھے۔ وہ سمجھ گئے یہ بھی اعصاب شکنی کا مرحلہ ہے۔ نہایت ہی اذیت ناک اور اعصاب شکن صورتحال تھی لمحہ بہ لمحہ ان کی اذیت اور تکلیف میں اضافہ ہونے لگا۔ سیاہ پوش انہیں بند کر کے جا چکے تھے۔

کمرے سے باہر کچھ فاصلے پر ایک دوسرا سیاہ پوش رائفل ہاتھ میں لئے کرسی پر بیٹھا تھا۔

ادھر رادھا میجر رام پرشاد سے التجا کر رہی تھی" آپ نے جیسا کہا میں نے ویسا ہی کیا اب آپ بھی اپنا وچن پورا کریں اور میری بیٹی کو میرے حوالے کر دیں اور جانے دیں۔"

رام پرشاد کرسی سے اٹھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "تم پریشان مت ہو چند روز ہمیں بھی سیوا کرنے کا موقع دو۔" پھر اس نے کسی شنکر نامی شخص

کو پکارا ایک قوی ہیکل سیاہ پوش نمودار ہوا۔

"اسے کسی کمرے میں منتقل کردو۔" اس نے حکم دیا۔ رادھا کو ایک بارہ بائی بارہ کے کمرے میں پہنچادیا گیا۔ اس کمرے میں ایک ڈبل بیڈ پڑا تھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھ کر اپنی قسمت کو کوسنے لگی۔ سمن کو پناہ دینا اور اس کی سنگت میں گزارے چند خوشگوار لمحات کی اسے بھاری قیمت چکانی پڑی تھی۔ اور اسے بیٹی سمیت راجستھان کے اس ویرانے میں پہنچادیا گیا تھا اور اسے مجبوراً بیٹی کی جان بچانے کے لئے سمن اور اس کے ساتھیوں کو دھوکے سے گھیر کر یہاں لانا پڑا تھا۔ اس کے باوجود میجر رام پرشاد نے اپنا وعدہ ایفا نہیں کیا تھا۔ رادھا کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کی بیٹی کو اس کیمپ میں کہاں رکھا گیا ہے اور کس حال میں ہے۔

دن کو اسے کھانا بھی دیا گیا۔ اس نے بے دلی سے چند نوالے کھائے اور بیڈ پر بیٹھ کر سوچنے لگی، نہ جانے اب یہ درندے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔

رات نو بجے کے قریب کمرے کا دروازہ کھلا اور دو سیاہ پوش اندر داخل ہوئے ان کے ہاتھوں میں آتشیں سیال کی بوتلیں تھیں اور آنکھوں میں ہوس کی چمک انہوں نے دروازہ اندر سے لاک کیا۔ اپنے مکروہ چہروں سے نقاب اتارے اور اس کی طرف بڑھے۔ رادھا نے مزاحمت کی کوشش کی مگر ان گرانڈیل شیطانوں کے مقابلے میں اس کی مزاحمت اس چڑیا کی طرح تھی جسے باز اپنے پنجوں میں دبوچ چکا ہو۔ وہ ان کی ہولناک گرفت میں مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی اور وہ اسے نہایت بے رحمی سے روندر ہے تھے۔

کمرہ رادھا کی چیخوں اور کراہوں سے گونج رہا تھا۔ وہ نصف شب تک شراب پیتے رہے اور مال مفت دل بے رحم کے مصداق اسے نوچتے کھسوٹتے رہے رات ایک بجے کے قریب انہوں نے نشے میں مدہوش ہوکر اسے چھوڑا تو اس نے سسکتے ہوئے پہلا سوال اپنی بیٹی کے بارے میں کیا۔ "وہ کہاں ہے اور اسے اس سے کب ملایا جائے گا؟"

ان میں سے ایک ہنسا اور لڑکھڑاتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اب سالی وہ پرلوک سدھار چکی ہے اسے میجر رام پرشاد کے حکم پر کل ہی گولی مار کر گڑھے میں دفن کروادیا تھا۔"

وہ بمشکل اپنے خراشوں سے بھرے بدن کو سمیٹ کر اٹھی اور دوبارہ چکرا کر بیڈ پر گر پڑی۔ وہ دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی۔ جبکہ وہ دونوں شیطان شراب کے نشے میں قالین پر دھت پڑے تھے۔

غم بے چینی اضطراب اور پھر اذیت میں بدل کر جسم وجان کو سلگا دیتا ہے وہ بیڈ پر چت لیٹی چھت کو دیکھتے ہوئے کچھ دیر رو کر ماتم کرتی رہی پھر اپنے کرچی کرچی وجود کو سمیٹ کر اٹھی۔ لباس پہنا اور بمشکل چلتی ان دونوں شیطانوں کے قریب پہنچی جو شراب کے نشے میں مدہوش خراٹے لے رہے تھے۔ ان کی رائفلیں ایک طرف پڑی تھیں رادھا نے ایک رائفل اٹھائی پھر کچھ سوچ کر رائفل واپس رکھی اور رائفلوں کے قریب پڑے خنجر کی طرف لپکی یہ خنجر بھی ان دونوں میں سے کسی کا تھا۔ اس کے دل میں نفرت اور انتقام کا جوالا مکھی دہک رہا تھا اور اسے دہکتے ہوئے انگارے میں تبدیل کردیا تھا جو قریب موجود ہر شے کو جلا کر راکھ کر ڈالتے ہیں اس کے دل میں انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ جس نے اس کے ڈر خوف اور بزدلی کے جذبات کو نگل لیا تھا۔

وہ خنجر اٹھائے ہوئے ان میں سے ایک کے قریب گئی اور نیچے بیٹھ کر خنجر کی دھار اس کی شہ رگ پر پھیر دی۔ اپنی پامالی کے احساس کے ساتھ ساتھ بیٹی کے قتل کا بدلہ لینے کا جنون تھا۔ اس لئے ہاتھ کی گرفت سخت رہی۔ تیز دھار خنجر نے اس شخص کا نرخرہ موم کی طرح کاٹ دیا۔ اور خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ اس کے گلے سے خون کا فوارہ نکلا جو رادھا کے چہرے اور لباس کو داغ دار کر گیا۔ اس کا جسم چند لمحے تڑپنے کے بعد ساکت ہوگیا۔

آوازیں سن کر اس کا ساتھی کسمسایا مگر نشے نے اسے دوبارہ مدہوش کردیا۔ رادھا آگے بڑھی اور خنجر دستے تک اس کے سینے میں عین دل کے مقام میں

اتار دیا۔ پھر اس پر بھی اسے چین نہیں آیا اس نے پے در پے کئی وار وحشیانہ انداز میں اس کے جسم پر کئے، وہ کچھ دیر وہاں بیٹھی ہانپتی رہی پھر باتھ روم میں نہانے کے ساتھ ساتھ لہو کے داغ دھبے دھوکر باہر نکلی رات کے ڈیڑھ بجے کے قریب کوریڈور سنسان پڑا تھا وہ غائب دماغی کی حالت میں آگے بڑھتی رہی۔

اسے سیل نمبر تھری کی تلاش تھی جہاں سمان اور اس کے ساتھیوں کو قید رکھا گیا تھا وہ ویسے بھی یہاں کے محل وقوع سے کسی حد تک واقف تھی وہ گزشتہ چند دنوں سے اسی کیمپ میں محصور تھی۔ اگرچہ اس پر کڑی نظر رکھی جاتی تھی لیکن گھومنے پھرنے پر کوئی پابندی عائد نہیں تھی وہ اسے بے ضرر اور کمزور سمجھ کر نظر انداز کئے ہوئے تھے۔ لیکن یہ ان کی بھول تھی۔ چیونٹی بظاہر کتنی ہی ننھی سی کیوں نہ ہو اگر ہاتھی کو کاٹ لے تو اس کا دم نکل جاتا ہے۔

کافی آگے جاکر یہ راہداری ایل کی صورت میں دائیں سمت مڑ رہی تھی وہ چند لمحوں کے لئے راہداری کے کنڑ پر رکی ذرا سا سر نکال کر جائزہ لیا سامنے ہی سنگلاخ سلاخوں والا دروازہ تھا جس میں تیز روشنی کے بلب میں الٹے لٹکے انسانی جسم صاف دکھائی دے رہے تھے کچھ فاصلے پر ایک سیاہ پوش کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے سو رہا تھا۔

رادھا نے خنجر پر اپنی گرفت مضبوط کی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی سیاہ پوش کے سر پر جا پہنچی۔ وہ تربیت یافتہ بلیک کیٹ کا اہلکار تھا اس کی چھٹی حس نے اسے ہوشیار کیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں مگر تب تک دیر ہو چکی تھی رادھا نے خنجر اس کے دل میں اتار دیا۔ اسے چیخنے تک کی بھی مہلت نہ ملی اور وہ جہنم رسید ہو گیا۔ رادھا کے ہاتھوں یہ تیسرا قتل تھا وہ ایک عام سی عورت تھی جو کاکروچ چوہے سے لے کر چھپکلی تک سے ڈرتی تھی۔ مگر بیٹی کے قتل کی وجہ سے وہ قاتل بن چکی تھی۔

سیاہ پوش کی لاش کی تلاشی کے دوران اس کی جیب سے تالے کی چابی بھی مل گئی۔ اس نے تالا کھولا اور کمرے میں داخل ہوگئی۔ حیدر علی، ناصر اور سمان ذبح کئے ہوئے جانوروں کی طرح الٹے لٹک رہے تھے قدموں کی آہٹ سن کر انہوں نے رادھا کو بھی دیکھ لیا تھا اور ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں لیکن وہ بولنے سے لاچار تھے اس بات کا احساس ہوتے ہی رادھا نے سمان کے منہ سے ٹیپ ہٹانے کے بعد سمان کے ہاتھوں پر بندھی رسی خنجر سے کاٹ ڈالی۔

”تم یہاں کیسے پہنچی؟“ سمان نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ وقت ان باتوں کے لئے مناسب نہیں اس سے پہلے کوئی دوسرا پہرے دار یہاں آجائے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو آزاد کروانے کی تدبیر کرو۔“ وہ جلدی سے بولی۔

کئی گھنٹوں سے الٹا لٹکنے کے باعث ان کی جسمانی حالت خاصی خراب تھی۔ سارا جسم سن ہو چکا تھا رادھا نے اس کے پاؤں کی رسی کاٹی تو اس نے گرتے وقت ہاتھ آگے کر لئے اس کے سر پر کوئی چوٹ نہ لگی چند منٹ چل کر اس نے دوران خون بحال کیا پھر اپنے ساتھیوں کو آزاد کرایا۔ وہ دونوں بھی اذیت کی وجہ سے چیخنے سے قاصر تھے خیر چند لمحے میں وہ دونوں بھی چلنے کے قابل ہوگئے ویسے بھی جب موت سر پر کھڑی ہو تو انسان موت کو سامنے دیکھ کر اپنے جسم کی ساری قوت یکجا کرکے اپنے لئے بچاؤ کی تدبیریں کرنے لگتا ہے۔ یہی کچھ اس وقت ان کے سامنے تھا۔

خوف کی تلوار ان سب کے سروں پر لٹک رہی تھی ان کی ٹانگیں ہلکی ہلکی کپکپا رہی تھیں، دل تھا کہ اپنی رفتار سے زیادہ دھڑک رہا تھا۔ حالت ان سب کی ایسی تھی کہ اگر کوئی ہلکی آواز بھی پیدا ہو جاتی تو ان کی چیخ نکلنے سے کسی صورت نہیں رک سکتی تھی۔

آگے بڑھتے ہوئے انہیں ایک کمرے کے دروازے کے نیچے سے روشنی نظر آئی اور پھر جب وہ دروازے کے قریب پہنچے تو وہ ششدر رہ گئے۔

(جاری ہے)